دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جون 2014

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 44 • شمارہ 06 • جون 2014 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
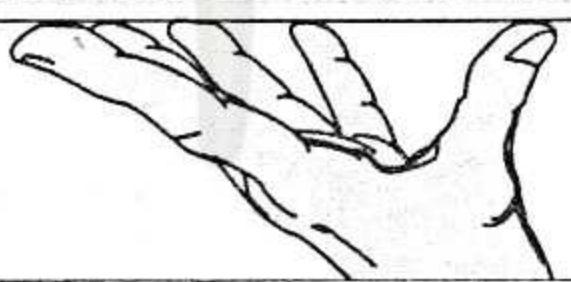
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چیتی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

جون کا مہکتا شمارہ آپ کی نذر ہے۔ ہمارے گرد و پیش میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ ہم سب دیکھ رہے ہیں... دیکھتی آنکھوں کے ساتھ ذہنوں میں یہ سوال جنم لے رہا ہے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے... اس گمبھیر سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ اس کڑے وقت میں کوئی نہیں جو قوم کو اس سوال کا جواب دے۔ اقتدار کے سارے ستون اپنی اپنی جگہوں پر منجمد اور تماشائی ہیں جیسے ان کی زبانیں گنگ اور دماغ ماؤف ہوں... دورے ہو رہے ہیں، مفاہمتی یادداشتوں پر دستخط ہو رہے ہیں، آنے والے سالوں کے لیے خوش خبریاں سنائی جا رہی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا جا رہا کہ غریب اور بھوکے دیہی پاکستانیوں کو رات کی روٹی کہاں سے ملے گی؟ دالیں مہنگی کیوں ہیں؟ آلو کب سستا ہوگا؟ ہمارا مقتدر طبقہ اِن دنوں دور اندیش ہو گیا ہے، دور کی کوڑی لا رہا ہے اور اسے دور کی سوجھ رہی ہے۔ ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے، اس سے کسی کو کوئی غرض نہیں۔ کرپشن، اقربا پروری، خودسوزیاں، قتل و خون ریزی، غربت و افلاس، رشوت خوری، بھتے اور تاوان جیسے گھٹیا مسائل شاید ان کی ترجیحات میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں۔ اس چشم پوشی میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں جو یہ تماشا دیکھ کر اپنی باری کے بارے میں خوش گمان ہیں، چپ سادھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ بولیں یا نہ بولیں، ان کو ہمارے اور آپ کے پیسوں سے پوری تنخواہیں اور مراعات بلاتعطل ملتی رہیں گی۔ قانون یہی کہتا ہے اور قانون بنانے والوں میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ہم کہاں جائیں، کس دروازے پر دستک دیں۔ جب تک یہ معلوم نہیں ہوتا، اسی دستک پر توجہ دیتے ہیں جو ہماری محفل کے دروازے پر دیر سے سنائی دے رہی ہے۔

ملکہ کوہسار سے نورالہدیٰ کی واپسی۔ ”ایک دفعہ پھر ایک نئے انداز میں، ایک نیا رنگ لیے نورالہدیٰ چیتی نکتہ چینی المعروف محفلِ ہاؤ ہو میں حاضر ہے۔ امید ہے اچھے الفاظ میں سواگت کیا جائے گا۔ ایک وقت ہوتا تھا ہم بھی اس محفل کے مستقل رکن ہوا کرتے تھے۔ امید تو نہیں کہ ہم ماسوائے چند ایک کے کسی کے ذہن کے کونے کھدرے میں موجود ہوں گے (ہماری یادداشت ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی... یاد ہے سب زیادہ زیادہ) جاب اور گھریلو معروفیات کی وجہ سے کافی عرصے ڈائجسٹ کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی۔ سرورق کی حسینہ جسے حسینہ کہنا مجھ سمیت تمام حسیناؤں کے ساتھ زیادتی ہے‘ بس ٹھیک ہی لگی۔ یہ اور بات ہے کہ مخالف صنف کے اراکین اپنے تبصروں میں اس کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔ فہرست کو دلکش انداز میں سجایا گیا۔ زیادہ تر نئے رائٹرز کے نام پڑھنے کو ملے۔ محفل ہاؤ ہو میں صرف چار خواتین۔ ہم کیا گئے کہ محفل کے رنگ ہی پھیکے پڑ گئے (جی جناب...) اپنے موسٹ فیورٹ آرٹسٹ کی علالت افسردہ کر گئی۔ خدا ان کو جلد صحت یاب کرے۔ آمین۔ جاوید مرزا المیہ یہ ہے کہ ہم سب کسی غیبی قوت کے انتظار میں ہیں کہ وہ آئے اور حالات سنوار دے، اس میں ہم اپنا کوئی رول پلے نہیں کر رہے۔ انکل جی تصویر العین کے غیاب پر آپ بڑے فکرمند دکھائی دیے۔ ہماری غیر حاضری کا تو آپ نے کبھی نوٹس نہیں لیا۔ اے گلاں چنگیاں تے نئیں نا (نہیں بھئی بہت پریشان تھے... تاروں سے پوچھا، ہواؤں کو سونگھا... مگر آپ کا کہیں پتا نہ ملا) شکیل کاظمی کا منفرد انداز پسند آیا۔ کبیر عباسی آپ ابھی تک بلیک لسٹ کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں؟ چچ چچ اللہ بچائے اس کے شر سے۔ اپنے تمام پرانے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ کم از کم ایک دفعہ ہماری خاطر انٹری مار ہی دیں۔ سلیم فاروقی کی قرضِ جاں تیز رفتار تھی مگر پلاٹ پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ انسانی ذہن اور باطن کی کیفیات کا ماجرا کاشف زبیر نے رابطہ میں بیان کیا اور کیا خوب کیا۔ منظر امام کی مختصر سی تحریر بساطِ عشق بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ دانیال عارف کی جائے مرگ ہماری پسندیدگی کے معیار سے بھی کافی اوپر کی تحریر تھی۔ بہت خوب بھئی۔ مریم کے خان کی تنگ آمد ہمارے معاشرے کی درست عکاسی کرتی ہے۔ ثمن باحلیم کی مسافر سرور اکرام اور منظر امام کے اسٹائل میں لکھی گئی پسند آئی۔ اب تک اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھ سکی ہوں۔ اب پتا نہیں اتنے عرصے بعد پڑھا اس لیے تمام تحریریں مزے کی لگیں یا واقعی مزے کی تھیں؟“ (او ہو سب مزے کی تھیں واقعی میں)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کے اعتراض ”3 تاریخ کو سرگزشت خریدنے بک اسٹال گیا تو نئے جاسوسی پر نظر پڑی تو یقین نہیں آیا، گویا کوئی خواب سا لگا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی انہی تاریخوں میں مل جایا کرے گا۔ (انشاء اللہ) سرورق دل کش تھا۔ خطوط کی محفل میں اس بار کافی جانے پہچانے نام نظر آئے۔ ان سب کو واپسی پر خوش آمدید۔ نوشہرہ کے جاوید مرزا اس بار دوڑ میں اول آئے، مبارک۔ کہانیوں میں جواری کی قسط اس بار شاندار رہی۔ پل پل بدلتے حالات کو قلم بند، اس دلچسپ اور سنسنی خیز انداز میں تحریر کرنا احمد اقبال صاحب ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ دیکھیں اب وہ سلیم اختر کی شادی۔ شاہینہ سے کرواتے ہیں یا حویلی سے فرار۔ ویسے ان مشکل حالات کا تقاضا ہے کہ وہ پیر صاحب کی دامادی قبول کر کے ان کی سرپرستی میں آ جائے تو جیل جانے اور پولیس کے خوف سے بچ جائے گا اور انور سے رشتے داری بھی ہو جائے گی۔ دوسری قسط وار کہانی بھٹی صاحب کی آوارہ گرد ایک نئے موضوع، اطفال گھر کی ایک اچھوتی داستان ہے۔ دیکھیں اب مرکزی کردار شہزاد احمد عرف شہزی آئندہ کیا کارنامے انجام دیتا ہے اور اب پولیس اور اطفال گھر کے کرتا دھرتا گل خان سے کیسے نجات حاصل کرتا ہے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں قرضِ جاں اور رابطہ اچھا انتخاب تھیں مگر اس شمارے کی بہترین کہانی ثمن باحلیم کی مسافر تھی اور بدیسی کہانیوں میں اقبال کاظمی کی شکست سب سے ممتاز رہی۔ تراش خراش کے اقتباسات نہ ہونے کے برابر تھے اور کہانیوں کے اینڈ بھی جاسوسی کے معیار کے نہ تھے۔“

ساگر کلوکر، چشمہ بیراج سے لکھتے ہیں۔ ”جاسوسی ڈائجسٹ بہت دیر اور تگ و دو کے بعد ملا۔ ٹائٹل سرخ ہونٹ، چمکیلے دانت کھڑی ناک، جھیل سی آنکھیں، ہلال کی طرح بھویں اور ساتھ ہی دو مُردے کیپٹر گیسٹوفل سے ہوتے ہوئے پاکیزہ سے ہیلو ہائے کی کیونکہ پاکیزہ کا بھی قاری ہوں۔ اداریے میں ملکی

مسائل بیان کیے گئے۔ محفل میں اول جاوید مرزا کو مبارک باد۔ حالات صرف آنسو اور دعاؤں سے ٹھیک نہیں ہوتے۔ اس کے لیے اچھے عمل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تصویر العین کی واپسی اچھی لگی۔ آرٹسٹ شاہد حسین کے لیے مسجد میں جا کر دعا مانگی۔ (بہت اچھا کیا) آوارہ گرد کی پہلی قسط جواری کی پہلی قسط کی طرح قید خانے سے فرار۔ آغاز تو اچھا ہے۔ موقع شناس کا انجام اچھا لگا۔ گورکن میں تابوت خالی نکلا۔ حیرانی ہوئی۔ تنگ آمد مریم کے خان کا نام ہی کافی ہے۔ لالچ کہانی اچھی لگی۔ قتلِ مقتول، احساسات اور گہرے مشاہدے کی بہترین کہانی ہے۔ دوسرا ایچ، بہت اچھوتی سی تحریر تھی۔ ایسی کہانیاں زیادہ شامل ہونی چاہئیں۔ آوارہ گولی میں ویزلی نے اپنی بیوی کے قاتل کو ڈھونڈ کر قتل کیا۔ اچھا کیا۔ ویزلی کی بیوی کو دوسرے دن ہی قتل کر دیا گیا۔ ارمان تو لگتا ہے۔ افسوس تو ہوتا ہے۔ بساطِ عشق، بے وفائی کی سزا صرف طلاق۔ کم از کم موت ہونی چاہیے تھی۔ (خوف خدا کریں) جائے مرگ، مکافاتِ عمل کی کہانی اس ماہ کا توشۂ خاص ثابت ہوئی۔ کہانی نے مکمل اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ دانیال عارف بہت خوب۔ ایک دن ان کا نام جاسوسی کے نامور لکھاریوں میں شامل ہو گا۔ مسافر میں ہلکی ہلکی منظر امام کی تحریر کی جھلک نظر آئی۔ جائے مرگ اور مسافر نے سرورق کی کہانیوں جتنا لطف دیا۔ قرضِ جاں نے مزہ نہیں کیا۔ سلیم ہمیشہ حقیقت سے بہت دور لکھتے ہیں۔ ٹیپر مین اور نارزن طرز کی کہانیاں لکھتے ہیں (اچھا ہے نا... ہر کام ہو جاتا ہے) رابطہ بہت دل آویز کہانی ضمیر کو جھنجوڑ گئی۔ واقعی ہم اپنی گلی اپنے گھر محلے اور اپنے شہر سے باہر کے مسائل کو اپنا نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارا المیہ ہے۔ حالانکہ سارا پاکستان ہمارا اپنا ہے۔"

بہاولپور سے **بشریٰ افضل کی یاد آوری** "دو مئی کو جاسوسی ملا۔ اوپر کونے پر صنفِ مخالف بڑی تکلیف میں دکھائی دے رہے ہیں۔ درمیان میں صنفِ نازک حیران و پریشان ہے۔ ساتھ ہی ایک کندھے پر گولی کا نشان نظر آ رہا ہے۔ ٹائٹل پر مکمل جاسوسیت چھائی رہی۔ کرسی صدارت سنبھالی محمد جاوید مرزا نے۔ اپنا میگزین کافی باریک بینی سے پڑھا۔ تبصرے پر کافی عرق ریزی کی گئی ہے، بہترین تبصرہ تھا۔ ہمارے آرٹسٹ شاہد حسین کو خدا صحت کاملہ عطا فرمائے، (آمین)۔ دوسرا ایچ، شاکر کو بیوی سے اتنی محبت تھی کہ اس کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بابا جال میں مرزا جی اتنا کچھ کما کر بھی خالی ہاتھ رہ گئے۔ حرام کا مال ایسے ہی جاتا ہے۔ جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ بساطِ عشق، غزالہ کے شوہر نے صحیح فیصلہ کیا کہ اس کو آزما کر اور آزمائش میں ڈال کر۔ جائے مرگ میں سلمان نے نادر سے ایسا انتقام لیا کہ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے اس نے صبر سے کام لیا۔"

اٹک سے **بشیر احمد خان خٹک کی مسرت** "اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ خلافِ معمول جلدی یعنی یکم مئی کو موصول ہوا۔ کھول کر دیکھا تو دہری خوشی ہوئی۔ ایک جلدی ملنے کی اور دوسری یہ کہ اس میں میری خواہش کے مطابق طبع زاد کہانیاں زیادہ ہیں۔ ابھی پڑھا نہیں ہے مگر یقیناً دلچسپ اور مزیدار ہو گا۔ براہِ کرم اسی طرح ہمیشہ طبع زاد کہانیاں زیادہ سے زیادہ شامل کیا کریں۔" (اتفاقات حسین ہوتے ہیں... اور کبھی کبھار ہوں تو زیادہ لطف دیتے ہیں)

صبا گل، پیر بابا بونیر سے **شکوہ گو ہیں** "میرے خیال میں میرے خط کو شمارے میں جگہ دے کر آپ کافی بوریت محسوس کرتے ہوں گے۔ کیونکہ میرے یکے بعد دیگرے چار خطوط یوں غائب کر دیے گئے جیسے کہ گدھے کے سر سے سینگ۔ کس نے؟ یہ نہیں معلوم۔ ڈاک والوں نے یا پھر... (ہم پر الزام نہ رکھیں) صدارت جاوید مرزا کے قبضے میں تھی، مبارک باد۔ تصویر العین بڑے عرصے بعد وارد ہوئیں۔ کیسی ہیں؟ سید اکبر شاہ! اتنے خوب صورت خط پر میری طرف سے ویلڈن۔ سبھی کے خطوط زبردست تھے۔ بالخصوص انور یوسف زئی، مرزا انجم اور شکیل کاظمی کے۔ کاظمی صاحب کی بات ہی الگ ہے۔ بھائی میرے آپ کی سخن دانی مجھے سب سے اچھی لگتی ہے اور یہ بتاؤ کہ آپ یہ اوٹ پٹانگ اقوال کس سے چوری کرتے ہیں؟ ویسے چینی خاتون کی باتیں یقیناً آپ اور آپ کی پڑوسن پر فٹ آتی ہیں۔ نئی سلسلے وار کہانی کی حالیہ قسط نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ جواری جو بن پر ہے۔ ملک سلیم کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ شکست نارمل تحریر تھی۔ مریم کے خان اس دفعہ زیادہ متاثر کن کہانی پیش نہ کر سکیں۔ منظر امام ایک عدد گھریلو قسم کی تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ روایتی موضوع تھا لیکن ٹریٹ منٹ اچھا تھا۔ سلیم فاروقی حسبِ سابق اپنے مخصوص موڈ کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ کہانی اچھی تھی۔"

آزاد کشمیر سے **مرزا انجم جرال کی پسندیدگی** "مئی کا شمارہ خلافِ توقع 2 مئی کو ملا تو خوشی کے ساتھ بہت حیرانگی بھی ہوئی کہ اتنی جلدی رسالہ کیسے آ گیا۔ ساتھ ہی اٹھارہ سالہ ریکارڈ بھی ٹوٹ گیا۔ (میرے پڑھنے کی مدت) کے اٹھارہ سالوں میں پہلی دفعہ 2 تاریخ کو رسالہ ملا (اب ایسی بھی بات نہیں) ٹائٹل پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے اداریہ پڑھا۔ اللہ پاک اس ملک پر رحم کرے۔ کرسیٔ صدارت پر محمد جاوید مرزا قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ مبارک ہو جناب تبصرہ لائقِ صدارت تھا۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے پڑھے جو کہ بہت پسند آئے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی کہانیاں میں نے اتنی زیادہ نہیں پڑھیں اور معذرت کے ساتھ کچھ خاص پسند بھی نہیں آئیں۔ لیکن ان کی قسط وار کہانی آوارہ گرد کی پہلی قسط پڑھی جو کہ بہت پسند آئی۔ شہزاد احمد خان عرف شہزی کا کردار بہت پسند آیا۔ آگے جا کے یہ ایک شاندار کہانی ثابت ہو گی۔ اس کے بعد جواری پڑھی۔ 11 ماہ ہو گئے ہیں مگر ابھی تک کہانی کا سرا ہاتھ نہیں آیا۔ بس حویلی کے گرد گھوم رہی ہے۔ احمد اقبال صاحب بہت اچھے لکھاری ہیں، پلیز کہانی میں کچھ ڈالیں۔ سر احمد اقبال صاحب میری باتوں کا مائنڈ نہ کرنا۔ اپنے پسندیدہ رائٹر کاشف زبیر کی کہانی رابطہ پڑھی، پُراسرار کہانی تھی۔ کہانی نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ سلیم فاروقی کی کہانی قرضِ جاں پڑھی، بہت اچھی کہانی تھی۔ احسن نے خوب دوستی نبھائی۔ علی کو پتا چل گیا لالچ بری بلا ہے۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت پسند آئیں۔ مجموعی طور پر مئی کا شمارہ ایک بہترین شمارہ تھا۔"

ہری پور ہزارہ سے **معراج محبوب عباسی کا کارنامہ** "اس بار جاسوسی خلافِ معمول 4 مئی کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل خاصا منفرد تھا۔ جو کہ عیاری، لاچاری اور معذوری کی آمیزش سے مرتب کیا گیا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں ایوانِ صدر کی کرسی محمد جاوید مرزا کو مبارک۔ جاوید صاحب آپ والا مسئلہ ہمیں بھی درپیش ہے۔ جواری بالکل سر کے اوپر سے گزر رہی ہے۔ سلیم اختر کی قیاس آرائیاں تو بور کر کے رکھ دیتی ہیں۔ سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ بھٹی صاحب اگر کچھ مزاح بھی ڈال دیں تو للکار کی کمی پچاس پرسنٹ تک تو پوری ہو ہی جائے گی۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی رابطہ سے رابطہ ہوا۔ اختتام تک توڑ نہ پائے۔ سلیم

فاروقی کی قرضِ جاں بھی جاندار تحریر تھی۔ حکومت اور جواری نے نہ ہونے کے برابر کارکردگی دکھائی ہے۔ اگر احمد اقبال صاحب سلیم صاحب کو سوچوں سے نکال لائیں اور عمل کے میدان میں اتاریں تو کہانی کچھ آگے بڑھ سکے گی۔ ایک دوست چند دن کے لیے رسالہ مستعار لے گیا تھا کیونکہ میں نے قاری بناؤ مہم کا آغاز کر دیا ہے اور ایک ماہ میں تین قاری بنا لیے ہیں جو اگلے ماہ سے مستقل رسالہ خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" (شکریہ)

فتح پور لیہ سے **سید محی الدین اشفاق کی سرخوشی** "ٹائٹل گرل کی آنکھوں کے علاوہ کچھ بھی ٹھیک نہ لگا۔ البتہ آوارہ گرد کی نئی سلسلے وار کہانی کا آغاز عبدالرب بھٹی کے قلم سے ہو گیا ہے۔ پہلی ہی قسط میں شہزی ایک نجی یتیم خانے میں عابدہ نامی لڑکی کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش میں اپنے دوستوں بالا اور اشرف کی وجہ سے ناکام ہو گیا ہے تاہم اسے اختتام پر کامیابی تو مل کر لگتا ہے کچھ نئے سنسنی خیز واقعات نیکسٹ پڑھنے کو ملیں گے۔ جواری میں احمد اقبال تیزی لے آئے ہیں۔ خاور انور نامی کنبل کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر اب کنبل اس کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔ خوابوں میں نورین کی خوشبو کا ملنا حیرت انگیز لگا۔ منظر امام کی بساطِ عشق میں میاں بیوی کے حساس رشتے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ غزالہ اور خورشید کی سچی محبت کا چائے نہ پینے سے پتا چل گیا۔ محمد جاوید مرزا ایور کرسی پر کڑھتے ایک اچھے تبصرے کے ساتھ وننگ سیٹ پر براجمان تھے۔ تصویر العین شکر ہے کسی نے تو پاکستانی اداکاروں کا نام لیا ورنہ ہمارے ہاں تو رواج بن گیا ہے انڈین اداکاروں کو سراہنے کا۔ زاہدہ اقبال ویلکم۔ بشریٰ افضل مختصر مگر جامع تبصرے کے ساتھ آئیں۔ سید اکبر شاہ یہی تو امتنگ ہے جو جاسوسی اپنے دیوانوں کی ٹوٹنے نہیں دیتا۔ یار خمار آلود لگا ہی صرف آپ کو ہی لگیں پوری محفل میں کیا وجہ؟ طاہرہ گلزار اتنے تفصیلی خط کے شائع ہونے کی خوشی میں مٹھائی تقسیم کریں۔ سید شکیل کاظمی اپنے آپ کو نوآموز اور بے ربط سطور نہ کرو جناب آپ کو دیکھ کر تو ہم کچھ نہ کچھ لکھ لیتے ہیں۔ اتنی کسرِ نفسی اچھی نہیں ہوتی۔"

نوشہرہ سے **محمد جاوید مرزا کا احوال** "اس ماہ کا جاسوسی 3 تاریخ کو ملنے پر حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ ذاکر صاحب کے زخم گزیدہ سرورق سے ہوتے ہوئے چینی نکتہ چینی پر آئے۔ دوستوں کی محفل میں داخل ہوئے تو اپنے نامے کو سرِ فہرست دیکھ کر خوشگوار مسرت ہوئی۔ تمام دوستوں کو محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ ابرار وارث کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ عبدالرب بھٹی بڑا نام ہے۔ آوارہ گرد کی پہلی قسط کا آغاز تو اچھا رہا۔ امید ہے کہانی امیدوں پر پوری اترے گی۔ سلیم انور کی موقع شناس اچھی کہانی تھی۔ اس کو کہتے ہیں موروں کو چور پڑنا۔ مغربی مجرم اکثر شاطر دماغ تو ہوتے ہی ہیں لیکن سادگی میں لٹنے والے بھی اکثر اندھے اعتماد کے ہاتھوں مات کھا جاتے ہیں۔ بابر نعیم کی مختصر کہانی گورکن پڑھ کر سر پیٹ لیا۔ آصف ملک کی لالچ کہانی جرم و سزا کے موضوع پر مبنی دلچسپ کہانی تھی جس نے بور نہیں کیا۔ سکندر علیم کی ترجمہ کہانی قتلِ مقتول ذہانت پر مبنی زبردست قوتِ مشاہدہ کے مالک سراغ رساں نے سیدھے سادے خودکشی کے کیس کو قتل ثابت کر دیا۔ مختار آزاد کی پیش کش دندان شکن بلاشبہ ایک باپ کی شفقتِ پدری کی ترجمان کہانی تھی جس نے ایک بیٹی کو کھو کر دوسری کو پالیا تھا۔ شکست جسے اقبال کاظمی نے ترتیب دیا۔ پیچ در پیچ رنگ بدلتی داستان تھی۔ امجد رئیس کی آوارہ گولی کا غیر متوقع انجام گولی کی طرح لگا۔ حیران کن، چونکا دینے والا انجام کہانی کے سامع کی طرح قاری کو بھی سکتہ زدہ کر گیا۔ منظر امام نے اس ماہ بساطِ عشق بچھائی اور کیا خوب بازی کھیلی۔ رشتوں کے اعتماد کا خون کرتے، بے راہ رو، دغاباز، پُرفریب مہرے بری طرح پٹ گئے۔ دانیال عارف کی جرم و سزا کی روایتی موضوع پر جائے مرگ اچھی تحریر لگی۔ ثمن با حلیم نے اس ماہ مسافر پیش کی۔ نیکی کی راہ کا مسافر اور بدی کی راہ کا مسافر، نیکی و بدی کی جنگ ازل سے جاری ہے۔ دونوں کی ہار جیت چلتی رہتی ہے کہانی کے مرکزی کردار کو جوانی میں توبہ کی توفیق ملی۔ یہ بڑی بات ہے۔ سلیم فاروقی کا سرورق پر قرضِ جاں زر کی ہوس پرستی کا چشم کشا فسانہ ہی تھا۔ کہانی اچھی تھی لیکن زیادہ متاثر کن نہیں تھی۔ اس ماہ کی آخری تحریر کاشف زبیر کی رابطہ کافی بہتر کہانی تھی۔ سنسنی خیزی اور دلچسپی کا عنصر غالب تھا۔"

خانیوال سے **محمد صفدر معاویہ کے موسم کے مزے** "شمارہ خلافِ معمول 5 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق کی خوب صورت ماڈل کے ساتھ ایک صنف وجاہت ایک کرخت وجاہت براجمان ہو کر سرورق کا کمپچر بناتے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا، موسم اس دفعہ بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ آج بھی خانیوال میں آسمان بادلوں کے ساتھ ڈھکا ہوا ہے۔ اپنی محفل میں آئے تو صدارت کی کرسی پر بھائی محمد جاوید مرزا کو صدارت کی کرسی سنبھالے دیکھا۔ مبارکاں بھائی جان دوسرے نمبر پر تصویر العین صاحبہ براجمان تھیں۔ اگر آپ پڑھ سکتی ہیں تو کیا ہم لوگ نہیں پڑھ سکتے۔ جاسوسی تو ہر خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ تو وہاں بھی پہنچتا ہے جہاں کھانا مشکل سے جاتا ہے۔ کہانیوں میں آوارہ گرد پڑھی۔ امید کرتا ہوں کہ یہ جاسوسی کے صفحات میں اچھا اضافہ ہو گی۔ موقع شناس، گورکن اسٹوری اچھی تھی۔ تنگ آمد ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی نظر آئی۔ شریف نے آخر وہی کیا جو تنگ آ کر ایک شریف آدمی کر سکتا ہے۔ لالچ کہانی میں آخرکار ملزم پھنس گئے نا۔ جواری اب ٹھیک طرح آگے بڑھ رہی ہے۔ اگلی قسط میں شاہینہ اور ملک سلیم کا دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔ قتلِ مقتول، دندان شکن، شکست، دوسرا ایچ، آوارہ گولی، بساطِ عشق بھی اچھی کہانیاں تھیں۔"

شہزادۂ کہسار **کبیر عباسی کا مری سے حسابی گوشوارہ** "اس دفعہ تو کمال ہی ہو گیا۔ جاسوسی جلدی مل گیا۔ ذاکر انکل اس دفعہ اپنی پرانی جون میں نظر آئے۔ ٹائٹل پسند آیا۔ کسی سیانے نے فرمایا تھا کہ کسی کی کارکردگی بڑھانی ہو تو اسے بانس پر چڑھا دو۔ سنجیدہ الفاظ میں کہیں تو اس کی تعریف کر دو۔ مسٹر امتیاز کی بھی تعریف کی گئی تو انہوں نے فہرست انتہائی منفرد انداز میں مرتب کی۔ محفل میں پہنچے تو پتا چلا کہ اس دفعہ آپ نے ڈائجسٹ اتنی جلدی کیوں چھاپا ہمیں بلیک لسٹ کی کرسیٔ صدارت جو دینا تھی۔ سید اکبر شاہ اپنی مشکل اردو سے ہمارے دماغ کا دہی کرنے میں مصروف تھے۔ خیر گرمیاں ہیں، کام آ جائے گا۔ شکیل کاظمی کی لگتا ہے گاں گم گئی ہے۔ اس کی تلاش میں کچھ عرصہ غیر حاضر رہے۔ نہیں ملی تو گوا چی گاں کا کردار تخلیق کر دیا۔ ادریس احمد اور جاوید مرزا کے تبصرے شاندار تھے۔ نئی سلسلے وار تحریر کے لیے عبدالرب بھٹی کا نام دیکھ حیرت ہوئی۔ تاہم واقعات کافی دلچسپ لگے البتہ کہانی میں کئی جگہ جھول بھی دیکھنے کو ملے۔ اس کے باوجود ہم نے اس کہانی کو ساٹھ نمبر دے کر فرسٹ ڈویژن میں پاس کر دیا (وڈی مہربانی) سلیم انور کی موقع شناس کا پلاٹ بھی زبردست تھا اور اندازِ بیان بھی خاص کر الفاظ کا چناؤ تو بہت ہی زبردست تھا۔ یہ تحریر نوے فی صد نمبر لے گئی۔ بابر نعیم کی گورکن کا اینڈ توقع کے مطابق تھا۔ اس لیے اس تحریر کے لیے ہماری پاکٹ سے پچاس فی صد نمبر ہی برآمد ہو سکے۔ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو مریم کے خان نے تنگ آمد میں بہت ہی

خوب صورتی سے بیان کیا۔ یہ تحریر پچانوے فی صد نمبر ہی لے سکی۔... ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو مریم کے نے تنگ آمد میں بہت ہی
خوب صورتی سے بیان کیا یہ تحریر پچانوے فی صد نمبر لے کر اس شمارے کی خاص الخاص تحریر رہی۔ آصف ملک کی لالچ کہانی بھی دلچسپ تحریر تھی مگر اس طرح کی تحریریں کافی دفعہ زیرِ مطالعہ آ چکی ہیں اس لیے یہ تحریر پینسٹھ فی صد نمبر لے سکی۔ جواری میں اس دفعہ ہیرو کافی ٹینس نظر آیا۔ مزاح کی کمی شدت سے محسوس ہوئی البتہ اینڈ چونکا گیا۔ میرا خیال ہے اس قسط کے لیے ساٹھ فی صد نمبر کافی ہوں گے۔ سکندر علیم کی قتل مقتول سراغ رسی کا شکار ثابت ہوئی اتنی فی صد نمبر تو بنتے ہیں۔ مختار آزاد کی دندان شکن بھی ہماری دلچسپی کے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب رہی اس کو ہم نے پچھتر فی صد نمبر دیے۔ شکست کا آغاز تو دلچسپ تھا لیکن آگے جا کر یہ ایک عام سی کہانی ثابت ہوئی۔ اس کے لیے ہم نے پچپن فی صد نمبر مختص کیے۔ جمال دستی کی دوسرا ایچ ہمیں چونکا نہیں سکی، اس لیے پینتالیس فی صد نمبر ہی لے سکی۔ البتہ امجد رئیس کی آوارہ گولی ہمیں چونکا گئی اور پچھتر فی صد نمبر لے گئی۔ منظر امام کی مختصری تحریر بساطِ عشق ہمیں اداس کرنے کے ساتھ ساتھ ستر فی صد نمبر لے گئی۔ منظر امام کے اسٹائل میں لکھی گئی ثمن باحلیم کی مسافر بھی ایک معیاری تحریر تھی۔ اس تحریر کو ہم نے اسی فی صد نمبر سے نوازا۔ سلیم فاروقی کی قرضِ جاں تو سے فی صد سے اوپر نمبر لے جاتی اگر اس میں اتنے جھول نہ ہوتے۔ کاشف زبیر کی رابطہ جیسی ایک اور تحریر کاشف زبیر پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ اس میں آسیب تھا اس میں نفسیات وہ بہت شاندار تھی۔ یہ کم شاندار پھر بھی پینسٹھ فی صد نمبر لے گئی۔ ڈائجسٹوں کی دنیا کے سب سے اچھے آرٹسٹ شاہد حسین کی علالت افسردہ کر گئی۔ بیماری کی نوعیت نہیں بتائی آپ نے؟ اس دفعہ طبع زاد تحریریں کافی زیادہ رہیں۔ یہ بات ہمیں تو پسند آئی البتہ مزاحیہ تحریر کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔"

آزاد کشمیر سے **افتخار اعوان** کی مصروفیت۔ "مئی 2014ء کا جاسوسی اتنا جلدی مل جائے گا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ٹائٹل جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ بس ذرا ذاکر انکل نے ٹائٹل گرل کو زیادہ ہی خوب صورت بنچ دے دیا ہے۔ ہمارا نازک سا دل ہے مچل جاتا ہے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے (سنبھالا کریں... جسم میں سب سے اہم پرزہ ہے) نکتہ چینی میں محمد جاوید مرزا پہلے نمبر پر رہے۔ ان کی رائے اچھی لگی۔ تصویر العین کی واپسی اچھی لگی۔ سید شکیل کاظمی صاحب کی تو بات ہی الگ ہے۔ آوارہ گرد ایک بہترین سلسلہ ہے۔ پہلی ہی قسط میں اتنا تھرل، اتنا ایکشن آگے چل کے تو یہ چائنا کے مارشل آرٹس کا کلب ثابت ہوگی۔ سرورق کے رنگوں میں کاشف زبیر کا دوسرا رنگ رابطہ تو بالکل فلمی سین لگا۔ خاص کر ثمینہ کی شخصیت تو بالکل معما ہی رہی۔ سلیم فاروقی کی قرضِ جاں وبالِ جان ثابت ہوئی۔"

اوکاڑہ سٹی سے **تصویر العین** کے ڈھول دھماکے۔ "جاسوسی کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ خصوصاً دوشیزہ کی آنکھیں بہت ہی پیاری تھیں۔ جاسوسی اس بار بہت لیٹ یعنی 12 تاریخ کو ملا (یہ کیا کہہ رہی ہیں، اس دفعہ تو جاسوسی سب کو جلدی ملا ہے) صدارت کی کرسی پر محمد جاوید مرزا موجود تھے واقعی تبصرہ جان دار تھا۔ سید اکبر شاہ آپ کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ آخر عمر کا بھی تو تقاضا ہے۔ محمد شاہان سعید آپ کے بارے میں تو بس اتنا ہی کہوں گی کہ وہ ہے ناں کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے اسی طرح آپ نے کچھ بھی نہیں لکھا اور لکھ بھی گئے۔ تابی اور بالو آپ کے خط نے اس بار مزہ نہیں دیا۔ کیا بات ہے؟ رانا ساجد علی جاسوسی کی محفل میں ویلکم۔ طاہرہ گلزار دے دی انٹری بہنا اب تو خوش ہو جاؤ۔ ادریس احمد خان کے خط میں سنجیدگی کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ بھائی خوش رہیں اور اچھا سوچیں اچھا سوچنے سے اچھا ہی ہوگا۔ مشائم دل سے دعا ہے کہ امتحان میں کامیابی نصیب ہو (آمین) ابرار وارث شرم کرو تم کالج رسالہ پڑھنے جاتے ہو یا پڑھائی کرنے۔ خط نہ لکھنے والی بات کچھ ٹھیک نہیں اگر پسند کی کہانی شائع نہیں ہوگی تو خط لکھنا بند ورنہ خط لکھو گے۔ یہ اچھی بلیک میلنگ ہے۔ شکیل کاظمی سن لیں مرزا انجم جرال کہہ رہے کہ آپ دوسروں کی شادیاں اٹینڈ کرتے پھر رہے ہیں کیونکہ خود کی شادی کا کوئی امکان نہیں اب آپ کو ان کا منہ بند کروانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ کہانیوں میں کاشف زبیر کی رابطہ سلیم فاروقی کی قرضِ جاں اور ثمن باحلیم کی مسافر اچھی لگی۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکی۔"

ملتان سے **زاہدہ اقبال** کا شکر پارہ۔ "مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ میرا خط شائع کریں گے، خط شائع کرنے کا بہت شکریہ اس لیے دوسری بار خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں (یہ جسارت ہر ماہ کیجیے گا) اسما قادری نے اتنی جلدی آخری قسط کر دی کہ اس کا اتنا دکھ ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا (کر دیں... وہ بھی چھاپ دیں گے) ہر ماہ گرداب کا انتظار رہتا تھا اسی دکھ کی وجہ سے دوسری کوئی بھی کہانی نہیں پڑھ سکی۔ خیر جتنا دکھ اختتام کا ہے، اتنی ہی خوشی ماہ بانو اور شہریار کی شادی کی ہے۔ اسما جی نے اتنا اچھا اختتام کیا ہے۔"

خانیوال سے **محمد قدرت اللہ نیازی** کا تجزیہ۔ "جاسوسی ایک تہلکہ خیز ٹائٹل کے ساتھ بروقت موصول ہوگیا۔ کرسیٔ صدارت پر جاوید مرزا بڑے جوشیلے موڈ کے ساتھ موجود ہیں اور احمد اقبال سے جواب طلب کر رہے ہیں حالانکہ یہ صرف خاور کے خیالات تھے جو موصوف نے بیان کیے۔ تصویر العین آپ جہاں بھی غائب رہی ہیں آپ کی کمی ضرور محسوس ہوئی ہے۔ جاسوسی پڑھ پڑھ کر آپ کا انداز بھی جاسوسوں جیسا ہو گیا ہے۔ تبھی ایم کے احساس سے بھی تفتیش شروع کر دی۔ زاہدہ اقبال آپ کے اختصاریے نے سارہ فرام لاہور کی یاد دلا دی جو کافی عرصے سے ہر فورم سے غائب ہیں شاید ظالم ساس کے شکنجے میں جکڑ دی گئی ہوں؟ آزاد کشمیر سے انجم جرال کی آمد خوشگوار رہی۔ عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پہلی قسط ہی شاندار لگ رہی ہے۔ امید ہے گرداب کا ملال کم کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ منظر امام کی بساطِ عشق خوب رہی۔ منیر نے غزالہ اور خورشید سے خوب انتقام لیا۔ ایک فقرہ خورشید میرا دوست ہے پتا نہیں دوست کس کو کہتے ہیں نے دل کو بہت اداس کر دیا۔ آج واقعی دوستی صرف ضرورت کا رشتہ بن کر رہ گئی ہے۔ ثمن باحلیم یہ مسافر کی مصنفہ کا نام ہے بہت عجیب سا لگا۔ تاہم تحریر اچھی تھی۔ تنویر نے بہت جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور اللہ نے اس کی مدد کی ورنہ دنیا تو توبہ کا موقع دینے کے موڈ میں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سلیم فاروقی کا پہلا رنگ قرضِ جاں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے مصنفین نئی جدتوں کے مطابق لکھنا شروع ہو گئے ہیں۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کا رابطہ انگریزی ناول اور ڈراموں کے آئیڈیا روح کی واپسی پر مشتمل تھا۔ اس عقیدے کو اگرچہ ہم نہیں مانتے تاہم تحریر خوب بنی گئی۔ اچھے اسکول اور اکیڈمیز میں بچوں کو داخلہ دلوا کر ان کی طرف سے بے فکر ہو جانا آج کل عام ہے جس سے راحیل اور شاہنواز جیسے کردار پیدا ہو رہے ہیں۔ کترنیں بھی خوب تھیں۔"

حافظ آباد سے **ماہا ایمان** کی دھونس۔ "آج کل کچھ عجیب سی مصروفیات نے ایسا پیچھا پکڑا ہے کہ جان چھڑانی دوبھر ہو گئی ہے۔ بہرحال جے ڈی پی کے دوستوں کی پُرخلوص فرمائش پر پھر قلم تھاما ہے۔ دیکھیں کس کو ہماری طرف سے لفظوں کے پھول پیش ہوتے ہیں اور کس کو لفظوں کے تیز دھار تیر۔ ہمارے غیاب کے دوران جن احباب نے یاد رکھا ان کو دل کی گہرائیوں سے سلام اور جنہوں نے تیری یاد خارِ گلاب ہے سمجھ کے بھلا دیا ان کو تو بس اللہ ہی پوچھے۔ چینی نکتہ چینی میں محمد جاوید مرزا کسی ماہر نکتہ داں کی طرح نکتے اٹھاتے پائے گئے۔ تصویر العین کو عرصے بعد محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بشریٰ افضل جی آداب عرض، بھول گئیں نا آپ بھی ہمیں اوروں کی طرح؟ ناظم آباد کراچی سے محترم ادریس احمد خان بڑا ہی باوقار اور شائستہ تبصرہ ہوتا ہے ہمیشہ کی طرح۔ کھاریاں سے تین چار گجر برادران بھی محفل کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ برادران کیا آپ کا دل کا پیچ کا ٹکڑا ہے۔ مرزا انجم جرال سادہ مگر پُرکار تبصرہ تھا۔ شکیل کاظمی صاحب سمجھ نہیں آ رہی وہ کم سے کم الفاظ میں کہاں سے لاؤں جس میں آپ کے تبصرے کی زیادہ سے زیادہ تعریف بیان ہو سکے لیکن سچ تو یہ ہے کہ شیکسپیئر اور پڑوسن کے بعد اب گاؤں کے تذکروں سے آپ ہمیں خوب انٹرٹین کرتے ہیں۔ اب جناب اگلے ماہ میں جوابی تعریف کی منتظر رہوں گی (اچھی زبردستی ہے بھئی) محمد شاہان سعید آپ کے شہر میں کیا اچھے ٹوتھ پیسٹ نہیں ملتے؟ خاصا جلا کڑھا تبصرہ تھا آپ کا۔ محمد صفدر معاویہ آپ کا تبصرہ پڑھ کر آپ کی بیگم کا ڈھیروں خون بڑھ گیا ہوگا۔ یہ بیویاں ایسی ہی معصوم ہوتی ہیں (آپ کی طرح) اس ماہ سب سے پہلے آوارہ گرد کو شرفِ ملاقات بخشا۔ عبدالرب بھٹی صاحب کا تحیر سسنی اور ایکشن میں ڈوبتا ابھرتا سلسلہ، کہانی پڑھتے ہوئے وہ سماں بندھا کہ میں اردگرد سے بیگانہ ہو گئی۔ امید ہے آگے چل کر مزید تیز رفتار اور اچھی ہو جائے گی۔ سرورق کے رنگوں میں پہلے دوسرا رنگ کاشف زبیر کی تحریر رابطہ پڑھی۔ شعور اور لاشعور کی دبیز تہوں میں پوشیدہ عوامل کی حقیقتوں کو آشکار کرتی تحریر متاثر کن تھی۔ پہلا رنگ سلیم فاروقی کی کہانی بالکل پسند نہیں آئی۔ احمد اقبال انکل کی جواری متاثر کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ سکندر علیم کی قتل مقتول مختصر طرز کی انسانی ذہن، احساسات اور مشاہدے کی بہترین مثالی تحریر تھی۔ شکست شاید اقبال صاحب کی پرانی تحریر تھی (یقیناً) الیے، اتفاقات زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ذہن و دل سے محو نہیں ہوتے۔ ان کی کسک دل اور روح کو جھنجوڑے رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہی کہانی ہے جو ہر جذبے کی ترجمانی کر رہی ہے۔ کافی لمبا تبصرہ ہو گیا۔ بہت بہت شکریہ اتنا برداشت کرنے کا۔ کافی عرصے بعد چکر لگایا ہے سو تبصرہ تو شائع ہونا ہی چاہیے اب ورنہ... ورنہ میں وٹامن سی کی گولیاں کھا کر سوسائڈ کر لوں گی... ہاہاہا۔"

راجن پور سے **ذاکم علی گورچانی** کے اندیشے۔ "اس بار خلافِ توقع جاسوسی نے 8 تاریخ کو درشن کروا دیے اور ہم نے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔ سرورق اپنی دل فریب رنگینوں کے ساتھ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہا تھا۔ اوپری کونے سے تفسیر عباس بھائی شاید حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بار تو فہرست بنانے میں ڈیزائنر صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ محفلِ یاراں میں محمد جاوید مرزا صاحب کرسیٔ صدارت پر سوچوں میں گم تھے کیونکہ ان کی شاہی کرسی بری طرح ڈول رہی تھی۔ تصویر العین صاحبہ بڑی مدت بعد جلوہ گر ہوئیں۔ شاید کرسیٔ صدارت کے چکر میں وظیفہ کرنے میں مصروف تھیں۔ کھاریاں سے چودھری برادران کا پنچایتی جرگہ زبردست رہا۔ سب سے پہلے جواری کو اسٹارٹ کیا لیکن یہ کیا، ابھی چلتی بھی بند اتنا سلو ٹیمپو شروع سے آخر تک ایک ہی نقطے پر گھوم رہی ہے۔ احمد اقبال یا تو اس کا اینڈ کریں یا پھر اسے حرکت میں لائیں۔ سرورق کے آخری رنگ اس مرتبہ بازی لے گئے۔ سلیم فاروقی ہمیشہ ہی تیز ٹیمپو والی کہانیاں لکھتے ہیں جو ہمیں بہت زبردست لگتی ہیں۔ آوارہ گرد میں پہنچے تو اس کے حصار نے ہمیں اپنے بندھن میں جکڑ لیا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اس بار جلدی خط بھیج رہے ہیں کیونکہ دھڑکا ہے کہ پھر کہیں بلیک لسٹ نہ ہو جائیں۔"

اسلام آباد سے **شکیل حسین کاظمی** کا محبت نامہ۔ "میرا ہمیشہ سے یہی ماننا ہے کہ اگر کوئی جاسوسی کا قاری ہے تو وہ اعلیٰ ذوق رکھتا ہے، اسی بہانے خود کی بھی دل جوئی ہو جاتی ہے لیکن اس بات میں بھی کوئی ابہام نہیں کہ رسالوں کی دنیا میں جاسوسی کا نام بہت درخشاں ہے اور عموماً جاسوسی کے قارئین کو زیادہ گہرا، ذہین اور پُراسرار سمجھا جاتا ہے۔ سرورق کے بارے میں میری رائے ابھی تک تبدیل نہیں ہوئی کہ بہت اچھا ہے۔ چینی نکتہ چینی میں منصبِ صدارت محمد جاوید مرزا کے حصے میں آیا جنہوں نے کہانیوں پر تبصرہ کیا تھا، مبارک باد جناب۔ تصویر العین صاحبہ کی واپسی پر ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس دفعہ سب سے متاثر کن اور جامع تبصرہ سید اکبر شاہ کا تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ یاد رکھنے کا شکریہ، چاہے کسی بھی بہانے۔ مرزا انجم جرال صاحب آپ کے توسط سے میری مصروفیت کا احوال احباب کے گوش گزار ہوا مگر میری پڑوسن بلاوجہ بیچ میں آ گئی۔ کہانیوں میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کا نیا سلسلہ آوارہ گرد جاسوسی کے ابتدائی صفحات کی زینت بنا جس سے یہ تو ثابت ہوا کہ ایک طویل کہانی رسالے میں کم ہے۔ حیرت انگیز طور پر پہلی قسط نے بہت زیادہ متاثر کیا اور واقعات کے تسلسل نے ڈاکٹر صاحب کی کہانی پر مضبوط گرفت کی غمازی کی۔ احمد اقبال صاحب کی جواری میں کافی پیش رفت ہوئی اور وہ یہ کہ پچھلے کافی ماہ سے خاور عرف ملک سلیم حویلی اور انور سے جان نہیں چھڑا سکا اور شاید یہاں پر ہی کسی دن اسے اعزاز و منصب (جو کہ کوئی بھی نہیں) کے ساتھ دفنا دیا جائے اور آگے انور اپنی کہانی کا راوی بن کے داستان گوئی شروع کر دے۔ اس کے بعد اقبال کاظمی کی شکست کا مطالعہ کیا۔ ایسی مربوط اور جاندار کہانی پڑھنے کو ملی کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ مریم کے خان کی تنگ آمد پاکستان کے حالات کی بہترین عکاس لگی کہ کس طرح شریف آدمی کی زندگی مشکل بنائی جا رہی ہے، اپنے ذاتی اور سیاسی مفاد کی خاطر۔ شاید جمہوریت اسی کا نام ہے۔ جمال دستی کی دوسرا ایچ اور بابر نعیم کی گورکن مختصر مگر اچھی کاوشیں تھیں۔ منظر امام کی بساطِ عشق بہت اچھی اور معاشرتی موضوع کا احاطہ کرتی ہوئی تحریر تھی۔ کیسے رشتوں کو زوال آتے ہیں اور کس طرح انسان کی زندگی میں زہر گھل جاتا ہے۔ سرورق کی کہانیوں میں سلیم فاروقی صاحب نے جس موضوع کو چنا وہ بطور انٹرنیٹ صارف میرا پچھلے آٹھ سال کا تجربہ ہے۔ اب فیس بک اور دوسری سوشل ویب سائٹس کی وجہ سے

سانحۂ ارتحال

ادارۂ جاسوسی ڈائجسٹ کے دیرینہ کارکن جناب اظہر جمیل صدیقی مشیتِ ایزدی سے یکم مئی 2014 کو انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام، اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ قارئین سے فاتحہ خوانی کی درخواست ہے۔

تھوڑا رجحان تبدیل ہوا ہے۔ ورنہ YAHOO کے دور میں شاید ہی کوئی ایسا صارف ہو جس کو ایسی ای میل نہ ملی ہو۔ لیکن تخیلاتی رنگ دے کر کہانی حقیقت سے بہت دور نکل گئی اس لیے متاثر نہ کرسکی۔ جبکہ کاشف زبیر صاحب کا دوسرا رنگ رابطہ بہت اعلیٰ تحریر ثابت ہوئی۔ شاہنواز اور راحیل کی لڑائی جب ہوئی تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں کسی نہ کسی حوالے سے مشکوک ہیں۔ ثمینہ کا کردار پُراسرار تھا مگر وہ کافی مثبت رہی۔ اور شیراز نے آخرکار اپنی اخلاقی ذمے داری کو نبھاتے ہوئے ردا کے قاتلوں کو کیفرِکردار تک پہنچایا۔ جیسے کہ گوا ہی گان نے بھی کہا تھا کہ ”عشق اور قتل کبھی چھپ نہیں سکتے۔“

رحیم یار خان سے مظہر سلیم کی باتیں ”تین مہینے کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر محفل میں حاضر ہیں۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ یہ زندگی بھی کیا تماشا ہے جب دیکھیے ایک فسانہ ہوتا رہتا ہے۔ (آپ لاڈلے سپوت ہوں گے) مئی کے جاسوسی ڈائجسٹ کا سرورق اس بار کچھ خاص جاذبِ نظر نہ تھا۔ تاہم ذاکر صاحب نے اسے جاسوسیت کا جو رنگ دینے کی کوشش کی ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس مرتبہ فہرست کی ڈیزائننگ معمول سے ہٹ کر تھی۔ اچھی لگی۔ اشتہارات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم چینی نکتہ چینی میں پہنچے تو آپ کا اداریہ ملکی حالات پر نوحہ خوانی کر رہا تھا۔ ڈالر جتنا بھی سستا ہو جائے، غموں، دکھوں اور فاقوں کی ستائی ہوئی قوم کے لیے بنیادی ضروریات کی اشیا کے نرخ میں کمی نہیں آسکتی۔ بوجھل دل کے ساتھ محمد جاوید مرزا کا نوازش نامہ پڑھنا شروع کیا، بوجھل پن میں کمی واقع ہوتی گئی۔ مرزا صاحب! خوب صورت تبصرہ لکھنے پر مبارک باد قبول فرمایئے۔ تصویر العین! آپ جب بھی تبصرہ لے کر آتی ہیں تو ادھر ادھر کی ہانک کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے ہاتھ کھنچتے ہیں کیا؟ ابرار وارث ہاشمی کے دانت کی نمائندگی کرتے ہوئے بے پر کی اڑاتے ہوئے نظر آئے۔ سید شکیل کاظمی! آپ سے ملاقات کی یاد تو ہماری قیمتی ترین یادوں میں سے ایک ہے۔ کبیر عباسی کی دعوت اور آپ دونوں کی محبت ہمیشہ یاد رہے گی، بس ایک شکوہ ہے کہ آپ نے اپنی پڑوسن سے نہیں ملوایا۔ مرزا انجم جرال کا تبصرہ بھی ان کی شخصیت کی طرح معصومیت کا تاثر لیے ہوئے تھا، پڑھ کر محظوظ ہوئے۔ کہانیوں کی ابتدا نئی سلسلے وار کہانی آوارہ گرد سے کی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی یہ کہانی ابتدا سے ہی ہنگامہ خیز رہی۔ شہزاد احمد خان عرف شہزی کا کردار اچھا لگا۔ جواری کا ٹیمپو تھوڑا سست ہے۔ صاحب تحریر سے گزارش ہے کہ تورین کی جلد انٹری کروائیں۔ سرورق کے رنگوں میں دوسرا رنگ پہلے پر غالب رہا۔ اقبال کاظمی مرحوم کی تحریر شکست متاثر کن رہی۔ مختصر کہانیوں میں بساطِ عشق، تنگ آمد اور دانیال عارف کی جائے مرگ اچھی لگیں۔“

لاہور سے زویا اعجاز کی لفاظی ”ٹائٹل پر ایک اینگری مین کے ساتھ موجود حسینہ جاسوسی کے کنارے نینوں میں تفکر کی پرچھائیاں نمایاں نظر آرہی تھیں جبکہ دوسرے موصوف گولی کھا کر بھی ڈھٹائی کا اشتہار بنے ہوئے تھے۔ اداریہ کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ عوام پر جلد ہی بجٹ کا ڈرون اٹیک ہونے والا ہے اور ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز رسائی سے مزید باہر ہوتی نظر آرہی ہے۔ ابرار وارث! سیانے کہتے ہیں، ادھورے اور الجھے ہوئے مشوروں سے خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے۔ انجم جرال کے دونوں تبصرے فطری بے ساختگی اور سادگی کا ملاپ تھے، ویری ویلڈن۔ وڈے شاہ جی اس مرتبہ کسی وی آئی پی کی طرح سب سے آخر میں تشریف لائے۔ ان کی زنبیل سے اس مرتبہ جو گواچی گاں برآمد ہوئی ہے امید ہے ان کی پڑوسن اور شیکسپیئر کی طرح اپنا سکہ جمانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔ سید اکبر شاہ کا بھی طویل خط شائع ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ گرداب کے داغِ مفارقت دینے کے سبب اس مرتبہ کہانیوں کا آغاز آوارہ گرد سے کیا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ تیز رفتار ایکشن، موضوعاتی تنوع اور ایڈونچر پر مبنی پہلی ہی قسط نے گرداب کی طرح کافی متاثر کیا ہے۔ امید ہے مستقبل قریب میں یہ ناول للکار اور گرداب کی کمی کا ضرور ازالہ کرے گا۔ فلموں اور گانوں کے ری میک کے بعد جواری نے دنیائے ناولز میں ری میک کا نہایت کامیاب آغاز کیا ہے۔ یہ تاریخی قدم اٹھانا ہی ہمارے نزدیک قابلِ تحسین ہے۔ مریم کے خان کی تنگ آمد پڑھ کر گلستانِ سعدی کی حکایت یاد آگئی کہ بلی جب مغلوب ہو جائے تو چیتے کی بھی آنکھیں نکال لیتی ہے۔ منظر امام نے اپنے مخصوص مختصر انداز میں اکیسویں صدی کے عشق اور عشاق کی حقیقت بڑی خوب صورتی سے واضح کی۔ سلیم فاروقی حسبِ معمول ایک بہت عمدہ موضوع سے انصاف کرنے میں ناکام نظر آئے۔ کہانی مزید بہتر لکھی جاسکتی تھی۔ رابطہ پورے شمارے کی جان ثابت ہوئی۔ کاشف زبیر نے ایک مشکل موضوع کو مکمل گرفت کے ساتھ لکھا۔“

سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ کا کراچی سے تبصرہ ”خلافِ معمول... توقع و روایت کے اس بار جاسوسی کا دیدار 3 تاریخ کو قرار پایا۔ سرورق خاصا ڈراؤنا تھا۔ ٹائٹل گرل بھی خاصی سخت مزاج لگی سو... محفلِ یاراں کی طرف متوجہ ہونے سے قبل کہانیوں کی فہرست دیکھی۔ ہماری داد نے امتیاز صاحب کو شاداب کر دیا۔ یوں انہوں نے مزید محنت کی۔ سرفہرست موجود محمد جاوید نے عقل کو استعمال میں لا کر کافی اچھی تجزیہ کاریاں و قیاس آرائیاں کیں۔ تصویر العین کی آمد پر بہار کافی خوش گوار رہی۔ ہمارے متعلق کہے جملے میں لفظ ”بہت“ نے بہت سے زیادہ خوشی دی۔ محمد شاہان کا تبصرہ پڑھ کر یوں لگا جیسے گنجے کو ناخن دیے گئے ہوں۔ ویسے سنا ہے ہم نے کہ ہر... خود کو عقل مند سمجھتا ہے۔ باقی آپ خود عقل مند ہیں سمجھ گئے ہوں گے۔ ابرار وارث کا تبصرہ جیسٹ رہا۔ اپنے لیے تعریفی الفاظ مانندِ موتی سن کر خوشی کے باعث آنکھوں سے قطرہ گوہر رواں ہوئے۔ عبدالرب بھٹی کی نئی سلسلے وار کہانی آوارہ گرد کا مطالعہ مقصود سمجھا۔ شہزاد احمد عرف شہزی کی داستانِ حیات... سنگ دل والدین کی بے حسی کا نشانہ بننے والے اطفال گھر کے بے سروسامان بچوں کا احوال پڑھ کے دل دکھی ہوا۔ بلال واشرف کو بے مروتی اور بے وفائی کی سزا ملی۔ اینڈ سسنی خیز رہا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ گورکن میں ڈاکٹر کا اندازہ ہی حقیقت کی تہ تک رسائی دلانے میں کامیاب رہا۔ جواری کی گیارھویں قسط کافی سست رہی۔ حویلی کے حالات ناسازگار رہے۔ ملک سلیم مشکلات کا شکار... یوں کہ حل کی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی۔ شاہینہ بساطِ محبت میں قلابازیاں مارتی نظر آئی۔ دوسرا پچھ میں روبی کی بدقسمتی پر دکھ ہوا۔ بساطِ عشق منظر امام کی بہترین تحریر تھی۔ منیر نے غزالہ کی بے وفائی کا ازالہ کر کے بوجھِ غم کو کم کر دیا۔“

کینٹ سے نازجی اینڈ سوہا جی کی واہ واہ جی ”خوب صورت سرورق سے سجا، جاسوسی 4 تاریخ ہی کو مل گیا اور برسات کا لطف دوبالا کر گیا۔ اداریہ حسبِ معمول تھا یعنی پاکستان کے حالات کا نوحہ۔ بس دعائے خیر ہی کی جاسکتی ہے۔ صدرِ محفل محمد جاوید مرزا کو مبارک باد، تبصرہ واقعی اچھا تھا۔ تصویر العین صاحبہ آپ کے تبصرے ہمیشہ معیاری اور بامقصد ہوتے ہیں۔ سید اکبر شاہ اب تو آپ کو اعتماد آچکا ہے تبصرہ لکھنے کا اور محفل میں آنے کے آداب بھی آگئے

ہیں۔ رب خیر کرے۔ محمد شاہان جی اس کائنات میں رنگ ہی وجودِ زن سے ہیں، یہ سچ تو نظرِ بد سے بچاتے ہیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! شکرانے کے نفل پڑھ کر ادارہ یہ جاسوسی کے حق میں دعا کر دیا کریں جو آپ کا خط پبلش کر دیتے ہیں۔ صفدر معاویہ جی آپ جاسوسی ڈائجسٹ پر تبصرہ لکھا کریں نہ کہ اپنی آپ بیتی۔ ویسے ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ادریس احمد صاحب آپ کے خیالات پڑھ کر اچھا لگا۔ آپ حساس دل انسان ہیں مگر اپنے اندر کچھ مضبوطی پیدا کریں۔ ساگر ٹکور جی! ٹائٹل گرل آپ کو اپنی منظورِ نظر جیسی لگی، یہ دل کا معاملہ ہے نظر کا دھوکا نہیں۔ ویسے آپ مٹھائی کا ٹوکرا کب پکڑ رہے ہیں۔ اب توجہ ہو جائے اپنے اصل کام کی طرف یعنی کہانیوں پر نظر۔ عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بہترین سنسنی خیز ایکشن سے بھرپور اور سبق آموز تحریر ہے۔ ہم جو کچھ اپنے والدین سے کریں گے وہی کچھ ہماری اولاد ہمارے ساتھ کرے گی۔ جمال دتی کی دوسرا پچھ، عورت اپنی محبت اور محبوب کو سچا سمجھتی ہے لیکن روبی کو معلوم نہیں شاکر دولت کے لیے اسے دوسری بار موت کی وادی میں دھکیل رہا ہے۔ اقبال کاظمی کی شکست میں اوبرائن نے 20 سال پہلے شروع ہونے والے قتل کی داستان کے اصل قاتل کو پکڑ کر نہ صرف اپنے بیٹے ہونے کا حق ادا کیا بلکہ رچرڈ جس نے تین بے گناہ لوگوں کی جان لی اس سے بھی شکست کا اعتراف کروایا۔ منظر امام صاحب کی بساطِ عشق میں پتا چلا کہ محبت اور دوستی میں دکھ اور تنہائی کے سوا انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ مریم کے خان کی تنگ آمد میں آج کل بھتا خوری و ٹارگٹ کلنگ کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ مریم کے خان ہمیشہ بہترین اسٹوری کے ساتھ آتی ہیں۔ جائے مرگ + دانیال عارف کی اچھی کاوش، کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ سمن باحلیم کی مسافر میں بتایا گیا کہ انسان برائی کا راستہ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلتا ہے تو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تحریر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ سلیم انور کی موقع شناس۔ لگتا ہے فی الحال زمانے میں دوستی ہو یا محبت، موقع شناس لوگوں کی کمی نہیں۔ جو دوست کو بھی دھوکا دینے سے گریز نہیں کرتے، ایسے لوگ کبھی سچی خوشیاں نہیں پاسکتے۔ دندان شکن، عمار آزاد جب ہم کسی کا دکھ دیکھتے ہیں تو اپنا دکھ یاد آتا ہے۔ جوزنے جب جینی کو دکھی دیکھا تو اس کی اپنی بیٹی کا قتل یاد آگیا۔ اس نے ان اوباش لڑکوں کو سزا دے کر اپنی منہ بولی بیٹی کی عزت و جان کو محفوظ کیا۔ کاشف زبیر کی رابطہ۔ آگہی جہاں انسان کو مشکلات سے دوچار کرتی ہے وہیں شیراز اور معاذ کی آگہی نے ردا کی روح کو انصاف دلایا۔“

شیخوپورہ سے محمد شاہان سعید کی عرق ریزی ”جون کا مہینا ایک عام سا مہینا ہے مگر میرے لیے سب سے خاص الخاص کیونکہ اس مہینے میری سالگرہ ہے، ہماری سترھویں سالگرہ ہے۔ (مبارک ہو بہت بہت) اس مرتبہ جاسوسی نے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے ویلڈن۔ اداریہ میں پاکستان کی نازک صورتِ حال کا ذکر کیا گیا۔ مہنگائی اور لوڈشیڈنگ عروج پر ہے۔ جون میں بجٹ بھی آرہا ہے یعنی کہ مہنگائی میں مزید اضافہ۔ دوستوں کی محفل میں پہلی بار سارے خط اول سے آخر تک پڑھے۔ جاوید مرزا اور شکیل کاظمی، اکبر اور صغراں کی لاشوں پر پریشان تھے۔ مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ لاش صغراں کی نہ ہو۔ یہ تو صرف خاور کا اپنا خیال ہے۔ رانا ساجد کی نے بھی ہمت کر ڈالی۔ ویسے اگر آپ چند سال مزید سوچتے تو پھر ٹھیک تھا۔ ابرار وارث کی دعاؤں کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار اپنے طویل خط سے خوش تھیں تو ساگر ٹکور اپنے خط کی کانٹ چھانٹ پر ناراض۔ صفدر معاویہ جاسوسی لیٹ ملنے پر پریشان تھے تو انور یوسف زئی، جاسوسی جلدی ملنے پر مسرور تھے۔ گجر برادری پنچایت لگائے بیٹھی تھی تو ادریس احمد خان نے خوش امیدی کی آس لگائے ہوئے تھی جبکہ سید اکبر شاہ پوسٹ آفس کے چکر لگا رہے تھے۔ مرزا انجم جرال کاظمی صاحب کی غیر حاضری کی وجہ بیان کر رہے تھے مگر ان سے اگلا خط ہی کاظمی صاحب کا تھا۔ مشائم اور تصویر العین بھی شکوہ کرتی نظر آئیں۔ آوارہ گرد پہلی لائن پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ کہیں یہ بندہ کوہ قاف یا بھوت گھر میں تو نہیں۔ مگر خیریت رہی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ جواری اس مرتبہ قدرے بہتر تھی۔ تنگ آمد شریف آدمی کی کتھا تھی۔ قسم سے گورکن کہانی کی خاک سمجھ نہ آئی۔ تابوت خالی نکلتا ہے اس کا مطلب؟ کیا وہ مردے چوری کر رہا تھا۔ مگر اس کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ دوسرا پچھ بھی اپنے پلے نہ پڑی۔ اس میں جاسوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ (دماغ لگا کے پڑھتے تو دوسرے کے ساتھ تیسرا پچھ بھی سمجھ میں آجاتا) قرضِ جاں میں احسن نے دوستی کا حق نبھا دیا۔ رابطہ بھی اچھی تحریر تھی۔ کترنوں میں شکیل کاظمی کا انتخاب بہترین سے بہترین تھا۔ امتحانات قریب آرہے ہیں اس لیے اب ان کی تیاری کرنی ہے۔“

ناظم آباد سے محمد ادریس احمد خان کی روداد ”جاسوسی ڈائجسٹ کا بے تابی سے انتظار رہتا ہے۔ جب مل جاتا ہے تو بے تابی کو قرار آجاتا ہے۔ میرے لیے تو اس کی اہمیت اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ وقت جیسے تھم سا گیا ہے کیونکہ تقریباً نو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا، صاحبِ فراش ہوئے۔ بقول شاعر کہ دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے تو شاید یہ محاورہ بھی کسی کے لیے تو اچھا ہے مگر میرے تو شب و روز بستر پر گزرتے ہیں اگرچہ اب اللہ کے فضل سے تھوڑا چلنے پھرنے واک کرنے سے موومنٹ بہتر ہوگئی۔ (انشاء اللہ بھاگنے دوڑنے بھی لگیں گے) سرورق ہمیشہ کی طرح ذاکر صاحب کی مہارت کا ثبوت تھا۔ اندر اداریہ میں موسمِ بہار کی نوید سنائی دے رہی ہے پھولوں کی خوشبوئیں ہیں۔ کراچی کے علاوہ بارش کی رم جھم کی بھی اطلاعات ہیں مگر ان سب پر بھاری لوڈشیڈنگ کا مہیب سایہ ہے جو کسی سے کم نہیں ہوتا اور دورانیہ بڑھتا جاتا ہے۔ اندر چینی نکتہ چینی میں سب دوست حاضر ہیں اور اپنی اپنی آرا کا اظہار کر رہے ہیں۔ بشریٰ افضل، سید اکبر شاہ، صفدر معاویہ، طاہرہ گلزار، ابرار وارث، انور یوسف زئی، شکیل کاظمی، ساگر ٹکور سب کا شکریہ۔ ساگر ٹکور بھائی میرے تبصرے میں شوخی شرارت یا حرارت یہ ضروری تو نہیں ہر انسان کا اپنا اپنا جدا جدا انداز ہوتا ہے۔ اپنی بات احسن طریقے سے دوسرے تک پہنچ جائے یہی بہت ہے۔ سب سے پہلے کہانی آوارہ گرد پڑھی جو کہ آغاز سے قسط کے آخری لفظ تک دلچسپی سے پڑھی۔ لکھنے والے کا نام بھی تحریر کے حوالے سے بڑا نام عبدالرب بھٹی صاحب۔ امید ہے یہ بھی گرداب کی طرح دلچسپ ترین ثابت ہو گی۔ دوسری کہانی احمد اقبال صاحب کی جواری پڑھی۔ جو ابھی گھریلو ماحول میں چل رہی ہے۔ آگے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ دندان شکن میں جوزنے بدمعاش لڑکوں کو اچھا سبق دیا۔ جوزنے اولاد کی محبت میں جذباتی ہو کر بہت بھیانک انتقام لیا کہ ان لڑکوں کی جان لے لی، انسان جوانی، قوت اور تکبر میں اتنا آگے نہ بڑھے کہ اور بہت سے لوگ نادیدہ دشمن بن جائیں۔ یہ فعل انسانیت کے بھی خلاف ہے کہ کسی دوسرے انسان کا آرام اور چین نیند سب حرام ہو جائیں۔

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

ابرار وارث، سندیلیانوالی۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ عبدالغفور خان خٹک، اٹک۔ محمد اقبال، کراچی۔ ثاقب عزیز، کوٹری۔ اشفاق احمد، حیدرآباد۔

بھیانک چال

ایچ اقبال

حال کو ماضی اور مستقبل سے جدا نہیں کیا جا سکتا... کچھ لوگ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں... اور کچھ ماضی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں... مستقبل پر نظر رکھنے والے اچھے زمانے کی آمد کے منتظر رہتے ہیں... جبکہ انسان دونوں سے متعلق ہوتا ہے... ایسا نہیں ہے کہ آدمی صرف مستقبل سے وابستہ ہو اور ماضی سے بالکل کٹ جائے... زمانۂ حال میں رہتے ہوئے بھی گزرے ہوئے وقت اور آنے والے دنوں سے سودے بازی چلتی رہتی ہے... ایک ایسی ہی عورت کے گرد گھومتی کہانی... جو ماضی میں کی گئی غلطیوں کا کفارہ چاہتی تھی ... اور مستقبل کا نقیب تیار کرنے میں ہر داؤ کھیلنے کو تیار تھی...

روشن جگمگاتے شہر میں بڑھتی تاریکیوں کا احاطہ کرتی ایک دلچسپ و پُراسرار تحریر...

نرگس زماں نے سگریٹ سلگا کر پہلا کش لیا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔

کال امان کے اسکول کی پرنسپل کی تھی۔ ''مسز زماں! آج پھر آپ کا بیٹا اسکول کے دو لڑکوں سے لڑ پڑا تھا۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ان دونوں لڑکوں کو زیادہ چوٹیں لگی ہیں لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ صورتِ حال کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ڈاکٹر کو بلا کر ان کی ڈریسنگ کروادی ہے۔ میں پہلے آپ ہی کو اطلاع دینا چاہتی تھی لیکن آپ کا موبائل...''

''ہاں۔'' نرگس نے بات کاٹی۔ ''میں کسی سے بات کر رہی تھی۔''

دوسری طرف سے پرنسپل بولی۔ ''آپ سے بات نہیں ہو سکی تو میں نے ان دونوں لڑکوں کے گھر والوں کو فون کیا۔ میں چاہتی تھی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اس لیے میں نے ان سے یہی کہا کہ غلطی سب لڑکوں کی تھی لیکن آپ کو بتا رہی ہوں کہ غلطی امان کی تھی۔''

''ہوا کیا تھا؟'' نرگس نے سکون سے پوچھا۔

''آئس کریم کا دھبا لگ گیا تھا امان کی قمیص پر... ان دونوں لڑکوں نے اس پر کچھ کہہ دیا۔ اسی پر لڑائی ہوئی۔''

''ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ غلطی امان کی تھی اور اب آپ کہہ رہی

ہیں کہ اس پر فقرہ کسا گیا تھا۔"

"اسکول کے بچوں میں ایسی فقرے بازیاں ہوہی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مار پیٹ بھی ہو۔ مار پیٹ کی شروعات امان نے ہی کی تھی۔" پرنسپل بولی۔ "لڑائی جھگڑا کرنا اس کی عادت ہے۔ چھ ماہ میں یہ تیسرا موقع ہے۔ اسی لیے میں امان کو ذمے دار قرار دے رہی ہوں۔"

"اطلاع کا شکریہ۔" نرگس نے کہا۔ وہ موبائل بند کرنا چاہتی تھی۔

"سنیے۔" پرنسپل تیزی سے بولی۔ "میں نے صرف اطلاع دینے کے لیے فون نہیں کیا آپ کو۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ امان کو سمجھائیں۔ وہ بہت غصہ ور ہے۔ معاف کیجیے گا۔ میرا خیال ہے کہ اسے پچھلے اسکول سے اسی لیے نکالا گیا ہوگا۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر اب اس نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو میں اسے فوری طور پر اپنے اسکول سے الگ کردوں گی۔"

"اس دوسری اطلاع کا بھی شکریہ۔" نرگس نے خشک لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر کے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔

ساڑی میں ملبوس وہ ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی... اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ نقوش دل آویز اور متناسب جسم کسا ہوا تھا۔ اسے دیکھنے والے بمشکل ہی کہہ سکتے تھے کہ وہ بارہ سال کے ایک بیٹے کی ماں ہوگی۔

سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور دماغ میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ امان کو دی ہوئی اس کی تربیت رائگاں نہیں جارہی۔ اس نے امان کو جیسا بنانا چاہا تھا، وہ ویسا ہی بنتا جارہا تھا اور اب جبکہ اس کی عمر بارہ سال کے قریب ہو چکی تھی، اسے کسی ایسی ڈگر پر ڈال دینا چاہیے تھا کہ وہ اس راستے پر تیزی سے آگے بڑھے۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور امان تیزی سے اندر آیا۔

"ہائے مام!"

"ہیلو بیٹا۔"

امان نے قریب آکر اپنا بستہ ایک طرف اچھال دیا اور دھم سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چائے مام۔"

"کہہ دیا ہے ملازمہ سے کہ جیسے ہی تم آؤ، وہ چائے لے آئے۔ یہ پیشانی پر پلاسٹر کیوں لگا ہے؟"

"دو لڑکوں کی ٹھکائی کی تھی۔" امان نے ہنس کر کہا۔ "ذرا سی چوٹ مجھے بھی لگ گئی۔"

"لڑائی اس دھبے کی وجہ سے ہوئی تھی؟" نرگس نے اس کی قمیص کی طرف اشارہ کیا۔

امان حیرت سے بولا۔ "آپ کو کیسے معلوم؟"

"پہلے تم مجھے پورا قصہ بتاؤ۔"

"آئس کریم کا دھبا لگ گیا تھا مام! کلاس سے نکلتے وقت وہ دونوں یہ دھبا دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں ان پر بگڑا تو کہنے لگے کہ گھر جاؤ گے تو تمہاری ممی کہیں گی، داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔ اس پر مجھے غصہ آگیا۔"

نرگس ہنس پڑی۔ "وہ اشتہار یاد آگیا ہوگا تمہیں جو ٹی وی پر آتا رہتا ہے۔"

"ہاں مام!" امان نے جواب دیا۔ "وہ تو ایک ٹیچر آگئی بیچ میں ورنہ تو خوب ٹھکائی لگاتا ان کی... لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہاری پرنسپل کا فون آیا تھا۔ شکایت کر رہی تھی وہ تمہاری۔"

امان ہنسا۔ "کسی دن اس موٹی کے ساتھ بھی کوئی ایکٹیوٹی کرنا پڑے گی۔ کل آپ مجھے اپنا پستول دے دیجیے گا ذرا۔ ڈراؤں گا اسے۔"

نرگس ہنسی۔ "حوالات جاؤ گے اور اپنے پستول کی وجہ سے میں بھی پھنسوں گی۔"

"خالی پستول دیجیے گا، گولیاں نکال کر۔" امان نے اتنی سادگی سے کہا جیسے خالی پستول رکھنا کوئی خاص بات نہ ہو۔

"بالکل اپنے ماموں پر گئے ہو تم۔"

"کہاں ہیں وہ؟" امان نے پوچھا۔ "آپ بات تو کرتی رہتی ہیں ان کی، کبھی دیکھا نہیں انہیں۔ وہ آپ سے ملنے کیوں نہیں آتے؟... اور نہیں آتے تو آپ ہی لے چلیں مجھے ان کے پاس۔"

"لے چلوں گی کسی دن۔ پستول چلانا بھی سکھا دیں گے وہ تمہیں۔"

"سچ؟" امان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

نرگس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی وقت ملازمہ چائے کی ٹرے لے کر آگئی۔ وہ اس نے ان کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ بھی تھے۔ امان نے پلیٹ پر نظر ڈالی اور بگڑے ہوئے انداز میں ملازمہ کی طرف دیکھا۔

"چاکلیٹ بسکٹ کہاں ہیں؟" وہ اس طرح بولا جیسے غرایا ہو۔

"ختم ہو گئے ہیں چھوٹے صاحب! شرفو کو بتا دیا تھا

میں نے۔" ملازمہ نے ملازم کا نام لیا۔ "وہ سارا سودا لایا، بس بسکٹ بھول گیا۔"

"مرغا بنانا پڑے گا کیا اسے؟" امان نے آنکھیں نکالیں۔ "بلاؤ اسے۔"

"اب جانے دو امان۔" نرگس بول پڑی۔ "بھول گیا ہوگا بے چارہ۔" ساتھ ہی اس نے ملازمہ کو جانے کا اشارہ بھی کیا۔

امان بولا۔ "ابھی مرغا بناؤں گا، دو ہاتھ ماروں گا تو پھر کبھی نہیں بھولے گا۔ آپ کہتی ہیں نا، اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔"

نرگس پھر ہنسی۔ "اینٹ کب ماری ہے اس نے تمہیں؟"

"چاکلیٹ بسکٹ جو نہیں لایا۔"

"اس کی سزا اسے پھر کبھی دے لینا۔ آج چاکلیٹ بسکٹ کے بغیر ہی لو چائے۔"

چودہ سال کے ملازم شرفو کو اکثر امان سے مار کھانا پڑتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر امان آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اسے نرگس نے تربیت ہی ایسی دی تھی۔ امان کو اچھی تعلیم دلانے کا بھی بندوبست نہیں کیا تھا۔ بس گلی در گلی کھلے ہوئے نام نہاد انگریزی اسکولوں میں سے ایک میں داخل کرادیا تھا جہاں تعلیم کے نام پر بس کمائی کی جاتی تھی۔ نہ انگریزی سکھائی جاتی تھی، نہ اردو... متوسط درجے کے احمق والدین ہنس کی چال چلنے کی خواہش میں اپنی بھی بھول جاتے تھے۔

لیکن نرگس کا تعلق متوسط طبقے سے نہیں تھا۔ وہ امان کو شہر کے کسی بھی بہترین اسکول میں داخل کرا سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے اس منصوبے پر عمل پیرا تھی جو اس نے بارہ سال پہلے بنایا تھا۔

چائے پینے کے بعد اس نے امان سے کہا۔ "اب جا کر فلم دیکھو۔ بہت اچھی فلم لائی ہوں تمہارے لیے۔"

"کہاں ہے؟" امان نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہارے کمرے میں۔" نرگس نے جواب دیا۔ "ڈی وی ڈی پلیئر میں لگا دی ہے۔"

"کس کی فلم ہے؟"

نرگس نے انگریزی کی ایکشن فلموں کے ایک ہیرو کا نام بتایا۔

"واہ... مزہ آجائے گا۔" امان اچھل کر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ "وہ تو ایسی فائرنگ کرتا ہے کہ بس... ڈھشنگ... ڈھشنگ۔" امان نے ایسا ایکشن بنایا جیسے خالی ہاتھوں سے ہی گولیاں برسا رہا ہو پھر وہ اندرونی دروازے کی طرف دوڑ گیا۔

نرگس نے چائے پینے سے پہلے سگریٹ ختم کر لی تھی۔ چائے ختم کر کے اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ اب اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

☆☆☆

ایس پی دانیال کا جب لاہور سے کراچی تبادلہ کیا گیا تو اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس کا تبادلہ کیوں کیا گیا تھا۔ وہ چند ذہین اور نڈر پولیس افسران میں سے ایک تھا۔ اس نے تعلیم تو جرنلزم کی حاصل کی تھی لیکن پھر اچانک اس کا دماغ بدلا اور اس نے جرنلزم میں قدم رکھنے کے بجائے محکمۂ پولیس کا رخ کیا۔ ٹریننگ کے بعد وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر بنا تھا۔ اس کی ذہانت اور دلیری اسے تیزی سے بھی ترقی دلوا سکتی تھی لیکن "ایمان دارانہ فرض شناسی" اس کے آڑے آتی رہی۔ پھر بھی بارہ سال میں وہ ایس پی بن ہی گیا اور فوری طور پر اس کا تبادلہ بھی ہوا۔

کراچی کی حالت ان دنوں بہت خراب تھی۔ لاء اینڈ آرڈر کا جیسے وجود ہی ختم ہو گیا تھا۔ ٹارگٹ کلنگ، بھتا خوری اور دہشت گردی کے جرثومے گلی در گلی پھیل چکے تھے۔

انہی حالات کی وجہ سے اعلیٰ سطحی اجلاس ہوتے رہتے تھے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ایجنسیاں نت نئے طریقہ کار وضع کرتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ اس میٹنگ کی تھی جو اس وقت پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہو رہی تھی۔

نظم

ایک گھر میں قیامت خیز ہنگامہ برپا تھا۔ گھر کے تمام بچے آپس میں خوب لڑ جھگڑ رہے تھے اور شور سے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ بچوں کی ماں کچھ دیر تو ان کی ہلڑ بازی اور بے ہودگی کو برداشت کرتی رہی جب کچھ بن نہ پڑا تو تنگ آکر بولی۔ "ارے کم بختو! تمہیں لڑنے کے سوا بھی کچھ آتا ہے؟"

ماں کی یہ بات سن کر ایک بچہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "جی امی جان مجھے ایک نظم آتی ہے۔"

دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑی اسکرین روشن تھی جس پر سارے شہر کا نقشہ دکھائی دے رہا تھا۔ ڈی آئی جی اسکرین کے قریب کھڑا مختلف علاقوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان علاقوں کے بارے میں بریفنگ بھی دے رہا تھا جس میں یہ بات خاص طور سے شامل تھی کہ مختلف خفیہ ایجنسیوں نے ان علاقوں کے بارے میں کیا رپورٹس دی تھیں۔

خاصی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد اسکرین دھندلانے کے بعد روشن ہوئی تو شہر کے صرف چوتھائی حصے کا نقشہ پوری اسکرین پر پھیل گیا۔

ڈی آئی جی بولا۔ ''ابھی آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ نئے لائحہ عمل کے مطابق شہر کے چار زون بنائے گئے ہیں۔''

یکے بعد دیگرے باقی زون بھی اسکرین پر آئے اور ڈی آئی جی بولتا رہا۔ کبھی کوئی آفیسر کسی بارے میں دو ایک سوال بھی کر لیتا تھا۔

اس کے بعد بی زون کے صرف ایک علاقے کا نقشہ اسکرین پر نمایاں ہوا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی گلیاں بھی واضح طور پر دکھائی گئی تھیں۔

''ایس پی دانیال!'' ڈی آئی جی بولا۔ ''یہ نقشہ خصوصاً آپ کے لیے ہے۔ یہ ہمارے شہر کا وہ علاقہ ہے جس پر آپ کو خصوصی توجہ دینی ہے۔ اس علاقے کو دو نام دیے گئے ہیں۔ شرقی اور غربی۔ ان دونوں حصوں میں جرائم پیشہ افراد کے دو مختلف گروپس کی عمل داری ہے۔ اکثر ان دونوں میں سنگین تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ہر گروپ چاہتا ہے کہ دوسرے کو اس علاقے سے نکال دے۔ ہماری ذمے داری یہ ہے کہ ان دونوں ہی گروپس کو ختم کیا جائے اور اس سارے علاقے میں رہنے والے لوگوں کو سکون کا سانس لینا نصیب ہو۔ شرقی علاقے کا سربراہ بلائنڈ ماسٹر ہے اور غربی علاقے کا سربراہ کالا سانپ ہے۔ یہ ان دونوں کے اصل نام نہیں ہیں مگر ان کے گروپس بلائنڈ ماسٹر گروپ اور کالا سانپ گروپ کہلاتے ہیں۔ ان کے اصل نام تحریری رپورٹ میں ہیں۔''

''سر!'' دانیال بول پڑا۔ ''مجھے اس نقشے کے پرنٹ آؤٹ تو ظاہر ہے کہ مل جائیں گے۔''

''بالکل۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔ ''اس علاقے کے بارے میں تحریری رپورٹ بھی ہے۔ گزشتہ ہفتے اس علاقے کے ہر داخلی راستے پر خفیہ کیمرے بھی لگا دیے گئے ہیں۔ اس علاقے میں داخل ہونے والا یا وہاں سے باہر آنے والا بلی کا بچہ بھی ان کیمروں کی زد سے نہیں نکل سکتا۔''

ڈی آئی جی کی تقریر جاری رہی۔ اسکرین پر شہر کے نقشے تبدیل ہوتے رہے۔ یہ اجلاس کیونکہ خاصا طویل تھا اس لیے بیچ میں دو مرتبہ چائے کے دور بھی چلے۔ آخر یہ سلسلہ ختم ہوا۔

دانیال جب پولیس ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوا تو اس کے پاس ایک فائل میں، شرقی اور غربی علاقے کے مختلف النوع نقشے موجود تھے جن کے پرنٹ اس نے اپنی مرضی سے اپنے سامنے نکلوائے تھے۔

تبادلے کے باعث اس کے قیام کا بندوبست پولیس لائن میں کیا گیا تھا لیکن اس نے اپنے چھوٹے بھائی شرجیل کے گھر میں قیام کو ترجیح دی تھی جو دو سال قبل کراچی آ چکا تھا۔ لاہور میں دانیال کے ساتھ اس کے بڑے بھائی اور بھاوج تھے اس لیے والدہ نے شرجیل کے ساتھ کراچی آ جانا ضروری سمجھا تھا۔ اب وہ اس بات سے خوش تھیں کہ دو بیٹے ان کے ساتھ ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی دانیال پر خفا ہوتیں کہ اس نے چھتیس سال کا ہو جانے کے باوجود شادی نہیں کی تھی۔ دو سال بڑے بھائی کی اولادیں بھی نوجوانی کی حد میں داخل ہو رہی تھیں۔

شرجیل کی عمر اب چھبیس سال تھی۔ شادی ابھی اس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ملازمت حاصل کرنے کے بعد اس کی خواہش بس یہ تھی کہ تھوڑی سی ترقی ہو جائے تو شادی بھی کر لے گا۔

دانیال نے پولیس لائن میں قیام سے گریز کے ساتھ فی الحال سرکاری کار بھی نہیں لی تھی۔ ممکنہ مدت تک وہ خود کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں کس علاقے کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ اس نے لاہور سے کراچی کے لیے اپنی ذاتی کار بھی بک کروا دی تھی جو اس کے کراچی پہنچنے سے ایک دن پہلے ہی یہاں آ گئی تھی۔ خود کو پولیس سے لاتعلق ظاہر کرنے کے لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پولیس کی وردی بھی نہیں پہنے گا اور اپنے گھر پر جو دراصل اس کے بھائی شرجیل کا گھر تھا، پولیس گارڈز بھی نہیں رکھے گا۔ اسے ڈرائیور کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ کئی مرتبہ کراچی آ چکا تھا اور اچھی طرح گھوم پھر چکا تھا۔

جب اس کی کار اپنے بھائی کے گھر کے قریب پہنچی تو اسے رفتار بہت کم کرنا پڑی کیونکہ اپنی بائیں جانب کی رو کے ایک بنگلے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ دیکھ کر چونک گیا۔

''نرگس زماں۔''

وہ صرف ''نرگس'' کے نام پر چونکا تھا لیکن جس نرگس

کو وہ جانتا تھا، اس کے نام کے ساتھ ''ارشد'' ہونا چاہیے تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کی شادی ارشد سے ہوئی تھی، یہ نرگس زماں کوئی اور ہوگی۔

ان خیالات کے باوجود کچھ یادیں دانیال کے دماغ میں چکرا گئیں۔ وہ اس وقت چونکا جب کار ایک موڑ کے قریب پہنچ گئی۔ شرجیل کا گھر اس موڑ سے پہلے تھا۔

دانیال نے کار روک کر آئینے میں اپنے عقب کا جائزہ لیا۔ راستہ صاف دیکھ کر اس نے ''یوٹرن'' لیا۔ پھر جب اس نے شرجیل کے بنگلے کے سامنے کار روکی تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر نرگس کے بنگلے کی طرف گئی۔

ہارن کی آواز سن کر چوکیدار نے پھاٹک کھولا۔ دانیال کار اندر لے گیا۔

☆☆☆

صبح کے دس بجے تھے جب نرگس کی کار متاثرہ شرقی علاقے میں داخل ہوئی۔ سڑک کے دائیں بائیں مختلف چیزوں کی چھوٹی بڑی دکانیں تھیں جہاں لوگ خریداری میں مصروف تھے۔

ان لوگوں نے چونک کر کار کی طرف دیکھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس طرف لگ بھگ دو میل تک لوئر مڈل کلاس کے لوگ رہتے تھے جن میں سے بہت کم کے پاس صرف موٹر سائیکلیں تھیں۔ کار رکھنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دو میل بعد نرگس کی کار نے ایک موڑ لیا۔ موڑ لینے کے بعد وہ مشکل سے دو تین فرلانگ کا فاصلہ طے کر سکی تھی کہ عقب سے دو تیز رفتار موٹر سائیکلیں آگے نکلیں اور نرگس کی کار کے آگے آ کر اپنی رفتار تیزی سے کم کرنے لگیں۔ نرگس اگر تیزی سے بریک نہ لگاتی تو موٹر سائیکلوں سے تصادم یقینی تھا۔

موٹر سائیکلوں کے ساتھ کار بھی رکی۔ نرگس بالکل پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ صورتِ حال اس کے لیے غیر متوقع نہ ہو۔

یہ سب کچھ دیکھ کر زیادہ تر راہ گیر تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے لیکن دو ایک ایسے بھی تھے جو رک کر یہ دیکھنے کے منتظر رہے کہ اب کیا تماشا ہوگا۔

ان چاروں افراد نے کار گھیرے میں لے لی۔ ان کی وضع قطع سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے دو، کار کی دائیں بائیں جانب کی کھڑکیوں سے اندر جھانکنے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کی کھڑکی سے اندر جھانکنے والا نہایت سخت لہجے میں بولا۔

''کون ہو میم صاب... ادھر کدھر؟''

دوسری کھڑکی سے جھانکنے والا تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ ''سی آئی ڈی؟''

نرگس پُرسکون رہی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے بلائنڈ ماسٹر سے ملنا ہے۔''

جھانکنے والے کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''کون بھیجا ہے تم کو ادھر؟''

''میں خود آئی ہوں۔ کسی نے نہیں بھیجا ہے مجھے۔''

کھڑکیوں سے کار میں جھانکنے والوں کے دو ساتھی کار کے قریب چوکنا کھڑے ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

''باہر آؤ۔'' نرگس سے بات کرنے والے نے باہر سے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔ دروازہ لاک تھا۔ اب اس نے لاک کھولنے کے لیے کھڑکی سے اندر ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن نرگس نے اتنی تیزی سے شیشہ اوپر چڑھایا کہ اس کا ہاتھ پھنس گیا۔ اس نے فوراً دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔

''پچھتاؤ گے مجھے نقصان پہنچا کر۔'' نرگس نے کہا۔ ''اپنے ماسٹر سے سزا ملے گی تمہیں! مجھے یقین ہے کہ تم اسی کے گرگے ہو گے۔ بس اپنے ماسٹر کو اطلاع دے دو کہ نرگس ملنے آئی ہے اس سے۔''

نرگس کا اطمینان اور اعتماد دیکھ کر اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا ہو گئے۔ اس کا وہ ہاتھ بھی جھک گیا جس میں ریوالور تھا۔

نرگس نے چڑھا ہوا شیشہ تھوڑا سا نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنا ہاتھ نکال لو۔''

نرگس نہ بھی کہتی تو بھی وہ شخص اپنا ہاتھ نکال لیتا۔

''دوبارہ بتا رہی ہوں۔ نرگس نام ہے میرا۔'' وہ بولی۔ ''تم لوگوں کے پاس موبائل فون ضرور ہوں گے۔ اپنے ماسٹر کو اطلاع دو۔ میرا پورا نام بتا دینا۔ نرگس افتخار۔''

وہ شخص اپنا ریوالور جیب میں ڈالتا ہوا اپنے ایک ساتھی کے قریب گیا۔ دوسری کھڑکی سے جھانکنے والا شخص بھی اب ہٹ گیا تھا۔

وہ چاروں دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے لیکن وہ نرگس اور ماحول کی طرف سے قطعی غافل نہیں تھے۔

موبائل فون پر بات کرنے والا اور دوسرا گرگا نرگس کی کار کے قریب آئے۔

''میڈم جی!'' اس مرتبہ اس کے انداز میں پہلی جیسی جارحیت نہیں تھی۔ ''ثبوت ہے کوئی؟''

''کس بات کا ثبوت؟'' نرگس نے پوچھا۔

''نرگس افتخار نام بتایا نا تم نے؟ اس کا ثبوت۔''

''ہاں۔'' نرگس نے جواب دیا۔ ''ثبوت بھی ہے۔''

''کیا ہے؟''

''جو بھی ہے، وہ میں تمہارے ماسٹر جی کو دکھاؤں گی۔''

اس شخص نے موبائل اپنے کان سے لگایا اور بولا۔ ''جوجی بابا! وہ بولتی ہے ثبوت ہے، پر وہ دکھائے گی بس ماسٹر کو۔''

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے ''اچھا'' کہا پھر موبائل نرگس کی طرف بڑھا دیا۔ ''بات کرو۔''

نرگس نے موبائل لے کر اپنے کان سے لگایا۔

''ہیلو۔'' وہ بولی۔

''کیسا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

نرگس نے آواز پر غور کیا۔ وہ بلائنڈ ماسٹر کی آواز نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے بلائنڈ ماسٹر کے گرگے کو موبائل پر بات کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔ اس نے کسی ''جوجی بابا'' کو مخاطب کیا تھا۔

''میں کہہ چکی ہوں۔'' نرگس نے جواب دیا۔ ''ثبوت جو بھی ہے جیسا بھی ہے، وہ میں صرف بلائنڈ ماسٹر کو دوں گی۔''

''اچھا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تم جہاں کھڑی ہو، وہاں سے تمہیں ایک بورڈ دکھائی دے رہا ہوگا۔ تمباکو کا اشتہار ہے۔''

نرگس کو ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر نیلے رنگ کا ایک سائن بورڈ نظر آرہا تھا جس پر کسی تمباکو کا نام تھا۔

''ہاں۔'' نرگس نے کہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں۔''

''ادھر ہی آجاؤ گاڑی میں۔ بورڈ کے بعد دو پلاٹوں کی جگہ خالی پڑی ہے۔ گاڑی ادھر ہی روک دینا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں۔''

''یہ موبائل اپنے پاس ہی رکھنا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

نرگس نے موبائل فون اپنی گود میں ڈال لیا اور پھر کار اسٹارٹ کرنے لگی۔ اس سے نہ موبائل فون واپس کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور نہ کار اسٹارٹ کرنے پر اسے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ غالباً ان سے سب کچھ کہا جا چکا تھا۔

چاروں گرگے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے اور نرگس کی کار آگے بڑھ گئی۔ اس نے کار اسی جگہ روکی جہاں اسے رکنے کے لیے کہا گیا تھا۔ نرگس انجن بند کرکے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کچھ لوگ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے مگر ان میں سے کوئی بھی نرگس کے قریب نہیں آیا۔

موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نرگس نے موبائل اپنی گود سے اٹھا کر کان سے لگایا۔ ''ہیلو۔''

''اب تم کار سے اتر آؤ۔'' آواز آئی۔ ''تمہارے سیدھے ہاتھ کی طرف جو گلیاں ہیں، ان میں سے دوسری گلی میں داخل ہو جاؤ اور آگے بڑھتی رہو۔ موبائل اپنے کان سے لگائے رکھنا۔''

''اچھا۔'' نرگس نے طویل سانس لی اور کار سے اتری۔ وہ اسے لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔ موبائل کان سے لگائے وہ اس گلی کی طرف بڑھنے لگی جس کے بارے میں اسے ہدایت کی گئی تھی۔ یہاں آتے وقت اسے خیال نہیں تھا کہ بلائنڈ ماسٹر تک پہنچنے کے لیے اسے اس قسم کے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔

گلی میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھی چلتی رہی۔ موبائل اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

''اپنے الٹے ہاتھ کی طرف دیکھتی رہنا۔'' نرگس کے کان میں آواز آئی۔ ''سیمنٹ کی چادروں کا ایک مکان دکھائی دے گا۔ اس کے برابر کی گلی میں داخل ہو جانا۔''

''اچھا۔'' نرگس نے پھر طویل سانس لی۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہدایات کا سلسلہ جاری رہا۔ نرگس ان ہدایات کے مطابق چلتی رہی۔ لگ بھگ بیس منٹ تک چلتے رہنے کے بعد وہ جھنجلا کر بولی۔ ''کتنی دیر تک چلنا پڑے گا مجھے؟''

''تمہیں اب کچھ فاصلے پر ایک پھاٹک دکھائی دے رہا ہوگا۔'' جواب میں آواز آئی۔ ''پھاٹک اندر سے بند نہیں ہے۔ تم اسے کھول کر اندر داخل ہو جاؤ۔''

کتھئی رنگ کا وہ پھاٹک نرگس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جس چار دیواری کا تھا، اس کی بلندی چھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ پھاٹک کے دوسری جانب کوئی احاطہ ہی ہوسکتا تھا۔ اگر کوئی بلند عمارت ہوتی تو دکھائی دے جاتی۔

موبائل سے نرگس کے کان میں آواز آئی۔ ''پھاٹک سے اندر داخل ہوگی تو تمہارے بائیں ہاتھ کی طرف ایک کمرا دکھائی دے گا جس پر دفتر لکھا ہوا ہے۔ تم اس دفتر میں

داخل ہو جانا۔''

''اچھا بابا اچھا۔'' نرگس نے منہ بنایا۔

دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ غالباً نرگس کی جھنجلاہٹ محسوس کرلی گئی تھی۔

نرگس اس پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے احاطے میں پایا۔ وہاں چھ سات موٹر سائیکلیں اور تین کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ ان گاڑیوں پر کام کررہے تھے۔ ان کے کپڑوں پر سیاہ دھبے تھے۔ وہ کوئی ورکشاپ معلوم ہورہی تھی جہاں خراب ہو جانے والی گاڑیاں ٹھیک کی جاتی تھیں۔

دائیں جانب ایک مستطیل کمرا دکھائی دے رہا تھا جس پر بڑے بڑے الفاظ میں ''دفتر'' لکھا ہوا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ کونے پر بنا ہوا تھا۔

نرگس ''دفتر'' میں داخل ہوگئی۔ وہاں ایک میز کے پیچھے بیٹھا ہوا آدمی ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میز پر دو تین رجسٹر اور رکھے تھے۔ کچھ فائلیں بھی تھیں۔ اس آدمی نے نظر اٹھا کر نرگس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دوسرا آدمی ایک بیساکھی کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔

''ادھر میم صاب...!'' بیساکھی والا بائیں جانب بنے ہوئے ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ نرگس نے اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔

دروازے کی دوسری جانب جو کمرا تھا، اس میں آٹو پارٹس پھیلے ہوئے تھے۔ دو آہنی الماریاں بھی تھیں۔ بیساکھی والے نے ان میں سے ایک الماری کھولی۔ اس میں آٹو پارٹس کے ڈبے رکھے ہوئے تھے.... بیساکھی والے نے نہ جانے کیا کیا کہ ہلکے سے کھٹکے کی آواز کے ساتھ الماری کی پشت کا حصہ کسی دروازے کی طرح دوسری طرف کھلتا چلا گیا۔

''اندر چلو میم صاب....'' بیساکھی والا بولا۔ ''ادھر زینہ ہے۔ نیچے اترنا ہوگا۔''

اب نرگس کچھ پریشان ہونے لگی۔ دماغ میں یہ خیال چکرانے لگا کہ بلائنڈ ماسٹر سے ملنے کی خواہش نے اسے کسی اور چکر میں تو نہیں پھنسا دیا؟

لیکن اب وہ اوکھلی میں سر دے ہی چکی تھی۔ اس نے قدم بڑھائے اور زینے اترنے لگی۔ وہاں برقی روشنی تھی اس لیے نرگس نے دیکھ لیا کہ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، وہاں آٹھ فٹ کی ایک مربع جگہ تھی جہاں ایک شخص ایک نئی موٹر سائیکل کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا جو اس نے بند کرکے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس کے ساتھ ہی نرگس نے محسوس کیا کہ اس کے کان سے لگے ہوئے موبائل کا دوسری طرف کے موبائل سے رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔

نرگس سمجھ گئی کہ اب تک وہ جس آدمی سے بات کرتی رہی تھی، وہ وہی تھا جو موٹر سائیکل کے قریب کھڑا نظر آیا تھا۔

نرگس آٹھ دس زینے اتری تھی کہ اس کے اوپر وہ راستہ بند ہوگیا جس سے گزر کر وہ زینے پر آئی تھی...... بیساکھی والا اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔

موٹر سائیکل کے قریب کھڑا ہوا شخص شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بھدے تھے۔

نرگس کے لیے ابھی تین چار زینے باقی تھے کہ شلوار قمیص والے نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا۔

''تم جوجی بابا ہو؟'' نرگس نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''بیٹھو میڈم!'' اس نے موٹر سائیکل کی عقبی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

نرگس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی لیکن اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ وہی کرے جو اس سے کہا جارہا تھا۔ موٹر سائیکل کی عقبی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے خلا کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی سرنگ تھی لیکن اندھیرا اس میں بھی نہیں تھا۔

موٹر سائیکل آہستگی سے حرکت میں آئی تو نرگس بولی۔ ''کتنی لمبی ہے یہ سرنگ... کتنی دور جانا ہے؟''

''دس منٹ۔'' مختصر جواب دیا گیا۔

موٹر سائیکل سرنگ میں داخل ہوئی اور اس کی رفتار بڑھنے لگی۔ سرنگ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اسپیڈ بریکر بنائے گئے تھے۔ ان کی وجہ سے موٹر سائیکل کی رفتار بہت کم کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود دس منٹ بعد موٹر سائیکل رک گئی۔ یہ بھی ایک مربع جگہ تھی جہاں زینے بنے ہوئے تھے۔

انجن بند کرکے شلوار قمیص والا شخص موٹر سائیکل سے اترا۔ نرگس اس سے پہلے ہی اتر چکی تھی۔ ایک موٹر سائیکل وہاں پہلے ہی سے کھڑی تھی۔

''آؤ میڈم!'' قمیص شلوار والا زینوں سے اوپر چڑھنے لگا۔

زینے کے اختتام پر چھت کے قریب جو دروازہ تھا، وہ کسی عام دروازے کی طرح آسانی سے کھل گیا۔

شلوار قمیص والے کے ساتھ نرگس اس دروازے سے گزری۔ اب اس نے خود کو ایک راہداری میں پایا جس کی لمبائی چالیس پچاس فٹ کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔ اس کے اختتام پر نہایت قیمتی لکڑی کا خاصا بھاری بھرکم دروازہ تھا۔ اس دروازے کے قریب ہی راہداری کی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا لیکن وہ زیادہ بھاری بھرکم نہیں تھا۔

شلوار قمیص والا ان دروازوں کے قریب رکا اور بھاری دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اندر چلی جاؤ میڈم!''

''وہاں سے کہاں جانا ہوگا؟'' نرگس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

قمیص شلوار والے کے بھدے ہونٹوں میں ایسا کھنچاؤ پیدا ہوا جیسے وہ مسکرایا ہو۔ ''ادھر تم ماسٹر سے ملو گی۔'' وہ بولا۔

نرگس نے بھاری دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

دوسری طرف نہایت کشادہ اور آراستہ کمرا تھا جس کے وسط میں چھ فٹ سے کچھ زیادہ قد کا ایک شخص کھڑا تھا جس کے جسم پر جینز اور جیکٹ تھی۔ اس کی عمر کے بارے میں پینتالیس سال کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ روز دانیال پولیس ہیڈ کوارٹر سے اپنے گھر ہی گیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر نکل کھڑا ہوا تھا۔ دوبارہ ہیڈ کوارٹر جا کر اس نے مانیٹرنگ سیل کا معائنہ کیا جہاں مخصوص علاقے کے گرد لگائے گئے خفیہ کیمروں سے حاصل ہونے والی ویڈیوز، مانیٹر کی جانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں سے دانیال اپنے علاقے کے دفتر گیا۔ وہاں اس نے اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ ایک طویل میٹنگ کی۔ اسی میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ دانیال کے دفتر کے تین افسران بھی ہیڈ کوارٹر میں قائم مانیٹرنگ سیل میں موجود رہیں گے۔ تین ذہین سب انسپکٹروں کا انتخاب دانیال نے ڈی ایس پی دانش کے مشورے سے کیا تھا۔ اس طرح خاصی رات گزر گئی۔ اسی لیے صبح وہ خاصی دیر سے اٹھا تھا اور ناشتا کر کے گھر سے روانہ ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنے دفتر پہنچنے سے قبل وہ علاقے کے گرد ایک چکر لگائے گا لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ وہ راستے ہی میں تھا جب موبائل فون پر اسے ڈی ایس پی دانش سے ایک ایسی رپورٹ ملی تھی کہ اس نے فوراً اپنی کار کا رخ اپنے دفتر کی طرف کر دیا تھا۔

ڈی ایس پی دانش نے بتایا تھا کہ دس بجے کے قریب ایک نہایت ماڈرن عورت کو اس علاقے میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور وہ نہایت قیمتی کار میں تھی۔

''سر!'' ڈی ایس پی دانش نے موبائل پر کہا۔ ''جب سے میڈیا والوں نے اس علاقے کو حد درجہ خطرناک قرار دیا ہے، تب سے متمول طبقے کے لوگوں نے اس علاقے سے گزرنا بھی چھوڑ دیا ہے، خواہ انہیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی طویل راستہ اختیار کرنا پڑے۔ ہیڈ کوارٹر میں اس وقت سب انسپکٹر تنویر کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے مجھے اس بارے میں اطلاع دی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اس عورت کی تصویریں بنوالے۔ میں نے ایک اے ایس آئی کو ہیڈ کوارٹر بھیج دیا ہے۔ وہ تنویر کی بنوائی ہوئی تصویریں لے کر آجائے گا کہ اس کی اہمیت ہے یا نہیں۔'' پھر اس نے پوچھا۔۔۔ ''آپ کب تک دفتر آئیں گے سر!''

''میں ابھی آرہا ہوں۔''

''اے ایس آئی ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو چکا ہے سر!'' ڈی ایس پی دانش نے کہا۔ ''وہ تصویریں لے کر آرہا ہے۔ انسپکٹر تنویر نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ کار ڈرائیو کرنے والی عورت کا چہرہ واضح نہیں تھا اس لیے تنویر نے اس کے چہرے کے بڑے کلوز اپ بھی بنوائے ہیں۔''

''گڈ!'' دانیال نے میز پر رکھے ہوئے گلوب کو انگلی سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''اس کی وجہ میں نے آپ کو فون پر ہی بتا دی تھی کیونکہ اس علاقے میں چھوٹے موٹے آپریشنز کے علاوہ دو بڑے آپریشن بھی کیے جا چکے ہیں جن میں کافی ہلاکتیں اور گرفتاریاں بھی ہوئی تھیں اس لیے میڈیا والوں نے اسے شہر کا سب سے خطرناک علاقہ قرار دے دیا ہے۔ اتنے کیمرے تو وہاں ابھی حال ہی میں لگائے گئے ہیں لیکن اس علاقے کی نگرانی شروع ہی سے کی جارہی ہے۔ نگرانی کرنے والوں کی رپورٹ کے مطابق اس سال میں متمول اور ماڈرن طبقے کے ایک فرد کو بھی اس علاقے میں جاتے یا وہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔''

دانیال نے افہامی انداز میں سرہلایا، پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ ''رپورٹ میں کالا سانپ اور بلائنڈ ماسٹر دونوں ہی کو یکساں خطرناک قرار دیا گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلائنڈ ماسٹر ہمارے لیے زیادہ مشکل ثابت ہو

گا۔ رپورٹ میں یہی لکھا ہے کہ کالا سانپ کو اس کے گروہ کے سبھی لوگ جانتے ہیں جبکہ بلائنڈ ماسٹر نے اپنی شخصیت بڑی حد تک راز میں رکھی ہے۔ رپورٹ میں قیاس کیا گیا ہے کہ اس کے گروہ کے بہت کم لوگ اس کے چہرہ شناس ہیں۔''

''جی ہاں سر! کالا سانپ بہت دلیر ہے۔''

''اس قسم کے لوگوں کا منظرِ عام پر آنا ان کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس قسم کی دلیری، ذہانت کے فقدان کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ذہانت کا یہ فقدان بلائنڈ ماسٹر میں نہیں ہے۔ دلیر آدمی اگر ذہین بھی ہو تو زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔''

ڈی ایس پی دانش سوچنے لگا پھر اس نے آہستگی سے اثبات میں سرہلایا۔

''اچھا ہاں۔'' دانیال بولا۔ ''ہم دوسری بحث میں پڑ گئے۔ بات اس عورت کی ہو رہی تھی۔ ممکن ہے، وہ کراچی میں نئی نئی آئی ہو اور اسے اس علاقے کے پُرخطر ہونے کا علم نہ ہو۔ وہ اس طرف سے گزر کر کہیں اور جانا چاہتی ہو۔ میرا مطلب ہے، ضروری نہیں کہ اس عورت کی منزل اسی علاقے میں کسی جگہ ہو۔''

ڈی ایس پی دانش نے سرہلایا۔ ''میں نے اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا لیکن اب۔'' اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ''اب اسے اس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔ خاصا وقت گزر چکا ہے، اسے اس علاقے میں داخل ہوئے لیکن ابھی تک ہیڈ کوارٹر سے یہ اطلاع نہیں آئی کہ اس کی کار کسی راستے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھی گئی ہے۔''

''گڈ۔'' دانیال نے آہستگی سے میز پر گھونسا مارا۔ ''اب اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے کہ اس عورت کی منزل اسی علاقے میں کسی جگہ ہے۔''

''ایک بات یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ کہیں پھنس گئی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''بلائنڈ ماسٹر کے لوگ اپنے علاقے میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ اس عورت کو سی آئی ڈی سے متعلق سمجھ کر۔۔۔۔ روک بھی سکتے ہیں اور جان سے مار بھی سکتے ہیں اگر وہ عورت غلطی سے اس علاقے میں چلی گئی ہو۔''

دانیال نے سرہلایا۔ ''اچھا پوائنٹ آیا ہے۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا مگر اس کا ایک پہلو اور بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عورت کسی کا کوئی پیغام لے کر بلائنڈ ماسٹر سے ملنے گئی ہو۔''

''اس طبقے کی عورت؟''

''یقیناً۔'' دانیال نے زور دے کر کہا۔ ''کیا آپ کے ذہن میں یہ بات نہیں کہ ہمارے ملک جیسے ترقی پذیر ممالک میں اس قسم کے جرائم پیشہ افراد یا گروہوں کو کسی بڑے آدمی کی سرپرستی بھی حاصل ہوتی ہے۔''

اسی وقت ایک اے ایس آئی اجازت لے کر اندر آیا۔ اس نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نصیرا دودھ والے نے فون پر ابھی ایک خبر دی ہے سر۔''

دانیال فوراً سمجھ گیا کہ نصیرا دودھ والا، اس علاقے میں پولیس کا ایک مخبر ہے۔ پولیس اس علاقے میں رہنے والے گیارہ افراد کو خرید چکی تھی جو مخبری کا فرض انجام دیتے تھے۔

''نصیرا دودھ والے کی دی ہوئی خبر کے مطابق ایک کار اس کی دکان کے سامنے سے گزری تھی جسے ایک خوب صورت عورت چلا رہی تھی۔ وہ دو میل آگے گئی تھی کہ بلائنڈ ماسٹر کے چار آدمیوں نے اسے روک لیا تھا۔''

''پھر؟'' ڈی ایس پی دانش نے بے چینی سے پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''یہ نہیں معلوم سر۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ''نصیرا نے اتنا ہی بتا کر فون بند کر دیا۔ اب دوبارہ اس کا فون آئے، تبھی اس سے اس بارے میں پوچھا جاسکتا ہے۔''

دانیال کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے خاموش رہنا پڑا کیونکہ ایک اور اے ایس آئی کمرے میں آیا تھا۔

''لے آئے تصویریں؟'' ڈی ایس پی دانش اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے چینی سے پوچھ بیٹھا۔

''جی سر!'' اے ایس آئی نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''پہلے آپ ہی دیکھیں سر۔''

دانیال نے تصویریں نکالیں۔ وہ تین فوٹو گراف تھے۔ اوپر جو فوٹو گراف تھا، اس میں ایک سفید کار تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ فوٹو گراف میں چہرہ چھوٹا ہونے کے باوجود دانیال کو وہ سو فیصد اجنبی نہیں محسوس ہوا۔ اس کے نیچے جو فوٹو گراف تھا، اس میں اسٹیئرنگ کے پیچھے اس عورت کا چہرہ بڑی حد تک صاف تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی دانیال شاید پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ اس نے جلدی سے تیسرا فوٹو گراف دیکھا۔ اس میں چہرہ اور

تھوڑا سا اسٹیئرنگ تھا۔ ”نرگس... نرگس... نرگس...“ دانیال کے دماغ میں شور سا مچ گیا۔

پندرہ سال پہلے دانیال نے جس نرگس کو دیکھا تھا وہ ایک جوان لڑکی تھی لیکن فوٹوگراف میں تیس بتیس سال کی عورت تھی۔ اس کے نقش و نگار میں اتنی تبدیلی نہیں آئی تھی کہ دانیال اسے پہچان نہ پاتا۔

ڈی ایس پی دانش نے دانیال کے تاثرات دیکھ کر سوال داغ دیا۔ ”کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں سر؟“

دانیال نے چونکتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر فوٹوگراف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

نرگس کے سامنے کھڑا ہوا شخص اچھے نقش و نگار کا مالک تھا۔ اگر اس کے گال پر کان کے پاس سے ٹھوڑی تک زخم کا نشان نہ ہوتا تو وہ بلاشبہ خوب صورت نظر آتا۔ وہ بڑے غور سے نرگس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نرگس اپنے ونیٹی بیگ سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس کے قریب گئی اور لفافے سے ایک تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں یہ تصویر یاد ہے؟“

تصویر میں بلائنڈ ماسٹر کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آٹھ دس سال کی ایک بچی کے پیچھے اس طرح کھڑا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ بچی کے شانے پر تھے۔ ہونٹوں پر خوش گوار مسکراہٹ تھی۔ گال پر زخم کا نشان نہیں تھا۔

”ہاں۔“ بلائنڈ ماسٹر نے تصویر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیس سال پہلے کی ہے یہ تصویر۔ میں اس میں نرگس افتخار کے ساتھ ہوں۔ تم میں اس کی کچھ مشابہت یقیناً ہے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم خود کو نرگس افتخار کہہ سکتی ہو۔“

”تم مجھ سے کچھ ایسے سوال کرلو جس سے تمہیں میری بات کا یقین آسکے۔“

بلائنڈ ماسٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ تصویر کس نے کھینچی تھی؟“

”تمہاری چھوٹی اور میری بڑی بہن پارس نے۔“ نرگس نے سکون سے جواب دیا۔ ”مجھے پارس باجی کہنا چاہیے۔“

بلائنڈ ماسٹر کا منہ تھوڑا سا کھلا۔ نرگس کا... جواب سنتے ہی وہ بے چین ہو گیا تھا۔ فوراً ہی اس نے دوسرا سوال بڑی تیزی سے کیا۔ ”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے یہ تصویر کھینچنے کے بعد۔“

”کیمرا پارس باجی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا لیکن فلم کی ریل محفوظ رہی تھی ورنہ یہ تصویر ضائع ہو جاتی۔“ نرگس نے وضاحت سے جواب دیا۔

بلائنڈ ماسٹر کے ہونٹوں میں ایسی لرزش ہوئی جیسے وہ کچھ جذباتی ہو گیا ہو۔ اس نے ایک اور سوال کیا۔ ”وہ کیمرا کس کا تھا؟“

”تم اپنے کسی دوست سے مانگ کر لائے تھے۔“ نرگس نے جواب دیا۔ ”کیمرا ٹوٹنے سے پریشان ہو گئے تھے کہ اب اپنے دوست سے کیا کہو گے۔“

بلائنڈ ماسٹر کے دونوں ہاتھ اٹھے اور نرگس کے شانوں پر مضبوطی سے جم گئے۔ ”تم یقیناً نرگس ہو۔“ اس وقت اس شخص کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی جس نے متعدد قتل کیے تھے اور نہ جانے کتنے ہی خطرناک کاموں میں ملوث رہا تھا۔ اس کی آواز میں لرزش بھی آ گئی۔ ”تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ میں نے گھر کب چھوڑا تھا؟“

”یہ تصویر کھنچنے کے دس بارہ دن بعد ہی آفی بھائی۔“

”اوہ... نرگس... نرگس۔“ بلائنڈ ماسٹر نے شدت جذبات سے نرگس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”بیس سال بعد اس طرح مخاطب کیا گیا ہے مجھے... بس بابو جی اور ماں جی کہتے تھے مجھے آفی! اب تو مجھے آفتاب کے نام سے بھی کوئی نہیں پکارتا۔ میں اب بس بلائنڈ ماسٹر ہوں۔“

نرگس بھی آب دیدہ ہو چکی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے یہ بھی یاد ہے آفی بھائی کہ تم نے گھر کیوں چھوڑا تھا بلکہ بابو جی نے نکالا تھا تمہیں گھر سے۔ بہت ناراض ہوئے تھے وہ۔ یہ بھی کہا تھا کہ بس سو من اناج کے، کام کے نہ کاج کے۔“

”ہاں۔“ بلائنڈ ماسٹر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پھر میں تم لوگوں سے کبھی نہیں ملا۔ اب تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی اپنی کسی بہن سے ملوں گا۔ آؤ... بیٹھو۔“

”بابو جی اور ماں جی تو اب رہے نہیں دنیا میں۔“

”معلوم ہے مجھے۔ میں نے چوری چھپے ان کی تدفین میں شرکت کی تھی۔ گھر کی سب خبر رکھتا تھا میں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے کسی سے لو میرج کر لی تھی اور پھر گھر نہیں گئی تھیں۔ میں تمہیں ڈھونڈ لیتا لیکن اچانک پولیس نے گرفتار کر لیا۔“

”گھر چھوڑتے ہی تم نے ایک ڈاکا مارا تھا۔ پکڑے گئے تھے۔“

”جب تو تھوڑی سی سزا ہوئی تھی۔ ایک بڑے معاملے میں پکڑا گیا تھا تو چھ سال گزارنا پڑے تھے جیل میں۔ پھر بہت بدنام ہو گیا تھا۔ تمہیں اور پارس کو میں نے ڈھونڈا ہی نہیں۔ سوچا تھا کہ تم دونوں اپنے اس بھائی سے ملنا پسند نہیں کرو گی جو اس نام نہاد شریف معاشرے کا ایک بُرا آدمی بن چکا ہے۔“

”سچ کہوں آفی بھائی!“ نرگس کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ ”اس وقت تو میری سوجھ بوجھ ہی کچھ نہیں تھی جب تم نے گھر چھوڑا تھا۔ چند سال بعد کچھ آئی تھی سمجھ بوجھ۔ تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے افسوس ہی ہوا تھا کہ تم بُرے راستوں پر نکل گئے لیکن اب میری سوچ بالکل بدل چکی ہے آفی بھائی... یہ دنیا ہی بہت بُری جگہ ہے۔ یہاں جس کے پاس پیسا نہیں، اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اسے اس کا حق دیا ہی نہیں جاتا۔ ایسے لوگوں کو اپنا حق چھیننا پڑتا ہے۔ تم نے بھی یہی کیا۔ ملازمت حاصل کرنے کے لیے ٹھوکریں کھاتے رہے تھے تم۔“

”اسی لیے کہا تھا بابو جی نے کہ میں کام کا نہ کاج کا۔“ بلائنڈ ماسٹر تلخی سے بولا۔ ”انہیں تو بھلے وقتوں میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو وقت آ گیا تھا، وہ بہت بُرا تھا۔ میں نے ملازمت کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائیں، ذلیل ہوتا رہا لیکن جب باپ بھی دھتکار دے تو دماغ گھوم جاتا ہے۔ میرا بھی گھوم گیا۔ نکل گیا میں اس راستے پر جہاں طاقت سے سب کچھ حاصل کیا جاتا ہے اور میں نے حاصل کر بھی لیا۔“

”تمہیں کالے سانپ سے زیادہ خطرہ ہے یا پولیس سے؟“

”پولیس بھی سانپ ہی ہے میرے لیے مگر چھوڑو یہ سب باتیں۔ مجھے بتاؤ کہ میری یاد کیسے آ گئی؟... یہ تو تمہیں اخباروں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بلائنڈ ماسٹر تمہارا بھائی ہے۔“

نرگس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ اسے اخباروں ہی سے معلوم ہوا تھا۔ پولیس نے بلائنڈ ماسٹر پر ہیڈ منی لگا دی تھی اور اس کی تصویر سبھی اخباروں میں چھپ چکی تھی۔

”میں اس علاقے میں آتے ہوئے ڈرتی تھی بھائی۔“ وہ بولی۔ ”سوچتی تھی کہ شاید تم تک پہنچ ہی نہ سکوں۔ تمہارا کوئی آدمی پہلے ہی مجھے گولی مار دے مگر کچھ دن پہلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ میرے لیے وہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔“

”ایسا کیا کام پڑ گیا تمہیں؟“ بلائنڈ ماسٹر کچھ حیرت سے بولا۔

”بتاؤں گی تو تم بہت حیران ہو گے۔ یقین بھی بڑی مشکل سے کرو گے لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔ میرا کام تم ہر صورت میں کرو گے۔“

”بیس سال بعد مل رہا ہوں اپنی بہن سے۔“ بلائنڈ ماسٹر نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں کیسے انکار کر سکتا ہوں اپنی بہن کے لیے کوئی کام کرنے سے۔“

”یہ مت پوچھنا کہ میں وہ کام کیوں کروانا چاہتی ہوں۔“

”الجھن بڑھا رہی ہو تم میری۔“

”بات کچھ ایسی ہی ہے آفی بھائی۔ بہت حیران ہو گے تم۔“

”اب بتا بھی چکو، میری الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔“

”میرا ایک بیٹا ہے آفی بھائی۔“

”ماشاءاللہ۔“

”تیرہ سال کا ہو چکا ہے۔“ نرگس پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں بولنے لگی۔ ”بڑی مشکل سے چھٹی کلاس تک پہنچا ہے۔ پڑھائی میں اس کا دل ہی نہیں لگتا۔ بس مار کاٹ کروا لو اس سے... لیکن ان سب باتوں میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے اس کی تربیت ہی اس طرح کی ہے۔“

بلائنڈ ماسٹر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ایسی تربیت کیوں کی تم نے اس کی؟“

”اسی لیے کہ وہ ایسا بن جائے جیسا وہ ہے۔“ نرگس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اب میں اسے تمہاری شاگردی میں دینا چاہتی ہوں۔“

بلائنڈ ماسٹر اس طرح ہنسنے لگا جیسے نرگس کی باتوں کو مذاق سمجھ رہا ہو۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم آسانی سے یقین نہیں کرو گے۔“ نرگس بولی۔

بلائنڈ ماسٹر سنجیدہ ہو گیا اور اس کی طرف پھر حیرت سے دیکھنے لگا۔

نرگس کہتی رہی۔ ”اسے ایسا بنا دو کہ اس کے دل میں رحم جیسا کوئی جذبہ باقی نہ رہے۔ وہ بے خطا نشانے باز بن جائے۔ ایک سفاک قاتل۔“

”نرگس!“ بلائنڈ ماسٹر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم پاگل ہو گئی ہو؟“

”ہاں۔“ نرگس نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے نظریں جھکائیں۔ ”شاید ایسا ہی ہے۔ ایسی ماں کو پاگل ہی سمجھا جاسکتا ہے جو اپنی اولاد کو ایسا بنانا چاہتی ہو۔“

”بات کیا ہے نرگس؟ تم اسے ایسا کیوں بنانا چاہتی ہو؟“ بلائنڈ ماسٹر حیرت زدہ تھا۔

”میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ مت پوچھنا۔“

”لیکن...“

”بحث مت کرو بھائی۔“

”لیکن نرگس...“ بلائنڈ ماسٹر نے تیزی سے کہنا چاہا۔

نرگس نے اس سے زیادہ تیزی سے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے کہا نا، بحث مت کرو۔ میں امان کو تم جیسا دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”امان نام ہے تمہارے بیٹے کا؟“

”ہاں۔“

”اور تم اسے بے امان بنانا چاہتی ہو؟“

”جو سمجھنا چاہو، سمجھ لو۔“

بلائنڈ ماسٹر اپنی پیشانی مسلتے ہوئے نرگس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا میں امید رکھوں کہ تم مجھے مایوس نہیں لوٹاؤ گے؟“ وہ بولی۔

”مجھے سوچنے دو نرگس! میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے بیٹے کو ایسا کیوں بنانا چاہتی ہو۔“

”نہیں سمجھ سکو گے۔ کوئی فائدہ نہیں سوچنے سے۔“

بلائنڈ ماسٹر متفکر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میری بات مانو گے نا بھائی؟“ نرگس نے اس کی طرف پُرامید انداز میں دیکھا۔

”امان کہاں ہے؟“

”ابھی تو اسکول میں ہوگا۔ کل لے آؤں گی اسے۔ سپرد کر دوں گی تمہارے۔“

”آج بھی تم یہاں آئی ہو تو اپنے لیے ایک پریشانی کھڑی کرلی ہے تم نے۔“

”کیسے؟ کیوں؟“

”پولیس یہاں ہفتے دو ہفتے بعد ریڈ کرتی رہتی ہے۔ کچھ نہ کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ ان میں اس علاقے میں رہنے والے معصوم لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن جب ریڈ نہیں کیا جاتا تو بھی اس سارے علاقے کی نگرانی جاری رہتی ہے۔ آنے جانے والوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ تم بھی ان کی نظر میں آ گئی ہوگی۔“

”تو کیا ہوا؟ یہاں سے لوگ گزرتے تو ہوں گے۔“

”ایسے لوگوں نے یہاں سے گزرنا چھوڑ دیا ہے جیسی تم ہو۔ جیسی کار میں تم یہاں آئی ہو، ایسی کار کو یہاں آتے ہوئے عرصے سے نہیں دیکھا گیا ہوگا۔ تم سے یہ پوچھ گچھ ضرور کی جائے گی کہ اس علاقے میں کیوں داخل ہوئی تھیں۔“

”اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ اب میں پہلے سے کوئی جواب سوچ لوں گی۔“

”مجھے بھی بتا کر جاؤ۔ میں اندازہ لگا لوں گا کہ تمہارا جواب پولیس کو مطمئن کر سکے گا یا نہیں۔“

”کہہ دوں گی، جانا کہیں اور تھا، بے خیالی میں ادھر مڑ گئی۔“

”یہ بالکل نامناسب جواب ہے۔ پولیس مطمئن نہیں ہوگی۔ تمہیں اس علاقے سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا جائے گا۔ پولیس پوچھ سکتی ہے کہ تم اتنی دیر تک اس علاقے میں کہاں رکی رہیں۔ میں اگر چاہوں تو یہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں اس علاقے سے نکلتے ہوئے دیکھا ہی نہ جاسکے لیکن اس طرح تم اور زیادہ مشکوک ہو جاؤ گی۔ تمہاری کار کے نمبر سے وہ تمہارا پتا تو لگا لیں گے۔ ایسی صورت میں وہ سوال کر سکتے ہیں کہ تم اس علاقے کے کس راستے سے باہر نکلیں۔ اس کا تم کوئی جواب نہیں دے سکو گی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ تم اس راستے سے نہیں نکلیں۔ پھر سب سے زیادہ پریشانی کی ایک بات اور ہوگی تمہارے لیے۔ پولیس کو اس کا علم ہوسکتا ہے کہ میرے چار آدمیوں نے تمہیں روکا تھا۔“

”اس کا کیسے پتا چل سکتا ہے پولیس کو؟“

”مخبر موجود ہیں ان کے اس علاقے میں۔“ بلائنڈ ماسٹر نے بتایا۔ ”دو مخبروں کو تو کالا سانپ ٹھکانے لگوا چکا ہے۔ ایک کو میں نے بھی ختم کروایا ہے لیکن اور مخبر بھی ہوں گے ان کے۔“

”یہ ضروری تو نہیں کہ تمہارے چار آدمیوں کو اور مجھے کسی مخبر نے دیکھ لیا ہو۔“

”ہاں ضروری تو نہیں لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم پریشانی میں پڑو۔“

یہ باتیں کرتے ہوئے نرگس کا دماغ کام کرتا رہا تھا۔ وہ یکایک مسکرائی اور بولی۔ ”ایک اہم بات بتاؤں

تمہیں... میں ایک اخبار میں کالم لکھتی ہوں۔ ہفتے میں دو تین کالم تو آ ہی جاتے ہیں۔“

”نرگس زماں کے نام سے ایک کالم کبھی کبھی میری نظر سے گزرا ہے۔ کیا وہ...“

”ہاں۔“ نرگس نے بات کاٹی۔ ”نرگس زماں کے نام سے... میں ہی لکھتی ہوں۔ موضوع، جرائم اور معاشرہ ہوتا ہے۔ میں پولیس کو یہ جواب دوں گی کہ میں تمہارا انٹرویو لینا چاہتی ہوں، اسی لیے اس علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ تمہارے آدمیوں سے آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔ میں نے ان سے بھی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ وہ میرا پیغام ماسٹر کو پہنچا دیں گے اور اگر ماسٹر نے انٹرویو دینے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تو مجھے فون پر بتا دیا جائے گا۔ انہوں نے میرا موبائل نمبر لے لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ میں آج ہی انٹرویو لینا چاہتی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکی۔ ان لوگوں سے اسی حجت کی وجہ سے مجھے اس علاقے سے نکلنے میں اتنی دیر لگی۔“

”کیا وہ یقین کرلیں گے کہ تم اتنی دلیر ہو؟ میرے علاقے میں آکر میرا انٹرویو کرنے کے بارے میں سوچنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔“

”یہ تو تاریخ ہے کہ صحافیوں نے خطرناک لوگوں کا انٹرویو لیا ہے۔“

”ہاں ایسا ہوا تو ہے لیکن... یہ ابھی میں نے کہا نا... کیا وہ یقین کرلیں گے کہ تم اتنی دلیر ہو؟“

”یقین کریں یا نہ کریں، میں اپنے اس بیان پر اڑی رہوں گی۔ وہ میرے ساتھ کوئی سخت رویہ تو اختیار کر نہیں سکتے۔ صحافیوں کے معاملے میں پولیس کو کچھ محتاط تو رہنا پڑتا ہے۔“

بلائنڈ ماسٹر کے چہرے سے فکرمندی ظاہر ہوتی رہی، پھر وہ بولا۔ ”تم پہلے ہی سے ایک کالم نگار ہو۔ یہ جواب چل تو سکتا ہے۔“

”بس تو اب میں چلتی ہوں۔ کل امان کو لے کر آؤں گی۔“

”کیا وہ تمہیں چھوڑ کر میرے پاس رک سکے گا؟“

”یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”اچھا ٹھہرو۔“

بلائنڈ ماسٹر اٹھ کر ایک الماری تک گیا۔ الماری سے وہ ایک موبائل فون نکال لایا اور اس میں کچھ کرنے کے بعد نرگس کو دیتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھ سے بات کرنے کے لیے یہ موبائل استعمال کرنا۔ میں نے اپنا نمبر اس میں فیڈ کر دیا ہے لیکن اگر میں نے تمہیں فون کیا تو تمہیں اسکرین پر دوسرا نمبر دکھائی دے گا۔ مجھے یہ احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ ایک نمبر میں ایک ہی بار استعمال کرتا ہوں۔“

نرگس خفیف سا مسکرائی۔ ”گویا ممکن نہیں ہے کہ سیلولر کمپنیوں کے تعاون سے بھی پولیس تمہارے کسی منصوبے سے آگاہ ہوسکے۔“

”انتہائی ضرورت کے وقت ہی تم مجھے فون کرنا۔ دوبارہ اس نمبر پر کال کرو گی تو مجھ سے رابطہ نہیں ہوسکے گا۔ میں ایک نمبر پر ایک مرتبہ بات کرنے کے بعد وہ نمبر استعمال نہیں کرتا۔ موبائل انسٹرومنٹ بھی بدل لیتا ہوں۔“

”کتنے انسٹرومنٹ ہیں تمہارے پاس؟“ نرگس حیرت سے بولی۔

”ایک ہزار سے زیادہ تو اسی الماری میں رکھے ہیں۔“ بلائنڈ ماسٹر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”ہر ایک میں سم بھی پڑی ہوئی ہے۔ جو موبائل میں ایک مرتبہ استعمال کرلیتا ہوں، اس کا ٹھکانا اس الماری میں ہوتا ہے۔“ بلائنڈ ماسٹر نے دوسری الماری کی طرف اشارہ کیا۔ پھر سنجیدہ ہو کر اس نے پوچھا۔ ”کل کس وقت آؤ گی؟“

”اسی وقت۔“

”گلی نمبر سات سے آنا۔“

”اسی سے کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟“

”مناسب نہیں ہوگا کہ کل تمہیں پھر اس علاقے میں آتے دیکھا جائے۔“

”جب یہاں کی نگرانی کی جارہی ہے تو کل بھی کی جائے گی۔ میں ان کی نظروں میں تو آؤں گی۔ دوبارہ یہاں آنے کے لیے بھی کوئی بہانہ سوچنا پڑے گا جو پولیس کو بتایا جاسکے۔“

”نہیں۔“ بلائنڈ ماسٹر نے کہا۔ ”کل تمہارا ان کی نظر میں آنا قطعی مناسب نہیں ہوگا کیونکہ کل تمہارے ساتھ امان بھی ہوگا۔ کل میں گلی نمبر سات پر کچھ بندوبست کر دوں گا۔ وہاں اگر نگرانی کرنے والے ہوں گے تو میرے آدمی انہیں گولیوں کا نشانہ بنا دیں گے۔ تم فائرنگ کی آواز سن کر یا دیکھ کر گھبرانا نہیں۔ کار تیزی سے گلی نمبر سات میں لے آنا اور پھر اسی پھاٹک پر آ کر رکنا جہاں گیراج ہے۔ تم جب احاطے میں آجاؤ گی تو میرے آدمی تمہاری کار پر کپڑا چڑھا دیں گے۔“

"کارکور؟"

"ہاں۔" بلائنڈ ماسٹر نے جواب دیا۔ "میرے آدمیوں کے علاوہ کوئی شخص تمہاری کار دیکھ لے گا تو وہ بھی پولیس کو کار کا نمبر نہیں بتا سکے گا۔"

"سرنگ استعمال ہوگی مجھے اور امان کو یہاں لانے کے لیے؟"

"ہاں، بالکل آج کی طرح... موٹر سائیکل جوجی ہی چلائے گا۔ کچھ دقت تو ہوگی لیکن کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔ بائک پر تمہیں امان کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ امان یہ سب کچھ دیکھ کر کیا محسوس کرے گا، کیا سوالات کرے گا تم سے۔"

"میں کہہ چکی ہوں کہ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

بلائنڈ ماسٹر نے کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ایس پی آفس کے کمرے میں دانیال اب اکیلا تھا۔ ڈی ایس پی دانش کو اس نے کچھ ہدایات دے کر رخصت کر دیا تھا۔ ہیڈ کوارٹر سے لائی گئی نرگس کی تصاویر اس کے سامنے میز پر پھیلی ہوئی رکھی تھیں۔ دانیال نے جب سے ان تصاویر کو دیکھا تھا، ماضی کی ایک فلم سی اس کے دماغ میں چلتی رہی تھی۔

پندرہ سال پہلے جب وہ کالج میں تھا اور فائنل ایئر میں پہنچ چکا تھا، اسی سال نرگس کالج میں داخل ہوئی تھی۔ وہ ایسی تھی کہ کالج کے خاصے لڑکے اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ نرگس نے بھی سب سے گھلنے ملنے میں کوئی تذبذب نہیں کیا تھا لیکن دانیال کی طرف اس کا جھکاؤ زیادہ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ دانیال کالج کے دو تین نہایت خوب صورت نوجوانوں میں سے ایک تھا۔

دانیال کو بھی نرگس پسند آئی تھی۔ تین چار مہینے ہی میں وہ ایک دوسرے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ اظہارِ محبت کی نوبت تو نہیں آئی تھی لیکن دانیال کو محسوس ہونے لگا تھا کہ نرگس بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے لیے یہ بات بھی باعثِ اطمینان تھی کہ نرگس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس طبقے کی لڑکیاں پیار محبت کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوتی ہیں اور شدید جذباتیت کی حامل بن جاتی ہیں جبکہ متمول طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اس قسم کے معاملات کو فلرٹ کی حد سے آگے تک محسوس نہیں کرتیں۔

نرگس کے والد کا نام افتخار احمد تھا۔ وہ کسی سرکاری ادارے میں ہیڈ کلرک تھے۔ اپنی کم آمدنی کے باوجود انہوں نے اپنے گھریلو اخراجات میں تو کمی کی تھی لیکن اپنی دونوں بیٹیوں کو بہترین درس گاہوں میں تعلیم دلائی تھی۔ نرگس کی بہن پارس نے بھی ایک سال پہلے گریجویشن کرلیا تھا اور چند ماہ قبل اس کی شادی بھی ہوچکی تھی۔

دانیال اور نرگس ایک دوسرے سے اس حد تک بے تکلف ہو چکے تھے کہ نرگس نے اس سے اپنے گھر کی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ یہ تک بتا دیا تھا کہ ان دونوں بہنوں کا بھائی آفتاب غلط قسم کے لوگوں کی صحبت میں پڑ کر اس حد تک بگڑ گیا تھا کہ افتخار احمد نے اسے کئی سال پہلے گھر سے نکال دیا تھا۔ آفتاب بگڑتا ہی چلا گیا اور ان دنوں میں بھی اس کا اٹھنا بیٹھنا بُرے ہی لوگوں میں تھا۔

خود دانیال کا تعلق کسی ایسے گھرانے سے نہیں تھا جسے "مال دار گھرانا" کہا جا سکتا لیکن آسودہ حالی بہرحال تھی۔ دانیال کی والدہ اس کی شادی کسی ایسی لڑکی سے کرنا چاہتی تھیں جو متوسط طبقے کی ہو۔ اپنے بڑے بیٹے کی شادی بھی انہوں نے متوسط گھرانے میں کی تھی۔

دانیال کے لیے یہ تو باعثِ اطمینان تھا کہ اس کی والدہ کی خواہشات کے مطابق نرگس ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن یہ امر پریشان کن تھا کہ اس کے بھائی نے اپنی زندگی گزارنے کے لیے تاریک راہیں اختیار کرلی تھیں۔

دانیال کی والدہ شاید یہ گوارا نہ کرتیں کہ ان کی بہو کا بھائی جرائم پیشہ ہو۔ اسی لیے دانیال کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ وہ کسی طرح آفتاب سے مل کر اسے اندھیرے راستوں سے واپس لانے کی کوشش کرے۔

رابطے کی کوشش نرگس کے ذریعے کی جاسکتی تھی لیکن نرگس نے انکار کردیا۔

"یہ میں نہیں کرسکتی دانیال۔" اس نے کہا۔ "اگر بابو جی کو یہ معلوم ہوگیا کہ میں بھائی سے ملی تھی اور تمہیں بھائی سے ملایا تھا تو وہ مجھ پر بہت بُری طرح بگڑیں گے۔ بہنوں کو بھائی سے بہت محبت ہوتی ہے اور پارس آپا کی طرح مجھے بھی بھائی سے دور ہوجانے کا قلق ہے لیکن میں بابو جی کی ناراضگی مول نہیں لے سکتی۔ اماں تو بیٹے کو یاد کر کے چپکے چپکے روتی ہی رہتی ہیں لیکن بابو جی کو ان کی بھی پروا نہیں حالانکہ وہ اماں سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

دانیال نے نرگس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس معاملے میں بہت رازداری برتی جائے گی لیکن وہ تیار نہیں ہوئی۔

دانیال کو احساس ہوگیا کہ اسے کوئی دوسری تدبیر کرنا پڑے گی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی دوسری تدبیر سوچ پاتا، حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ نرگس کا جھکاؤ اس کی طرف بہ تدریج کم ہونے لگا اور ارشد کی طرف بڑھنے لگا۔

ارشد بھی کالج میں فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ اس کی صورت شکل بھی واجبی سی تھی۔ اسی لیے دانیال کا خیال تھا کہ نرگس کے اس جھکاؤ کی وجہ دولت ہوگی۔

ارشد بہت دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی چمکتی دمکتی کار میں کالج آتا۔ نرگس کی طرف جھکنے کی پہل اسی نے کی تھی۔ اگر یہ پہل اس نے شروع ہی میں کی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ نرگس، دانیال کی طرف نہ جھکتی۔

تنہائی میں ملاقات ہوتے ہی دانیال نے نرگس سے شکوہ کر ڈالا۔ "کیا تم مجھے بھلا رہی ہو نرگس؟"

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"تمہارا جھکاؤ اب ارشد کی طرف ہے۔"

"جھکاؤ کیا مطلب؟ میں تو شادی بھی اسی سے کرنا چاہتی ہوں۔"

اتنا کورا اور صاف جواب ملنے پر دانیال کو سکتہ سا ہو گیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" وہ بہ مشکل بول سکا۔

"کیوں... کیا کوئی غلط بات ہے یہ؟"

"اور وہ... وہ جو... وہ جو ہم... کتنا قریب رہے ہیں ایک دوسرے سے؟"

"وہ تو اب بھی رہیں گے۔ ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔" نرگس نے جواب دیا پھر بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "کیا تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟"

"میں اب تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"کبھی ایسی کسی بات کا اظہار تو نہیں ہوا۔"

"لفظوں سے نہ سہی، عمل سے تو ہوا ہے۔"

"میں نے اس عمل کو ایک اچھی دوستی کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔" نرگس کی سنجیدگی برقرار رہی۔ "اور ایک اچھے دوست کی طرح تمہیں اس بات سے خوش ہونا چاہیے کہ میں ایک اچھے مستقبل کی طرف بڑھنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا مستقبل؟" دانیال نے افسردگی سے کہا۔ "یعنی دولت؟"

"ہاں۔" نرگس نے جواب دیا۔ "اچھا مستقبل دولت سے ہی بن سکتا ہے۔ دیکھو دانیال! اس اچھے کالج میں پڑھنے کے علاوہ میری زندگی میں محرومیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اب اگر میں ان محرومیوں سے دور نکل جاؤں تو ایک اچھے دوست کی طرح تمہیں اس پر خوش ہونا چاہیے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ اس طرح تمہاری زندگی میں خوشیاں آجائیں گی؟"

"خوشیاں دولت ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔"

"محبت سے بھی خوشیاں ملتی ہیں اور ارشد تمہیں محبت نہیں دے سکے گا۔ دولت مند لوگ محبت بھی دولت مندوں ہی سے کرتے ہیں۔"

"وہ مجھ سے محبت کا اظہار کر چکا ہے۔"

"محبت کا اظہار کرنے اور محبت ہونے میں بہت فرق ہے۔ ارشد کا اظہارِ محبت... محبت نہیں۔ دولت مند لوگ..."

"پلیز دانیال! ارشد کے خلاف ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ اس قسم کی باتوں سے میری اور تمہاری دوستی بھی ختم ہوجائے گی۔ میں ارشد سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

"ارشد سے یا اس کی دولت سے؟" دانیال کے لہجے میں تلخی آگئی۔

"دانیال۔" نرگس کو غصہ آگیا اور پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ان دونوں میں یہ باتیں کالج کی راہداری میں ہوئی تھیں۔

دانیال کو افسوس ہوا کہ اس کے منہ سے ایک سخت بات نکل گئی تھی۔ لیکن اسے یہ خیال بھی رہا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔

اس دن کے بعد سے نرگس نے دانیال سے بات کرنا بھی چھوڑ دی۔ اس کا ارشد کی طرف تیزی سے جھکاؤ کالج کے زیادہ تر لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی محسوس کرلیا۔

وقت گزرتا رہا۔ کچھ دن بعد ارشد کبھی کبھی موٹر سائیکل پر بھی آنے لگا۔ کسی سے دانیال کے علم میں آیا کہ نرگس اس سے موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہی تھی۔

دانیال کا دل اس کے بعد بھی نرگس ہی کے لیے دھڑکتا رہا۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا کہ دولت کی چکا چوند میں نرگس کوئی دھوکا نہ کھا جائے۔

کچھ وقت اور گزرا۔ ارشد اور نرگس کی ملاقاتوں میں

کوئی فرق نہیں آیا لیکن دانیال نے یہ ضرور محسوس کیا کہ نرگس متفکر نظر آنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ کینٹین میں یا کالج کی کسی اور جگہ تنہا ہوتی تو بہت کھوئی کھوئی سی نظر آتی۔

کیا ہوسکتا ہے... دانیال سوچتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نرگس کے گھر والے اس کا رشتہ ارشد سے نہ کرنا چاہتے ہوں؟

پھر ایک دن ایسا آیا جب ارشد اور نرگس کالج نہیں آئے۔

دوسرے دن... اور پھر تیسرے دن بھی نہیں آئے۔

اب دانیال کو تشویش ہونے لگی۔ کالج کے دوسرے لڑکے لڑکیاں بھی ان دونوں کے نہ آنے پر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

پانچویں دن کسی طرح دانیال کے علم میں آیا کہ کالج کی انتظامیہ نے ان دونوں کے گھروں سے رابطہ کیا تھا۔ نرگس کے والد نے بتایا تھا کہ اب وہ اپنی بیٹی کو مزید نہیں پڑھانا چاہتے اور اس کی شادی کر رہے ہیں۔ دانیال کے والد نے بتایا تھا کہ ارشد کے کسی چچا کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی اس لیے وہ انہیں دیکھنے اچانک امریکا چلا گیا تھا۔

گویا یہ بات طے پاگئی تھی کہ ارشد اس شہر میں نہیں تھا۔

دانیال نے نرگس کے گھر کے چکر لگائے اور کسی نہ کسی طرح اس کے علم میں آگیا کہ نرگس گھر پر نہیں تھی اور اس کے والد شدید علیل تھے۔

پھر دانیال نے کالج کی انتظامیہ کے دو آدمیوں کی باتیں بھی سنیں۔ وہ نرگس اور ارشد ہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان دونوں ہی نے محسوس کیا تھا کہ ارشد کا باپ کچھ غصے میں بھی تھا۔

دانیال کو ایک ایسا خیال آیا کہ اس کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ارشد، نرگس کو بھگا لے گیا ہو۔

یہ ایک امکان بہرحال تھا کہ ارشد کے باپ کو بھی ایک ''معمولی لڑکی'' سے اپنے بیٹے کا رشتہ منظور نہ ہو اور اسی لیے ارشد، نرگس کو لے کر اس شہر سے بھاگ لیا ہو۔ اسی سبب سے باپ کو اپنے بیٹے پر غصہ ہو۔

دوسری طرف نرگس کے باپ کی علالت اس صدمے سے بھی ممکن تھی کہ ان کی بیٹی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے... انہوں نے اس کی رپورٹ شاید بدنامی کے ڈر سے نہ کروائی ہو۔

ان خیالات سے دانیال اپنے وجود میں ہی بکھر کر رہ گیا۔ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہوگیا۔ یہ شاید ایک معجزہ ہی تھا کہ اس نے فائنل ایئر کا امتحان پاس کرلیا۔

اس کے بعد چودہ سال گزر گئے لیکن دانیال، نرگس کو نہیں بھلا سکا۔

اور اب نرگس کچھ اس انداز سے سامنے آئی تھی کہ دانیال کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس سے پہلے جب اس نے بلائنڈ ماسٹر کے بارے میں جو رپورٹ پڑھی تھی، اس سے وہ جان چکا تھا کہ بلائنڈ ماسٹر کا اصل نام آفتاب ہے۔ رپورٹ میں اس کے ماضی کے بارے میں بھی کچھ باتیں تھیں۔ اس کا باپ افتخار احمد سرکاری ملازم اور ایک شریف آدمی تھا جس نے بیٹے کے بگڑتے انداز دیکھ کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔

اس رپورٹ سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ نرگس کا بھائی تھا اور اب نرگس جس انداز سے سامنے آئی تھی، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نوگو ایریا .... میں اپنے بھائی ہی سے ملنے گئی ہوگی۔

میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی نے دانیال کو چونکایا۔ دوسری طرف سے ڈی ایس پی دانش بول رہا تھا۔

''وہ اس علاقے سے نکل آئی ہے سر... آپ کی ہدایت کے مطابق اسے روک کر پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ بس تعاقب کرکے اس کا گھر دیکھ لیا گیا ہے۔ اس کے گھر پر نرگس زماں کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی ہے اور...''

''نرگس زماں؟'' دانیال چونک پڑا۔

''جی ہاں سر... کیا آپ اس نام سے واقف ہیں؟''

''نہیں۔'' دانیال نے جلدی سے کہا۔

''آپ چونکے تھے یہ نام سن کر... اس لیے خیال آیا مجھے کہ آپ شاید جانتے ہیں۔ آپ کے بھائی کا گھر بھی تو وہیں ہے نا جہاں آپ ٹھہرے ہیں۔''

''اور کچھ بھی بتا رہے تھے آپ؟'' دانیال نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

''جی ہاں، رجسٹریشن آفس سے رابطہ کیا گیا تھا۔ کار کے نمبر سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کار نرگس زماں ہی کے نام سے رجسٹرڈ ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی کچھ سوچ رہا ہوں، تھوڑی دیر بعد بات کروں گا آپ سے۔''

دانیال نے جواب کا انتظار کیے بغیر ریسیور رکھا اور کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے تصور میں وہ بنگلا تھا جو وہ اپنے بھائی کے گھر کے قریب دیکھ چکا تھا اور سوچ چکا تھا کہ

یہ شاید وہ نرگس زماں ہو جو ایک اخبار میں کالم لکھا کرتی ہے۔

لیکن اب اس کے دماغ میں یہ سوال تھا کہ وہ نرگس زماں کیوں ہے؟ اسے تو نرگس ارشد ہونا چاہیے تھا... کیا اس نے ارشد سے شادی نہیں کی تھی؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اور یہ زماں کون ہے؟

☆☆☆

بلائنڈ ماسٹر ایک کمرے میں بیٹھا، جوجی کو کچھ ہدایات دے رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ اس کی اسکرین پر نظر آنے والا نمبر اسی کے گروہ کے کسی آدمی کا تھا۔

''بولو۔'' بلائنڈ ماسٹر نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''کالا سانپ کا ایک بندہ اپنے علاقے میں آیا تھا ماسٹر۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''گولی ماردی اسے؟'' بلائنڈ ماسٹر نے بڑے سکون سے پوچھا۔

''نہیں ماسٹر۔'' جواب ملا۔ ''ادھر وہ آیا تھا تو دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے سینے پر چوڑا سفید کپڑا بندھا تھا اور اس پر لکھا تھا ''قاصد''... ہم نے اس کو پکڑ لیا۔''

''اوہ۔'' بلائنڈ ماسٹر کے منہ سے نکلا۔ ''قاصد؟''

''ہاں ماسٹر... کالا سانپ نے بھیجا اس کو، وہ آپ سے ملنے کو مانگتا۔ کالا سانپ کوئی پیغام بھیجا ہے۔''

بلائنڈ ماسٹر کی پیشانی پر ایک موٹی سلوٹ ابھر آئی۔

''اب آپ جیسا حکم دو ماسٹر۔'' آواز آئی۔

''تلاشی لی اس کی؟''

''وہ تو فٹافٹ لی تھی ماسٹر... کچھ نہیں اس کے پاس... چاقو بھی نہیں... سب جیب خالی۔''

''پیغام کیا لایا ہے؟''

''نہیں بتاتا۔ بولتا ہے، بس آپ کو بتائے گا۔ اس کو ٹھونکنے کا بولیں تو ٹھیک رہے گا۔ اس کا باپ بھی بولے گا۔''

بلائنڈ ماسٹر سوچنے لگا۔ جوجی غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اسے گزدر کے حوالے کردو۔'' بلائنڈ ماسٹر نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''گزدر لے آئے گا اسے میرے پاس۔''

پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔ موبائل بند کرکے اس نے جوجی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ دو۔''

جوجی اس الماری کی طرف گیا جس کے بارے میں بلائنڈ ماسٹر نے نرگس کو بتایا تھا کہ اس میں وہ موبائل فون رکھ دیے جاتے تھے جن پر وہ ایک مرتبہ کسی سے بات کرلیتا تھا۔

خود بلائنڈ ماسٹر اس الماری کی طرف گیا جن میں وہ موبائل فون رکھے تھے جنہیں اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اس سے دو موبائل فون نکال کر وہ اپنی جگہ پر آبیٹھا۔

جوجی بھی موبائل رکھ کر واپس اپنی جگہ آگیا تھا۔

بلائنڈ ماسٹر نے اسے بتایا کہ فون پر ملنے والی اطلاع کیا تھی۔

جوجی سوچتے ہوئے بولا۔ ''پہلے تو کبھی نہیں ہوا ایسا۔ وہ کیا پیغام بھیجے گا؟''

بلائنڈ ماسٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''مجھے یہ پوچھنے کا خیال نہیں رہا کہ وہ لوگ اس وقت کہاں تھے۔ گزدر کے پاس پہنچنے میں انہیں کتنی دیر لگے گی؟ گزدر تو اسے لے کر دس منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا۔''

بلائنڈ ماسٹر کے ٹھکانے تک پہنچنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستے کے لیے ''گیٹ نمبر ایک'' اور دوسرے راستے کے لیے ''گیٹ نمبر دو'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ ان دو راستوں کا علم اس کے گروہ کے صرف دو آدمیوں، جوجی اور گزدر کو تھا۔ گزدر ''گیٹ نمبر ایک'' سے واقف تھا۔ اسے ''گیٹ نمبر دو'' کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ ''نمبر دو'' کا علم جوجی کو تھا جس سے گزدر بے خبر تھا۔

''جب تک وہ نہیں آجاتا، ہم اپنی بات جاری رکھیں گے۔'' بلائنڈ ماسٹر نے جوجی سے کہا۔

ان دونوں میں پھر اسی موضوع پر باتیں ہونے لگیں جس موضوع پر فون آنے سے پہلے ہوتی رہی تھیں۔ اس گفتگو میں ''دانیال'' اور ''ایس پی دانیال'' کے الفاظ بار بار آرہے تھے۔

جو دو موبائل بلائنڈ ماسٹر الماری سے نکال کر لایا تھا، ان میں سے ایک فون کی گھنٹی پندرہ منٹ بعد بجی۔ وہ کال گزدر کی تھی۔ اس نے کہا۔

''ماسٹر! ابھی ایک آدمی کو...''

''مجھے معلوم ہے۔'' بلائنڈ ماسٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے لے کر آؤ۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دینا۔ وہ جسمانی طور پر کیسا ہے؟''

''آسانی سے قابو آجائے گا ماسٹر۔'' گزدر کی آواز آئی۔ ''ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہاتھ باندھ کر لانا۔'' بلائنڈ ماسٹر نے درشت لہجے میں کہا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر کے اسے ''آف'' کیا پھر جوجی کی طرف بڑھا دیا۔

جوجی وہ بھی الماری میں رکھ آیا۔ اب بلائنڈ ماسٹر کے کسی آدمی کی کال آتی تو دوسرے موبائل پر آتی جو بلائنڈ ماسٹر کے پاس رکھا ہوا تھا۔ اس سے رابطہ کرنے کے لیے اس کے آدمیوں کے پاس اس کے دس نمبرز ہوتے تھے۔ گروہ کا آدمی کسی ایک نمبر پر بلائنڈ ماسٹر سے رابطہ نہیں کر پاتا تھا تو دوسرا نمبر ملاتا تھا۔ دوسرا بھی نہ ملنے کی صورت میں تیسرا... چوتھا... اور پھر دسویں نمبر کی ضرورت بھی پیش آ سکتی تھی لیکن ایسا ہوتا نہیں تھا۔ بعد میں انہیں ایس ایم ایس کے ذریعے مزید نمبرز مل جاتے تھے۔

''آؤ۔'' بلائنڈ ماسٹر موبائل فون اٹھا کر کھڑا ہوا اور ایک دروازے کی طرف بڑھا۔

جوجی اس کے پیچھے چلا۔ ایک راہداری اور دو کمروں سے گزر کر بلائنڈ ماسٹر جہاں رکا، وہ ٹی وی لاؤنج تھا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہوگا کہ اس علاقے میں بلائنڈ ماسٹر کا ٹھکانا ایسی کشادہ اور سجی سجائی جگہ ہوگی۔

بلائنڈ ماسٹر نے بیٹھتے ہوئے ریموٹ اٹھایا اور بڑی اسکرین کا ٹی وی آن کیا۔ اس کے اشارے پر جوجی بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ بلائنڈ ماسٹر نے خاصے چینل تبدیل کیے اور پھر ٹی وی بند کر کے جوجی کی طرف متوجہ ہوا۔

''تو بس۔'' اس نے جوجی سے کہا۔ ''ایس پی دانیال کی ریکی شروع کروا دو۔ چند دن میں اس کے معمولات کا ریکارڈ بن جائے گا تو یہ طے کرنے میں آسانی ہوگی کہ اسے کس جگہ گولیوں کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر...''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک دروازے کے عقب میں آہٹیں سنائی دیں۔ بلائنڈ ماسٹر بات ادھوری چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہوا۔ جوجی کی نظر بھی ادھر اٹھ گئی۔ اس دروازے کو کھول کر گزدر ایک آدمی کو دھکیلتا ہوا اندر لایا۔ اس آدمی کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ سینے پر اب وہ سفید کپڑا نہیں تھا جس پر اطلاع کے مطابق ''قاصد'' لکھا ہوا تھا۔ وہ کپڑا بلائنڈ ماسٹر ہی کے آدمیوں نے ہٹایا ہوگا۔

بلائنڈ ماسٹر اپنے قیدی کو گھورنے لگا جس کی عمر تیس چالیس سال کے درمیان ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے سے جھنجلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

''میرے ساتھ یہ سلوک ٹھیک بات نہیں۔'' وہ بولا۔

''پیغام کیا لائے ہو؟'' بلائنڈ ماسٹر نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر سکون سے کہا۔ ''اچھا ہوگا کہ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔''

''میرا باس تم سے فون پر بات کرے گا۔ تم اس سے بات کر لو یا اپنا نمبر مجھے دے دو۔ وہ فون کرے گا تمہیں۔''

''میں کر لیتا ہوں اسے فون۔'' بلائنڈ ماسٹر نے کہا۔ ''مجھے اس کے وہ دونوں نمبر معلوم ہیں جو وہ استعمال کرتا ہے۔''

''تو اس کا رعب کیوں جماتے ہو مجھ پر۔'' منہ بنا کر کہا گیا۔ ''ہم بھی جانتے ہیں اس کا نمبر۔''

''اسے لے جاؤ۔'' بلائنڈ ماسٹر نے گزدر سے کہا۔ ''وہیں ڈال دو۔''

''مجھے واپس جانا ہے۔'' قیدی بپھرا۔

''واپس ہی بھیج رہا ہوں۔'' بلائنڈ ماسٹر نے کہا اور پھر آنکھوں سے گزدر کو اشارہ کیا۔

گزدر اس شخص کو دھکے دیتا ہوا ایک دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ اس ٹی وی لاؤنج میں تین دروازے تھے۔ ایک دروازے سے بلائنڈ ماسٹر اور جوجی وہاں آئے تھے۔ دوسرے سے کالا سانپ کے قاصد کو قیدی بنا کر لایا گیا تھا۔ اب گزدر اسے تیسرے دروازے سے لے جا رہا تھا۔

بلائنڈ ماسٹر کے الفاظ ''وہیں ڈال دو'' کا مطلب یہ تھا کہ قیدی کو لے جا کر تیزاب کے کنوئیں میں ڈال دو۔

جوجی ان الفاظ کے مطلب سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس تیزاب میں گوشت تو کیا، ہڈیاں بھی گل کر سیال بن جاتی تھیں۔

انسان کو ایسے تیزاب میں ڈالنا حد درجہ سفا کی تھی لیکن اس کا حکم صادر کرتے وقت بلائنڈ ماسٹر اتنا پُرسکون رہا تھا جیسے اس نے کسی معمولی بات کا حکم دیا ہو۔

گزدر جب اس آدمی کو لے گیا تو بلائنڈ ماسٹر موبائل فون پر نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات کرنا چاہتا ہوگا وہ مجھ سے۔''

جوجی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

بلائنڈ ماسٹر موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا، دو گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

''بلائنڈ ماسٹر۔'' بلائنڈ ماسٹر نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں تھی کہ میں تمہارے آدمی کو اپنا نمبر بتاتا۔ وہ

جا کر نمبر تمہیں دیتا پھر تم فون کرتے۔ میں نے سوچا، اتنی دیر کیوں لگائی جائے۔ میں خود تم کو فون کر لیتا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو۔ کیا بات ہے؟''

''تم کو ہوشیار کرنے کا سوچا میں نے۔'' آواز آئی۔ ''وہ جو ایس پی اشرف تھا، اس کی کھوپڑی کے پرزے... بیکار تھے۔ اس کی جگہ جو نیا آیا ہے، وہ مجھے خطرناک لگتا ہے۔''

''نیا آ گیا اس کی جگہ؟'' بلائنڈ ماسٹر نے جوجی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے لہجے سے حیرت کا اظہار کیا۔

''کل ہی آ گیا تھا۔ میرے کو ایسی اطلاع فوراً ملتی ہے۔ دانیال نام ہے اس کا۔''

''دانیال۔'' بلائنڈ ماسٹر نے دہرایا۔ ''لیکن تم مجھے یہ اطلاع دینے کے لیے بے چین کیوں ہو گئے؟''

''دیکھو ماسٹر... میں تمہارا دشمن... تم میرے دشمن... لیکن جو ہم دونوں کا دشمن... اس سے تو ہم دونوں کو مل کر لڑنا چاہیے۔''

''پہلے کبھی یہ بات نہیں سوچی تم نے۔''

''پہلے بات اور تھی۔ ایس پی اشرف بیکار آدمی تھا۔ یہ دانیال بہت خطرناک ہے۔ مجھے پتا چل گیا ہے اس کے بارے میں سب۔''

''خوب... تو بس یہی اطلاع دینا تھی؟''

''ایک بات اور۔'' آواز آئی۔ ''ابھی وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے۔ وردی بھی نہیں پہنی اس نے۔ سرکاری گاڑی بھی نہیں لی۔ اس کی ریکی تو چالو کرا دیا ہوں۔ اسے ختم کرنا ہوگا۔ کلاشنکوف کا ایک برسٹ... دوسری دنیا کی سیر کرے گا وہ۔''

''یہ تو بالکل ٹھیک ہوگا۔'' بلائنڈ ماسٹر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''ایک پرابلم اور ہو سکتا ہے نا... ریکی میں دو چار دن بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر اس نے ایک دو دن بعد ہی بلٹ پروف کار لے لیا تو پھر اس کو مارنا مشکل ہو جاوے گا۔''

''تم چاہتے ہو کہ اگر وہ بلٹ پروف لے تو اسے دھماکے سے اڑوا دوں؟''

''ہاں... بس اسی واسطے تم کو فون کرنے کو مانگتا تھا میں... اور کوئی دوسرا بات نہیں ہے۔''

''یہ کام ہو جائے گا اگر اس نے بلٹ پروف کار لی۔''

''ہم دونوں کی لڑائی تو رہے گی لیکن وہ ہم دونوں کا دشمن ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔''

''میرا آدمی کو تم واپس بھیج دو۔''

''اسے بھیج دیا ہے۔ وہ جا چکا ہے۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

''بے وقوف۔'' بلائنڈ ماسٹر فون بند کر کے بڑبڑایا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ جوجی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ سمجھ رہا تھا کہ میں ایس پی دانیال سے بے خبر ہوں۔'' پھر اس نے موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ آؤ۔ نیا اٹھا لاؤ۔ بالکل آگے رکھا ہے۔''

جوجی موبائل لے کر چلا گیا۔ بلائنڈ ماسٹر کچھ سوچنے لگا۔ جب جوجی دوسرا موبائل لے کر آیا، اسی وقت گزدر نے بھی قدم رکھا۔

''ڈال آئے؟'' بلائنڈ ماسٹر نے اس سے پوچھا۔

''یس ماسٹر... میں اب جاؤں؟''

بلائنڈ ماسٹر نے سر کی جنبش سے اجازت دی۔ گزدر اسی دروازے سے چلا گیا جس دروازے سے کالا سانپ کے آدمی کو لے کر آیا تھا۔

''یہ کالا سانپ خود کو بہت پہنچا ہوا سمجھتا ہے۔'' بلائنڈ ماسٹر نے جوجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟ دانیال کی کچھ بات تھی؟''

بلائنڈ ماسٹر نے اسے مختصر طور پر بتایا کہ کالا سانپ سے اس کی کیا گفتگو ہوئی تھی۔

جوجی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ہم ابھی یہی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''اس کی معلومات کے ذرائع کیا ہو سکتے ہیں ماسٹر؟''

''ڈی ایس پی دانش کا ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل اسی کا آدمی ہے۔ اسی لیے کالا سانپ کی گرفتاری کے لیے ایس پی اشرف نے جو چھاپے مارے تھے، وہ ناکام رہے تھے۔ کالا سانپ کو اس ریڈ کی اطلاع پہلے سے مل جاتی ہے اور وہ اپنے علاقے سے غائب ہو جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ بہت سینہ پھلا کر چلتا ہے۔ میں اگر چاہوں تو کسی وقت بھی اس سانپ کا پھن رگڑ سکتا ہوں۔''

''تو پھر کر ڈالیں نا یہ کام ماسٹر... سارا علاقہ ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہمیں۔ اس کا ختم ہو جانا ہمارے حق میں نہیں ہے۔ ابھی تو پولیس کی توجہ دو طرف بٹی

ہوئی ہے۔ پھر وہ یک سوئی سے ہماری طرف ہی متوجہ رہیں گے۔"

جوجی نے انہامی انداز میں سر ہلایا پھر بولا۔ "ہم نے ابھی جو منصوبہ بندی کی تھی دانیال کے معاملے میں۔۔۔"

"اس میں اب کچھ تبدیلی ہوگی۔ کالا سانپ دانیال کی ریکی شروع کروا چکا ہے۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس کے بجائے اب ریکی کرنے والوں پر نظر رکھنا ہو گی۔ دانیال کو دھماکے سے اڑانے کا کام تو ہمیں ہی کرنا ہے۔ وہ کل بلٹ پروف گاڑی لے لے گا۔"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا ماسٹر؟" جوجی بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

بلائنڈ ماسٹر نے جواب دینے کے بجائے موبائل فون اٹھایا اور کالا سانپ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے وہی آواز سنائی دی جس سے بلائنڈ ماسٹر گفتگو کر چکا تھا۔

"بلائنڈ ماسٹر بول رہا ہوں۔"

"کیا کوئی بات رہ گئی تھی؟"

"میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تم نے جس آدمی کو میرے پاس بھیجا تھا، وہ۔۔۔"

"وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے لیکن آجائے گا۔ ٹائم تو لگتا ہے نا۔۔۔ تم کو اس کی کیا بات کرنا ہے؟"

"وہ اب تم تک نہیں پہنچے گا۔"

"کیوں؟" چونک کر پوچھا گیا۔

"اس احمق کو یہاں کے راستوں کا علم نہیں تھا اور میرا کوئی آدمی اسے چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ وہ بے وقوف ایک ایسی گلی میں داخل ہو گیا جو علاقے سے باہر کی سڑک تک جاتی ہے۔ ادھر سے ایک پولیس موبائل گزر رہی تھی۔ وہ پاگل اس موبائل کو دیکھ کر بھاگا تو پولیس نے اس سے رکنے کے لیے کہا اور جب وہ نہیں رکا تو پولیس نے اس پر گولی چلا دی۔"

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی غرایا ہو۔

بلائنڈ ماسٹر نے کہا۔ "ابھی میرے آدمیوں نے یہ اطلاع دی ہے مجھے۔ تمہارا آدمی گولی کھا کر گر پڑا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اٹھایا اور موبائل میں ڈال کر لے گئے۔"

"وہ زندہ تھا یا۔۔۔"

"میرے آدمیوں نے یہ سب کچھ دور سے دیکھا تھا۔ انہیں معلوم نہیں کہ اسے گولی کہاں لگی تھی اور وہ زندہ تھا یا مر گیا۔"

دوسری طرف پھر غراہٹ سی ہوئی پھر جھنجلاہٹ یا غصے میں رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

بلائنڈ ماسٹر فون بند کر کے ہنسا۔ "اسے مطمئن کرنا ضروری تھا ورنہ وہ سمجھتا کہ میں نے اس کے آدمی کو چھوڑا ہی نہیں یا مروا دیا۔"

"اسے ختم تو آپ نے اسی لیے کروایا ہے کہ اس نے یہ جگہ دیکھ لی تھی۔"

"ہاں۔"

"مگر ہم اسے کہہ دیتے تو وہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لاتا۔"

"پٹی بندھی ہونے کی صورت میں بھی کچھ اندازہ تو کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسے کس سمت میں لے جایا گیا تھا، کتنی دور لے جایا گیا تھا۔ پھر اسے زینے طے کر کے نیچے جانا پڑا تھا اور کچھ دور جانے کے بعد پھر کسی زینے سے اوپر چڑھنا پڑا تھا۔" بلائنڈ ماسٹر نے وضاحت سے بتایا اور کھڑا ہو گیا۔ "دشمن اتنا بھی اندازہ لگائے تو مناسب نہیں۔"

جوجی نے اثبات میں سر ہلایا۔

بلائنڈ ماسٹر جوجی کے ساتھ اسی کمرے میں آگیا جہاں وہ پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم اب جاؤ۔" بلائنڈ ماسٹر نے جوجی سے کہا۔ "اور جو باتیں ہوئی ہیں، ان کے مطابق اپنے آدمیوں کو ہدایات دے دو۔"

جوجی اسی دروازے سے چلا گیا جہاں سے وہ نرگس زماں کو لایا تھا۔

بلائنڈ ماسٹر نے موبائل فون اس الماری میں رکھا جس میں استعمال شدہ موبائل فون ڈھیر تھے۔ پھر اس نے دوسری الماری سے نیا موبائل فون نکالا۔

☆☆☆

آٹھ بجے تھے جب دانیال گھر پہنچا۔ اسی وقت وہ علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ دانیال کے علم میں آچکا تھا کہ اس وقت اس علاقے میں ایک گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے۔

شرجیل کے گھر میں یو پی ایس تھا جس سے ضرورت کے مطابق روشنی کر لی جاتی تھی۔ کال بیل بھی یو پی ایس کے ذریعے کام کرتی تھی۔

دانیال نے اپنی والدہ کے ساتھ چائے پی۔ شرجیل ان کے ساتھ نہیں تھا۔ والدہ نے بتایا کہ شرجیل اس وقت

اوپر ٹیرس پر جا کے چہل قدمی کیا کرتا ہے۔ چہل قدمی کر کے نیچے آتا تو دونوں ماں بیٹے کھانے کی میز پر پہنچ جاتے۔ گزشتہ روز سے کھانے کی میز پر پہنچنے والے تیسرے فرد، دانیال کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دانیال نے اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں کر کے چائے کا آخری گھونٹ لے کر والدہ سے پوچھا۔

"سامنے کے گھروں کی رو میں کوئی عورت نرگس زماں بھی رہتی ہے؟"

"مجھے تو پڑوسیوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم بیٹا۔۔۔ گھٹنوں میں تکلیف کی وجہ سے کہیں نکلتی ہی نہیں ہوں گھر سے۔ یہی بہت ہے کہ گھر میں چل پھر لیتی ہوں۔ بس ایک خاتون کبھی مجھ سے ملنے آجاتی ہیں، برابر کے گھر سے۔"

"شرجیل کو ضرور معلوم ہوگا۔" دانیال کھڑا ہوا۔

"ہو سکتا ہے، اسی سے پوچھنا۔ کیا پولیس کا کچھ معاملہ ہے؟"

"کچھ ایسا ہی ہے امی۔" دانیال نے جواب دیا اور ٹیرس کی طرف بڑھ گیا۔

شرجیل ٹیرس پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے دانیال کو سلام کیا۔

دانیال نے جواب دے کر کہا۔ "کیا روز اسی وقت لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے؟"

"ٹائم بدلتا رہتا ہے بھائی جان۔" شرجیل نے جواب دیا۔ "ایک ہفتے سے تو یہی ٹائم ہے جو آپ کل سے دیکھ رہے ہیں۔"

"ذرا ادھر آؤ۔" دانیال اس طرف بڑھا جہاں سے سڑک اور سامنے کے گھروں کو دیکھا جا سکتا تھا۔

جنریٹرز یا یو پی ایس وہاں بھی گھروں میں تھے، اس لیے تھوڑی بہت روشنی تھی لیکن نرگس زماں کا بنگلا بالکل تاریک نظر آرہا تھا۔

"آس پاس جو لوگ رہتے ہیں، ان کے بارے میں معلومات ہیں تمہیں؟" دانیال نے شرجیل سے پوچھا۔

"دراصل ایک پولیس آفیسر ہونے کی وجہ سے میں جہاں رہتا ہوں، وہاں آس پاس رہنے والوں کے بارے میں واقفیت رکھنے کی عادت ہے مجھے۔"

"میں کچھ لوگوں کے بارے میں تو جانتا ہوں بھائی جان، سب کے بارے میں نہیں جانتا۔"

"جو جانتے ہو، وہی بتاؤ۔" دانیال ظاہر نہیں کرنا

اپنی ماں سے تم خود بات کرو۔ مجھے تو وہ بدکلام غبی اور جاہل کہتی ہے!

چاہتا تھا کہ اسے دراصل نرگس زماں کے گھر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔

شرجیل نے سامنے کے تین گھروں کے بارے میں جزوی یا مکمل معلومات کا اظہار کرنے کے بعد کہا۔ "وہ بنگلا جو بالکل تاریک پڑا ہے، اس کے بارے میں ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے آپ ضرور سوچیں گے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" دانیال اسی گھر کے بارے میں معلومات چاہتا تھا۔

"اس گھر میں ایک عورت اپنے بارہ چودہ سال کے بیٹے کے ساتھ رہتی ہے۔" شرجیل نے بتایا۔ "پھاٹک پر نرگس زماں کے نام کی پلیٹ لگی ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہو گا نا بھائی جان کہ اس عورت ہی کا نام نرگس ہوگا۔ لڑکا شاید بیٹا ہوگا۔ زماں اس کے شوہر کا نام ہو سکتا ہے۔ یہاں پڑوسیوں میں میرے کسی حد تک بے تکلفانہ تعلقات صرف ایک صاحب سے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تین سال سے اس بنگلے میں مقیم ہے۔ عورت خوب صورت ہے۔ آس پاس کسی سے اس کا ملنا جلنا نہیں ہے۔ جب وہ آئی تھی تو دو ایک خواتین سے اس کا تھوڑا بہت میل جول ہو گیا تھا لیکن جب ایک خاص بات سامنے آئی تو ان خواتین نے بھی اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔"

"ایسی کیا خاص بات ہو گئی؟"

"جن خواتین سے اس کا شروع میں میل جول ہوا تھا، ان کو اس نے بتایا تھا کہ وہ بیوہ ہے۔ ایسی صورت میں اس کا میل جول صرف اعزا یا قریبی واقف کاروں سے ہونا چاہیے اور وہ بھی کھلے عام لیکن ایسا نہیں ہے۔ جو بھی اس سے

ملنے آتا ہے، بہت چوری چھپے آتا ہے۔"

"چوری چھپے؟ کیسے؟"

"جب علاقہ تاریک ہو جاتا ہے، میرا مطلب ہے جب لوڈشیڈنگ شروع ہوتی ہے تو وہ اس گلی سے نکلتا ہے۔" شرجیل نے اس گلی کی طرف اشارہ کیا جو نرگس کے بنگلے کے برابر میں تھی۔ "وہاں سے وہ بہت تیزی سے چلتا ہوا اس عورت کے بنگلے کے پھاٹک پر پہنچتا ہے اور پھاٹک کھول کر اندر چلا جاتا ہے۔ اس وقت پھاٹک اندر سے بند نہیں ہوتا۔"

"تم ایسا ہوتے ہوئے خود دیکھ چکے ہو یا کسی نے تمہیں بتایا ہے؟" دانیال کو یہ جان کر تکلیف ہوئی تھی کہ نرگس کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی۔

شرجیل بولا۔ "جن صاحب سے میرے کچھ بے تکلفانہ تعلقات ہیں انہوں نے بتایا تھا مجھے۔ میں یہاں ٹہلنے کے لیے روز ہی آتا ہوں مگر ان صاحب کے بیان کی تصدیق کے لیے میں ایک شام اس وقت ٹیرس پر آیا جب لوڈشیڈنگ کا وقت قریب تھا۔ جیسے ہی لائٹ غائب ہوئی، میں نے وہی کچھ دیکھا جو مجھے بتایا گیا تھا۔"

دانیال نے کچھ رک کر پوچھا۔ "کیا روزانہ ایسا ہوتا ہے؟"

"نہیں۔" شرجیل نے جواب دیا۔ "پندرہ بیس دن یا مہینا بھر میں ایسا ہوتا ہے۔ کبھی ایک ہفتے کا وقفہ ہوتا ہے۔"

"آنے والے مختلف لوگ ہیں؟"

"اس بارے میں کہنا مشکل ہے بھائی جان... اسے اتفاق کہیں یا کچھ اور... ہماری گلی میں آٹومیٹک جنریٹر یا آٹومیٹک یو پی ایس دو ایک ہی ہیں۔ اسی لیے لوڈشیڈنگ کے بعد یو پی ایس یا جنریٹرز چلنے میں پندرہ بیس سیکنڈ یا آدھا منٹ لگ جاتا ہے۔ اتنی دیر کے لیے بالکل تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس بنگلے میں جانے والا شخص بس سائے کی طرح نظر آتا ہے۔"

"جسامت کا فرق تو محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں اگر مسلسل نظر رکھی جائے تو جسامت کے فرق کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن میں نے اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آج سے پہلے میں نے صرف دو مرتبہ ایسا ہوتے دیکھا تھا یا آج دیکھا ہے۔"

"آج گیا ہے کوئی اس بنگلے میں؟"

"جی ہاں۔ ابھی لوڈشیڈنگ شروع ہوئی تو میں نے دیکھا۔"

"وہ جائے گا کس وقت؟"

"یہ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا لیکن جن صاحب نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا، انہی کے بیان کے مطابق دوبارہ جب لوڈشیڈنگ ہوتی ہے، اسی وقت وہ بنگلے سے نکل کر گلی میں جاتا ہے۔"

"گویا سات گھنٹے اس بنگلے میں گزارنے کے بعد؟"

"جی۔"

"لوڈشیڈنگ کے اوقات شروع سے یہی ہیں؟"

"جی نہیں۔ سال چھ ماہ میں تبدیلی تو آتی ہے لیکن یہ طے ہے کہ دن میں دو مرتبہ اور رات کو دو مرتبہ لوڈشیڈنگ ہوتی ہے۔ جو بھی اس گھر میں آتا ہے، وہ لوڈشیڈنگ ہی کے وقت آتا ہے اور دوسری لوڈشیڈنگ کے وقت جاتا ہے۔"

"یہ گلی کہاں ختم ہوتی ہے؟" دانیال کے دماغ میں سوالات مسلسل امنڈ رہے تھے۔

"دو قطاریں ہیں بنگلوں کی، اس کے بعد پھر ایسی ہی پکی سڑک ہے جیسی یہ ہماری ہے۔"

"اس عورت کے گھر میں اندھیرا ہی رہتا ہے؟"

"کم از کم باہر تو مکمل اندھیرا ہی رہتا ہے۔ اندر کے کمروں میں تو روشنی کا کوئی بندوبست لازمی ہوگا۔"

"ابھی جو آیا ہے، وہ اسی وقت جائے گا جب دوبارہ لوڈشیڈنگ ہوگی؟"

"یہ تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن معمول یہی رہا ہے۔"

"ہوں۔" دانیال خاموش ہو گیا۔

شرجیل ہنسا۔ "پولیس آفیسر کی حیثیت سے آپ متجسس تو ہو گئے ہوں گے۔"

"قدرتی بات ہے کیونکہ یہ گھر اسی گلی میں ہے جہاں میں آ کر رہا ہوں، ورنہ سارے ہی بڑے شہروں میں ایسے گھر ہوتے ہیں جہاں لوگوں کی آمد و رفت چوری چھپے رہتی ہے۔"

"کیا آپ اس عورت کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے؟"

"علاقائی ایس ایچ او دیکھتا ہے اس قسم کے معاملات۔" دانیال نے سرسری انداز اپنایا۔ "تم سے اتنی پوچھ گچھ میں نے صرف اس لیے کر ڈالی کہ عادت ہے اس کی۔ جہاں میں رہتا ہوں، وہاں کے ماحول سے باخبر رہنا میرے پیشے کا تقاضا ہے۔"

پھر دانیال نے نرگس اور اس کے گھر کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد شرجیل کو ٹیرس پر ٹہلتا چھوڑ کر نیچے آ گیا۔ اس کی والدہ نے پوچھا۔

"معلوم ہوا کچھ شرجیل سے؟"

"جی ہاں لیکن آپ شرجیل کو نہ بتایئے گا کہ میں نے آپ سے اس عورت کے بارے میں پوچھا تھا۔ اسے تو عادت ہے بال کی کھال نکالنے کی۔ مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دے گا وہ۔" دانیال ہنسا۔

"کیا تمہارے محکمے کا کوئی معاملہ ہے اس عورت سے؟"

"جی ہاں، ہے تو میرے ہی محکمے کا معاملہ لیکن وہ علاقے کا ایس ایچ او دیکھے گا۔ میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا۔ اچھا میں ذرا کپڑے تبدیل کر آؤں۔" دانیال گھر میں آتے ہی والدہ کے ساتھ چائے پینے بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں، بدل آؤ۔" والدہ نے کہا۔ "ذرا دیر میں شرجیل بھی اتر آئے گا ٹیرس سے... پھر کھانا کھائیں گے۔"

"جی میں آتا ہوں۔" دانیال کہتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔

ماں سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے دماغ میں ہلچل مچی رہی تھی۔ جو کچھ اسے معلوم ہوا تھا، اس سے نرگس کے بارے میں بظاہر جو کچھ سمجھ میں آ رہا تھا، اس سے دانیال کو شدید اذیت پہنچ رہی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر دانیال نے اسی دماغی ہلچل کے عالم میں موبائل پر ڈی ایس پی دانش سے رابطہ کیا۔

"آپ کی یہ کال اچانک ہے میرے لیے۔" ڈی ایس پی دانش چھوٹتے ہی بولا۔ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے سر؟"

"ابھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خاص ہے یا نہیں۔" دانیال نے کہا۔ "آپ فوراً دو معتمد آدمیوں کو نرگس زماں کے گھر کی نگرانی کے لیے بھیجیے۔ نرگس کے گھر کے برابر میں جو بنگلا ہے، اس کے بعد گلی ہے۔ وہ گلی جس سڑک پر ختم ہوتی ہے، ایک آدمی وہاں ہونا چاہیے اور ایک نرگس کے گھر کے سامنے۔ دونوں حتی الامکان خود کو پوشیدہ رکھیں۔ نرگس کے گھر میں اس وقت ایک شخص ہے۔ اس پر نظر رکھنی ہے۔ ابھی تو یہ علاقہ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے تاریکی میں ہے لیکن جب تک آپ کے آدمی یہاں پہنچیں گے لوڈشیڈنگ ختم ہو چکی ہوگی۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟"

"ہمہ تن گوش ہوں سر! آپ کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں ہے۔"

"اچھا۔" دانیال نے کہا۔ "دوبارہ لوڈشیڈنگ تین بجے شروع ہوگی۔ امکان ہے کہ وہ شخص لوڈشیڈنگ شروع ہوتے ہی بنگلے سے نکل کر تیزی سے گلی میں جائے گا۔ گلی جس سڑک پر ختم ہوتی ہے، وہاں امکان ہے کہ اس کی کار کھڑی ہوگی۔ وہاں اس وقت ٹیکسی و یکسی تو مل نہیں سکتی، کار ہی کا امکان ہے۔ آپ کے آدمی کا کام صرف یہ ہوگا کہ اس کار کا نمبر نوٹ کر لے۔ میں اس کے تعاقب کے لیے بھی کہتا لیکن اس وقت اتنا سناٹا ہوگا کہ اسے فوراً اپنے تعاقب کا علم ہو جائے گا۔ کار کا نمبر معلوم ہونے کے بعد کل صبح رجسٹریشن آفس سے اس نمبر کی کار کے مالک کا نام معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کل میں آؤں تو رپورٹ دے دیجیے گا۔ ہاں اگر رات ہی کو کسی قسم کی کوئی غیر معمولی بات ہو تو مجھے اسی وقت کال کر کے بتایئے گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

دانیال نے رابطہ منقطع کرنے کے بعد کپڑے تبدیل کیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی والدہ اور شرجیل کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ انہی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا رہا۔ پھر دس بجے کی خبریں سننے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ دماغ میں نرگس کے بارے میں خیالات مسلسل چکراتے رہے۔ وہ خیالات ماضی کے بھی تھے اور حال کے بھی۔

بلائنڈ ماسٹر سے نرگس کا تعلق آشکار ہونے پر اس کے دماغ میں اتنی ہلچل نہیں مچی تھی جتنی شرجیل سے حاصل کردہ معلومات کی وجہ سے مچی۔

نیند اس کی آنکھوں سے بالکل اڑی ہوئی تھی۔ ایک بجے بھی وہ جاگ ہی رہا تھا جب ڈور انٹرکام کی مدھم آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ڈور انٹرکام لاؤنج میں تھا جس کا تعلق چوکیدار کی کوٹھری سے تھا۔ کال بیل بھی اس کی کوٹھری میں تھی۔ کسی کی آمد پر وہ ڈور انٹرکام سے ہی گھر میں اطلاع دیتا تھا۔

دانیال چونک کر بستر سے اٹھا۔ "اس وقت کون آ گیا؟" اس کے دماغ میں سوال گونجا۔

کچھ وقفے سے انٹرکام کی آواز پھر آئی۔

'شرجیل ہی کا کوئی جاننے والا ہو سکتا ہے۔' دانیال نے سوچا۔

اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دانیال کے اندازے کے مطابق وہ آواز شرجیل کے کمرے کے دروازے کی تھی۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی جو لاؤنج کی طرف جارہی تھی۔ وہ آہٹ بھی دانیال نے پہچان لی۔ وہ شرجیل ہی کی تھی۔ معدوم ہوجانے کے بعد آہٹ پھر سنائی دی جو قریب آرہی تھی۔ وہ دانیال ہی کے کمرے کے دروازے پر آکر رکی۔

''بھائی جان۔'' شرجیل کی مدھم آواز سنائی دی اور دروازہ بھی آہستہ سے کھٹکھٹایا گیا۔

اب دانیال تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔

''کیا بات ہے شرجیل؟'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''خیریت؟ کون آیا ہے؟''

''کوئی آپ سے ہی ملنا چاہتا ہے بھائی جان۔''

''مجھ سے؟'' دانیال چونکا۔

''جی ہاں، چوکیدار یہی بتارہا ہے۔ کال بیل کی آواز سن کر وہ پھاٹک پر جاکے پوچھتا ہے کہ کون ہے، پھر انٹرکام پر اطلاع دیتا ہے۔''

لاؤنج میں انٹرکام کا ریسیور لٹکا ہوا تھا۔ شرجیل نے وہ پکڑ کر اپنے کان سے لگایا۔ ''لو بھائی جان کو بتاؤ اسماعیل۔''

چوکیدار کا نام اسماعیل تھا۔

دانیال نے شرجیل سے ریسیور لے کر اپنے کان سے لگایا۔ ''اسماعیل! جو آیا ہے اس نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''جی نہیں صاب... بول رہا تھا کہ آپ اس کا نام نہیں جانتے۔''

دانیال کے چہرے پر فکرمندی کا تاثر بڑھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''وہ کار میں آیا ہے؟''

''یہ تو پتا نہیں صاب۔''

''اچھا ذرا ہولڈ کرو۔'' دانیال نے کہا پھر ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر شرجیل سے بولا۔ ''تم چوکیدار کو سمجھا دو کہ میں ابھی باہر آرہا ہوں۔ جب میں پھاٹک کے بالکل قریب پہنچ جاؤں، وہ اسی وقت پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولے۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ اور جو کچھ بھی دیکھے، وہ بھی کسی کو ہرگز نہیں بتائے۔''

''کیا معاملہ ہے بھائی جان۔'' شرجیل ریسیور لیتے ہوئے پریشان نظر آیا۔

''دیکھتا ہوں، کون آیا ہے۔ تم چوکیدار کو سمجھا دو۔''

جواب دے کر دانیال تقریباً دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اپنا ریوالور نکال کر اس نے کرسی پر پڑے ہوئے گاؤن کی جیب میں ڈالا، موبائل اٹھا کر دوسری جیب میں ڈالا اور گاؤن پہنتا ہوا کمرے سے نکلا۔ شرجیل انٹرکام بند کر چکا تھا۔

''تم باہر مت نکلنا۔'' دانیال اس سے کہتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''کوئی خطرہ ہے کیا بھائی جان؟'' شرجیل کی پریشانی بڑھ چکی تھی۔

''خطرہ بھی ہوگا تو میں اسے نمٹنا جانتا ہوں۔ تم باہر مت نکلنا۔ اور ہاں' برآمدے اور پھاٹک کی لائٹ آف کر دو۔''

''میں دروازے کی جھری بنا کر دیکھتا رہوں گا۔''

''گھبراؤ نہیں شرجیل! سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

شرجیل نے دروازے کے قریب لگے ہوئے سوئچ بورڈ کے دو بٹن ''آف'' کردیے۔

دانیال باہر نکل کر تیزی سے لیکن محتاط انداز میں پھاٹک کی طرف بڑھا۔ وہاں مکمل تاریکی اب بھی نہیں تھی کیونکہ آس پاس کے گھروں میں روشنی تھی۔

چوکیدار پھاٹک کے قریب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ وہ بھی کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔

دانیال نے پھاٹک کے بالکل قریب کھڑے ہوئے چوکیدار کو اشارہ کیا۔ اشارہ سمجھ کر چوکیدار نے ذیلی دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھتے ہوئے، باہر کھڑے آدمی سے کہا۔ ''صاب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' باہر سے آواز آئی۔

چوکیدار نے کنڈی ہٹا کر ذیلی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آئیں۔''

دانیال اب ریوالور اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ جیسے ہی باہر کھڑا ہوا شخص اندر آیا، دانیال نے تیزی سے اس کے قریب پہنچ کر ریوالور اس کی گردن سے لگا دیا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھا دو۔''

آنے والے نے جلدی سے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

دانیال نے ٹانگ مار کر ذیلی دروازہ بند کیا اور ایک ہاتھ سے آنے والے کا سارا جسم ٹٹولنے لگا۔

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے صاحب!'' آنے والے نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

چوکیدار پھاٹک کے ذیلی دروازے کی کنڈی لگا چکا تھا۔

دانیال نے خود بھی اطمینان کرلیا کہ آنے والا مسلح نہیں تھا۔

''کون ہو تم؟'' دانیال نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام قادر ہے صاحب۔'' آنے والے اجنبی نے کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''بہت سی بات بتانا ہے آپ کو۔''

''چلو۔'' دانیال نے اسے برآمدے کی طرف دھکیلا۔ ''اب تم اپنے ہاتھ نیچے کرسکتے ہو۔''

اجنبی نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ نیچے کرلیے۔

برآمدے میں پہنچ کر دانیال نے دیکھا کہ دروازے میں جھری تھی۔ ''دروازہ کھول دو شرجیل۔''

شرجیل نے دروازہ کھول دیا۔ دانیال نے اجنبی کو پھر دھکیلا۔ شرجیل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں ایسی صورتِ حال نہیں دیکھی ہوگی۔

دانیال نے اجنبی کو لاؤنج میں بٹھایا۔ اب روشنی میں وہ اس کا باقاعدہ جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کی عمر چالیس بیالیس سال ہوسکتی تھی۔ رنگ سانولا اور نقش و نگار معمولی تھے۔

''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' دانیال نے سختی سے پوچھا۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر شرجیل کی طرف دیکھا۔ ''امی تو نہیں اٹھیں؟''

''نہیں بھائی جان۔''

دانیال پھر اجنبی کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں کالا سانپ کے گینگ کا آدمی ہوں ایس پی صاحب۔'' قادر کے جواب نے دانیال کو چونکا دیا۔

''مجھے کیسے جانتے ہو؟'' وہ تیزی سے بولا۔

''گینگ کے سب لوگوں کو پتا لگ چکا ہے صاحب آپ کا... آپ کے لیے خطرہ ہے۔ وہ آپ کا ریکی کرارہا ہے۔ موقع دیکھ کر آپ کو ختم کرانے کا سوچا ہے اس نے۔''

''تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو جبکہ تمہارا تعلق اسی سے ہے؟''

''میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں صاحب۔'' قادر آبدیدہ ہوگیا۔ ''اس کے ایک آدمی نے میرے جوان بیٹے کو گولی ماردی صاحب! جان سے ختم کردیا اسے۔ میں خود تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ابھی میں بہت چھپ کر آیا ہوں آپ کے پاس۔ اسے پتا لگ جائے تو وہ میرا سارا گھر ہی برباد کردے گا۔ میری بیوی اور میرے دو بچوں کو بھی مروا دے گا۔''

''میں تمہاری باتوں پر کیوں یقین کروں؟''

''کل ثبوت مل جائے گا صاحب آپ کو۔ میں بالکل سچ بول رہا ہوں۔ وہ آپ کا ریکی کرارہا ہے۔ دو کاریں آپ کے پیچھے لگی رہیں گی۔ ایک کار نیلے رنگ کی ہے... کرولا... دوسری بھورے رنگ کی ہے... ہنڈا... دونوں کے نمبر بھی بتا سکتا ہوں آپ کو۔''

دانیال کے دماغ میں کئی سوال چکرا رہے تھے لیکن اس نے وہ سوال کرنے سے پہلے قادر کے بتائے ہوئے نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کیے۔ اس وقت اس نے گھڑی میں وقت بھی دیکھا۔ لوڈشیڈنگ شروع ہونے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔

☆☆☆

نرگس اپنے بنگلے کے بیرونی دروازے سے نکل کر پھاٹک تک گئی۔ ویران سڑک کا جائزہ لینے کے بعد وہ واپس مڑی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جو اس نے جلائی نہیں تھی۔ ابھی لوڈشیڈنگ شروع نہیں ہوئی تھی لیکن بنگلے کا احاطہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بنگلے کی کسی کھڑکی میں بھی روشنی نہیں تھی۔ نرگس بنگلے میں داخل ہوئی۔ وہاں بھی تاریکی تھی۔ نرگس نے دروازہ بند کرکے ٹارچ روشن کی۔ اس کی روشنی

میں وہ اپنی خواب گاہ تک گئی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے ٹارچ بجھا دی۔ کمرے میں تیز برقی روشنی تھی۔

”بس اب چلو۔ تین منٹ رہ گئے ہیں۔“ نرگس نے براؤن سوٹ والے سے کہا جو سگریٹ کے کش لیتا ہوا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا کر براؤن سوٹ والا دروازے کی طرف بڑھا۔ نرگس وہیں کھڑی تھی۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ نرگس نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے ٹارچ روشن کی۔ وہ دونوں تیزی سے بیرونی دروازے پر پہنچے۔ نرگس نے ٹارچ بجھا کر دروازہ کھولا۔ وہ دونوں باہر نکلے اور تاریکی ہی میں تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھے۔

آس پاس کے سبھی بنگلوں کے پھاٹک روشن تھے۔ کھڑکیوں میں بہت کم ایسی تھیں جو روشن ہوں۔ سوتے وقت لوگ زیادہ تر لائٹس بجھا ہی دیتے ہیں۔

وہ دونوں پھاٹک کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

”امان کے امتحانات اگلے ماہ شروع ہو رہے ہیں نا؟“ براؤن سوٹ والے نے پوچھا۔

نرگس دھیرے سے ہنسی۔ ”اب چلتے وقت خیال آیا ہے۔“

براؤن سوٹ والا جواباً کچھ کہتا مگر اسی وقت سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

”نکلو۔“ نرگس نے جلدی سے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا۔

براؤن سوٹ والے نے بھی باہر نکلنے میں تیزی دکھائی۔ اب نرگس نے ذیلی دروازہ بند کیا اور واپس مڑی۔

اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ کمرے میں اس وقت بھی روشنی تھی۔ آٹومیٹک یو پی ایس لائٹ جاتے ہی فعال ہو جاتا تھا لیکن ان اوقات میں اس سے صرف نرگس اور اس کے بیٹے امان کے کمرے میں روشنی ہوتی تھی۔ امان کے کمرے میں اس وقت صرف نائٹ بلب جلتا تھا۔

نرگس کچھ دیر تک کسی سوچ میں ڈوبی رہی پھر اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ شاور لے کر اس نے تولیے سے جسم خشک کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ساڑی میں ملبوس اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی اپنا کمپیوٹر آن کرنے کے بعد میز پر رکھا ہوا ایک کاغذ پڑھ رہی تھی۔ اس کاغذ پر ان خبروں کے نوٹس تھے جن کا تعلق شہر کے ان علاقوں سے تھا جو نوگوایریا تھے۔ ان علاقوں سے متعلق پولیس اور سیاست دانوں کے بیانات کے نوٹس بھی تھے۔ وہ نرگس نے گزشتہ شام لکھے تھے۔ انہی کی روشنی میں اسے اخبار کے لیے کالم لکھنا تھا۔ نوٹس کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد اس نے کاغذ ایک طرف رکھا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ کی بورڈ پر پہنچ گئے۔ اس کی انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ رک کر سوچنے لگتی۔

دو گھنٹے میں مضمون مکمل ہو گیا۔ اب اس نے مضمون پر نظر ثانی شروع کی۔ دس منٹ گزرے تھے کہ ڈورائٹر کام کی آواز آئی۔

نرگس سمجھ گئی کہ اس کا ملازم اور ملازمہ ہوں گے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ بیوی تو گھر کا کام کاج کر کے دوپہر کے بعد اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ اس کا شوہر گھر کا سودا سلف لانے کے علاوہ مالی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ شام کو وہ بھی اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ پھر دونوں میاں بیوی صبح چھ ساڑھے چھ بجے کے درمیان آجاتے تھے۔

نرگس نے جا کر پھاٹک کھولا اور وہ دونوں اندر آگئے۔

”میں ابھی جا کر امان کو اٹھاتی ہوں۔“ نرگس نے ملازمہ سے کہا۔ ”پندرہ بیس منٹ بعد تم ناشتا تیار کرنا۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاب۔“

نرگس نے اندر آ کر امان کے کمرے کا رخ کیا۔ اسے جگایا۔ جلدی سے تیار ہونے کی ہدایت کی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے الماری سے وہ موبائل فون نکالا جو اسے بلائنڈ ماسٹر سے ملا تھا۔

بلائنڈ ماسٹر سے رابطہ ہوا تو وہ کچھ حیرت سے بولا۔

”خیریت؟... اتنی صبح؟“

”کل میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ کس وقت آؤں گی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ امان آتا تو اسکول کی بس سے ہے لیکن اسے چھوڑنے میں ہی جاتی ہوں۔ ابھی میں اسے لے کر نکلوں گی اور اسے اسکول لے جانے کے بجائے سیدھی تمہارے پاس لاؤں گی۔“

اس گفتگو میں بالکل صحیح وقت کا تعین بھی کیا گیا۔ بلائنڈ ماسٹر نے گلی نمبر سات کی تاکید بھی کی۔

تھوڑی دیر بعد وہ امان کے ساتھ ناشتے کی میز پر تھی۔ وہ گزشتہ روز بھی امان کو ذہنی طور پر تیار کرتی رہی تھی کہ اب وہ اپنے ماموں کے ساتھ رہ کر وہ سب کچھ سیکھے گا جو

سیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے ملنے کبھی کبھی وہاں آتی رہے گی اور کبھی اسے بھی گھر بلا لیا کرے گی۔

امان اس کی مخصوص تربیت اور انگریزی کی مار دھاڑ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر ذہنی طور پر پچاس فیصد نہیں تو تیس فیصد ویسا بن چکا تھا جیسا نرگس اسے بنانا چاہتی تھی۔

”ابھی تم میرے ساتھ اپنے ماموں کے پاس چلو گے۔“ اس نے ناشتے کی میز پر امان سے کہا۔

”ابھی؟“ امان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”ہاں۔“ نرگس اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ”ابھی۔“

”اور اسکول؟“

”اسکول کو تو اب تم بھول ہی جاؤ۔“ نرگس نے کہا۔ ”تم جیسا بننا چاہتے ہو، ویسا ہی بنو۔ اس کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں۔“

نرگس اسے یہ بھی بتا چکی تھی کہ اس کے ماموں کا خفیہ نام بلائنڈ ماسٹر ہے۔ یہ امان کے لیے ایک سنسنی خیز بات تھی اور اسے انگریزی فلموں کے کئی کردار یاد آگئے تھے جن کے بارے میں اس نے نرگس کو بھی بتایا تھا۔

جب وہ دونوں کار میں گھر سے روانہ ہوئے تو نرگس نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے امان سے کہا۔ ”اگلے موڑ کے بعد تم پچھلی نشست پر جا کے لیٹ جانا۔“

”کیوں مام؟“

”اس وقت تمہیں کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہیے جب ہم نوگوایریا میں داخل ہوں گے۔ اس وقت وہاں فائرنگ بھی ہو سکتی ہے۔ گھبرانا مت۔“

”میں کیوں گھبراؤں گا مام! مجھے تو مزہ آئے گا۔“ امان کے چہرے پر ایسی سرخی پھیل گئی جیسے وہ انتہائی پُرجوش ہو گیا ہو۔

اگلے موڑ کے بعد وہ پچھلی سیٹ پر جا کے لیٹ گیا۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی نرگس اپنے منصوبے پر غور کرتی رہی۔ اسے اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن یہ وہ اب بھی نہیں جانتی تھی کہ نتیجے میں کیا صورتِ حال بن سکے گی۔

نوگوایریا کی گلی نمبر سات سے بمشکل دو منٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ فضا دھماکوں سے گونجنے لگی۔ وہ دھماکے کلاشنکوف یا آٹومیٹک رائفلوں کے چلنے کی وجہ سے ہو سکتے تھے۔

”مام!“ امان چیخ پڑا۔

”چپکے لیٹے رہو۔“ نرگس نے تیزی سے کہا اور ساتھ ہی کار کی رفتار بھی خاصی تیز کر دی۔ اسے بلائنڈ ماسٹر کی بات یاد آگئی تھی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ گلی نمبر سات کے قریب پہنچے تو کسی طور بھی گھبراہٹ کا شکار نہ ہو۔

فائرنگ کرنے والے بلائنڈ ماسٹر ہی کے آدمی ہو سکتے تھے۔ انہوں نے پولیس والوں پر گولیاں برسائی ہوں گی۔ گولیاں چلنے کے وہ دھماکے آٹھ دس سیکنڈ ہی میں ختم ہو گئے تھے لیکن... سب کچھ متوقع ہونے کے باوجود نرگس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں کیونکہ یہ بہرحال اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔

”مام!“ اس مرتبہ امان کی آواز پُرجوش تھی۔ ”کیا ہوا تھا یہ؟“

”اپنے ماموں سے پوچھنا۔“

”اوکے مام۔“ امان ایک مرتبہ یکبارگی چیخ تو اٹھا تھا لیکن اب اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے اس صورتِ حال نے اسے پُرجوش کر دیا ہو۔

پھر جب گلی نمبر سات سے پندرہ بیس سیکنڈ کا فاصلہ رہ گیا تھا، تو دو دھماکے پھر سنائی دیے۔

نرگس نے ان دھماکوں کے بعد بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھا اور بریک لگائے ورنہ تیز رفتاری کے سبب وہ گلی نمبر سات سے آگے نکل جاتی۔

ان دھماکوں سے گلی کے مقامی لوگوں میں ہلچل مچ گئی تھی لیکن نرگس اس ہلچل کی طرف دھیان دیے بغیر کار کو تیزی سے آگے لیے چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور امان جوجی کی موٹر سائیکل پر بیٹھے تھے۔ موٹر سائیکل سرنگ میں دوڑ رہی تھی۔

امان بولا۔ ”ایسا ہی ٹنل میں نے ایک فلم میں دیکھا تھا مام۔“ اس کی آواز کی لرزش جوش کے سبب سے تھی۔

”تم اب ایسی بہت سی چیزیں دیکھو گے جو تم نے فلموں ہی میں دیکھی ہوں گی۔“ نرگس نے اسے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد موٹر سائیکل رکی۔ زینے طے کیے گئے۔ پھر نرگس اور امان اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں بلائنڈ ماسٹر ان کا منتظر تھا۔

”خوش آمدید۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”فائرنگ کی آوازوں سے ڈر تو نہیں لگا؟“

”تم مجھے بتا چکے تھے آنی بھائی... لیکن دل کی دھڑکنیں ضرور تیز ہو گئی تھیں۔“ نرگس نے ہنس کر کہا۔ پھر امان سے بولی۔ ”یہ ہیں تمہارے ماموں۔“

”ہائے انکل!“ امان خوش خوش بلائنڈ ماسٹر کی طرف

بڑھا۔

بلائنڈ ماسٹر نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ ”بہت پیارا بچہ ہے تمہارا۔“ اس نے نرگس سے کہا۔

”اب اپنے جیسا بھی بنا دینا اسے۔ یہ بھی جان لے کر حق مانگا نہیں جاتا، چھینا جاتا ہے۔“ نرگس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بلائنڈ ماسٹر کے چہرے پر سوچ کا تاثر ابھرا اور پھر غائب ہو گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جانتی ہو، وہ گولیاں کیوں چلی تھیں؟“

”پولیس۔“ نرگس نے کہا۔ ”اس گلی کی بھی نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”نگرانی تو ہر گلی کی کی جا رہی ہے۔ پولیس نے اپنے خیال کے مطابق بڑے خفیہ انداز میں کیمرے لگوا دیے ہیں۔ گلی کے قریب پہنچنے پر تم نے دو فائروں کی آوازیں سنی ہوں گی۔ وہ گولیاں انہی کیمروں پر ماری گئی تھیں۔ ٹکڑے اڑ گئے ان کے۔ اب پولیس نہیں جان سکے گی کہ تم اس گلی میں داخل ہوئی تھیں۔“

”اوہ۔“ نرگس کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

”اور اس سے پہلے۔“ بلائنڈ ماسٹر نے بتایا۔ ”جو زوردار فائرنگ ہوئی تھی، وہ میرے آدمیوں نے اس کار پر کی تھی جو تمہارا تعاقب کر رہی تھی۔“

اب نرگس چونکی۔ ”میری نگرانی کرائی جا رہی ہے؟“

”مجھے اس کا یقین تھا۔“ بلائنڈ ماسٹر نے کہا۔ ”کل تو کیمروں نے انہیں بتا دیا ہو گا کہ تم اس علاقے میں داخل ہوئی تھیں۔ ان کا چونکنا یقینی تھا کہ تم جیسی ماڈرن عورت اس علاقے میں کیوں داخل ہوئی۔ انہوں نے تم سے پوچھ گچھ نہیں کی ورنہ تم مجھے بتاتیں۔ انہوں نے تمہاری صرف نگرانی ہی کر کے حقیقت کی تہ تک پہنچنے کا سوچا ہو گا۔“

”مائی گاڈ۔“

”پروا مت کرو۔ مجھے ان لوگوں سے نمٹنا آتا ہے۔“ بلائنڈ ماسٹر نے کہا اور پھر امان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کیسا لگا میرے بچے... تم تو ضرور ڈر گئے ہو گے اس فائرنگ سے۔“

”میں تو نہیں ڈرا انکل! مجھے تو مزہ آیا تھا۔“

”گڈ۔“ بلائنڈ ماسٹر ہنسا پھر نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ رہے ہیں۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا۔ میں امان کو اس قسم کی باتوں کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار کر چکی ہوں۔“

”انکل!“ امان بول پڑا۔

”ہاں میرے بچے۔“ بلائنڈ ماسٹر نے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کا نام بلائنڈ ماسٹر کیوں ہے؟ مام تو کہہ رہی تھیں کہ آپ آنکھیں بند کر کے بھی صحیح نشانہ لگا سکتے ہیں۔“

”تمہاری مام صحیح کہہ رہی تھیں۔“

”ریوالور ہے آپ کے پاس؟“

بلائنڈ ماسٹر نے ریوالور نکال کر دکھایا۔

”مجھے دیں۔“ امان نے پُرشوق انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔

”صبر میرے بچے۔“

نرگس ہنسنے لگی۔

بلائنڈ ماسٹر نے امان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اتنا شوق ہے تو میں تمہیں ایک ہی مہینے میں بہت سچا نشانے باز بنا دوں گا۔ لیکن تم میرے ساتھ رہ سکو گے... اپنی مام کو چھوڑ کر؟“

”مام کہہ رہی تھیں کہ یہ کبھی کبھی آیا کریں گی۔ کبھی مجھے بلا لیا کریں گی۔“

”گڈ ہی گڈ۔“ بلائنڈ ماسٹر ہنسا۔

نرگس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”ذرا چوکس رہنا۔“ بلائنڈ ماسٹر نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس علاقے کا ایک نیا... ایس پی آیا ہے اور اسی سڑک پر رہ رہا ہے جہاں تمہارا گھر ہے۔“

”کہاں؟“ نرگس نے چونک کر پوچھا۔

بلائنڈ ماسٹر نے بنگلے کا نمبر بتایا پھر کہا۔ ”نام دانیال ہے۔“

”دانیال؟“ نرگس چونکی۔

”کیوں! کیا جانتی ہو اسے؟“

”معلوم نہیں، جانتی ہوں یا نہیں۔“ نرگس الجھے ہوئے سے انداز میں بولی۔ ”دراصل میں نے جس کالج میں پڑھا ہے، وہاں بھی ایک دانیال تھا۔“

”یہ نام کم سننے میں آتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ وہی ہو۔ اور اگر ہو بھی تو تمہیں اس کی پروا کیوں ہو۔ آخر یہ آفی بھائی ہے نا تمہارے ساتھ۔“

”میں یوں الجھ رہی ہوں کہ وہ میرے گھر کے قریب رہتا ہے۔“

”کسی بات کی پروا مت کرو، بس ہوشیار رہنا۔“

”اسے بھی تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کہاں رہتی ہوں۔“

”تمہاری نگرانی سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ کل کیمروں کی آنکھوں نے تمہیں علاقے میں آتے دیکھا ہو گا اور اس نے تمہاری تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی لیکن میں نے کہا نا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

نرگس کے سامنے صرف یہ سوال تھا کہ یہ کہیں وہی دانیال نہ ہو۔

☆☆☆

صبح دانیال ناشتا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا، روانگی کی تیاری نہیں کی۔ اب اسے گھر سے نکلنے سے پہلے صورتِ حال پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ رات کو قادر خاصا کچھ بتا کر گیا تھا۔ اس نے قادر سے گھما پھرا کر ایسے سوالات کیے تھے کہ جواب میں اس کے منہ سے کوئی ایسا لفظ ضرور نکل جاتا جس سے اس کا بیان جھوٹ ثابت ہو جاتا یا کم از کم مشتبہ ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور دانیال اس کے بیان پر سو فیصد یقین لے آیا تھا۔

قادر کے بیان کے مطابق وہ دراصل کالا سانپ کے گینگ کا آدمی تھا لیکن بظاہر بلائنڈ ماسٹر کے گروہ سے ملا ہوا تھا۔ اس کا گھر بھی بلائنڈ ماسٹر کے علاقے میں تھا۔ اسے ان لوگوں کی کوئی بات معلوم ہوتی تھی تو وہ کالا سانپ کو اس کی اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے کالا سانپ کی خاطر اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی شدید خطرے میں ڈال دی تھی۔ وہ کالا سانپ سے پوری طرح مخلص تھا لیکن اس کا صلہ اسے یہ ملا کہ اسے اپنے جوان بیٹے کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔

دونوں گروہوں کے آدمیوں میں جھڑپ تو آئے دن ہوا کرتی تھی۔ گولیاں چلتی تھیں اور ایک دوسرے پر گرینیڈ بھی پھینکے جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک جھڑپ میں کالا سانپ کے ایک جوان کارندے بلال نے قادر کے بیٹے انور کو گولی ماردی تھی جو بیس اکیس سال کا تھا۔

جب اس معاملے میں قادر نے کالا سانپ سے فریاد کی تو اسے خود ہی جھاڑ پھٹکار سننا پڑی۔ بلال کیونکہ کالا سانپ کا منہ چڑھا تھا اس لیے اس کی بات سچ سمجھی گئی تھی۔ کالا سانپ کا خیال تھا کہ اگر بلال کو کسی وجہ سے دشمنی ہوتی تو وہ قادر کے خلاف بھی ایسی کوئی بات کہہ سکتا تھا۔ اس کے برخلاف اس نے حیرت ظاہر کی تھی کہ قادر جیسے سچے اور اچھے ساتھی کا بیٹا آخر بلائنڈ ماسٹر کے لوگوں سے کیوں جا ملا۔

قادر کو دل مسوس کر رہ جانا پڑا لیکن دل میں اس نے یہ بات طے کر لی تھی کہ اب وہ کالا سانپ کے لیے کوئی کام نہیں کرے گا اور موقع ملنے پر اسے نقصان ہی پہنچائے گا۔

”اب میں اس گندے راستے پر نہیں چلوں گا صاحب۔“ قادر نے دانیال کے پاس سے جاتے وقت بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ”جوان بیٹے کو مرتے دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اب تو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ کالا سانپ اور بلائنڈ ماسٹر، دونوں ہی کا بیڑا غرق ہو۔“

اس نے دانیال کو دو قیمتی معلومات فراہم کی تھیں۔ اس کے بیان کے مطابق بلائنڈ ماسٹر کا ٹھکانا بہت ہی خفیہ تھا جس سے اس کے گروہ کے سب لوگ واقف نہیں تھے۔ دو تین ہی آدمیوں کو اس کا علم ہو سکتا تھا اور ان میں سے ایک کا نام گزدر تھا۔

بلائنڈ ماسٹر کے کسی آدمی نے گزدر کو کوئی اہم بات بتائی تھی اور جواب میں گزدر نے کہا تھا کہ وہ ابھی بلائنڈ ماسٹر کے پاس جا کر اس سے اس مسئلے پر بات کرے گا۔

گزدر کو جو بات بتائی گئی تھی، وہ قادر نہیں سن سکا تھا لیکن گزدر کا جواب اس نے سن لیا تھا اور بڑے محتاط انداز میں گزدر پر نظر رکھی تھی۔ تعاقب کر کے اس نے گزدر کو ایک جنرل اسٹور میں جاتے دیکھا تھا۔

اس گلی میں جو گھر تھے، ان سبھی گھروں کے مالکان نے اپنے مکانوں کے عقبی حصے میں دو بڑی یا تین چھوٹی دکانیں بنا کر کرائے پر اٹھا دی تھیں۔ گھر والوں کی آمدورفت کا راستہ دوسری طرف کی گلی میں تھا۔ اس گلی کے پار ایک میدان تھا جہاں بچے فٹ بال اور کرکٹ وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔

گزدر جس جنرل اسٹور میں گیا تھا، اس کا نام چاند اسٹور تھا۔ اس کا مالک چاند خاں بلائنڈ ماسٹر کے گروہ سے ہی تعلق رکھتا تھا۔

قادر نے چاند اسٹور پر نظر رکھی۔ گزدر ڈیڑھ گھنٹے بعد اسٹور سے باہر آتا نظر آیا تھا۔

”مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی صاحب۔“ قادر نے کہا تھا۔ ”گزدر کو اسی وقت بلائنڈ ماسٹر کے پاس جانا تھا لیکن بلائنڈ ماسٹر اس دکان میں تو نہیں رہتا ہو گا نا۔“

دانیال نے اس بات پر خیال ظاہر کیا تھا کہ جنرل اسٹور کے اندر کوئی دروازہ ہو گا جس سے وہ برابر کی دکان میں، وہاں سے اس کے برابر کی دکان میں اور اسی طرح کہیں سے کہیں نکل گیا ہو۔

لیکن قادر نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ جنرل اسٹور کے دائیں بائیں کی دکانیں علاقے کے عام لوگوں کی تھیں جن کا بلائنڈ ماسٹر سے کوئی تعلق ہرگز نہیں ہوسکتا اور جنرل اسٹور جس مکان میں تھا، وہ قریب کی ایک مسجد کے امام کا تھا۔ قادر نے اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہا تھا کہ امام صاحب سے زیادہ نیک آدمی اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا اس لیے ناممکن ہے کہ بلائنڈ ماسٹر امام صاحب کے مکان میں رہے۔

''تو پھر گزدر ڈیڑھ گھنٹے تک چاند اسٹور سے کیوں نہیں نکلا؟''

قادر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''وہ تو میرے کو پتا نہیں صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تو بس وہ بتا دیا جو میں نے دیکھا تھا۔ شاید اس دکان میں کوئی تہ خانہ ہو۔ مگر نہیں صاحب! تہ خانے میں کوئی کتنا رہ سکتا ہے، کب تک صاحب؟ کب تک؟''

اس معاملے میں قادر چکرایا ہوا تھا لیکن یہ یقین اسے تھا کہ گزدر اس وقت بلائنڈ ماسٹر سے ہی ملنے گیا تھا۔

دوسری بات قادر نے وہی بتائی تھی کہ کالا سانپ دانیال کی نگرانی کروا کے اس کے راستے کی کوئی ایسی جگہ منتخب کرنا چاہتا ہے جہاں سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کی جاسکے۔

قادر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ جب کالا سانپ کو دانیال کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا تو یہ ممکن نہیں کہ بلائنڈ ماسٹر اس سے بے خبر ہو۔

صبح بستر پر لیٹا ہوا دانیال انہی سب باتوں پر غور کررہا تھا جن میں نکتے کی بات ''چاند اسٹور'' تھی۔ اس کے علاوہ اب دانیال کو اپنا خیال بھی رکھنا تھا۔ قادر پر مکمل یقین کے باعث اسے یہ یقین بھی تھا کہ وہ جب بھی گھر سے نکلے گا، قادر کے بتائے ہوئے رنگوں کی کاریں اس کی نگرانی کریں گی۔

پولیس کی وردی نہ پہنتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دشمن اس سے واقف ہوچکے تھے۔ اس کے خیال میں یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ کالا سانپ زیادہ دن تک اس کی نگرانی کرواتا۔ وہ عجلت میں کہیں بھی اور کسی وقت بھی اس پر فائرنگ کرواسکتا تھا۔

اب بلٹ پروف کار اس کے لیے ضروری ہوگئی تھی جسے لینے سے اس نے فوری طور پر تو انکار ہی کردیا تھا۔ اب اس نے سب کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد موبائل پر آئی جی سے رابطہ کیا۔ ان دونوں میں تقریباً دس منٹ تک گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد اس نے موبائل پر ہی اپنے بھائی شرجیل سے بھی رابطہ کیا کیونکہ اس کے خیال کے مطابق شرجیل کو اب اپنے گھر میں نہیں بلکہ اپنے دفتر میں یا دفتر کے راستے ہی میں ہونا چاہیے تھا۔

''کہاں ہو؟'' دانیال نے رابطہ ہوجانے پر پوچھا۔

''دفتر جارہا ہوں بھائی جان! بلکہ قریب پہنچ چکا ہوں دفتر کے... کیوں خیریت؟''

''ہاں، خیریت ہی ہے۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ رات کو جو شخص آیا تھا، اس کی بیان کردہ باتوں کی وجہ سے اب میں اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی کررہا ہوں۔ اب بلٹ پروف کار میرے لیے ضروری ہوگئی ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گی۔ میں ابھی گھر پر ہی ہوں لیکن یہاں واپس نہیں آؤں گا۔ پولیس لائن میں رہوں گا۔''

''یہ خیال تو مجھے بھی تھا کہ آپ کو بلٹ پروف کار لینا چاہیے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آپ گھر کے بجائے پولیس لائن میں رہیں۔''

''ضروری ہے شرجیل۔'' دانیال نے نرم لہجے اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کسی وقت میری وجہ سے یہاں بھی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ امی کو کسی قسم کی پریشانی ہو۔ تم بھی ان سے کوئی ایسی بات نہ کہنا کہ وہ دماغی دباؤ کا شکار ہوجائیں۔ میں یہاں سے رخصت ہوتے وقت ان سے صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے آئی جی صاحب کے حکم کی تعمیل کرنا پڑرہی ہے۔''

''ٹھیک ہے بھائی جان... یہ تو میں بھی نہیں چاہوں گا کہ امی پریشان ہوں لیکن... کیا زیادہ خطرہ ہے؟'' شرجیل کے لہجے میں تشویش تھی۔

دانیال ہنسا۔ ''پولیس میں رہ کر خطرات سے تو کھیلنا ہی پڑتا ہے برادر... لیکن فوری طور پر ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ تم پریشان ہونے لگو۔''

شرجیل کو دلاسا دینے کے لیے چند باتیں کرکے دانیال نے رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ دانیال نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ڈی ایس پی دانش تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، دانیال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیوں پریشان ہوگئے؟ میں آج کچھ دیر سے آؤں گا۔''

''یہ بات نہیں ہے سر!'' ڈی ایس پی دانش کا لہجہ

گمبھیر تھا۔ ''میں آپ کو نرگس کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوں۔''

''خیریت؟'' دانیال نے تیزی سے کہا۔

''اس کار پر گولیاں برسا دی گئیں سر جس میں ہمارے دو آدمی نرگس کا تعاقب کررہے تھے۔''

''کس جگہ؟ کہاں گولیاں برسائی گئیں؟'' دانیال نے جلدی سے پوچھا۔ ''ہمارے دونوں آدمی...''

''وہ تو سمجھیں خیریت ہی سے ہیں۔'' ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ''بس ایک کے بازو پر معمولی سا زخم آیا ہے۔ غالباً وہ دونوں ٹارگٹ تھے بھی نہیں۔ فائرنگ کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ نرگس کا تعاقب جاری نہ رہ سکے۔ کار کے دو ٹائر برسٹ کیے گئے تھے۔ اس کے بعد فائرنگ کرنے والے غائب ہوگئے۔''

''کس جگہ ہوا یہ؟''

''اسی علاقے میں جہاں نرگس پہلے گئی تھی۔''

''تو کیا نرگس...''

''جی ہاں سر۔'' ڈی ایس پی نے دانیال کی بات کاٹی۔ ''نرگس غالباً آج بھی وہاں گئی ہے جہاں کل گئی تھی اور ہمارا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوگیا کہ ہم نے وہاں کیمرے خفیہ طور پر لگائے تھے۔ غربی علاقے کی گلی نمبر سات کے کیمرے گولیاں مار کر توڑ دیے گئے ہیں۔''

''اوہ۔'' دانیال کے منہ سے نکلا۔

''میں اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کرسکا ہوں سر... نرگس غالباً گلی نمبر سات ہی سے... گئی ہوگی۔ اگر اس پر یقین کرلیا جائے کہ بلائنڈ ماسٹر سے نرگس کا کوئی تعلق ہے تو پھر بلائنڈ ماسٹر نے وہ کیمرے اسی لیے تباہ کروائے ہوں گے کہ ہمیں ان کیمروں کی وجہ سے اس علاقے میں نرگس کے داخلے کا علم نہ ہوسکے۔''

''ہوں۔'' دانیال نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔ ''یہ عین ممکن ہے۔''

''بس یہی اطلاع دینی تھی سر۔''

''نرگس کا تو اب کچھ پتا نہیں ہوگا۔''

''ظاہر ہے سر! اس کا تعاقب جاری نہیں رہ سکا لیکن مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ وہ اس علاقے ہی میں ہوگی اس وقت۔''

''اچھا۔'' دانیال نے طویل سانس لی۔ ''میں آتا ہوں، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں۔''

''رائٹ سر!''

فراخ دلی

کون کہتا ہے اسکاٹ لینڈ کے باشندے ضرورت سے زیادہ کنجوس ہوتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے اسکاٹ لینڈ کی فٹ بال ٹیم کے منیجر نے سینٹر فارورڈ کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اس سے کہا۔ ''ولیم! اس سیزن میں تم نے اتنے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا ہے کہ بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اسپیشل بونس دیا جائے۔ یہ لو ہم تمہیں سو پونڈ کا چیک دیتے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' کھلاڑی نے کہا۔ ''میں بورڈ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔''

ٹیم کے منیجر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اگلے سیزن میں بھی اتنے ہی اچھے کھیل کا مظاہرہ کرتے رہے تو چیئرمین صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس چیک پر دستخط بھی کردیں گے۔''

دانیال نے رابطہ منقطع کرکے اپنے بریف کیس سے سگریٹ کیس نکالا۔ وہ سگریٹ نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن دماغ پر زیادہ دباؤ پڑ جانے کی صورت میں وہ پے در پے سگریٹ پھونکنے لگتا تھا۔

بلٹ پروف کار آجانے کے بعد وہ جب وہاں سے روانہ ہوا تو ایس پی کی وردی میں تھا۔ وردی کے نیچے اس نے بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن لی تھی۔ جب احتیاط کرنا مقصود ہو تو مکمل ہی احتیاط کرنا چاہیے۔

اپنی والدہ سے اس نے وہی کہا تھا جو شرجیل کو بتا چکا تھا۔ اپنی کار اس نے وہیں چھوڑ دی تھی۔ اس کے علاوہ کرتا بھی کیا۔

''میں آرہا ہوں۔'' اس نے ڈی ایس پی کو فون پر اطلاع دے دی تھی۔

راستے میں قادر کے بیان کی تصدیق ہوگئی جس کا دانیال کو یقین بھی تھا۔ دو گاڑیاں وقفے وقفے سے اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ نیلی گاڑی غائب ہوتی تو کسی طرح سے بھورے رنگ کی ہنڈا آجاتی۔ جب وہ غائب ہوتی تو پھر نیلے رنگ کی گاڑی آجاتی۔ یہ تعاقب کا ایک محتاط طریقہ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ ان گاڑیوں کا موبائل فون پر آپس میں رابطہ ہوگا۔

دانیال پولیس اسٹیشن پہنچا تو اس کے احاطے میں موجود پولیس والوں نے اسے چونک کر دیکھا کیونکہ وہ اس

وقت وردی میں آیا تھا۔

جلد ہی وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اس کے پیچھے ڈی ایس پی دانش بھی آ گیا۔ دانیال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے کہ کوئی اور خاص اطلاع نہیں ہوگی ورنہ آپ خود ہی بتاتے۔"

"جی سر! کوئی اور اطلاع نہیں ہے۔"

"نرگس؟"

"معلوم نہیں سر! ہوسکتا ہے وہ ابھی اسی علاقے میں ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واپس چلی گئی ہو۔ ہاں البتہ ایک بات آپ کو بتانا میں بھول گیا ہوں جو لوگ نرگس کے تعاقب میں تھے، انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ آج نرگس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔"

وہ اس کا بیٹا ہی ہوسکتا تھا۔ دانیال کو شرجیل سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ نرگس اپنے بنگلے میں دو ملازموں اور اپنے تیرہ چودہ سال کے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی۔

دانیال کے لیے یہ بات قابلِ غور تھی کہ آج نرگس اپنے بیٹے کو بھی اس علاقے میں لے گئی تھی مگر اس نے ڈی ایس پی پر اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ "کسی اور گلی میں فائرنگ کی اطلاع آپ نے نہیں دی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر نرگس اس علاقے سے نکل گئی ہے تو وہ گلی نمبر سات ہی سے نکلی ہوگی۔"

"ممکن ہے سر! مجھے آپ نے کوئی ہدایت نہیں دی تھی اس لیے میں نے اس گلی کی نگرانی کے لیے کسی کو نہیں بھیجا تھا۔"

"خفیہ کیمرے اسی لیے لگوائے گئے تھے کہ نگرانی کرنے والے ہمارے اِکا دُکا آدمی گولیوں کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"گلی نمبر سات کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نقشے میں دیکھ چکا ہوں۔ اس طرف بنگلے ہیں۔ کیا وہاں رہنے والا کوئی شخص ہمیں بہ خوشی اس کی اجازت دے دے گا کہ اس کے بنگلے سے ہمارے دو ایک آدمی گلی نمبر سات کی نگرانی کر سکیں؟"

"ہر شخص ہی اجازت دے دے گا سر! وہاں رہنے والے سبھی لوگ جرائم پیشہ افراد کی وجہ سے آئے دن پریشان ہوتے ہیں۔ وہاں رہنے والا ہر شخص پولیس سے تعاون کرنے پر آمادہ ملے گا۔ وہ سبھی چاہتے ہیں کہ وہاں کسی طرح امن و امان ہو۔"

"تو پھر آپ کسی سے بات کیجیے گا... لیکن بہت خفیہ طور پر... کیمروں کا علم تو انہیں ہو چکا ہے۔ کم از کم اس بنگلے پر انہیں کوئی شبہ نہ ہو۔"

"میں اس معاملے کو آج ہی دیکھتا ہوں۔"

"اچھا وہاں جو ہمارے مخبر ہیں جن میں سے ایک کوئی دودھ والا بھی ہے؟"

"نصیرا دودھ والا۔" ڈی ایس پی نے نام یاد دلایا۔

"کیا سب مخبر مکمل بھروسے کے ہیں؟"

"سو فیصد بھروسے کے ہیں سر! دراصل وہ اسی علاقے میں رہنے والے وہ لوگ ہیں جن کا بلائنڈ ماسٹر یا کالا سانپ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تو ان لوگوں کو... اچھا ہاں... اس علاقے میں چاند اسٹور کے نام سے کوئی جنرل اسٹور ہے؟"

ڈی ایس پی دانش نے کچھ رک کر سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس نام کا ایک اسٹور ہے۔ ایس پی اشرف صاحب کی ہدایت پر میں اس علاقے میں کئی مرتبہ ریڈ کر چکا ہوں۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے اس نام کا ایک اسٹور وہاں دیکھا ہے۔" پھر ڈی ایس پی یک بہ یک چونک کر بولا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا سر؟"

دانیال نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنے سب مخبروں کو ہدایت کر دیجیے کہ وہ چاند اسٹور پر کڑی نظر رکھیں اور وہاں اس علاقے سے باہر کا کوئی فرد آتا جاتا نظر آئے تو آپ کو رپورٹ دیں۔ یہ ہدایت آپ ان مخبروں کو خود دیجیے گا اور انہیں یہ تاکید بھی کر دیجیے گا کہ وہ اپنی رپورٹ صرف آپ کو دیں۔"

"صرف مجھے؟" ڈی ایس پی نے غور سے دانیال کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" دانیال نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو یہاں کسی پر شبہ ہو گیا ہے سر؟ کیا ہمارے لوگوں میں کوئی کالی بھیڑ ہے؟"

"اس کا جواب میں آپ کو کل دوں گا۔"

"بہتر ہے۔" ڈی ایس پی دانش نے آہستہ سے کہا۔ پھر کچھ رک کر بولا۔ "مگر کیا اب ہمیں صرف نگرانی کرنا ہے اس علاقے کی؟ وہاں کوئی ریڈ نہیں کرنا؟"

"نہیں۔" دانیال نے جواب دیا۔ "میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا، نہ مجھے کہنا چاہیے کہ ایس پی اشرف صاحب اچھے پولیس آفیسر نہیں تھے لیکن میں ان کا اپنایا ہوا طریقہ

کار نہیں اپنانا چاہتا۔ بار بار ریڈ کرنے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ بس کچھ آدمی گرفتار کر لیے جاتے ہیں، اسلحے کی برآمدگی ہو جاتی ہے اور تو کچھ نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ نے مناسب ہی سوچا ہوگا۔ میں آج رات گلی نمبر سات کے سامنے والے کسی بنگلے کے مالک سے بات کر لوں گا۔"

"چاند اسٹور والی بات بھی بہت ضروری ہے۔ آپ ابھی اپنے کمرے میں جا کر موبائل پر ان سب کو ہدایت دے دیجیے۔"

"رائٹ سر!" ڈی ایس پی دانش اٹھا، پھر جاتے جاتے رک کر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "آپ نے کہا تھا سر کہ چند دن وردی نہیں پہنیں گے لیکن آج آپ نے وردی بھی پہنی ہے اور بلٹ پروف کار بھی لے لی ہے۔"

"ہاں۔" دانیال نے طویل سانس لے کر کہا۔ "میں چاہتا تھا کہ جب تک ممکن ہو، یہاں اپنی موجودگی کو راز رکھوں لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ کالا سانپ کو میرے بارے میں اطلاع مل گئی ہے۔"

ڈی ایس پی چونکا۔

دانیال کہتا رہا۔ "اور جب اس ڈفر کو معلوم ہو گیا ہے تو بلائنڈ ماسٹر بھی بے خبر نہیں رہا ہوگا۔"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا سر کہ کالا سانپ کو..."

دانیال نے ڈی ایس پی کی بات کاٹ دی۔ "میرا کوئی ذریعہ ہے، بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔"

ڈی ایس پی کو اپنے کمرے سے رخصت کرنے کے بعد دانیال نے سگریٹ سلگایا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ جو قدم اٹھانے کا خیال اس کے دماغ میں آیا ہے، وہ اس پر عمل کرے یا نہیں؟

کچھ دیر بعد اس نے گھنٹی بجا کر اپنے لیے چائے منگوائی، پھر چائے لانے والے کانسٹیبل ہی سے کہا۔ "ذرا دانش صاحب سے کہو، میرے پاس آئیں۔"

"جی سر۔"

دانیال نے چائے کا گھونٹ لے کر ایک اور سگریٹ سلگایا۔ ابھی اس نے دوسرا ہی کش لیا تھا کہ ڈی ایس پی دانش کمرے میں داخل ہوا اور چونکا۔ اس نے دانیال کو پہلی مرتبہ سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے چونکنے کی یہ وجہ دانیال نے بھی سمجھ لی مگر اس بارے میں کچھ کہنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"بیٹھیے۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"سر! اگر آپ نہ بلاتے تو بھی میں آپ کے پاس آنے ہی والا تھا۔"

"کوئی خاص اطلاع؟"

"جی نہیں۔ میں بس ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں آپ کو۔ جب آپ نے محتاط ہونا ضروری سمجھ لیا ہے تو اپنے ساتھ گارڈز بھی رکھیے۔"

"اپنے ساتھ؟ آپ کا مطلب ہے اپنی گاڑی میں؟"

"جی ہاں، گاڑی بلٹ پروف سہی لیکن کسی جگہ آپ کو گاڑی سے اترنا بھی پڑ سکتا ہے۔ اس وقت گارڈز آپ کو اپنی آڑ میں رکھ سکتے ہیں۔"

دانیال خفیف سا مسکرایا۔ "یعنی خطرہ ہو تو میرے بجائے ان کی جان چلی جائے۔"

ڈی ایس پی کچھ شپٹایا۔ "یہ تو ہوتا ہے سر۔"

"نہیں۔" دانیال سنجیدہ ہو گیا۔ "میں اپنی فورس کے ہر جوان کی زندگی، اپنی زندگی سے کم قیمتی نہیں سمجھتا۔"

ڈی ایس پی نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر بولا۔ "تو پھر کم از کم دو موبائلیں تو اپنے ساتھ رکھیں۔ ایک آپ کی گاڑی کے آگے اور ایک پیچھے چلتی رہے۔"

"ہاں یہ کیا جا سکتا ہے مگر آج سے نہیں۔ آج مجھے ایک کام کرنا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ میرے ساتھ شوفر کے سوا کوئی نہ ہو۔ اسی کے بارے میں کچھ بات کرنے کے لیے آپ کو بلایا تھا۔"

"فرمایئے سر!"

"مخبروں سے بات ہو گئی؟"

"جی ہاں۔"

دانیال نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا، پھر ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ایک منصوبے کے بارے میں بات شروع کی۔

یہ میٹنگ پندرہ منٹ جاری رہی۔

"ٹھیک ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "یہ کام آپ کی منشا کے عین مطابق ہو جائے گا۔"

اسے رخصت کرنے کے بعد دانیال نے موبائل پر شرجیل سے رابطہ کیا۔ اس سے گفتگو کرنے کے بعد اس نے میز کی دراز سے علاقے کے نقشے نکال کر میز پر پھیلائے۔

☆☆☆

دن گزر گیا۔ رات شروع ہوئے آدھا گھنٹا گزرا ہوگا جب دانیال اسی دن بلٹ پروف کار میں پولیس لائن سے نکلا

جہاں اس کے قیام کا بندوبست دو دن قبل ہی کیا جا چکا تھا۔

کار ڈرائیو ایک کانسٹیبل ہی کر رہا تھا لیکن اس کے جسم پر وردی نہیں تھی۔ پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا دانیال بھی اس وقت سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے تیسرے پہر کو پولیس لائن آکر پولیس کی وردی اتار دی تھی اور سادہ لباس پہن کر رات کی تاریکی پھیلنے تک جسمانی طور پر تو آرام ہی کرتا رہا تھا لیکن دماغ کو آرام کرنے کی مہلت اس لیے نہیں ملی تھی کہ وہ مسلسل سوچتا رہا تھا۔

اور اب اس کی کار سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی تو بھی وہ خالی الذہن نہیں تھا۔ اس نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی تھی کہ اسے کن راستوں سے گزر کر کدھر جانا ہے۔

پندرہ منٹ بعد اس کی کار ایک بے حد روشن سڑک پر دوڑ رہی تھی جب اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال ڈی ایس پی دانش کی تھی۔

''جی سر۔'' ڈی ایس پی نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

جواب میں دانیال نے پوچھا۔ ''پوزیشن؟''

''آپ کا تعاقب کرنے والی ہنڈا تو ابھی ابھی بائیں جانب مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے اور دوسری سڑک سے کرولا اس شاہراہ پر آکر آپ کے تعاقب میں ہے۔''

''اور موٹر سائیکل؟ اور آپ کی کار؟''

''میں کرولا کے پیچھے ہوں۔ ہمارے درمیان چار گاڑیاں ہیں۔ موٹر سائیکل سوار کرولا کے بہت قریب ہیں۔''

''اچھا تو اب جو چوراہا آرہا ہے، وہاں سے میں دائیں جانب مڑوں گا۔ وہاں بہت کم ٹریفک ہوگا۔ روشنی بھی اس شاہراہ سے کم ہوگی۔ جب میری کار تین چار فرلانگ آگے نکل جائے تو موٹر سائیکل سواروں کو سگنل دے دیجیے گا۔''

''رائٹ سر۔''

دانیال نے رابطہ منقطع کر کے ڈرائیور سے کہا۔ ''چوراہے سے دائیں ہاتھ پر موڑ لینا؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے بائیں جانب کا شیشہ تھوڑا سا کھولا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' ڈرائیور نے جواباً کہا۔

یہ اتفاق تھا کہ سرخ سگنل مزاحم نہیں ہوا اور کار رکے بغیر لیکن رفتار کم کرتے ہوئے دائیں جانب مڑ گئی۔ پھر ڈرائیور نے رفتار میں اضافہ شروع کیا۔

پھر ایک منٹ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی جو دھماکا ہوا، وہ یقیناً ٹائر برسٹ ہونے کا تھا۔ دانیال کی ہدایت ہی یہ تھی کہ موٹر سائیکل سوار، تعاقب کرنے والی کار کے ٹائر پر گولی چلانے کے بعد اتنی تیزی سے کسی طرف نکل جائیں کہ کوئی انہیں ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکے۔

دانیال کی کار کی رفتار یک لخت بہت زیادہ ہو گئی۔ ڈرائیور کو دانیال سے یہی ہدایت ملی تھی کہ فائر اور دھماکے کی آواز سنتے ہی کار کی رفتار تیزی سے بڑھائے اور پھر جو بھی موڑ آئے اسی طرف مڑ جائے۔

ہدایت کے مطابق کار ایک جانب مڑ بھی گئی۔

''جلدی جلدی دو تین موڑ اور لے لو۔'' دانیال نے کہا۔

ڈرائیور نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔

''بس اب بائیں جانب موڑ لینا اور سیدھے چلتے رہنا۔'' دانیال نے ڈرائیور کو ہدایت کی پھر گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ ''رفتار تیز ہی رکھنا۔''

ڈرائیور نے کار بائیں جانب موڑ کر ایکسلریٹر پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

دانیال نے موبائل فون پر ڈی ایس پی دانش سے کہا۔ ''کرولا تو اس قابل رہی نہیں ہوگی کہ میرا تعاقب جاری رکھ سکے اور ہنڈا والوں کو بھی اندازہ نہیں ہو سکا ہوگا کہ اب میری کار کہاں ہے۔''

ڈی ایس پی دانش کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ ''اب تو مجھے بھی معلوم نہیں سر کہ آپ کی کار کہاں ہے۔''

جواباً دانیال خفیف سا مسکرایا اور بولا۔ ''بس! تھینک یو مائی ڈیئر ڈی ایس پی... اب آپ سے کل ملاقات ہوگی۔''

اس نے ڈی ایس پی کی کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کیا اور ڈرائیور کو ہدایت دینے لگا کہ اب کہاں جانا ہے۔

تعاقب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے گولی سے ٹائر برسٹ کرنے کے علاوہ کوئی ایسا سیدھا سادہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا تھا جس سے سڑک پر کوئی سنسنی نہ پھیلے لیکن دانیال نے اس طرح کالا سانپ کو باور کرایا تھا کہ اس کا مقابل اس سے زیادہ ہوشیار ہے۔ ایک اعتبار سے اس طرح کالا سانپ کو مرعوب کیا گیا تھا۔

''اب رفتار کچھ کم کرو۔'' دانیال نے کچھ دیر بعد گھڑی دیکھ کر کہا۔ کار کی رفتار کم کر دی گئی۔

دانیال نے موبائل پر شرجیل سے رابطہ کیا۔ ''ہاں

شرجیل؟''

دوسری طرف سے اطمینان بخش جواب ملا۔ ''وہ گھر پر ہی ہے بھائی جان۔''

''گڈ۔'' دانیال نے کہا اور رابطہ منقطع کر کے ڈرائیور سے بولا۔ ''وہ جو دائیں ہاتھ پر ایک درخت نظر آرہا ہے، اس کے قریب کی گلی کے بالکل سامنے کار روکو۔''

''جی سر۔''

کار کی رفتار کم ہونے لگی۔

دانیال بولا۔ ''کار رکتے ہی میں تیزی سے اتر جاؤں گا۔ میرے اترتے ہی تم کار کچھ آگے بڑھا کر کسی جگہ روک دینا۔''

''جی سر۔''

دانیال نے پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے وقت کا بالکل صحیح صحیح اندازہ لگانا تھا جو اس نے لگا لیا تھا۔ کار رکتے رکتے اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول لیا تھا۔ کار بالکل رکتے ہی وہ دروازہ پوری طرح کھول کر اترا اور تیزی سے گلی میں داخل ہو گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق کار فوراً آگے بڑھ گئی۔

دانیال نے چند قدم آگے بڑھائے تھے کہ سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ لوڈشیڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ دانیال نے زیادہ تیزی سے قدم بڑھائے۔

پانچ چھ سیکنڈ بعد ہی وہ ایک بنگلے کے پھاٹک پر لگے ہوئے انٹرکام کا بٹن دبا چکا تھا۔ پھر اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر دو افراد مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ خاصا آگے ایک کار ایک بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔

دس سیکنڈ تک کوئی جواب نہیں ملا تو دانیال نے مضطربانہ انداز میں دوسری مرتبہ بٹن دبایا۔ وہ چاہتا تھا کہ آس پاس کے گھروں میں تھوڑی بہت روشنی ہونے سے پہلے جواب مل جائے۔

پانچ ہی سیکنڈ بعد اس نے پھر بٹن دبا دیا۔ اس مرتبہ اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ انٹرکام کے اسپیکر سے آواز آئی۔ ''کون؟''

''اگر تم پندرہ سال پہلے کے واقعات نہیں بھولی ہو نرگس تو تمہیں کالج کا دانیال ضرور یاد ہوگا۔'' دانیال نے فوراً جواب دیا۔ ''میں وہی دانیال ہوں۔''

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے طویل سانس لی گئی ہو پھر کہا گیا۔ ''اچھا! میں آتی ہوں۔'' پھر رابطہ منقطع ہونے کی آواز آئی۔

مطلوبہ کتاب

لندن میں ایک خاتون نے ایک کتاب فروش سے کوئی ایسی کتاب ڈھونڈنے کو کہا جس میں مٹاپا کم کرنے کے طریقے اور دوائیں درج ہوں۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون اسی دکان میں گئیں تو کتب فروش خوش ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ لیجیے آپ کی مطلوبہ کتاب مگر آپ تو پہلے سے خاصی دبلی نظر آرہی ہیں؟''

''جی ہاں...'' خاتون بولیں۔ ''میرے شوہر گم ہوگئے ہیں اور میں اسی پریشانی میں دبلی ہو گئی ہوں۔''

''اوہ۔'' دکان دار نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''آپ نے پولیس کو بھی اطلاع دی کہ نہیں؟''

''جی نہیں! میں چاہتی ہوں، تھوڑی سی اور دبلی ہو جاؤں پھر پولیس کو اطلاع دوں۔''

(مرسلہ: تنزیل احمد۔ کراچی)

دانیال حیرت زدہ رہ گیا۔ نرگس کا جواب ایسا تھا جیسے وہ دانیال کی منتظر ہی تھی۔

اب گلی کے بہت سے گھروں میں ہلکی ہلکی روشنی ہونا شروع ہو چکی تھی۔

ایک کار تیزی سے آرہی تھی۔ دانیال اس کی روشنی میں نہا گیا۔ اس نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کار میں بیٹھا ہوا یا بیٹھے ہوئے لوگ اس کا چہرہ دیکھ سکیں۔

کار گزر گئی۔ جس طرف وہ گئی تھی، اسی طرف سے تین اشخاص ٹہلتے ہوئے آتے دکھائی دیے تو دانیال نے پھر اپنا رخ بدلا۔ اب گھروں میں اتنی روشنی ہو چکی تھی کہ قریب آجانے پر وہ تینوں دانیال کا چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ قریب آجاتے، دانیال نے ایسی آواز سنی جیسے اندر سے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا جا رہا ہو۔ یقیناً نرگس نے پھاٹک تک آنے میں عجلت برتی تھی۔ غالباً وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ لوگ دانیال کو دیکھ سکیں۔

ذیلی دروازہ کھول کر نرگس اس طرح ایک طرف ہٹ گئی جیسے چاہتی ہو کہ دانیال فوراً اندر داخل ہو جائے اور دانیال نے کیا بھی یہی۔ نرگس نے فوراً ذیلی دروازہ بند کیا۔

آس پاس کے گھروں میں اب اتنی روشنی ہو چکی تھی کہ نرگس کے گھر کے چھوٹے سے احاطے میں زیادہ تاریکی

نہیں رہی تھی۔

"آؤ۔" نرگس نے کہا اور قدم بڑھائے۔

دانیال کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ نرگس کا ردِعمل اس کے لیے نہایت غیر متوقع تھا۔

گھر میں داخل ہوتے وقت نرگس نے ٹارچ روشن کرلی اور جب دانیال بھی اندر پہنچ گیا تو نرگس نے دروازہ بند کردیا۔ وہ ٹارچ ہی کی روشنی میں دانیال کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی جہاں روشنی تھی۔

نرگس نے ٹارچ بجھا کر ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم پندرہ سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں تم کیا محسوس کررہے ہو مگر لیکن میرے جسم میں اس وقت سے سنسناہٹ پھیلی ہوئی ہے جب سے میں نے انٹرکام پر تمہاری آواز سنی ہے۔"

"لیکن تمہارے جواب سے، تمہارے انداز سے تو یوں ظاہر ہوا جیسے اس وقت تم میری منتظر ہی تھیں؟"

"نہیں، اس وقت تو منتظر نہیں تھی لیکن یہ خیال ذہن میں تھا کہ تم کسی نہ کسی وقت، کہیں نہ کہیں مجھ سے ملو گے ضرور۔"

"اگر تمہیں یہ خیال تھا تو میری سمجھ میں نہیں آئے گا کہ تمہیں یہ خیال کیوں تھا؟"

"آؤ بیٹھو۔" نرگس نے ایک گوشے میں لگے ہوئے صوفوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا پھر بولی۔ "تم قریب ہی کے ایک گھر میں آکر ٹھہرے ہو، بس اتفاق ہے کہ ان دو تین دنوں میں ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا لیکن آج مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ تم کس گھر میں آکر ٹھہرے ہو۔"

اب دانیال حیرت کے بھنور سے نکل آیا تھا اور اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ نرگس ایک صوفے پر بیٹھ چکی تھی اور اس نے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سامنے کے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اور کیا کیا معلوم ہوا ہے تمہیں میرے بارے میں؟" دانیال نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں نرگس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ بولی۔ "جب میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں گی تو تم بھی بہت کچھ سمجھ جاؤ گے۔ مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تم سپرنٹنڈنٹ پولیس بن چکے ہو اور تمہارا یہاں تبادلہ خاص طور پر ایک نوگوایریا کے سبب سے ہوا ہے۔"

"بلائنڈ ماسٹر نے بتایا ہے تمہیں یہ سب کچھ؟" دانیال بولا۔

"میں نے ابھی کہا تھا نا، تم بھی بہت کچھ سمجھ جاؤ گے تم نے میری اس وقت کی تصویریں دیکھی ہوں گی جب میں نوگوایریا میں داخل ہوئی تھی۔ تم نے دھڑ سے بلائنڈ ماسٹر کا نام لے لیا لیکن مجھے اس پر بھی اس لیے حیرت نہیں کہ تم ایس پی ہو۔ کچھ تو سراغ لگا ہی چکے ہوگے۔"

دانیال نے ایک طویل سانس لی پھر کہا۔ "تمہاری تصویر دیکھ کر کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی تھی میری۔ کاش تمہاری وہ تصویر نوگوایریا کے علاوہ کسی جگہ کی ہوتی۔"

"میں اندازہ لگا سکتی ہوں تمہاری اس کیفیت کا۔" اس مرتبہ نرگس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "موبائل فون سے کھینچی ہوئی تمہاری تصویر بھی دیکھی تھی میں نے... اس وقت میری بھی کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی تھی دانیال! آج میں سارا دن ماضی کی یادوں میں ڈوبی رہی ہوں... اور تمہیں کھو کر میں پچھتائی تو ساری زندگی ہوں۔" نرگس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

دانیال اس کی طرف تکتا رہ گیا۔ نرگس ایک ٹشو لے کر اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات تو غم ناک ہو ہی چکے تھے۔ اپنی آنکھیں خشک کرکے وہ دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "تمہیں کھو دینا میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔"

دانیال نے کچھ رک کر پوچھا۔ "ارشد کا انتقال کب ہوا تھا؟"

"انتقال؟" نرگس کا انداز چونکا ہوا سا تھا۔ "انتقال تو نہیں ہوا اس کا۔"

"لیکن یہاں رہنے والے تو یہی کہتے ہیں اور پھر تمہارے نام کے ساتھ بھی ارشد کا نام نہیں ہے۔ پھاٹک پر نیم پلیٹ نرگس زماں کی ہے۔"

"اس سے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے تم نے۔" نرگس ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "ہاں، یہ تو صحیح ہے کہ یہاں رہنے والے مجھے بیوہ ہی سمجھتے ہیں اور انہیں سمجھنا بھی چاہیے کیونکہ میں نے یہی ظاہر کیا تھا لیکن تم سے میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ ارشد زندہ ہے۔ دراصل اس کا پورا نام ارشد الزماں ہے۔"

دانیال کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔

نرگس بولتی رہی۔ "کراچی میں اس کے جاننے والے زماں ہی کے نام سے جانتے ہیں۔ سب ہی اسے زماں صاحب کہتے ہیں۔ اس کی ٹیکسٹائل مل کا نام بھی زماں

ٹیکسٹائل مل ہے۔"

"اگر وہ زندہ ہے تو تم یہاں اکیلی کیوں رہتی ہو؟"

"صرف اتنا ہی پوچھو گے؟" نرگس پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "یہاں کے لوگوں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ کوئی شخص چوری چھپے مجھ سے ملنے آتا ہے اور اس کی وجہ سے مجھے یہاں ایک آوارہ عورت سمجھا جاتا ہے۔"

"بتایا ہے۔" دانیال نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن وہ ارشد الزماں ہی...؟"

"ہاں۔" نرگس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے دانیال کی بات کاٹی۔ "وہ زماں ہی ہے جو اس طرح یہاں آتا ہے۔"

"مگر کیوں؟ اس طرح کیوں؟"

"تاکہ یہ علم کسی کو نہ ہو کہ وہی اس طرح مجھ سے ملنے آتا ہے۔ اس طرح بات پھیل سکتی ہے۔ زماں کی بیوی کو بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ بیوی سے زماں کے باپ کو بھی معلوم ہوجائے گا۔"

دانیال اس کا منہ تکتا رہا۔

نرگس بولی۔ "بات تمہاری سمجھ میں شاید اس وقت نہیں آئے گی جب تک میں تمہیں یہ نہ بتادوں کہ میرے یہ پندرہ سال کس طرح گزرے ہیں اور کیوں اس طرح گزرے ہیں۔"

نرگس نے وضاحت سے بیان کیا کہ دانیال سے محبت کے باوجود اس کے دل میں یہ خواہش بڑی شدید تھی کہ اس کے پاس دولت ہو اور وہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزار سکے۔ اسی لیے جب ارشد الزماں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ صرف اس کی دولت کی وجہ سے اس کی طرف جھکتی چلی گئی۔ ان دونوں کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ کیونکہ نرگس کا تعلق ایک سید گھرانے سے تھا اس لیے وہ جانتی تھی کہ اس کے گھر والے اس کی شادی کسی ایسے لڑکے سے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جس کا تعلق سید گھرانے سے نہ ہو۔ اور ارشد الزماں سید گھرانے سے نہیں تھا۔ اپنی اس پریشانی کا اظہار اس نے ارشد الزماں سے بھی کردیا اور پھر اس کے اکسانے پر وہ اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر ارشد الزماں کے ساتھ کراچی آگئی۔ ارشد الزماں نے اس سے کہا تھا کہ جب وہ فون پر اپنے گھر والوں کو بتائے گی کہ اس نے اپنی خواہش کے مطابق شادی کرلی ہے تو اس کے گھر والوں کے لیے پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ صبر کرلیں اور زیادہ بدنامی سے بچنے کے لیے اس سے واپس گھر آنے کے

ریس

"بڑا قیمتی فون ہے... کہاں سے لیا؟" ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"ریس میں جیتا ہے۔"

"ویری گڈ... کتنے آدمی تھے ریس میں؟"

"تین!" اس نے اطمینان سے کہا۔ "مگر میں جیت گیا۔"

"وہ بالکل ہی لولو ہوں گے؟"

"بہت پھرتیلے تھے۔ میں سب سے آگے تھا، میرے پیچھے پولیس والا لگا ہوا تھا۔ سب سے پیچھے وہ آدمی چلّاتا ہوا آرہا تھا جس کے ہاتھ سے میں نے یہ فون چھینا تھا۔"

مریض

ڈاکٹر اسپتال سے گھر آیا۔ بیوی نے محبت سے چائے پیش کی اور وہ ٹانگیں پسار کر ٹیلی وژن کے سامنے جم گیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تمہارے نکمے دوستوں کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔" بیوی نے خوش ہوکر کہا۔ "کافی دنوں کے بعد آج ہمیں مل بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔"

ڈاکٹر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور بیوی سے کہا۔ "ذرا دیکھو رضا کیا کررہا ہے؟"

بیوی اپنے شوہر کے ان حربوں سے واقف تھی۔ وہیں جمی رہی۔

ڈاکٹر نے فون ریسیو کیا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یار! کیا کررہے ہو؟"

"ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔"

"پوکر کھیلنے کا موڈ ہورہا ہے۔ ہم تینوں ٹھنڈے تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔ اسپتال جونیئر دیکھ رہے ہیں... آسکتے ہو تو آجاؤ، چار کا کورم پورا ہوتے ہی کھیل شروع ہوجائے گا۔"

"بس ابھی آیا۔" ڈاکٹر نے فون بند کیا اور اپنا بیگ اٹھالیا۔

"کہاں چلے؟" بیوی نے ترشی سے پوچھا۔

"مریض کو دیکھنا ہے۔" ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔

"کیا اس کی حالت زیادہ خراب ہے؟"

"اس سے زیادہ اور کیا خراب ہوگی کہ آپریشن تھیٹر میں تین ڈاکٹر پہنچ چکے ہیں اور میرا انتظار ہورہا ہے۔" اس نے یہ کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

کراچی سے جاوید کاظمی کے حربے

لیے کہیں مگر جب نرگس نے فون پر اپنے باپ کو یہ اطلاع دی تو وہ غصے سے اس پر برس پڑے اور انہوں نے کہا کہ اب وہ زندگی بھر اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔

"اس کے بعد وہ بیمار پڑ گئے تھے۔" دانیال بول پڑا۔ "انہیں بہت صدمہ پہنچا تھا۔ بیماری بھی اتنی تیزی سے بڑھی کہ بہت جلد ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے انتقال کے صدمے سے تمہاری والدہ کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"سب معلوم ہو گیا تھا مجھے۔" نرگس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "والد سے بات کرنے کے بعد موبائل فون پر ہی میرا رابطہ اپنی بڑی بہن سے رہا تھا۔ وہ مجھ سے خفگی کا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں اور مجھے حالات بھی بتاتی رہتی تھیں لیکن والدہ کے انتقال کے باعث وہ مجھ سے اتنی ناراض ہوئیں کہ انہوں نے بھی مجھ سے اپنا ناتا ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنا موبائل نمبر بھی تبدیل کر لیا تھا کہ میں بھی ان سے رابطے کی کوشش نہ کر سکوں۔"

"ارشدالزماں پر اس کا کیا ردِعمل ہوا؟"

"بس وہ میری ڈھارس بندھاتا رہا۔"

"تم سے شادی تو کر لی ہوگی اس نے؟"

"نہیں۔" نرگس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "اس نے مجھ سے شادی کی ہی نہیں۔ آج بھی میں اس کی داشتہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی ہوں۔"

دانیال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آواز نہیں نکلی۔

"جب میں اس کے ساتھ کراچی آئی تھی۔" نرگس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "اسی وقت مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ کالج ہی کے زمانے میں ہم تنہائی میں ملنے لگے تھے۔ والد سے بات کرنے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ اب ہم شادی کر لیں مگر اس نے جواب دیا کہ وہ واپس لاہور جا کر اپنے والدین سے بات کرے گا اور پھر میں دھوم دھام سے شادی کے بعد اس کے گھر جاؤں گی۔ اس نے ڈیفنس میں مجھے ایک بنگلا دلا دیا تھا۔ پندرہ بیس دن بعد واپس آ کر اس نے مجھ سے کہا کہ ابھی وہ اپنے والدین کو منانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارے گا۔ ایک ہفتہ میرے ساتھ گزار کر وہ پھر لاہور چلا گیا۔ واپس آیا تو پھر وہی بہانہ کہ اس نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ وہ مجھے اسی طرح ٹالتا رہا یہاں تک میں امان کی ماں بن گئی۔ امان میرے بیٹے کا نام ہے دانیال... اب اس کی عمر چودہ سال سے کچھ زیادہ ہے۔"

"اس نے تم سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"اسے صرف اپنی خواہشات سے غرض ہے۔" نرگس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ "لیکن مجھ سے شادی نہ کرنے کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ دراصل اس کی شادی اس کی چچا زاد بہن سے ہوئی تھی۔ وہ اچھے مزاج کی لڑکی نہیں تھی اور آج بھی اتنی تندخو ہے کہ اگر اسے میری اور ارشدالزماں کی شادی کا علم ہو جائے تو وہ اس سے طلاق لینے یا خلع لینے میں دیر نہیں لگائے گی۔ ارشدالزماں کو یہ خوف ہے کہ ایسی صورت میں اس کا باپ اس سے ناراض ہو کر اس سے وہ سب کچھ چھین لے گا جو اس نے اسے دے رکھا ہے۔ ارشدالزماں قلاش ہو جائے گا۔" نرگس نے ٹھنڈی سانس لی پھر کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ اس نے اس وقت بتایا تھا جب میں امان کی ماں بن چکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا، میں کسی پر ظاہر نہ کروں کہ میری شادی نہیں ہوئی اور ٹھاٹ سے زندگی گزارتی رہوں۔ اس نے مجھے ایک کار بھی دلا دی تھی۔ گھر میں ملازم بھی رکھوا دیے تھے۔ میں نے پندرہ سالوں میں چار گھر تبدیل کیے ہیں۔ یہ چوتھا گھر ہے جہاں تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ جانے کیوں یہاں میرا دل چاہا تھا کہ خود کو بیوہ مشہور کر دوں۔" وہ پھر یکایک رکی اور غور سے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ میں تمہیں یہ سب کچھ بتا رہی ہوں۔"

دانیال اب بھی خاموشی سے اس کا منہ تکتا رہا۔

"میں بتاتی ہوں کہ میں نے تم پر یہ سب کچھ کیوں ظاہر کیا۔" نرگس خود ہی بولی۔ "آج میں دن بھر سوچتی رہی تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں یہ سب کچھ تو بتا ہی دوں گی۔ یہ سب کچھ میرے دل پر ایک بوجھ تھا، پندرہ سال کا بوجھ... میں کسی اپنے کے سامنے دل کا یہ بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ یقیناً تم شادی کر چکے ہو گے لیکن میرا اندازہ ہے کہ تمہارے دل میں میری محبت اب بھی ہوگی۔ تم مجھے بھول نہیں سکے ہو گے۔ تم نے مجھے اتنی ہی شدت سے چاہا تھا۔ اسی لیے میں آج بھی تمہیں اپنا سمجھتی ہوں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آج کے بعد... یہ سب کچھ جاننے کے بعد تم مجھ سے نفرت کرنے لگو کہ میں وہ نرگس نہیں جسے تم نے پندرہ سال پہلے آخری بار دیکھا تھا۔ اب میں وہ نہیں بلکہ داشتہ ہوں کسی کی... طوائف ہوں ایک۔"

"نرگس۔" دانیال ایک دم صوفے سے اٹھا۔ اس کے لہجے میں شدید کرب تھا۔ "ایسے الفاظ اپنی زبان پر مت لاؤ۔" اس کی آواز میں لرزش تھی اور وہ یہ کہتا ہوا کھڑکی کے پردوں کے قریب تک چلا گیا۔ اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس کی محبت اس کے دل میں آج بھی زندہ تھی، اس نے پندرہ سال تک ایک اذیت ناک زندگی گزاری تھی۔

"دانیال!"

دانیال نے محسوس کیا کہ نرگس اس کے عقب میں بالکل قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت قلیل توقف سے بولی۔ "مجھے خیال نہیں تھا کہ اب بھی تمہیں وہ الفاظ گراں گزر جائیں گے جو میں نے اپنے لیے کہے تھے۔"

"تم نے میری محبت کا بہت کم اندازہ لگایا نرگس۔" دانیال کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "تمہارا یہ یقین بالکل غلط ہے کہ میں نے شادی کر لی ہوگی۔ میں نے تو یہ سارا عرصہ تمہاری یادوں کے سائے میں گزارا ہے۔"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ نرگس فوراً کچھ نہیں بول سکی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی ہوگی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں آیا ہوگا کہ پندرہ سال تک دانیال اس کی محبت میں ڈوبا رہے گا اور شادی کرنے کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آئے گا۔

"دانیال!" کچھ وقفے کے بعد اس کی آواز ایسی تھی جیسے رو پڑی ہو۔

دانیال تیزی سے مڑا۔ نرگس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک چکے تھے۔ دانیال نے اپنے ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھ دیے اور شدید جذباتی لہجے میں بولا۔ "تم میرے لیے آج بھی وہی ہو جو پندرہ سال پہلے تھیں۔ آج میں نے تم سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس میں میری ایک غرض بھی تھی لیکن اب اس بارے میں بات کرنے سے پہلے میں تم سے کہوں گا کہ میں آ گیا ہوں تو اب تم ارشدالزماں کو دھتکار دو۔ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کر دو۔ میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارا جسم پندرہ سال تک کسی اور کی آغوش میں رہا ہے۔ مجھے تمہارے جسم سے نہیں، تم سے محبت ہے نرگس۔"

نرگس روتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔

دانیال پھر بولا۔ "میری یہ باتیں کوئی سنے تو شاید انہیں کتابی باتیں قرار دے۔ افسانوی باتیں قرار دے... لیکن ایسی باتیں کرنے والے ناواقف ہوں گے کہ محبت کی روح کیا ہوتی ہے۔"

نرگس اس کے سینے سے لگی روتی رہی۔ دانیال محبت کے بارے میں بہت کچھ کہتا رہا۔ نرگس کی جذباتیت کا ابال کم ہونے میں کچھ وقت لگا پھر دانیال اسے سہارا دے کر بستر تک لے گیا۔ اسے لٹا کر دانیال نے اپنا ایک ہاتھ تکیے پر رکھ دیا اور نرگس کی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ "اب تمہیں اپنے اذیت ناک پندرہ سال ہمیشہ کے لیے بھلا دینا ہے۔"

"خوش قسمت ہوں میں۔" نرگس بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بہت خوش قسمت کہ تم اب بھی مجھے اپنانے کے لیے تیار ہو لیکن... جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ کچھ دن بعد ہو سکے گا۔"

"کیوں؟"

نرگس نے دانت پیسے۔ "پہلے مجھے ارشدالزماں سے انتقام لینا ہے اپنا۔ میرے لیے اس کے دل میں محبت کبھی نہیں رہی۔ صرف ہوس تھی اور ہوس ہی آج بھی ہے۔ میں اس کا حساب لوں گی اس سے۔"

"کیا مطلب؟" دانیال کے لہجے میں حیرت تھی۔

نرگس یکایک وحشت زدہ سی نظر آنے لگی۔ اس نے دانیال کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ "امان کی پیدائش کے بعد ہی میرے دماغ میں یہ خیال پکنے لگا تھا کہ مجھے ارشدالزماں سے اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہیے اور پھر میں نے انتقام لینے کا ایک انوکھا طریقہ بھی سوچ لیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ امان کی پرورش ایک خاص طریقے سے کروں گی اور جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اسی کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی گولیاں ارشدالزماں کا سارا جسم چھلنی کریں گی۔ اسی کا بیٹا اس سے میرا انتقام لے گا۔"

"پاگل پن کا یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔" دانیال نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا یہ نہیں سوچا تم نے کہ اس کے بعد امان کا کیا ہوگا؟ کیا وہ قانون کے شکنجے سے بچ سکے گا؟"

"نہ بچے۔" نرگس کی وحشت زدگی قائم رہی۔ "میں اپنا انتقام تو لے لوں گی۔"

دانیال نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔ "ہوش میں آؤ... اس طرح تم خود بھی نہیں بچ سکو گی قانون کی گرفت سے اور اب تمہیں پا لینے کے بعد میں تمہیں دوبارہ نہیں کھو سکتا۔"

شانے جھنجوڑنے سے نرگس اس طرح چونکی جیسے انتقام کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اپنے ہوش میں نہیں رہی تھی۔

دانیال پھر بولا۔ "اب تمہیں سب کچھ بھول کر میری

زندگی کا، میرے مستقبل کا ساتھی بننا ہے۔ میں اب تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنے دوں گا۔''

نرگس اس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔۔ یک بارگی اس نے دانیال کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اٹھنے کی کوشش کی۔ دانیال نے اسے سنبھالا۔

''بس اب رونہیں۔'' وہ بولا۔

لیکن نرگس اس سے لپٹ کر پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''خود کو سنبھالو۔'' دانیال نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ لوڈ شیڈنگ کا وقت ختم ہو جائے، میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

کمرے میں وال کلاک تھا۔ دانیال کی نظر اس پر گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن ڈی ایس پی دانش نے تیسرے پہر کو دانیال کا استقبال کیا۔

''سر!'' وہ بولا۔ ''آج آپ کہیں بہت مصروف۔۔۔''

دانیال نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ''اگر آپ کوئی خاص بات بتانا چاہتے ہیں تو کمرے میں بیٹھ کر ہی بتایئے گا۔''

دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ آس پاس موجود کوئی پولیس والا کوئی خاص بات سنے۔ اس نے کمرے میں پہنچنے کے بعد ڈی ایس پی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے اور خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، اب بتایئے۔''

''میں نے دو مخبروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ چاند اسٹور پر نظر رکھیں اور اگر گزدر دکان میں جاتا نظر آئے تو کچھ خریدنے کے بہانے دکان کے قریب جا کر دیکھا جائے کہ وہاں گزدر کیا کر رہا ہے۔ آٹھ بجے اسٹور بند ہو جاتا ہے لیکن ساڑھے آٹھ بجے گزدر وہاں پہنچا۔ دکان میں پڑے ہوئے تالوں کی چابیاں اس کے پاس بھی تھیں۔ وہ دکان کھول کر اندر گیا اور اندر سے ہی شٹر بند کر لیا۔ پھر وہ کوئی پون گھنٹے بعد شٹر کھول کر باہر آیا اور تالے لگا کر چلا گیا۔''

''گڈ۔'' دانیال نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ اس رپورٹ کو سن کر چونکا نہ ہو۔

ڈی ایس پی نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''اور آج صبح کی رپورٹ یہ ہے کہ اسٹور کھلنے کے پندرہ منٹ بعد ہی گزدر وہاں پہنچا تھا اور دکان کے اندر چلا گیا تھا۔ مخبر کچھ سامان خریدنے کے بہانے دکان کے قریب گیا تو دکان میں اسے گزدر دکھائی نہیں دیا۔''

''سمجھ گیا۔ وہاں بھی کوئی سرنگ ہے۔'' دانیال مسکرایا۔

''سرنگ؟ کیا مطلب سر؟ آپ کا مطلب ہے کہ۔۔۔''

''اس کے علاوہ کوئی رپورٹ؟'' دانیال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا پھر بولا۔ ''میں نے گلی نمبر سات کے سامنے والے کسی بنگلے کے بارے میں کچھ کہا تھا آپ سے؟''

''جی ہاں، بندوبست ہو گیا ہے۔ گلی کے بالکل سامنے والے بنگلے میں تو ایک ایسی فیملی ہے جو ان جرائم پیشہ افراد سے بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ پولیس سے تعاون کے نتیجے میں انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ بہت ہی ڈرپوک یا محتاط ہے وہ ڈاکٹر، اس لیے۔۔۔''

''ڈاکٹر؟'' دانیال نے بات کاٹی۔

''جی ہاں، ڈاکٹر فیض۔'' ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ''خاصا ضعیف بھی ہے وہ۔۔۔ اوپر کی منزل پر رہتا ہے۔ نیچے گراؤنڈ فلور پر اس کا کلینک ہے اور وہ بھی چھوٹے سے حصے میں۔ باقی حصہ خالی ہی ہوگا۔ لیکن خیر۔۔۔ میں نے اس پر دباؤ نہیں ڈالا۔ اس کے برابر والے بنگلے کے مالک سے بات کر کے مسئلہ طے ہو گیا۔ وہ کاغذ کا بیوپاری ہے۔ سوئڈن سے کاغذ امپورٹ کرتا ہے۔ گراؤنڈ فلور کو اس نے گودام بنا رکھا ہے۔ رہتا وہ بھی اوپر کی منزل پر ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ شاید کوئی ملازم وغیرہ ہو۔ اس کی فیملی حیدرآباد میں رہتی ہے۔ وہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں میں نے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ آٹھ آٹھ گھنٹے سے ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔''

''نام کیا ہے اس امپورٹر کا؟''

''واجد علی۔''

''نگرانی کس جگہ سے کی جائے گی؟''

''برآمدے میں تین دروازے ہیں۔ سامنے اور دائیں بائیں۔ اس نے دائیں جانب کا کمرا ہمیں دے دیا ہے۔ کاغذ کے رم وہاں بھی بھرے ہوئے ہیں لیکن اتنی جگہ ہے کہ وہاں ہمارا ایک آدمی آرام کر سکتا ہے۔''

''آرام کر سکتا ہے؟ کیا مطلب؟ نگرانی کون کرے گا؟''

''نگرانی اس کمرے کی کھڑکی سے تو نہیں کی جا سکتی احاطے کی دیوار کے قریب سیڑھی پر چڑھ کر نگرانی کرنا ہوگی۔ سیڑھی بھی واجد علی نے خود مہیا کی ہے۔ آہنی سیڑھی ہے۔ اسی پر بیٹھ کر نگرانی کرنا ہوگی۔ اور ایک ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔''

''ایک گھنٹے بعد۔'' دانیال سوچتے ہوئے بولا۔ ''یعنی ہر گھنٹے بعد نگرانی میں تھوڑا سا وقفہ آئے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک اترے گا تو دوسرا چڑھے گا۔ نگرانی ہر گھنٹے بعد پندرہ سولہ سیکنڈ کے لیے تو رکے گی۔''

''جی ہاں، اتنا وقفہ تو آئے گا۔''

''اس وقفے میں بھی کچھ ہو سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ نظر میں نہیں آ سکے گا۔''

''یہ تو ہے سر۔۔۔ یہ چانس تو ہمیں لینا پڑے گا یا پھر اگر کچھ اور ہو سکتا ہے تو آپ فرمائیں۔''

اسی وقت ایک کانسٹیبل نے اندر آ کر دانیال سے کہا کہ آئی جی نے ہیڈ کوارٹر سے کسی اے ایس آئی کے ہاتھ کوئی لفافہ بھجوایا ہے۔

دانیال نے اے ایس آئی کو فوراً بلوایا۔ اس نے اندر آ کر سیلوٹ کیا اور دانیال کی طرف ایک لفافہ بڑھایا۔ دانیال نے لفافہ لے کر اے ایس آئی کو رخصت کیا اور لفافہ چاک کیا۔

ڈی ایس پی دانش خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ کوئی فوٹوگراف تھا جو لفافے سے نکلا تھا۔ دانیال کی نظریں چند لمحوں کے لیے فوٹوگراف پر جم کر رہ گئیں۔ پھر اس نے فوٹوگراف میز پر اوندھا رکھا اور نظریں جھکائے کچھ سوچنے لگا۔

''کیا آیا ہے سر؟'' ڈی ایس پی دانش بے چینی سے پوچھ بیٹھا۔

دانیال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''ہماری نفری مکمل ہے اس وقت؟''

''جی ہاں۔'' ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ''ایس آئی، اے ایس آئی، کانسٹیبل، سب ہیں جن کی اس وقت ڈیوٹی ہوتی ہے۔''

''اس کے باوجود ریڈ کرنے کے لیے یہ نفری کم ہے اس لیے دوسرے تھانوں سے بھی منگوانا پڑے گی۔''

ڈی ایس پی چونکا۔ ''ریڈ کرنا ہے؟''

''ہاں۔ کالا سانپ کو گرفتار کرنا ہے۔''

''وہ ہاتھ نہیں لگ سکتا سر۔۔۔ ریڈ کے وقت ہی

تنہائی

علاقے سے غائب ہو جاتا ہے۔ کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے۔''

''آپ یہاں تو سب کو الرٹ کریں۔'' دانیال نے میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فونز میں سے ایک کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں دوسرے تھانوں سے نفری منگواتا ہوں۔ آپ سب کو احاطے میں جمع کیجیے۔ میں انہیں آپریشن کی ہدایات دینے کے بعد جسے مناسب سمجھوں گا، اسے یہاں چھوڑ دیا جائے گا۔''

ڈی ایس پی کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا لیکن وہ اور کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کر سکا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

پانچ منٹ کے اندر اندر پولیس اسٹیشن کا ہر فرد احاطے میں تھا۔

دانیال جب باہر آیا تو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپ لوگ۔'' دانیال نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''میری طرف منہ کر کے ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔''

فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ ڈی ایس پی دانش بھی قطار میں جانا چاہتا تھا لیکن دانیال نے اسے روک لیا۔ ''آپ نہیں۔'' پھر اس نے باقی لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب اپنے اپنے موبائل اپنی جیبوں سے نکالیں اور یہاں لا کر رکھ دیں۔'' اس نے قریب میں ایک جانب اشارہ کیا۔

جلد ہی سب موبائل ایک جگہ ڈھیر ہو گئے۔

دانیال نے ایک سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سارے موبائل آپ میرے کمرے میں

پہنچا ئیں۔" پھر وہ ڈی ایس پی سے بولا۔ "آپ ان سب لوگوں کو اپنے کمرے میں لے جائیں۔"

ڈی ایس پی نے ان سب کو اشارہ کیا۔ جلد ہی وہ سب ڈی ایس پی کے ساتھ اس کے کمرے میں جمع تھے۔ چہروں سے الجھن مترشح تھی۔ جلد ہی وہ سب انسپکٹر بھی آ گیا جو موبائل دانیال کے کمرے میں چھوڑنے گیا تھا۔

خاصی دیر بعد ڈی ایس پی دانش کے موبائل پر دانیال کی کال آئی۔

"دو موبائل نمبر لکھیے۔" دانیال نے اس سے کہا۔

ڈی ایس پی نے اس کے بتائے ہوئے نمبر لکھے۔ ایک نمبر لکھتے ہوئے اس نے ایک کانسٹیبل کی طرف اور دوسرا نمبر لکھتے وقت ایک اور کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ اس کے علم میں تھا کہ وہ موبائل نمبرز ان دونوں کانسٹیبلوں کے تھے۔

پھر دانیال کی ہدایت کے مطابق وہ ان دونوں کانسٹیبلوں کو لے کر دانیال کے کمرے میں پہنچا۔ دونوں کانسٹیبلوں کے چہرے کچھ عجیب سے ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام ابراہیم اور دوسرے کا نام مختار تھا۔

دانیال کے ہاتھ میں دو موبائل تھے۔ باقی موبائل میز پر رکھے ہوئے تھے۔

"تو تم دونوں ہو۔" دانیال نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ غصے کے باوجود وہ سخت لہجے میں بہت کم بات کرتا تھا۔

ان دونوں کی نظریں جھک گئیں۔

دانیال نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب آپ ان سب لوگوں کو احاطے میں جمع کر رہے تھے، اس پانچ چھ منٹ کے دوران میں ان دونوں کے علاوہ کسی نے بھی اپنا موبائل استعمال نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک ہی نمبر پر کالز کی تھیں اور وہ نمبر کالا سانپ کا ہے۔"

ڈی ایس پی چونکا اور دونوں کانسٹیبلوں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کالا سانپ کو ان سے اطلاع مل جاتی ہو گی کہ ریڈ کیا جانے والا ہے۔" دانیال پھر بولا۔ "ظاہر ہے کہ پھر وہ اپنے علاقے سے غائب تو ہو گا۔"

"میں ان دونوں کو..." ڈی ایس پی کا لہجہ بے حد غصیلا تھا۔

دانیال نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور دونوں کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب تم دونوں پھر کالا سانپ کو فون کرو گے اور اسے اطلاع دو گے کہ ریڈ کا پروگرام اچانک کسی وجہ سے کل رات تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔"

"معاف کر دیجیے صاحب۔" مختار گڑگڑایا۔

"غلطی ہو گئی صاحب۔" ابراہیم تو جیسے رونے لگا۔

دانیال بولا۔ "فون کرتے وقت موبائل کے اسپیکر کھلے رکھنا۔ میں دوسری طرف سے آنے والی آواز بھی سننا چاہتا ہوں۔"

ان دونوں کو اپنے اپنے موبائل سے کالز کرنا ہی پڑیں۔ مختار کی بات سن کر کالا سانپ نے اسے ایک موٹی سی گالی دی تھی۔ اس کا کچھ اسی قسم کا ردِعمل ابراہیم کی کال پر بھی ہوا تھا۔

دانیال نے ڈی ایس پی سے کہا۔ "ان دونوں کے سلسلے میں جو کچھ کرنا ہے، وہ تو کرنا ہی ہو گا۔ فی الحال آپ ان دونوں کو لے جا کر حوالات میں ڈالیے اور میرے پاس آیئے... کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اور ہاں... سب انسپکٹر سے کہہ دیجیے گا کہ وہ آ کر باقی لوگوں کے موبائل لے جائے اور ایک اے ایس آئی کو بھی حوالات میں ان دونوں کے سر پر مسلط کر دیجیے گا۔"

ڈی ایس پی نے ان دونوں کو ایک ایک تھپڑ لگایا اور کمرے سے لے گیا۔ جب وہ دونوں کو حوالات میں چھوڑ کر اور ایک اے ایس آئی کو ہدایات کے ساتھ ان دونوں کے سر پر مسلط کر کے واپس آیا تو دانیال موبائل پر کسی سے اپنی گفتگو ختم کر رہا تھا۔ ڈی ایس پی صرف ایک جملہ سن سکا جس کے بعد دانیال نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس ایک جملے سے ڈی ایس پی صرف اتنا سمجھ سکا کہ بات بکتر بند گاڑیوں کی تھی۔

"بیٹھیے۔" دانیال نے اس سے کہا۔ "آج رات سارا کھیل ختم کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بھی میری مدد کر رہی ہے ورنہ شاید اتنی جلدی یہ سب کچھ نہ ہو پاتا۔ ابھی مجھے فرحان، صدیق اور جاوید کو بھی فون کر کے ہدایات دینی ہیں۔"

ڈی ایس پی فرحان، ڈی ایس پی صدیق اور ڈی ایس پی جاوید بھی دانیال کے ماتحت تھے اور اس کے علاقے کے مختلف پولیس اسٹیشنز پر بیٹھتے تھے۔

"آج ہی رات؟" ڈی ایس پی دانش کچھ حیرت سے بولا۔

"ہاں۔" دانیال نے کہا اور پھر لفافے سے فوٹو گراف نکال کر ڈی ایس پی کی طرف بڑھا دیا۔

"بلائنڈ ماسٹر۔" ڈی ایس پی فوٹو گراف دیکھتے ہی

چونکا۔ پھر تیزی سے بولا۔ "جب اس کے سر کی قیمت رکھی گئی تھی تو میں نے اخبارات میں بھی اس کی تصویر دیکھی تھی۔"

"ابھی آپ کو سارا پروگرام بتاتا ہوں۔ پہلے ذرا فرحان، صدیق اور جاوید کو ہدایات دے دوں۔" دانیال نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

ڈی ایس پی نے فوٹو گراف کی طرف دیکھتے ہوئے شاید اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہا لیکن دانیال کو نمبر ڈائل کرتے دیکھ کر خاموش رہ گیا۔

☆☆☆

رات کے دو بجے تھے جب علاقے کی ساری فضا خوف ناک دھماکوں سے لرزنے لگی۔ ہر طرف شعلے لپکتے نظر آنے لگے۔ گولیاں کھا کر زخمی ہونے یا مرنے والوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ کئی پولیس موبائلوں پر لگے ہوئے اسپیکرز سے اعلان کیا جا رہا تھا کہ مقامی لوگ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں۔

کالا سانپ کے علاقے پر ڈی ایس پی جاوید کی کمان میں... ریڈ کیا گیا تھا۔ اس علاقے کے لیے اس کا انتخاب دانیال نے اس لیے کیا تھا کہ پہلے تین ناکام ریڈ بھی ڈی ایس پی جاوید ہی کی کمان میں کیے گئے تھے۔ وہ اس علاقے سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا۔

اس آپریشن میں سب انسپکٹرز اور اسسٹنٹ سب انسپکٹرز بھی شامل تھے جو سپاہیوں کے ساتھ بکتر بند گاڑیوں کی آڑ سے فائرنگ کرتے ہوئے بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ ہی آگے بڑھ رہے تھے۔

یہ آپریشن سابقہ آپریشنز سے قطعی مختلف تھا۔ پولیس ہر طرف پھیل کر فائرنگ نہیں کر رہی تھی۔ دونوں بکتر بند گاڑیاں ایک ہی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھیں جن میں سے ایک میں ڈی ایس پی فرحان موجود تھا۔

فرحان کے ایک ہاتھ میں موبائل اور دوسرے ہاتھ میں واکی ٹاکی تھی۔ واکی ٹاکی پر وہ اپنے ساتھ آنے والی پولیس کے دو سب انسپکٹروں سے رابطے میں تھا جبکہ موبائل پر اسے قادر سے رابطے میں رہنا تھا جس سے اسے گزدر کے بارے میں رپورٹ ملتی رہتی کہ وہ کس وقت کہاں ہے۔

مقابلہ کیونکہ دھواں دھار ہو رہا تھا اس لیے امکان نہیں تھا کہ گزدر کسی ایک ہی جگہ رکا رہتا لیکن قادر کو ہر ممکن کوشش کرنا تھی کہ وہ گزدر کی پوزیشن سے آگاہ رہے اور فرحان کو بھی باخبر رکھے۔

دانیال سے ملاقات میں تو قادر کی شکایت کالا سانپ ہی سے تھی لیکن ہمدرد تو وہ بلائنڈ ماسٹر کا بھی نہیں تھا۔ دانیال نے اس سے فون پر ہی بات کی تھی اور وہ دل و جان سے دانیال کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

فرحان کو کوشش کرنا تھی کہ گزدر کسی طرح اس کے ہاتھ لگ جائے لیکن ایسا نہ ہونے کی صورت میں بھی اسے چاند اسٹور تک پہنچنا تھا۔ دانیال کے خیال کے مطابق وہاں سے کسی سرنگ کا خفیہ راستہ مل سکتا تھا۔

نرگس کیونکہ جوجی کے ذریعے ایک سرنگ کے راستے بلائنڈ ماسٹر تک پہنچی تھی، اس لیے دانیال کو بڑی حد تک یقین تھا کہ چاند اسٹور کی طرف سے کوئی دوسری سرنگ ہو گی جسے بلائنڈ ماسٹر تک پہنچنے کے لیے گزدر استعمال کرتا ہو گا۔

علاقے میں دوسری جانب سے پیش قدمی کرنے والے ڈی ایس پی صدیق کو اس ورک شاپ تک پہنچنا تھا جہاں سے نرگس، جوجی کے ساتھ ایک سرنگ میں گئی تھی۔ نرگس نے اس بارے میں دانیال کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسے اپنے جرائم پیشہ بھائی سے نہ محبت تھی، نہ ہمدردی۔ وہ اسے صرف امان کو تربیت دینے کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی لیکن دانیال نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ارشد سے انتقام لینے کے لیے اس کا طریقہ کار اسے اور امان کو بھی قانون کے شکنجے میں پہنچا دے گا۔

نرگس کو بھی یہ اندازہ شروع ہی سے ہو گا جس کے لیے وہ ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھی لیکن بدلے ہوئے حالات نے اس کا ذہن بھی تبدیل کر دیا تھا۔ پندرہ سال تک پچھتانے کے بعد اس کے لیے ایسے حالات بن گئے تھے کہ دانیال دوبارہ اس کی زندگی میں آ سکتا تھا۔

آپریشن کے دوران میں جس طرح فرحان کو قادر سے رابطہ رکھنا تھا، اسی طرح صدیق علاقے کے دوسرے مخبروں سے رابطے میں تھا جنہیں جوجی پر نظر رکھنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

جوجی اور گزدر کے ہاتھ نہ لگنے کی صورت میں سرنگ کے خفیہ راستے کھولنے میں فرحان اور صدیق کو مشکل پیش آ سکتی تھی لیکن انہیں ہر صورت میں ان منازل تک پہنچنا تھا جو دانیال نے ان دونوں کے لیے متعین کی تھیں۔ چاند اسٹور اور ورک شاپ۔

خود ایس پی دانیال اور ڈی ایس پی دانش کہاں تھے، اس کا علم فرحان اور صدیق کو نہیں تھا۔ دونوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ کسی تیسری جانب سے علاقے میں داخل ہوئے ہوں گے۔ ایس پی دانیال سے ان دونوں کا رابطہ

اس طرح قائم تھا کہ وہ صورتِ حال کی رپورٹ ایس ایم ایس کے ذریعے دانیال کو دے رہے تھے اور ایس ایم ایس ہی کے ذریعے انہیں دانیال کی ہدایات مل رہی تھیں۔

پولیس کے پیچھے اس وقت ایمبولینسیں بھی حرکت میں آچکی تھیں، جب انہیں زخمی ہونے اور مرنے والوں کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں۔

''سر!'' ڈی ایس پی فرحان کو واکی ٹاکی پر سب انسپکٹر کی رپورٹ ملی۔ ''ہمارے تین اہلکار زخمی ہو چکے ہیں سر لیکن ہمارے دشمن کو خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔''

دوسری طرف صدیق کو اپنے چار اہلکاروں کے زخمی ہونے اور ایک کے مرنے کی اطلاع ملی تھی۔

پھر اس اطلاع نے فرحان اور صدیق، دونوں ہی کو دھچکا پہنچایا جب انہیں وقفے وقفے سے یہ اطلاعات ملیں کہ پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے جوجی اور گزدر دونوں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

فرحان کی بکتر بند اس وقت چاند اسٹور کے قریب پہنچ چکی تھی۔

فائرنگ کے شور سے تو ایک قیامت برپا تھی ہی کہ پے در پے تین بہت خوف ناک دھماکے ہوئے۔ پولیس پر گرینیڈ برسائے گئے تھے جن سے زیادہ سپاہیوں کی ہلاکت یقینی امر تھی۔ ایک گرینیڈ فرحان کے ساتھ آنے والی بکتر بند گاڑی پر پڑا تھا۔

اس وقت دونوں گاڑیاں چاند اسٹور کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھیں۔ یہاں پہنچنے کے لیے فرحان نے اس علاقے کا وہ نقشہ استعمال کیا تھا جو اسے دانیال سے ملا تھا۔

گولیاں برسا کر چاند اسٹور کے تالے توڑ دیے گئے۔ دونوں بکتر بند گاڑیاں اس طرح کھڑی کی گئی تھیں کہ اسٹور کا تالا توڑنے والے سپاہی کسی طرف سے آنے والی گولی کا شکار نہ ہو سکیں۔

تالے ٹوٹ جانے کے بعد دکان کا شٹر کھولنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پولیس اسٹور میں داخل ہو گئی۔ ان میں ایس پی فرحان بھی تھا۔ شٹر دوبارہ گرا کر اسٹور کی اندرونی لائٹس جلالی گئیں۔

دیواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھا گیا لیکن کہیں شبہ نہیں ہو سکا کہ دوسری طرف خلا ہوگا۔ فرش بھی ٹھوس معلوم ہوا۔

''یہ کارٹن ہٹاؤ۔'' فرحان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ایک جگہ تین بڑے بڑے کارٹن رکھے ہوئے تھے۔ انہیں ہٹانے پر ایک چوڑا سلیب نظر آیا جس میں ایک کنڈا بھی لگا ہوا تھا۔ اس کنڈے کو پکڑ کر زور لگایا گیا تو وہ کنڈے ہی کی جانب سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔

گہرائی میں زینے نیچے جاتے نظر آئے۔

پولیس کے اس آپریشن سے بلائنڈ ماسٹر بھی بے خبر نہیں رہا تھا۔

اس کے سامنے بہت سے موبائل رکھے ہوئے تھے کبھی وہ ایک موبائل اٹھا کر اپنے کسی آدمی کو ہدایات دیتا اور کبھی دوسرا موبائل اٹھا کر ہدایات جاری کرتا۔ اپنے آدمیوں سے صورتِ حال کی اطلاعات اسے بھی برابر مل رہی تھیں۔ ابتدا میں وہ زیادہ پریشان نظر نہیں آیا تھا لیکن جوجی اور گزدر کی ہلاکت کی اطلاع نے اسے بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ وہ بکتر بند گاڑیوں کو راکٹوں کا نشانہ بنوا دیتا لیکن راکٹ اور راکٹ لانچر کس خفیہ مقام پر چھپائے گئے تھے، اس مقام کا علم جوجی اور گزدر کے علاوہ اس کے کسی آدمی کو نہ تھا۔

پھر اسے یہ نہایت تشویش ناک اطلاعات بھی ملیں کہ دو بکتر بند گاڑیاں چاند اسٹور پر جا رکی تھیں اور دو گاڑیاں ورک شاپ کا پھاٹک توڑتی ہوئی اندر داخل ہو گئی تھیں۔

بلائنڈ ماسٹر کے منہ سے غراہٹ کی آواز نکلی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پولیس ان دونوں سرنگوں کا سراغ لگا چکی تھی۔ چاند اسٹور کی طرف سے راستہ تلاش کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری سرنگ کا میکنزم سمجھنا پولیس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوتا لیکن بلائنڈ ماسٹر پولیس کی موجودگی کے باعث اس راستے سے بھی فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

علاقے میں دھماکوں نے جو قیامت برپا کر رکھی تھی، اس کی بہت مدھم آوازیں بلائنڈ ماسٹر کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں مگر ان مدھم آوازوں ہی سے امان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ بلائنڈ ماسٹر کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے انکل؟'' وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔

اسی طرح بلائنڈ ماسٹر بھی ہر بار ایک ہی جواب دیتا تھا۔ ''گھبراؤ نہیں میرے بچے! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور اب بلائنڈ ماسٹر اس طرح اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا جیسے کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہو۔

''بس اب مقابلہ کرنا بیکار ہے۔'' آخر اس نے ایک موبائل پر اپنے کسی آدمی سے کہا۔ ''سب تک یہ پیغام پہنچا دو کہ راہ فرار اختیار کی جائے۔ میں کل کسی وقت تم لوگوں سے رابطہ کروں گا۔''

پھر اس نے تیزی سے اٹھ کر ایک الماری سے

کلاشنکوف نکال کر اپنے شانے سے لٹکائی لیکن پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ کلاشنکوف اتار کر واپس رکھی اور اپنی جیب تھپتھپائی جس میں آٹومیٹک ریوالور موجود تھا۔

اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر امان بھی کھڑا ہو چکا تھا۔

''آؤ۔'' بلائنڈ ماسٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک جانب قدم بڑھائے۔ اب اسے فرار ہونے کے لیے تیسرا راستہ اختیار کرنا تھا جس کا علم جوجی اور گزدر کو بھی نہیں تھا۔

امان کے ساتھ وہ تیزی سے زینے اترا ہی تھا کہ ایک آواز آئی۔ ''اس وقت کہاں جا رہے ہیں واجد صاحب۔''

یہ آواز اس کانسٹیبل کی تھی جو احاطے کی دیوار کے ساتھ ایک گھوڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' بلائنڈ ماسٹر نے کوشش کی تھی کہ اس کی آواز سے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہ ہو۔ وہ پھاٹک کھولنے کے لیے بڑھا تھا۔ امان سے اس نے اپنی کار کے قریب رکنے کے لیے کہا تھا۔

برآمدے میں اتنی تاریکی تھی کہ بلائنڈ ماسٹر کا چہرہ دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

''آپ کا ملازم کہاں ہے؟'' کانسٹیبل پھر بولا۔ ''اور یہ بچہ...''

''تمہیں میرے معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔'' اس مرتبہ بلائنڈ ماسٹر کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

علاقے میں ہونے والے دھماکوں کی آوازیں وہاں صاف آ رہی تھیں۔

''اس وقت باہر نکلنے سے آپ بھی خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔'' کانسٹیبل نے سیڑھی سے اترتے ہوئے کہا۔

بلائنڈ ماسٹر تیزی سے پھاٹک کھول کر کار کی طرف لوٹا تھا۔

''میں اپنا تعارف کرا دوں۔'' کانسٹیبل پھر بولا۔ ''میں ایس پی دانیال ہوں۔''

بلائنڈ ماسٹر کار کا دروازہ کھولتے کھولتے چونک کر اتنی تیزی سے مڑا تھا کہ جیسے اس کے عقب میں دھماکا ہو گیا ہو۔

اسی وقت کسی نے پیچھے سے قینچی ڈال کر بلائنڈ ماسٹر کو بے بس کرنے کی کوشش کی۔ وہ ڈی ایس پی دانش تھا جو دانیال ہی کی طرح کانسٹیبل کی وردی میں تھا۔

''انکل...'' امان گھبرا کر چیخا۔

دانیال تیزی سے بلائنڈ ماسٹر کی طرف بڑھا تھا۔ اسی وقت بلائنڈ ماسٹر نے اپنا سر بڑی تیزی سے پیچھے کرتے ہوئے ڈی ایس پی کی پیشانی پر ایک زوردار ٹکر ماری اور اپنی دونوں ٹانگیں اوپر کرتے ہوئے دانیال کے سینے پر لاتیں مار دیں۔

یہ دانیال کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ جھٹکا کھا کر پیچھے کی طرف زمین پر گرا۔ بلائنڈ ماسٹر، ڈی ایس پی دانش کے شکنجے سے بھی نکل چکا تھا۔ اس نے تیزی سے ریوالور نکال کر دانیال پر کئی گولیاں برسا دیں۔ دانیال نے خود کو تیزی سے بچانے کی کوشش کی تھی پھر بھی اس کا ایک بازو زخمی ہو گیا۔

ڈی ایس پی دانش نے بلائنڈ ماسٹر کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کر دیا اور ریوالور کی باقی گولیاں ہوا میں چلی گئیں۔

اسی وقت ایک موبائل تیزی سے پھاٹک کے سامنے آ کر رکی۔ وہ کچھ ہی فاصلے پر موجود رہی تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر کو پہلے ہی ہدایت دی جا چکی تھی کہ اسے موبائل کس وقت پھاٹک پر لانا ہے۔

بلائنڈ ماسٹر ڈی ایس پی دانش سے لپٹ پڑا تھا۔ لیکن اسے ان کانسٹیبلوں نے جکڑ لیا جو کود کر موبائل سے اترے تھے۔ فوراً ہی بلائنڈ ماسٹر کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

امان کار سے چپکا پلکیں جھپکائے بغیر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بلائنڈ ماسٹر کی گرفتاری اتنی جلدی ممکن نہ ہوتی اگر دانیال کو قادر سے چاند اسٹور اور گزدر کا علم نہ ہوتا اور نرگس اسے اس سرنگ کے بارے میں نہ بتاتی جس میں وہ جوجی کے ساتھ گئی تھی۔

ان دونوں باتوں کے علاوہ سب سے اہم وہ فوٹوگراف تھا جو اس دن سہ پہر کو دانیال نے ڈی ایس پی دانش کو دکھایا تھا۔

بلائنڈ ماسٹر کی عادت تھی کہ وہ کبھی کبھی اس بنگلے کی ایک کھڑکی میں کھڑا ہو کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے اس علاقے کا جائزہ لیا کرتا تھا جہاں اس نے اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ اسے یہ علم تو ہو چکا تھا کہ گلیوں پر پولیس نے کیمرے لگا دیے تھے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کیمرے کی زد پر گلی میں داخل ہونے والے ہی نہیں بلکہ اس کا بنگلا بھی پہلی منزل تک نظر آتا تھا۔

گلی میں داخل ہوتے وقت نرگس کی جو تصویریں بنی تھیں، اس وقت بلائنڈ ماسٹر بھی بنگلے کی کھڑکی میں کھڑا ہوا تھا۔ ان تصویروں میں اس کا چہرہ نمایاں نہیں تھا۔ دانیال نے بھی یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ اس بنگلے میں رہنے والا کوئی شخص ہوگا لیکن جب اسے نرگس سے سرنگ کے بارے میں معلوم ہوا تو اسے خیال آیا کہ وہ سرنگ سڑک پار کے کسی بنگلے تک گئی ہو۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ شاید وہ وہی بنگلا ہو جو نرگس کی تصویر میں نظر آ رہا تھا اور اسی بنگلے کی کھڑکی

میں کوئی شخص بھی کھڑا تھا۔

یہ شبہ ہو جانے کے بعد ہی اس نے ہیڈ کوارٹر جا کر... آئی جی کے ذریعے ڈارک روم کو ہدایت کروائی تھی کہ کھڑکی میں نظر آنے والے شخص کا چہرہ بڑا کر کے فوٹو گراف بنایا جائے۔ اتنا بڑا ہونے کی وجہ سے فوٹو گراف میں وہ چہرہ پھٹا پھٹا سا آیا تھا، پھر بھی اسے بلائنڈ ماسٹر کی حیثیت سے شناخت کیا جاسکتا تھا۔ ڈی ایس پی دانش نے اسے فوراً پہچان بھی لیا تھا۔

اب ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ براہِ راست اس بنگلے پر ہی چڑھائی کر دی جاتی لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ اگر بلائنڈ ماسٹر کو ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ ان سرنگوں میں سے کسی راستے سے فرار ہوسکتا تھا۔ اسی اندیشے کے تحت دانیال کو بڑا آپریشن کرنا پڑا تھا۔ پولیس جب سرنگوں تک پہنچتی تو بلائنڈ ماسٹر بنگلے کے پھاٹک... ہی سے فرار ہونے کی کوشش کرتا لہٰذا دانیال نے ڈی ایس پی دانش کے ساتھ ان کانسٹیبلوں کی جگہ سنبھال لی تھی جنھیں گلی نمبر سات کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔

☆☆☆

ڈھائی بجے رات سے ٹی وی چینلز نے اس آپریشن کی "بریکنگ نیوز" دی تھی اور یہ سلسلہ آپریشن ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہا تھا۔ یہ خبر بھی نشر کی گئی تھی کہ بلائنڈ ماسٹر کے علاوہ کالا سانپ کی گرفتاری بھی عمل میں آگئی تھی۔ اس آپریشن میں پولیس کے سات اہلکار ہلاک اور بائیس زخمی ہوئے تھے۔ کالا سانپ اور بلائنڈ ماسٹر کے سینتالیس آدمی ہلاک اور پچاسی زخمی ہوئے تھے جن میں سے سات کی حالت بہت نازک تھی۔ زخمیوں اور لاشوں کو اسپتال پہنچایا جاچکا تھا۔

رات گئے دانیال نے فون پر نرگس کو بتا دیا تھا کہ اب وہ آپریشن کرنے جارہا ہے اس لیے وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ خبریں سنتی رہی تھی اور کیمرے جو کچھ دکھاتے رہے تھے، دیکھتی رہی تھی۔

خبروں میں بلائنڈ ماسٹر کے ساتھ ایک بچے کا ذکر بھی آیا جسے اس ہنگامہ خیزی میں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا تھا۔

اس آپریشن کے مناظر دیکھنے کے ساتھ نرگس یہ کوشش بھی کرتی رہی تھی کہ موبائل پر دانیال سے رابطہ قائم ہو جائے لیکن ہر مرتبہ دانیال کا موبائل بند ہی ملا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے اس براہِ راست آپریشن کی نشریات ختم ہوئیں۔ نرگس بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ پھر موبائل کی گھنٹی بجنے پر اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا۔

اسے یقین تھا کہ دانیال کی کال ہوگی لیکن اسکرین پر ارشدالزماں کا نام دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"ہیلو!" اس نے کال ریسیو کی۔ اس کی آواز پتھرائی ہوئی سی تھی۔

"ابھی خبریں سنی ہیں میں نے ٹی وی پر۔" آواز آئی۔ "معلوم ہوا ہے کہ ایک نوگو ایریا میں آدھی رات سے پولیس کا آپریشن جاری تھا۔ دونوں گروہوں کے سرغنہ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔"

"میں سب کچھ دیکھتی رہی ہوں۔"

"ایس پی دانیال کا نام سنا ہے میں نے۔" ارشدالزماں بولا۔ "یہ وہی دانیال تو نہیں جو..."

"وہی دانیال ہے۔" نرگس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہی دانیال جسے کھو کر میں زندگی بھر پچھتاتی رہی ہوں۔"

"پچھتاتی رہی ہو؟ کیا مطلب؟"

"اب پالیا ہے میں نے اسے۔ بہتر ہوگا کہ تم اب میری طرف رخ نہ کرنا۔ جان ہی گئے ہو کہ اب وہ ایس پی ہے۔ میں تمھیں کوئی بھی الزام لگوا کر جیل میں سڑوا دوں گی۔"

"اچھا۔" ارشدالزماں ہنسا۔ "کیا مل چکی ہو اس سے؟"

"بہت جلد اس کی اور میری شادی ہو جائے گی۔"

"خوب۔" ارشدالزماں تلخی سے ہنسا۔ "کیا وہ میرے ناجائز بیٹے کا باپ بننے کے لیے تیار ہوگیا ہے؟"

"شٹ اپ۔" نرگس چیخ پڑی اور پھر اس نے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

ناشتا کیے بغیر وہ شدید غصے میں ٹہلتی رہی۔

آٹھ بجنے والے تھے جب انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ نرگس نے تیزی سے انٹرکام کے قریب جا کر ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے دانیال کی آواز آئی۔ نرگس فوراً ہی پلٹی۔ پھاٹک تک وہ تقریباً دوڑتی ہوئی گئی۔

باہر پولیس کی دو موبائلز کے بیچ میں دانیال کی بلٹ پروف کار کھڑی تھی۔ خود دانیال ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور پتلون پہنے پھاٹک پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ امان بھی تھا۔

"آؤ۔" نرگس نے کہنا چاہا لیکن خوشی سے اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ آواز نہیں نکلی۔

امان کے ساتھ دانیال اندر آگیا اور نرگس نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آگئی ہو۔

گینگ

امجد رئیس

جعل سازی بھی ایک فن ہے۔ مکر و فریب کے جال میں سب کو الجھانے کا سبب بننے والے ایک شاطر کی کارروائی ... وہ اس سے بے خبر تھا کہ کوئی اور بھی ہے جو اس سے زیادہ باخبر اور باریک بین ہے۔

جیل کی فضاؤں میں رچی بسی کہانی...... وارڈن اور ڈپٹی وارڈن کا انوکھا ٹکرا......

"نیا وارڈن پہنچ گیا ہے جناب۔"

ڈپٹی وارڈن فلیچر نے نگاہ اٹھا کر کلرک کو دیکھا۔

وارڈن اینڈرسن کو سیاسی وجوہات کی بنا پر ہٹا دیا گیا تھا۔ کئی ہفتے سے وارڈن کی پوسٹ خالی تھی۔ سیاست دانوں کی دخل اندازی کے بارے میں افواہوں اور چہ میگوئیوں کا سلسلہ جاری تھا مگر قیدیوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اگر نیا وارڈن نرم طبیعت کا ہوا تو قیدیوں کے پیرول کے معاملات آسان ہو جائیں گے۔ اگر کوئی سخت گیر وارڈن

آ گیا تو قیدیوں کے لیے بُری خبر ہوگی۔

جیل میں تین ہزار قیدی تھے اور سب کے سب عمر رسیدہ فلیچر کو اچھی طرح جانتے تھے۔

فلیچر اپنے آفس سے اٹھ کر ایڈمنسٹریشن بلاک کے اس حصے کی جانب چل پڑا جہاں وارڈن کا دفتر تھا۔ کئی وارڈن آئے اور گئے مگر فلیچر کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ نئے وارڈن کو بھی اسے بہت سی باتیں سمجھانی تھیں۔

نئے وارڈن کا نام جیمر تھا۔ جیمر نے خوش دلی سے فلیچر کا استقبال کیا اور بلا تکلف انکشاف کیا کہ یہ اس کے لیے نیا تجربہ ہوگا۔ فلیچر نے سوچا کہ یہ بھی کوئی سیاسی تبدیلی ہے۔ پہلے بھی وہ کئی بار اس قسم کے ناتجربہ کار وارڈنوں کو بھگت چکا تھا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت رہے گی۔" جیمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "گورنر نے تمہارے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔ کافی تعریف کی ہے تمہاری... کیا تم مجھے یہاں تھوڑا سا گھماؤ گے تاکہ میں معاملات سمجھنے کے لیے قید خانے سے مانوس ہونے کا آغاز کروں۔"

"کیوں نہیں، جناب۔" فلیچر نے معمول کے مطابق شائستگی کا مظاہرہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کے پاس تعیناتی کا لیٹر ہوگا؟"

"ہاں، یقیناً... یہ رہا۔" جیمر نے ایک لیٹر نکال کر آگے بڑھایا۔ جس کے مطابق گورنر نے اپنے قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے جیمر کو ریاستی جیل خانے کا وارڈن مقرر کیا تھا... وغیرہ وغیرہ...

"میں چاہتا ہوں۔" وارڈن نے کہا۔ "اسے فریم کروا کر یہاں دیوار پر آویزاں کروا دوں۔ کیا تم کسی قیدی سے ایک چھوٹا سا فریم بنوا دوگے؟"

"کیوں نہیں، مجھے خوشی ہوگی۔" فلیچر نے کہا۔ "میں اسے فریم کروا کے دے دوں گا۔"

"تو کیا ہم ایک راؤنڈ لگالیں؟"

"ہاں یہ اچھا رہے گا۔" فلیچر کھڑا ہو گیا۔

جیل کا رقبہ اچھا خاصا تھا۔ یہاں وسیع چار دیواری میں تیئس عمارتیں تھیں۔ چار دیواری کی اونچائی تیس فٹ تھی جس کا گھیرا ایک میل سے زیادہ بنتا تھا۔

سرسری راؤنڈ میں بھی دونوں کو تین چار گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ ڈپٹی وارڈن فلیچر، نئے وارڈن کو وقفے وقفے سے مختلف اُمور اور عمارتوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ گزشتہ تیس برسوں میں وہ ایسا متعدد بار کر چکا تھا۔

نیا وارڈن بھی، پچھلے دوسرے وارڈنوں کی طرح بہت سی باتوں سے لاعلم تھا۔ وہاں ہر طرح کے مجرم تھے۔ حتیٰ کہ سفید پوش اور کاروباری افراد بھی۔ قاتل اور لٹیروں کے ساتھ اسمگلر، بلیک میلر وغیرہ وغیرہ۔

"ڈونی کا گروپ بھی تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں، وہ تعداد میں سات ہیں۔ باقی بھی پکڑے جائیں گے۔"

"سنا ہے یہ ایک خطرناک گروہ ہے؟"

"نہیں، اتنا خطرناک بھی نہیں ہے۔" فلیچر نے جواب دیا۔

"ان کا رویہ کیسا ہے؟" جیمر نے پوچھا۔

"اب تک تو انہوں نے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کی ہے۔ چھوٹی موٹی خلاف ورزی کی انہیں ضرورت نہیں اور کوئی بڑی حرکت بھی نہیں کی ہے کہ "بلیک ہول" کی سیر کرانی پڑتی۔" فلیچر نے بلیک ہول کا ذکر کرنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ لیا تھا۔

"اوکے، شکریہ مسٹر فلیچر۔" وارڈن نے کہا۔ "میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔ بقیہ وزٹ کل پر رکھتے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ رات میں کچھ کتابی کام کر لیا جائے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" فلیچر نے جواب دیا۔ وہ معاً کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا... اسی انداز میں وہ اپنے دفتر واپس آ گیا۔ وہاں کرسی پر بیٹھ کر بھی وہ کچھ سوچتا رہا۔ معاً وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے فون پر ڈیلی ڈسپیچ کا نمبر ملایا۔ وہ منیجنگ ایڈیٹر سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ بالآخر اس کا رابطہ ایڈیٹر سے ہو گیا۔

"فریڈ تم ہو؟"

"ہاں، کیا بات ہے؟ تم فلیچر بات کر رہے ہو؟"

"ہاں، میں فلیچر بول رہا ہوں۔ تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔"

"کیوں نہیں۔" ایڈیٹر نے کہا۔ "جو تم چاہو۔"

☆☆☆

ڈیڑھ گھنٹے بعد فلیچر ڈیلی ڈسپیچ کے دفتر میں ایڈیٹر سے ایک لفافہ وصول کر رہا تھا۔

وہاں سے نکل کر وہ ٹیلی گراف آفس پہنچا اور ہیڈ کلرک سے ملا۔ "اچھے لڑکے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیس منٹ میں ٹرین اسپرنگ فیلڈ کے لیے نکل رہی ہے... میں چاہتا ہوں کہ یہ تم گورنر کے حوالے کر دو۔ خبردار کسی اور کے ہاتھ نہ لگے۔ میں گورنر کو فون کر دوں گا۔ وہ تمہارا منتظر رہے گا۔ یہ پانچ ڈالر پکڑو۔ کرائے میں تین ڈالر خرچ ہوں گے۔ چلو فوراً نکل جاؤ۔"

ہیڈ کلرک کو روانہ کرنے کے بعد فلیچر نے گورنر آفس میں بات کی اور سیدھا واپس قید خانے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ریکارڈ کلرک لوگان کو فون کیا اور ہدایت دی کہ فنگر پرنٹ پاؤڈر

لے کر فوراً اسے ملے... لوگان چند منٹ بعد ہی فلیچر کے دفتر میں آن دھمکا۔ وہ تیئس برس سے وہاں کام کر رہا تھا۔ فلیچر نے اسے کم ہی کام کہے تھے... لیکن یہ سب سے حیران کن تھا...

فلیچر نے ایک کاغذ اس کے حوالے کیا۔ لوگان کا منہ کھل گیا۔ "آپ کا مطلب ہے... کہ میں..."

"ہاں ٹھیک سمجھے ہو... کاغذ پر پاؤڈر استعمال کرو۔ اس پر میری انگلیوں کے نشان بھی ہوں گے۔ ان کے علاوہ جو نشان ہیں ان کے بارے میں بتاؤ؟"

"اوکے سر۔" لوگان اپنے کام میں لگ گیا۔ یہ گورنر کی جانب سے ایک خط تھا۔ "انگلیوں کے بارہ نشانات ہیں اس پر۔" کچھ دیر بعد لوگان نے اطلاع دی۔

فلیچر نے ایک سادہ کاغذ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا پھر وہ کاغذ لوگان کے حوالے کر دیا۔ "بارہ نشانات میں سے میری انگلیوں کے نشان الگ کرو۔"

لوگان نے سادہ کاغذ پر پاؤڈر چھڑکا اور جیب سے ایک پوائنٹر کے ساتھ طاقتور محدب عدسہ نکالا۔ اس کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے دونوں اشیا جیسے اس کے جسم کا حصہ تھیں۔ وہ پھر دونوں کاغذات پر جھک گیا۔

"پانچ نشانات کسی اور کے ہاتھ کے ہیں۔" ذرا دیر بعد لوگان نے بتایا۔

"پانچوں کو کلاسی فائی کر سکتے ہو؟"

"بالکل۔" وہ زیادہ انہماک سے خط نما کاغذ پر جھک گیا۔ اس نے نشانات کی باریکیوں کو بغور چیک کیا پھر ملا کر دیکھا۔ پوائنٹر سے کچھ لکھا پھر ری چیک کیا۔

"اوکے۔" لوگان سیدھا ہو گیا۔ "اگر یہ کوئی خط ہے تو اس پر تیسرے ہاتھ کے نشان بھی ہونے چاہئیں۔ میرا مطلب ہے کہ خط دینے والے کے۔ یہاں آپ کے علاوہ باقی پانچ نشان ایک ہی شخص کی انگلیوں کے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" فلیچر مسکرایا۔ "کلاسیفکیشن کر لی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کلاسیفکیشن مجھے دو اور اپنا ریکارڈ چیک کر کے واپس آؤ۔" فلیچر نے نئی ہدایت دی۔ جواباً ہیڈ کلرک لوگان کمرے سے نکل گیا۔ خط نما کاغذ کا ٹکڑا وہ ساتھ لے گیا تھا۔

واپس آنے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا۔

"ہماری فائلوں میں یہ نشانات نہیں ہیں۔" اس نے رپورٹ دی۔

"او کے۔ بہت شکریہ۔" فلیچر نے فون اٹھایا۔ "واشنگٹن کے ڈپارٹمنٹ آف جسٹس میں فنگر پرنٹ بیورو میں ملاؤ۔" اس نے آپریٹر سے کہا۔

"ہیلو فلیچر۔" کچھ دیر بعد آواز آئی۔ "کیا افتاد آن پڑی اس وقت؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ وقت کم ہے۔ کلاسیفائڈ کوڈ بھیج رہا ہوں۔ پنسل اٹھاؤ۔" فلیچر نے کہا۔

"ہاں بولو۔"

"WO L-6 L-9... سمجھ گئے؟"

"ہاں... ابھی بتاتا ہوں۔"

"شکریہ۔" فلیچر نے انتظار شروع کر دیا۔

پھر آواز آئی۔ "پہلا جرم ستمبر 13، ریپ کیس، شکاگو... دوسرا، راہزنی، کنساس سٹی۔ پانچ سال قید۔"

"اور کچھ؟"

"بس اتنا ہی ہے۔"

"شکریہ دوست۔" فلیچر نے فون بند کر دیا۔ ایک منٹ بعد وہ متحرک ہوا۔ اس کا رخ وارڈن کے آفس کی جانب تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ رات میں رکیں گے؟" فلیچر نے وارڈن سے استفسار کیا۔

وارڈن نے کلاک کی جانب دیکھا۔ "ہاں، کیوں خیریت ہے؟"

"میں شاید تھیٹر چلا جاؤں۔ تاہم آپ کہیں گے تو میں رک سکتا ہوں۔"

"اوہ نو... تم جا سکتے ہو۔ ضرورت پڑی تو میں کل صبح تم سے رابطہ کر لوں گا۔" وارڈن نے فراخ دلی سے کہا۔

☆☆☆

دسمبر کی سرد رات تھی۔ فلیچر ایڈمنسٹریشن کی عمارت کے عقب میں کھلی جگہ پار کر کے قید خانے کی دیوار کے ساتھ ساتھ مشرقی موڑ کی جانب چل پڑا۔ وہ اپنے خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

فلیچر چونک کر گھوما۔ محافظ کی گن اس کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

"اوہ، سوری سر۔" اس نے ڈپٹی وارڈن کو پہچان لیا۔

"فریڈرک آؤ میرے ساتھ، واچ ٹاورز کو الرٹ کا سگنل بھی دے دو۔" فلیچر نے کہا۔

"رائٹ سر۔"

فلیچر اسے لے کر وسیع جیل کی ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔

”گارڈ ڈیل فیلڈ کو بلاؤ۔“

”جناب۔“ ڈیل فیلڈ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ڈیل۔“ فلیچر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہنری، مارٹن، شیل، کرسپن، اینڈی کاٹ اور راجرز کو لے کر ہیڈ کلرک کے دفتر میں پہنچو۔“

”اوکے سر۔“ ڈیل نے تعجب سے فریڈرک کو دیکھا۔

فلیچر کے قید خانے کے ایک حصے میں متعین گارڈ اوبرائن کے پاس پہنچا۔ اوبرائن نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

”کوئی گڑبڑ ہے، جناب؟“

”ہوسکتی ہے۔“ فلیچر نے کہا۔ ”چیو گم ہے؟“

”جی ہاں۔“

”پانچ چھ پیس دے دو۔“ کسی کو پتا نہ چلے کہ میں آیا تھا۔ وارڈن کی کار موجود ہے؟“

”موجود ہے جناب۔“

”ٹھیک ہے۔“ فلیچر اب ہیڈ کلرک کے کمرے کی جانب جارہا تھا۔ پیچھے اوبرائن الجھی ہوئی نظروں سے اپنے قابلِ احترام اور عمر رسیدہ ڈپٹی وارڈن کو دیکھ رہا تھا۔

فلیچر، ہیڈ کلرک کے کمرے تک پہنچا تو وہاں چھ عدد گارڈز کو منتظر پایا۔

”جوانوں تیار ہو جاؤ۔ دو دو کر کے ساؤتھ سیلی پورٹ پہنچو۔ میں باؤنڈری کے انتہائی جنوبی کونے پر ملوں گا۔ میں پہلے جاؤں گا۔“ فلیچر نے ہدایات دیں۔ ”کوئی سوال؟“

”نو سر۔“

فلیچر باہر نکلا تو ڈیل فیلڈ اس کے پیچھے آیا۔ ”ایک سیکنڈ، میں ایک پیغام دینا بھول گیا تھا۔“

”کیا؟“

”اسپرنگ فیلڈ سے آپ کے لیے گورنر کی کال تھی۔ پیغام تھا۔ ”NO“۔

”گڈ۔“

وارڈن نے ڈنر اپنے آفس میں کیا۔ ڈنر سے فارغ ہو کر اس نے کیپٹن کرنی کو طلب کیا۔ کیپٹن رات کی نگرانی کا انچارج تھا۔ نئے وارڈن نے اپنے تعارف کرانے کے بعد پچیس افراد کی ایک فہرست کیپٹن کے حوالے کی۔ یہ پچیس قیدیوں کے نام تھے۔

”ان لوگوں کو یہاں لے آؤ۔“ وارڈن نے حکم دیا۔ ”میں ان لوگوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

کیپٹن نے فہرست پر نظر ڈالی۔ اسے جھٹکا لگا۔ تاہم وہ ہچکچاتے ہوئے مڑا پھر دفعتاً واپس پلٹا۔

”معاف کیجیے گا جناب۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔ ”یہ لوگ یہاں کے خطرناک قیدیوں میں سے ہیں... چار کا تعلق اسپائنڈر گینگ سے ہے اور سات کا تعلق ڈونی گینگ... جن کی وابستگی...“

”میں جانتا ہوں۔“ وارڈن نے کیپٹن کی بات کاٹی۔ ”مجھے خدشہ ہے کہ یہ کوئی گڑبڑ کریں گے۔ میں ان کو براہِ راست تنبیہ کرنا چاہتا ہوں کہ کسی نے ایڈونچر کی کوشش کی تو میری موجودگی میں اسے بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔“

”ویری ویل سر۔“ کیپٹن باہر نکل گیا۔ تاہم اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

بیس، پچیس منٹ بعد وارڈن کے مطلوبہ پچیس افراد اس کے آفس کے باہر موجود تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ کیپٹن کے ساتھ ایک اور گارڈ بھی آیا تھا۔

کیپٹن کرنی نروس تھا لیکن اس کی چوکسی میں فرق نہیں آیا تھا۔ وارڈن، گروپ وائز مجرموں کا انٹرویو کرنے کے بعد ان کو گروپ وائز ہی واپس روانہ کر رہا تھا... حتیٰ کہ وہاں صرف ڈونی گینگ کے افراد رہ گئے۔ کیپٹن قدرے مطمئن کیفیت میں واپس آ گیا۔

وارڈن، ڈونی گروپ کے افراد کی جانب متوجہ ہو گیا... دورانِ گفتگو وارڈن نے کب ایڈ ڈونی کے ہتھکڑی بند ہاتھوں میں گن پکڑائی، کیپٹن دیکھ نہ سکا۔ کیونکہ وہ ڈونی گینگ کے ساتوں افراد کی قطار کے عقب میں تھا... ایڈ ڈونی نے اس کی جانب رخ کیا تو وہ دنگ رہ گیا۔ ”کوئی حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ ایڈ ڈونی نے دھمکی دی۔ یہ محض دھمکی نہیں تھی۔

”چابیاں نکالو۔“

کیپٹن نے بلا چون و چرا چابیاں اس کے حوالے کر دیں اور کینہ توز نظروں سے وارڈن کو دیکھا۔ وارڈن فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

ذرا دیر بعد ہی کیپٹن اور اس کا ساتھی غیر مسلح ہو چکے تھے۔ پھر ان دونوں کو باندھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔

بدنام زمانہ ڈونی گینگ کے سات اراکین آزاد تھے... تاہم ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔

مین کوریڈور میں ان کی مڈبھیڑ اوبرائن سے ہو گئی... تاہم اوبرائن کو کچھ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

اسے بے ہوش کر کے ساتوں نکلتے چلے گئے۔ وہ سلاخوں سے باہر اور آزاد تھے... آخری مرحلہ جیل کی چار دیواری عبور کرنا تھا۔ وہ وارڈن کی کار تک پہنچے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ وارڈن کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"احمق، چابی مجھے دو۔" ریڈ ڈونی غرایا۔
وارڈن سے چابی لے کر اس نے کار لاک میں گھسانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ پھر جھکا۔
"لاک میں چیونگم پھنسائی گئی ہے۔" وہ پھنکارا۔ ڈونی گھوم کر دوسری جانب گیا۔
"اس کا کیا مطلب ہے؟" وہ وارڈن کی جانب دیکھ کر غرایا۔
وارڈن کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔
ڈونی گینگ کے افراد کو ہوش اس وقت آیا جب فلیچر مسلح گارڈز کے ساتھ ان سب کو گھیر چکا تھا۔ واچ ٹاورز کی روشنیوں نے وارڈن کی کار اور اطراف کو روشن کر دیا تھا۔
پانچ منٹ کے اندر وہ سب دوبارہ وارڈن کے آفس میں تھے۔
بالآخر وارڈن کی قوتِ گویائی بحال ہوئی۔ "ان بدمعاشوں سے بہت جلد ملاقات ہو گئی... انہوں نے مجھے مارنے کی دھمکی دی اور ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" فلیچر نے کہا۔ "اب وارڈن کے بارے میں بھی بتا دو۔"
"تم کون ہو؟ اس طرح بات کرنے والے؟"
"تمہارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ وارڈن کے بارے میں بتاؤ میں دوبارہ نہیں پوچھوں گا۔" فلیچر نے گن نکال لی۔ اس کے تیور بدل چکے تھے۔ "تین تک گنوں گا..." فلیچر نے گنتی شروع کی اور جعلی وارڈن نے گھٹنے ٹیک دیے۔
"رکو، میں بتاتا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔"
"کہاں ہے؟"
"میں نے اسے مورگن روڈ کے مکان میں چھپایا ہوا ہے۔ یہاں سے دس میل دور... میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔"

☆☆☆

"تمہیں کس چیز نے شک میں ڈالا تھا؟" گورنر نے پُرتجسس آواز میں پوچھا۔
"اس نے کئی غلطیاں کیں۔" فلیچر نے بتانا شروع کیا۔ "ان کے لیے اس نے "ڈونی گروپ" کا لفظ استعمال کیا۔ جب ہم وزٹ پر تھے۔ صرف گینگسٹر، پولیس اور قیدی افراد گروپ یا ٹیم جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ گینگ کہتے ہیں۔"
"ہاں، لیکن یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔" گورنر کا تجسس برقرار تھا۔
"یقیناً۔" فلیچر نے اعتراف کیا۔ "دوسری بات اس نے ڈونی گینگ میں کیوں دلچسپی لی... میں نے چیک کرنے کے لیے بلیک ہول کی مخصوص اصطلاح استعمال کی اور انتظار کیا کہ وہ بلیک ہول کے بارے میں پوچھے گا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے بہت سی باتیں نہیں معلوم تھیں لیکن بلیک ہول کا پتا تھا۔ اس لیے اس نے سوال نہیں کیا۔ مجھے یقین ہو چلا کہ وہ خود کہیں نہ کہیں جیل کاٹ چکا ہے... ایک اور بات بھی تھی جس کے بعد میں پُریقین ہو گیا کہ وہ جعلی وارڈن ہے۔"
"وہ کیا؟" گورنر نے دلچسپی سے پوچھا۔
"اس نے مجھے بتایا تھا۔" فلیچر نے کہا۔ "کہ گورنر تمہاری بے حد تعریف کرتا ہے... جبکہ میں جانتا تھا کہ جناب ایسا ہرگز نہیں کرتے... چاہے دل میں کتنا ہی قائلِ تعریف مجھے ہوں۔" فلیچر نے اطمینان سے جواب دیا۔
گورنر نے سامنے کھڑے ڈپٹی وارڈن کو بغور دیکھا اور مسکرایا۔
"ویل۔" وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کل رات جو کچھ بھی ہوا اس کے بعد بھی اگر مجھے کسی کی تعریف کرنی پڑی تو مسٹر فلیچر، وہ تم ہو گے۔"
"شکریہ۔" فلیچر بھی مسکرایا۔ "جب میرا شک تقریباً پکا ہو گیا تو فی الفور میں نے اس کا فوٹو حاصل کیا اور آپ کو روانہ کر دیا۔ آپ کی جانب سے وہی جواب آیا جس کی میں توقع کر رہا تھا پھر میں نے اپائنٹ منٹ لیٹر سے فنگر پرنٹس لیے...
"وہ قید بھگت چکا تھا ماضی میں... آپ کا خط اصلی تھا لیکن وہ اصل وارڈن نہیں تھا... میں نے اس کی کار کی تلاشی بھی لی تھی جس میں ایک مشین گن اور چھ پسٹل موجود تھے۔ ان کا منصوبہ پوری طرح عیاں ہو چکا تھا۔ جعلی وارڈن خود بھی گینگ کا رکن تھا۔
"کار میں اسلحے کی موجودگی نے میرے کام کو آسان کر دیا۔ میں نے اپنے آدمی کار کے قریب گھات میں لگا دیے تھے۔ وہ پہلے دن کی پہلی رات ہی دفتر میں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ بات بھی مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ آج رات ہی ہونا ہے۔"
فلیچر نے بات ختم کر دی۔
چند لمحے گورنر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ "شاید تم جانتے ہو مسٹر فلیچر کہ تم ڈپٹی کے بجائے وارڈن کی پوسٹ کے اہل ہو اور میں چاہتا بھی یہی تھا... لیکن سیاسی مداخلت کا کیا کیا جائے... تم اس بات کو سمجھتے ہو۔"
"میں سمجھتا ہوں اور میں اپنی جگہ خوش ہوں اور ہاں میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔" فلیچر یہ کہہ کر خوش دلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

یادداشت کے خانے میں گم ہو جانے والا کھل جا سم سم کا سحر...

کسی بھی مقصد کے لیے کٹھن انتظار کرنا پڑتا ہے... اس نے بھی دولت حاصل کرنے کے لیے بڑا طویل منصوبہ بنایا تھا اور غیر معمولی صبر و سکون کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس کی احتیاط پسندی نے اسے ایسے جال میں الجھا دیا کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن...

مہنگی بھول

بشریٰ امجد

"ریونٹ" بینک کے لیے دس برس سے کام کر رہا تھا۔ ڈوبے ہوئے قرضوں کی وصولیابی ریونٹ کی ذمے داری تھی۔ اس کا ریکارڈ بے داغ تھا۔ دس برسوں میں اس کی کوئی غلطی، کوئی شکایت سامنے نہیں آئی تھی۔
وہ تنہائی پسند تھا اور اکیلا رہتا تھا۔ دوست بنانے سے پرہیز کرتا تھا۔ کیفے اور ہوٹلز جیسی جگہوں سے دور رہتا تھا۔ نہ کوئی لو افیئر... وہ اپنی محدود روش سے خوش اور مطمئن تھا۔

بعض اوقات کوئی اس کے طرزِ زندگی کی وجہ دولت کو گرداننا تو وہ جواب دیتا کہ۔۔۔'' یہ پیسا میرا اپنا نہیں ہے۔ میرا حق تو صرف تنخواہ پر ہے۔ وصول شدہ رقوم مجھے بینک کو واپس کرنی پڑتی ہیں۔''

اس روز بھی وہ وصولیابی کی مخصوص مہم پر تھا۔ تاہم وہ واپس گھر نہیں آیا۔ اس کو جاننے والے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ بددیانتی کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔

پولیس اس کی کھوج میں تھی۔۔۔ وہ اپنے بلوں کی ادائیگی پابندی سے کرتا تھا۔۔۔ اس روز اس نے سات بجے کے قریب مانٹ روگ گیٹ پر وصولیابی کی تھی۔ اس وقت اس کے پاس دو سو ہزار فرانکس کی خطیر رقم تھی۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ ہر متعلقہ علاقے کو چھانا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پولیس اور بینک انتظامیہ کا شک تھا کہ وہ خطرناک پیشہ ور لیٹروں کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور اس کی لاش کسی دریا میں پڑی ہوگی۔

پیرس میں صرف ایک آدمی یہ سب کارروائی اور خبریں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بے پروائی سے شانے اچکا کر ٹی وی بند کردیا۔

وہ آدمی ''ریونٹ'' تھا۔

☆☆☆

ریونٹ کی ناکام تلاش کی مہم مدھم پڑنے لگی تو وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل کر دریائے سین پر پہنچا۔ اس نے عام سا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ وہ اپنا یونیفارم ایک دن قبل ہی وہاں چھپا آیا تھا، دریا پر پہنچ کر اس نے وردی ایک واٹر پروف بیگ میں بند کر کے وزنی پتھر کے سہارے تہ نشین کر دی تھی۔

اس مہم سے فارغ ہو کر وہ واپس پیرس آگیا۔ ہوٹل پہنچ کر وہ سو گیا اور خوب سویا۔ چند گھنٹوں میں بظاہر ایک ایمان دار اہلکار (بینک اہلکار) سے وہ ایک چور بن چکا تھا۔

اس نے جس کام کا آغاز کر ڈالا تھا، اس کے لیے اسے طویل اور صبر آزما منصوبہ بندی کرنا پڑی تھی۔ تیز آگے بھی اس کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔

پہلی کامیاب واردات کے بعد بذریعہ ٹرین اسے سرحد کی جانب روانہ ہونا چاہیے تھا۔ تاہم اس نے یہ حماقت نہیں کی۔ تقدیر کے معاملے میں وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا۔ وہ باخبر تھا کہ سرحد پر پہنچتے ہی دھر لیا جائے گا۔

اس کا منصوبہ کچھ اور تھا۔

صبح بیدار ہو کر ریونٹ نے رقم ایک لفافے میں بند کر کے اس پر فلکسڈ سیل لگائی اور ایک وکیل کے پاس پہنچ گیا۔

وکیل کے سامنے جو کہانی اس نے تراشی، وہ کچھ اس طرح تھی: ''جناب میں ایک لمبے سفر پر جارہا ہوں اور نہیں جانتا کہ کب تک واپسی ہوگی۔ آپ کے بارے میں میرے ایک دوست نے بتایا تھا۔ بدقسمتی سے میرا وہ عزیز دوست اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری واپسی تک یہ پیکٹ آپ کی تحویل میں رہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو مجھے بتایئے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں آپ کو پیکٹ کی رسید بنا دیتا ہوں۔'' وکیل نے جواب دیا۔

ریونٹ خاموش رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رسید کا مسئلہ تو ٹیڑھا ہے' وہ اسے کہاں رکھے گا؟ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس میں رسید کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ رسید اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے تاثرات ابھرے۔ رسید والے معاملے میں اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسے خوامخواہ کی پیچیدگی پیدا ہوتی نظر آئی۔ تاہم وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہا اور سکون سے گویا ہوا۔

''جناب! میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ دوست، نہ رشتے دار۔ میں جس سفر پر جارہا ہوں یہ بھی ایک قسم کا ایڈونچر ہے اور خطرات سے خالی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ جب میں واپس آؤں گا تو آپ کو یا آپ کے جانشین کو محض اپنا نام بتا کر پیکٹ وصول کرلوں گا۔'' ریونٹ نے سوالیہ نظروں سے وکیل کو دیکھا۔

''لیکن اس صورت میں خطرہ ہے۔۔''

ریونٹ نے وکیل کی بات کاٹ دی۔ ''آپ بے شک رسید پر وضاحت کردیں کہ پیکٹ وصول کرنے کی واحد صورت یہی ہوگی۔ میرا مطلب ہے کہ جو نام بتائے گا پیکٹ اسے دے دیا جائے گا۔ اس میں بھی کوئی خطرہ ہے تو وہ میری ذمے داری ہے۔''

''ٹھیک ہے نام بتایئے۔''

ریونٹ نے بلاتردد نام بتایا۔ ''ہیمنی ڈوونچر۔''

☆☆☆

وہ دوبارہ شہرِ واردات میں پہنچ چکا تھا۔ تاہم بینک پہنچنے سے پہلے ہی اسے گرفتار کرلیا گیا۔

اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ بینچ پر سو گیا تھا اور اس

دوران اسے لوٹ لیا گیا۔ اس کی کمزور مزاحمت کسی کام نہ آئی اور وہ خوف زدہ ہو کر پیرس بھاگ گیا، بعدازاں ضمیر کی چبھن کے باعث اسے واپس آنا پڑا۔

ایک تو اس کا سابقہ ریکارڈ بے داغ تھا۔ اس پر مستزاد وہ خود واپس آگیا تھا۔ لہٰذا اسے محض پانچ برس کی قید ہوئی، اس کی عمر 35 برس تھی۔ پانچ سال بعد وہ چالیس برس کا ایک متمول شخص ہوتا۔

وہ جس طرح دورانِ ملازمت ایک ''ماڈل'' تھا' اسی طرح قید خانے میں بھی وہ ایک ماڈل قیدی ثابت ہوا۔ وہ اطمینان اور صبر سے ایامِ اسیری کاٹ رہا تھا۔ کوئی عجلت نہ کوئی اضطراب۔۔۔ صرف وہ اپنی صحت کا خیال رکھ رہا تھا۔

بالآخر اس کی رہائی کا آخری دن آپہنچا۔ اس کی مختصر اشیا اس کے حوالے کر کے اسے آزاد کردیا گیا۔ اس نے صبر وضبط اور طویل منصوبہ بندی کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا تھا اور اس وقت بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وکیل کی طرف رخ کرنے کا فی الحال اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اس نے تین ماہ آوارہ گردی اور مفلوک الحالی میں گزار دیے، ساتھ ہی وہ نئی ملازمت حاصل کرنے کا ڈراما بھی کرتا رہا۔ پہلے مہینے میں گو اسے شک ہوا کہ اس کی نگرانی ہورہی ہے کیونکہ دورانِ ٹرائل تو اس سے کچھ اگلوانے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

تین ماہ میں اسے یقین ہوگیا کہ اسے معصوم سمجھ لیا گیا ہے۔۔۔ اب اس نے پیرس روانگی کے لیے پر تولنے شروع کیے۔ بات سادہ تھی کہ اسے یہاں تو کوئی ملازمت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لہٰذا اسے دوسرے شہر میں ہی قسمت آزمائی کرنی تھی۔

☆☆☆

اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کیا وکیل اسے پہچان لے گا؟ وہ وہاں ہوگا یا کوئی اور بیٹھا ہوگا؟ دورانِ قید اس نے اپنی صحت کا خاص خیال رکھا تھا۔ لہٰذا وکیل اسے یقیناً شناخت کرلے گا۔

تاہم آئینہ دیکھنے سے اس پر انکشاف ہوا کہ پانچ سال میں اس کے چہرے پر بڑھاپے جیسی تبدیلیاں در آئی تھیں۔۔۔ بال بھی کم ہوگئے تھے۔ خیر کیا فرق پڑتا ہے۔

ریونٹ نے وکیل کے دفتر میں قدم رکھ دیا۔

''کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟'' وکیل نے سوال کیا۔

''پانچ سال قبل میں ایک امانت آپ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔''

''رسید ہوگی آپ کے پاس؟''

''رسید آپ کے پاس ہی ہے۔'' ریونٹ نے پانچ سال قبل کی گفتگو کے بارے میں اسے بتایا۔

دفعتاً اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ نام۔۔۔ کیا نام تھا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے دماغ پر زور دیا۔ وکیل مطلوبہ نام پوچھ رہا تھا۔

ریونٹ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔

''جناب! میرا نام ہے۔۔۔ م۔۔۔ م۔۔۔ جناب۔'' اس کی حرکتِ قلب بے قابو ہوچکی تھی۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' وکیل نے استفسار کیا۔

''میں بہتر محسوس نہیں کررہا۔'' ریونٹ نے جواب دیا۔

''میں پھر کسی وقت حاضر ہوتا ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

☆☆☆

وہ ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ گھنٹوں اپنے دماغ سے کشتی لڑتا رہا۔ یہ کیا ہوگیا؟ اسے لگا کہ وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے نام کا پہلا حرف یاد کرنے کی کوشش شروع کردی۔

ہمارا ایک قیدی بھاگ گیا ہے۔ تم آگئے تو اب گنتی پوری ہوجائے گی

قصور مت پوچھو۔

نام اور حروف اس کے ذہن میں ناچ رہے تھے لیکن زبان تک آنے سے قاصر تھے۔

دو سو ہزار فرانک کا خیال آتے ہی اس کا بدن اینٹھنے لگا۔ اس کی زبان اور ہونٹ خشک تھے۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ جتنی توجہ مرکوز کرتا، اسے اتنی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ اچانک بینچ سے کھڑا ہو گیا پھر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ وہ روئے یا لڑے؟

وہ شدید اذیت محسوس کر رہا تھا۔ آج سے پیشتر وہ خود کو ایک جینئس خیال کرتا رہا تھا۔ تاہم اس وقت اسے لگا کہ اس سے بڑا گدھا کوئی نہیں۔

نام کی شق اسی نے ڈلوائی تھی۔ نام ہی اس کے خزانے کی کنجی تھی۔ تمام جزئیات کا خیال کرتے ہوئے وہ ”خزانے کی کنجی“ سے ہی دھیان ہٹا بیٹھا تھا، نام اس کے حلق میں پھنسا ہوا تھا مگر نوکِ زبان پر نہیں آ رہا تھا۔

”گھبرانے اور پریشان ہونے سے کیا ملے گا؟“ اس نے نام سے دھیان ہٹایا اور پارک سے نکل گیا۔

وہ پیدل چلنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ ونڈو شاپنگ کر رہا تھا۔ لوگوں کی آوازیں سن رہا تھا اور بے خیالی میں سائن بورڈز بھی پڑھتا جا رہا تھا لیکن اس کا ذہن گھوم گھوم کر نام کی سوئی پر اٹک جاتا۔ دن کی روشنی ڈھلنے لگی۔ سڑکوں پر سناٹا بڑھ رہا تھا۔ اس کا دماغ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

بالآخر اس نے ایک سستے سے ہوٹل کے کمرے میں پناہ لی۔ جس حال میں تھا، وہ اسی حال میں بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تاہم صبح ہوتے ہوتے وہ سو چکا تھا۔

جب وہ بیدار ہوا تو اس کا ذہن پُرسکون تھا۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ تاہم سکون کا وقفہ قلیل ثابت ہوا تھا۔ بھولے ہوئے نام کی دہشت نے اسے پھر جکڑ لیا تھا۔

ایک نیا خیال اس کے ذہن کو قابو کر رہا تھا۔ خیال نہیں یہ خوف تھا کہ شاید اب بھی وہ وکیل کے پاس لکھے ہوئے نام کو یاد نہ کر سکے گا۔

وہ پھر سڑکوں پر نکل گیا اور وکیل کے دفتر کے آس پاس گھومتا رہا۔ تاہم دفتر میں جانے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

دوسری رات شروع ہو گئی۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا تھا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دو سو ہزار فرانک اگرچہ اس نے مجرمانہ طریقے سے حاصل کیے لیکن اب وہ اس کے تھے، اس رقم کے لیے اس نے بڑے صبر سے پانچ سال قید کاٹی تھی۔ دولت اس کی راہ دیکھ رہی تھی اور وہ نوٹوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

اگلی صبح وہ پھر سڑکوں پر تھا۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ اب نہ نام یاد کرنے کا جنون تھا نہ بھول جانے کی جگر پاش اذیت... اس کی ذہنی کیفیت دگرگوں اور ناقابلِ وضاحت تھی۔

وہ جیسے عالمِ مدہوشی میں چلا جا رہا تھا۔ اس نے یقین کر لیا تھا کہ نام یاد نہیں آئے گا۔ وہ ایک لیمپ پوسٹ سے ٹکرایا۔ پھر اس کا ایک پیر فٹ پاتھ سے نیچے پڑا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے کانوں میں چند اجنبی قہقہے گونجے۔ اس نے اندھادھند بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ پیادہ لوگوں سے ٹکرا رہا تھا۔ کوئی تو احتجاج کرے اور وہ لڑنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں وہ کب اور کیسے دریائے سین تک پہنچا۔ یہاں کیچڑ اور کائی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ دریا کے سرد پانی تک پہنچ کر اس نے چہرے کو تر کیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں بلکہ سارا بدن جل رہا تھا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ چکنی سیڑھیوں سے پھسل رہا ہے۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش نہیں کی اور دریا کے سرد پانی میں جا گرا۔ جلتے بدن پر سرد پانی کرنٹ کی طرح لگا۔ اس نے جبلی طور پر ہاتھ پیر مارے۔ بجلی کی طرح اس کے دماغ میں بلب سا روشن ہوا۔

”یاد آ گیا... یاد آ گیا۔“ وہ چلّایا۔ ”ہیمنی ڈو ونچر... ہیم... ہیم... ہمپتی... ہیلپ... ہیلپ۔“

دور دور تک سناٹا تھا۔ دریا خاموشی اور سست روی سے بہہ رہا تھا۔ ایک غیر متوقع تیز لہر نے اسے کنارے سے دور کر دیا۔

سفید اور سرخ روشنیاں پانی پر رقص کر رہی تھیں۔ برج کے نیچے سے گزرتا ہوا... دریا آواز پیدا کر رہا تھا۔

ریونٹ نے نڈھال انداز میں سر پانی سے اوپر رکھنے کے لیے برج کے ستون پر ہاتھ مارا۔ لیکن ستون کی چکناہٹ نے الٹا اثر کیا۔ اس کا سر زیرِ آب چلا گیا۔

دریا مزید سست ہو گیا... یوں لگا جیسے دریا سست روی سے بہتے ہوئے ساکت ہو چکا ہے۔

مکمل سکوت۔ ابدی خاموشی۔

مینڈک باز

مختار آزاد

چالاکی اور عیاری سے دوسروں کو زیر کرنے والے کبھی کبھی خود بھی زیر ہو جاتے ہیں... محبوبہ کی بے وفائی سے شروع ہونے والا قضیہ... ہر کام اس کے منصوبے کے مطابق انجام پذیر ہو رہا تھا مگر اچانک ہی حالات نے وہ رخ اختیار کر لیا... جس کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا...

طوفان کی بلاخیزی اور ہولناکی کا شکار ہو جانے والے شکاری کی مہمات

جیک امریکی بحریہ سے برطرف نشانہ باز اور من موجی بندہ تھا لیکن چند برس پہلے ایک ریستوران میں جینی سے ملاقات کے بعد اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آنا شروع ہوا۔ وہ بھی عادت و اطوار میں اس سے کچھ مختلف نہیں تھی لیکن ایڈم بیری نامی اس چھوٹے سے شہر میں کچھ خاص بات تھی کہ ان کے پاؤں یہیں جم کر رہ گئے۔ بھاگتے بھاگتے شاید دونوں ہی تھک چکے تھے۔ انہیں سکون کی تلاش تھی اور اس خوبصورت قصبے میں قدرتی مناظر اور ذہنی سکون دونوں کی

فراوانی تھی۔
موٹر مکینک سے لے کر بار ٹینڈر اور ویٹر تک، چند برسوں کے دوران میں جیک نے اتنے کام کیے کہ اب اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کچھ کرگزرا ہے۔ جینی اور وہ ساتھ رہ رہے تھے لیکن جیک کی نیک نیتی سے یہ خواہش تھی کہ وہ اپنا کوئی کاروبار سیٹ کرتے ہی جینی سے شادی کر کے، بچوں سے بھرے پُرے گھر میں خوشگوار زندگی بسر کرے۔ جینی بھی اس کی ہم نوا تھی۔ جیک کو یقین تھا کہ گھر بسانے کے لیے اسے جینی سے زیادہ اچھی لڑکی نہیں مل سکتی۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں تھی۔ دونوں کی زندگی میں دن میں بھرپور کام اور شام گھومنے پھرنے کے لیے مخصوص تھی۔

اُن دنوں جیک ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے ایک مقامی کوریئر کمپنی میں کام کررہا تھا۔ اس کا کام دن بھر پارسل کی ڈیلیوری تھی۔ ایک دن کمپنی کے ہوائی جہاز میں خرابی ہوئی تو اسے ہفتہ بھر کے لیے گھر سے باہر رہنا پڑا۔ اسے کئی ریاستوں تک بھاری پارسل پہنچانے تھے۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسے جینی سے ہفتہ دس دن دور رہنا پڑا لیکن اب وہ لوٹ آیا تھا۔ اُس دن وہ بہت خوش تھا۔ بنا اطلاع گھر پہنچ کر اسے حیران کردینا چاہتا تھا۔ وہ پہنچا تو گھر کے سامنے جدید ماڈل کی سرخ اسپورٹس کار کھڑی تھی۔ وہ چونک گیا۔ جینی گھر میں تھی۔ ثبوت یہ تھا کہ اس کی دس سالہ پرانی بیوک بھی اسپورٹس کار کے قریب ہی پارک تھی۔ وہ سخت حیران تھا کہ یہ کار والا کون ہوسکتا ہے۔ ابھی وہ کچھ دور ہی تھا کہ گھر کے اندر سے جینی اور ایک اجنبی نوجوان باہر نکلتے دکھائی دیے۔ وہ فوراً درخت کی آڑ میں ہوگیا۔ دونوں کے بازو ایک دوسرے کی کمر کے گرد حمائل تھے۔ یہ دیکھ کر اسے سخت جھٹکا لگا۔ وہ جوان جینی سے بغل گیر ہوا اور پھر آگے بڑھ کر اسپورٹس کار میں بیٹھ کر ہوا ہوگیا۔ جینی گھر کے اندر جاچکی تھی۔

جیک کے لیے یہ کافی صدمے کی بات تھی۔ اسے جینی کی لااُبالی پن کی عادت معلوم تھی لیکن جو کچھ دیکھا، وہ جیک کے نزدیک بے وفائی تھی۔ وہ گھر جانے کے بجائے پلٹا اور بازار کی طرف چل دیا۔

وہ کتنی دیر تک بار میں بیٹھا رہا، یہ اسے علم نہیں لیکن اس دوران میں وہ جینی سے بے وفائی کا بدلہ لینے کا پورا منصوبہ تیار کرچکا تھا۔ وہ نہ صرف اسے بے وفائی کی کڑی سزا دینا چاہتا تھا بلکہ اس کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا تھا۔

جیک باہر نکلا تو سورج مغرب کی طرف کھسک چکا تھا۔ دھوپ نرم پڑ چکی تھی۔ ہوا میں بھی گرمی کے بجائے ہلکی سی ٹھنڈک محسوس ہورہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر کی طرف بڑھا۔ اس کے شانے سے چھوٹا سفری بیگ لٹک رہا تھا۔ ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ اور ذہن بدستور ہرجائی محبوبہ سے انتقام لینے پر سوچ رہا تھا۔ اسے اپنا منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل لگ رہا تھا۔ دل میں انتقام کے شعلے دہک رہے تھے لیکن چہرے پر بھرپور اطمینان تھا۔

اس نے ڈور بیل بجائی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، اس نے جینی کو آغوش میں بھرلیا۔ ”یہ میرے لیے؟“ چند لمحوں کے بعد جینی اس سے علیحدہ ہوئی تو اس نے گلدستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی چاہت سے پوچھا۔

”تم مجھ سے شادی کروگی؟“ جیک گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے سامنے گلدستہ پیش کرتے ہوئے بولا۔

”اندر آؤ۔“ جینی نے ہنستے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ دونوں قصبے کے شان دار ریستوران میں ڈنر کررہے تھے۔ دریا کنارے بنے اس ریستوران میں ڈنر کی خوبی یہاں کا دلفریب نظارہ، خاموشی اور سکون تھا۔ دریا کا بہتا پانی اطراف کی عمارتوں سے پڑنے والی روشنیوں سے جھلملا رہا تھا۔ کچھ یہی حال ان دونوں کے دلوں کا بھی تھا۔ جینی جیک کو چھوڑنے کا سوچ رہی تھی اور جیک اسے سبق سکھانے پر غور کررہا تھا۔ جینی کو یقین ہوچکا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر نہیں کرسکے گی۔ اسے عیش و آرام بھی چاہیے تھا لیکن کئی سال گزرنے کے باوجود اب تک وہ ایسا کچھ نہ کرسکا تھا کہ انہیں مالی خوشحالی نصیب ہوسکتی۔ دوسری طرف جیک کا خیال تھا کہ وہ اگر اپنے منصوبے پر عمل نہ کرے، تب بھی جینی اسے ضرور چھوڑ جائے گی... تو کیوں نہ وہ اس طرح اسے چھوڑے کہ وہ کسی قابل ہی نہ رہے۔ دونوں کی محبت نفرت میں بدل چکی تھی مگر بظاہر اب بھی وہ ایک دوسرے سے محبت کا ناٹک کررہے تھے۔

کافی دیر تک وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول رہے، آخر اس نے خاموشی توڑی۔ ”بات یہ ہے جینی...“ جینی نے سر اٹھا کر جیک کو دیکھا۔ ”مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“

”میری...“ اس نے حیرت سے جواب دیا۔

”میں اس زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی۔ ”سب کچھ کرکے دیکھ لیا مگر زندگی سیٹ نہیں ہورہی۔ میرے ذہن میں ایک

منصوبہ ہے۔ اگر تم ساتھ دو تو ایک بار... صرف ایک بار یہ کرنے کے بعد ہم دونوں کی زندگی سیٹ ہوسکتی ہے۔“

جینی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ آج پہلی بار جیک اتنا سنجیدہ ہوا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا دل ڈول گیا مگر پھر اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کے ساتھ گزرے روز و شب کو دل و دماغ سے دور کیا اور توقف کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”کہو... اگر کرسکی تو ضرور مدد کروں گی۔“

”تمہاری مدد کے بنا میں یہ کام اکیلا ہرگز نہیں کرسکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ وہاں کوئی تیسرا نہ تھا۔ جینی اس کی طرف متوجہ تھی۔ جیک نے سوچا سمجھا منصوبہ بیان کرنا شروع کیا۔

”تو یہ بات ہے۔“ اس کے خاموش ہوتے ہی جینی نے کہا۔

”یہی ہے پورا منصوبہ۔“ جیک نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان آٹھ دس دنوں میں مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا اور تمہارے ساتھ رہنے کے لیے کاروبار سیٹ ہونا چاہیے اور اس کے لیے پیسا کہاں سے آئے، اس لیے اس سے زیادہ اچھا اور فوری حل میرے ذہن میں کوئی اور نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے سگریٹ سلگایا۔

جینی نے پوری توجہ اور خاموشی سے اس کی بات سنی۔ چاہتی وہ بھی یہی تھی کہ جیک کسی نہ کسی طرح سیٹ ہوجائے مگر جیک کے بنا گزرے پچھلے ایک ہفتے نے اس کی سوچ بڑی حد تک بدل دی تھی۔

ایڈی کون تھا، یہ وہ نہیں جانتی تھی لیکن پچھلے ایک ہفتے کے دوران وہ یہ بات اچھی طرح جان چکی تھی کہ من موجی ایڈی کے پاس دولت بہت تھی اور یہ بات اس کے رہن سہن سے عیاں تھی۔ ایک ہفتے کے دوران ہی وہ ایڈی کے اتنے نزدیک ہوچکی تھی کہ پلٹنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ بار میں اتفاقیہ ملاقات اتنی زیادہ قربت میں بدل چکی تھی کہ پچھلے پانچ دن انہوں نے اکٹھے گزارے تھے۔ اس دوران میں ایڈی نے اسے ڈائمنڈ کا نیکلس اور گولڈ بریسلیٹ بطور تحفہ دیا تھا۔ جینی کے لیے اس کی قیمت لاکھوں میں تھی لیکن شاید مال دار ایڈی کے لیے وہ کچھ خاص رقم نہیں تھی۔ یہی بات اسے بے انتہا دولت کا مالک ثابت کرتی تھی۔ وہ اپنے بارے میں ایڈی کو سب کچھ صاف صاف بتاچکی تھی اور اس کے مشورے سے یہ طے کرچکی تھی کہ اب جیک سے پیچھا چھڑانا ہے۔ جب جیک نے منصوبہ بیان کرنا شروع کیا تو اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا۔ منصوبہ جیک کا تھا لیکن وہ ذرا سی تبدیلی کرکے اسے اپنے فائدے میں ڈھال سکتی تھی۔ اس نے نہایت تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ سب کچھ طے کرچکی تھی۔ جینی کے لیے معاملہ ’آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام‘ جیسا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ پیچھا چھڑانے کا موقع خود جیک نے فراہم کردیا ورنہ تو اس بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دماغ ہلکان ہوگیا تھا۔ ”آئی لو یو...“

اس نے آہستہ سے کہا تو جیک مسکرادیا۔ ”لعنت ہو تم پر۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس کے بعد وہ کافی دیر تک خاموشی سے کھانا ختم کرتی رہی۔ جینی بہت آہستہ آہستہ کھارہی تھی۔ منہ چلانے کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی چل رہا تھا۔ وہ جیک کے منصوبے کو اپنی سوچ کے مطابق ترتیب دے رہی تھی۔

”اس میں کچھ خطرہ تو نہیں ہے۔“ کچھ دیر بعد جینی نے پوچھا۔

”خطرہ نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر جیک نے لمحہ بھر کو توقف کیا اور پھر اطراف پر نظریں ڈالتے ہوئے گردن جھکائی اور جینی کے قریب ہوکر سرگوشی کی۔ ”اگر میں یہ کہوں تو غلط ہوگا۔ خطرہ ہر حال میں ہے اور یہ صرف اس منصوبے کا حصہ نہیں بلکہ ہر چیز کا جزو ہے۔“

جینی نے سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔ ”سیدھی سادی بات کرو۔“

”تمہارا کھانا زہریلا تھا۔“ اس نے سرد لہجے میں سرگوشی کی۔

”کیا...؟“ جینی کا دل دہل گیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”ڈرو مت۔“ وہ ہنسا۔ ”میں نے مذاق میں کہا ہے۔ ذرا سمجھو کہ خطرہ کہاں نہیں ہوسکتا۔“

”اوہ میرے خدا۔“ اس نے سر پکڑ لیا۔ وہ سچ مچ خوف زدہ ہوگئی تھی۔

”شکر ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور پانی پیا۔

”تو مطلب یہ کہ خطرہ ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”بالکل ٹھیک کہا۔“ جیک بولا۔ ”میں یہ کام اکیلا کرسکتا تھا مگر اس میں کسی پارٹنر کی ضرورت ہے اور تم سے اچھا، قابلِ بھروسا پارٹنر بھلا کون ہوسکتا ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“ جینی نے جیک کے منصوبے میں ذرا سی ترمیم کرکے دل ہی دل میں اپنا منصوبہ بھی مکمل کرلیا

تھا۔ وہ خوش تھی کہ جیک نے راہ سے ہٹنے کا منصوبہ خود ہی سوچ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس پر ہنس بھی رہی تھی۔ جیک جو سوچ رہا تھا، وہ کر لیتا لیکن فائدہ سراسر جینی کو ہی پہنچنا تھا۔

دو دن میں سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اس دوران میں جیک گھر پر ہی رہا البتہ جینی مختلف بہانوں سے کئی کئی گھنٹوں کے لیے باہر جاتی رہی۔ اس دوران میں جیک نے کسی طرح اسے یہ شائبہ تک ہونے نہ دیا کہ وہ کسی اور نوجوان کے ساتھ اسے دیکھ چکا ہے۔

وہ جمعے کی صبح تھی۔ اس کی دو دن کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ وہ کمپنی کی وین لے کر ڈلیوری دینے کے لیے نکلا۔ اسے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور واقع شہر کے دو جیولرز تک پارسل پہنچانے تھے۔ یہ کل ہی رات نیویارک سے پہنچائے گئے تھے۔ ایک سیکیورٹی گارڈ بھی اس کے ساتھ ہی وین میں سوار تھا۔

کمپنی کے دفتر سے نکل کر بیس کلومیٹر دور تک، گھنے جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی سڑک پر سفر کرنے کے بعد ہائی وے پر نکلنا تھا۔ منصوبے کے عین مطابق، طے شدہ مقام پر سڑک کنارے جینی کی بیوک کھڑی تھی۔ اچانک جینی سڑک پر آئی اور رکنے کے لیے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے اشارہ کیا۔ جیک نے گاڑی روکی تو وہ چلائی۔ ”میری مدد کریں، گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔“

جیک نے گارڈ کی طرف دیکھا، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں جیسے ہی گاڑی سے باہر نکلے، عقب سے ایک فائر ہوا۔ گولی گارڈ کے سر میں لگی تھی۔ جیک حیران رہ گیا کہ یہ کیا ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سرخ اسپورٹس کار سے ایڈی اتر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”یہ کیا؟“ وہ جینی کی طرف دیکھ کر چلایا۔

”تمہارا منصوبہ اب ہمارا ہے۔“ پیچھے سے آواز آئی۔ جیک کے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

”وہ پارسل نکالو مسٹر۔“ ایڈی نے درشت لہجے میں کہا۔ پستول کی نال کا رخ اس کی طرف تھا۔ اس دوران میں وہ جیک کے اور قریب آ چکا تھا۔

”ایڈی پلیز، جیک کی مدد کرو۔“ جینی نے طنزیہ انداز میں، نہایت ہی لگاوٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جل بھن گیا۔

”آگے بڑھو اور پارسل نکالو۔“

جیک نے مڑ کر دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اتنے فاصلے سے ایڈی گولی چلاتا تو بچنا ممکن نہیں تھا۔ جیک آگے بڑھا اور وین کا پچھلا دروازہ کھول کر پارسل نکالنے لگا۔ ایڈی اور جینی، دونوں پستول تھامے عین اس کی پشت پر کھڑے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان پر ہنسا۔

وہ پارسل لے کر پلٹا تو جینی نے اسے جیک کے ہاتھوں سے اُچک لیا۔ ”بائے جیک...“ جینی نے ایڈی کی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اچھے دنوں کی یادوں اور اس قیمتی تحفے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے الوداع۔“ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے ہاتھ ہلا کر اسے مخاطب کیا۔

ایڈی کار کی طرف بڑھ رہا تھا اور جینی نے جیک پر پستول تان رکھا تھا۔ ابھی ایڈی کار سے چند قدم دور تھا کہ جینی نے گولی چلا دی۔ وہ اناڑی تھی۔ گولی جیک کے بازو سے رگڑ کھاتی ہوئی نکل گئی۔ بازو سے خون نکلنے لگا۔ جیک تربیت یافتہ فوجی تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بنا کمر کے پیچھے ہاتھ ڈالا اور پستول نکال کر دھڑا دھڑ کئی فائر کر دیے۔ جینی خون میں لت پت کار کی اگلی سیٹ پر ڈھیری ہو چکی تھی۔ ایڈی زمین پر پڑا تھا۔ جیک جلدی سے آگے بڑھا۔ پارسل اٹھایا اور جینی کے پرس سے چابی نکال کر اُس کی کار کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں اس نے وین کے اگلے حصے سے اپنا بیگ بھی نکال لیا تھا۔ سب کچھ صرف چند منٹ میں ہوا تھا۔ سڑک بدستور سنسان تھی۔

جیک تیزی سے گاڑی میں بیٹھا۔ کافی آگے جا کر اس نے رومال سے اپنا زخم صاف کیا اور اسی سے پٹی باندھ لی۔ اگرچہ بازو میں تکلیف ہو رہی تھی لیکن رکنا خطرناک تھا۔ ویسے بھی زخم مہلک نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہائی وے پر تھا۔ اس کا رخ جارج ایڈورڈ کی طرف نہیں بلکہ اس کے مخالف کسی اور سمت میں تھا۔

وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اگر دونوں مرنے سے بچ گئے تب بھی پولیس سے بچنا محال ہوگا۔ جس وین کو وہ چلا رہا تھا، اس کے بیرونی حصے میں بھی خفیہ کیمرے لگے تھے جو چار اطراف کے تین گز کے علاقے کو بہت اچھا ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جس وقت وہ وین کے پچھلا لاکر سے پارسل نکال رہا تھا، وہاں لگے خفیہ کیمروں نے جینی اور ایڈی کو پستول ہاتھ میں تھامے ریکارڈ کر لیا تھا۔ اگر دونوں زندہ بچ بھی جاتے تو انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے یہی ثبوت کافی تھا لیکن جیک... اسے یقین تھا کہ پولیس اس تک کبھی پہنچ نہ پائے گی۔

ہائی وے پر دو سو کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اس نے احتیاطاً راستہ بدل لیا۔ وہ چھوٹی سڑکوں پر سفر کرتے

ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ یہ راستہ مشکل اور تکلیف دہ تھا لیکن ہائی وے کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ محفوظ تھا۔ جیک کو یقین تھا کہ اگلی صبح تک وہ محفوظ مقام تک پہنچ جائے گا۔

اسی چکر میں وہ دریا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا لیکن شام ہوتے ہوتے بادل گھر آئے اور پھر تیز گھن گرج کے ساتھ بارش شروع ہو گئی لیکن اس کا سفر جاری رہا۔ رات کے دس بج رہے تھے جب اچانک کار نے کئی جھٹکے لیے اور پھر اس کا انجن ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ جیک نے ہر طرح کوشش کی لیکن کار اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ پیٹرول ختم ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس نے ہائی وے چھوڑنے سے پہلے ہی ٹنکی فل کرائی تھی۔ رات کے اس پہر اور ایسے ماحول میں خرابی دور کرنا مشکل تھا۔ آخر وہ اسے دھکیلتا ہوا درختوں کے ایک جھنڈ تلے لے آیا۔

دن ہی نہیں، وہ پوری رات بھی جیک کے لیے مشکلات بھری تھی۔ ہائی وے چھوڑنے کے بعد سے اب تک وہ دلدلوں اور جنگلوں کے درمیان، دریائے اوگی چی کے کنارے کنارے تیز بارش کے اعصاب شکن ماحول میں ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ یہ راستہ اس کی مجبوری تھی۔ اس طرح وہ اسکریون اسٹیٹ پولیس سے بچ گیا۔ اس کی منزل ابھی میلوں دور تھی کہ کار نے جواب دے دیا۔ رات کے اس پہر ایسی حالت میں جیک کے پاس صبح کا انتظار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ درختوں کے اس جھنڈ میں کسی کی اُس پر نظر نہیں پڑے گی۔ اس نے فرنٹ سیٹ پیچھے کھسکائی اور نیم دراز ہو گیا۔ وہ تھکن سے بے حال تھا، ایسے میں کانٹوں پر بھی خراٹے لے کر سو سکتا تھا۔

وہ اتوار کی صبح تھی۔ کہیں قریب سے آنے والے انجن کی تیز گڑگڑاہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ جیک کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں پر ہے۔ دریا اور اس کے کنارے، تاحدِ نظر درختوں کا جھنڈ شدید دھند میں اٹا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور ماتھے پر پڑے سیاہ گھنے بالوں کو پیچھے کیا۔ کار کی ونڈ شیلڈ پوری طرح اوس سے دھندلا چکی تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکا اور کھڑکی سے گردن باہر نکالی۔ پتوں پر ٹھہر جانے والی اوس اور رات برسنے والی بارش کے قطرے، روپہلی کرنیں پڑنے پر موتی کی طرح چمک رہے تھے۔ بہت سہانا موسم تھا۔ مگر انجن کی تیز گڑگڑاہٹ جنگل کے حسن کو غارت کر رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد یہ آواز آنا بند ہو گئی۔ جیک نے گہری سانس لی۔

کچھ دیر تک وہ قدرت کے حسین نظاروں میں کھویا رہا لیکن یک بارگی بازو میں درد کا احساس جاگ اٹھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلیں۔ ڈیش بورڈ کھولا مگر وہاں پلاس یا پچ کش جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ پر رکھے تھیلے کو اٹھایا لیکن اس میں بھی ایسی کوئی چیز نہ ملی۔ اب اسے کار اسٹارٹ کرنے کی فکر تھی۔ اپنی بےوفا... محبوبہ کی پرانی بیوک پر اسے زیادہ بھروسا نہیں تھا لیکن پھر بھی، جب کوئی اوزار نہ ہو تو انجن میں تاکا جھانکی سے کچھ نہیں ہونے والا۔ رات کار کو دھکا لگا کر یہاں تک لانے میں اس کی ساری توانائی صرف ہو چکی تھی۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ یہاں سے نکلا جائے اور نکلنے کے لیے انجن کا اسٹارٹ ہونا لازم تھا۔ اب اس میں کار کو دھکیلنے کی بالکل بھی ہمت نہ تھی۔ اس نے امید کے سہارے چابی اگنیشن میں لگائی۔ دو تین بار کی کوشش سے انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اس نے ریس دی۔ کمر پر ہاتھ لگایا۔ اعشاریہ بتیس بور کا پستول ہولسٹر میں تھا۔ انجن گرم ہوا تو اس نے آہستہ آہستہ درختوں کے بیچوں بیچ، کچے راستے پر اندازے سے آگے بڑھنا شروع کیا لیکن چند گز دور جانے کے بعد انجن ایک بار پھر بند ہو گیا۔

درختوں سے گھرے اس تنگ اور ویران کچے راستے پر کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اگنیشن میں چابی گھمائی لیکن کچھ نہ ہوا۔ اسی دوران میں جھاڑیوں سے کسی کی آواز آئی۔ ”تم بوری کو وہاں سے پکڑنا، میں یہاں سے اٹھاتا ہوں۔“ جیک لہجے سے پہچان گیا۔ یہ جنگلوں میں رہنے والے ریڈ انڈین نسل کا لہجہ تھا۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ بولنے والا کوئی صحتمند اور جوان آدمی ہوگا۔ اس نے پستول کو تھپتھپا کر دیکھا۔

اس کے بعد زمین پر بوری گھسٹنے کی آواز آئی اور پھر کچھ دیر بعد کسی نے کہا۔ ”سنو بسٹر... ڈیش بورڈ میں ایک فالتو چاقو رکھا ہے، تم اسے بھی نکال لو۔“ جھاڑیوں کے اُس پار سے آنے والی اس آواز کا لہجہ بھی ریڈ انڈین جیسا تھا مگر لگتا تھا کہ بولنے والا کوئی عمر رسیدہ شخص ہے۔

”یہ تم نے اچھا کیا جو ایک فالتو چاقو بھی رکھ لیا۔“ اس بار وہی آواز سنائی دی جسے بسٹر کہہ کر پکارا گیا تھا۔

”جانتا ہوں... تمہارا دماغ تو ہر وقت چلتا نہیں، مجھے ہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔“ جیک نے اندازہ لگایا کہ درخت اور جھاڑیوں کے پیچھے کم از کم دو افراد ضرور موجود ہیں۔ ”چلو، اب اسے پک اپ پر چڑھاتے ہیں۔“

اسے یقین ہو گیا کہ وہ جو بھی تھے، ان کے پاس ایک پک اپ تھی۔ جیک کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اسے باہر نکلنے کے لیے سواری مل گئی تھی۔

''اب اسے ترپال سے ڈھانپ دو۔'' بسٹر کی آواز سنائی دی۔ ''ٹانگیں اس ڈرم میں ڈالنا۔''

جیک سوچ رہا تھا کہ یہ کتنے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اسے دو کا یقین تھا مگر ان دو کے مزید ساتھی بھی ہوئے اور انہوں نے اسے دیکھ لیا تو پھر... ہو سکتا ہے ان کا رویّہ دوستانہ نہ ہو تو وہ کیا کرے گا؟ اس کے دماغ میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشات تھے۔ اس نے اگنیشن سے چابی نکالی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کار اسٹارٹ کرنے کی آواز سے وہ اس کی جانب متوجہ ہوں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اجنبی شکاری ہیں، جرائم پیشہ یا کوئی اور۔ اس کے سامنے آنے پر حالات کوئی سا بھی رخ اختیار کر سکتے تھے۔ وہ تمام امکانات اور اپنے بچاؤ کے ہر پہلو پر تیزی سے سوچ بچار کر رہا تھا۔

''ذرا ٹھیک سے۔'' وہی بھاری آواز پھر سنائی دی۔

''یہاں سے بھی پانی نکال دو۔''

''او کے، کوشش تو کر رہا ہوں۔''

''بڑے بُرے انجام سے دوچار ہوا بے چارہ۔'' خاصی دیر بعد بسٹر کی پاٹ دار آواز پھر گونجی۔ اس کے بعد دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ جیک سمجھ گیا کہ وہ کسی جاننے والے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

''میں نے اُسے منع بھی کیا تھا کہ انگور وزنی ہیں، کشتی پر اور زیادہ وزن مت لادنا لیکن وہ سب جانتے بوجھتے بھی پانچ فٹ کی کشتی کو لبالب بھرتا چلا گیا۔'' بسٹر کہہ رہا تھا۔ ''بس! اسی چکر میں سانپ بھی نکل آیا۔ اس نے بچنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس نے ٹانگ پر ڈس ہی لیا۔''

لمحہ بھر خاموشی رہی۔ ''میرا خیال ہے کہ مکاسین نے خوف زدہ ہو کر اُسے ڈسا تھا۔'' یہ رائے کمزور آواز والے بسٹر کے ساتھی کی تھی۔

مکاسین کو مار سیاہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سانپوں کی نیم آبی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا سر چپٹا، گردن پتلی، ناک اور آنکھ کے درمیان نمایاں گڑھا ہوتا ہے۔ یہ دو میٹر تک لمبا ہوتا ہے۔ مکاسین استوائی امریکا کی دلدلوں اور ندیوں کے پاس پایا جاتا ہے۔ یہ اپنے شکار کو نہایت تیزی سے ڈستا ہے اور اس کا ڈسا عام حالات میں زندہ نہیں بچ پاتا۔ جیک، مکاسین کے بارے میں جانتا تھا اور یہ بات سننے کے بعد اسے لگا کہ گھسیٹے جانے کی جو آواز اس نے سُنی تھی، وہ بوری نہیں بلکہ شاید ایک لاش تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے سکون کی سانس لی۔ وہ جو کوئی بھی تھے، کم از کم قاتل نہیں تھے اور یہ بات اطمینان بخش تھی۔ ان حالات میں اسے شاید اُن اجنبیوں سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔

''سفید فام کو بھی سبق مل ہی گیا۔'' بسٹر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''ٹھیک ہی ہوا، اسی طرح سہی مگر دنیا سے کم از کم ایک سفید فام بے وقوف تو کم ہو گیا۔''

جیک نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھولا، درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا آوازوں کی سمت بڑھا۔ پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ پوری طرح چوکنا اور کسی بھی قسم کی صورتِ حال میں اپنے دفاع کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ چند گز آگے بڑھا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ایک تنگ لیکن کچی سڑک سامنے تھی جس کے کنارے پر ایک چھوٹی لیکن بہت پرانی پک اپ کھڑی تھی۔ پچھلا حصہ اس کی نظروں کے سامنے تھا جس کے سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ گزشتہ شب جب وہ یہاں پہنچا تو اندھیرے اور بارش کے باعث اس سڑک کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس لیے وہ جھاڑیوں میں گھری پگڈنڈی پر چلتا ہوا دریا کنارے تک پہنچا تھا۔ جیک کے علم میں یہ بات تو تھی کہ اِس وقت وہ جس علاقے میں تھا، وہ بڑے بڑے مینڈکوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا قد مرغابیوں جیسا ہوتا ہے، جسے مقامی باشندے پکڑ کر فروخت کرتے ہیں اور مختلف علاقوں میں ان کا گوشت بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ اس نے یہ سب باتیں سن رکھی تھیں لیکن اس وقت نگاہوں کے سامنے پک اپ کے پچھلے حصے پر جال سے بنی بڑی بوری میں وہی مینڈک بھرے تھے۔

جیک کے اندازے کے مطابق بسٹر واقعی جوان اور صحت مند تھا البتہ اس کا ساتھی بہت بوڑھا تھا۔ بسٹر کے کندھے سے لٹکتی رائفل کی لمبی نال چڑھتے دن کی ہلکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس نے فشنگ کیپ پہن رکھی تھی۔ بوڑھے کے جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں، جلد کی رنگت سرخ مائل اور پی کیپ سے جھلکتے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید تھے۔ جسمانی طور پر وہ بوڑھا بظاہر کمزور لگ رہا تھا۔ بوڑھے کی پی کیپ پر پرنس البرٹو تمباکو کا نشان بنا ہوا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کا لباس خون آلود تھا جس پر جگہ جگہ گریس کے گہرے دھبے تھے۔ انہوں نے ربر کے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔ عموماً جھیلوں اور دریاؤں میں ماہی گیری کرنے والے مچھیرے اس طرح کے جوتے استعمال کرتے ہیں۔

دونوں ایک ایک کر کے بوری سے مینڈک نکال رہے تھے اور بڑے شکاری چاقوؤں سے ان کے گلے کاٹنے کے بعد ٹانگیں الگ کر کے ایک بہت بڑے نیلے رنگ کے ڈرم میں ڈالتے جا رہے تھے۔ جیک نے گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ بعض مینڈک زندہ تھے اور جان بچانے کے لیے جال سے چھٹکارے کی کوشش میں نڈھال ہو رہے تھے۔ وہ دونوں نہایت ذوق وشوق سے مینڈکوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جیک نے پیچھے کی طرف نظر ڈالی۔ یہ کچی سڑک دریا کے کنارے تک جا رہی تھی۔ کم از کم تیس چالیس گز دور، خشکی پر ایک چھوٹی کشتی خالی کھڑی تھی۔ مقامی انداز کی بنی یہ چھوٹی کشتی عموماً دریا میں ماہی گیری کے لیے مچھیرے استعمال کرتے ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ کشتی ضرور انہی کی ہو گی۔

اسی دوران میں بوڑھے نے ایک زندہ مینڈک پکڑا لیکن وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گرا۔ بوڑھے نے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی تو جان پر بنی تھی۔ وہ لمحہ بھر میں اچھلتا کودتا، ٹرٹراتا ہوا برابر کی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ وہ بے بسی سے پلٹا۔ اسی دوران میں بسٹر نے چاقو ایک طرف رکھا اور اپنے خون آلود ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ، ان ٹانگوں کا کیا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گردن گھمائی۔ ''تم تو ان کا ہر طرح سے استعمال جانتے ہو۔'' بسٹر نے نیلے ڈرم کی طرف اشارہ کیا جس میں وہ دونوں مُردہ مینڈکوں کی ٹانگیں کاٹ کاٹ کر پھینکتے جا رہے تھے۔

بوڑھا خاموشی سے آگے بڑھا۔ اسی دوران میں اس نے واسکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا چاقو نکال لیا تھا۔ وہ جھکا اور ڈرم سے ایک ٹانگ نکال کر اس کی کھال صاف کی اور پھر اسے قریب رکھے دوسرے ڈرم سے ڈونگے میں پانی بھر کر اچھی طرح رگڑ رگڑ کر دھونے لگا۔ ''اس طرح صاف کر کے، دھو کر کھارے پانی کے ڈرم میں ڈالتے جاؤ۔ کھارے پانی سے گوشت جلدی خراب نہیں ہوتا۔'' وہ منمنا کر بولا۔

''تو تم یہ کرو۔'' رائفل بردار بسٹر نے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے بوڑھے کو ڈانٹا۔ یہ سن کر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ ڈرم سے ایک کٹی ٹانگ اٹھا کر اسے صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن جیک دیکھ سکتا تھا کہ اس کے لرزتے ہاتھوں سے یہ کام نہیں ہو پا رہا تھا۔

بوڑھے کے ہاتھ نہایت مہارت سے انہیں صاف کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اسے یہ کام کرنے کا خاصا تجربہ ہے۔ ''انہیں اچھی طرح صاف کر کے، مسالا لگا کر فرائی کیا جائے تو کھانے میں بالکل چپس جیسا کرارا اور خستہ ذائقہ ملتا ہے۔'' بوڑھے نے بسٹر کی طرف دیکھا۔

''تم اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے کھانے کی دعوت دی جا رہی ہو۔'' بسٹر نے کہا لیکن بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ انہماک سے اپنا کام کر رہا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ بسٹر کی رائفل کی نال اس کی طرف تھی۔ جیک کے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ بوڑھا بسٹر کو ناپسند کرتا ہے اور شاید کسی مجبوری کے باعث وہ اس کے ساتھ تھا۔

بسٹر کا چہرہ سپاٹ اور تاثرات سے عاری تھا۔ اس نے خون آلود ہاتھ میں بدستور شکاری چاقو پکڑ رکھا تھا۔ اسی دوران میں بوڑھے نے زیرِ لب کچھ کہا۔

''اَے... کیا کہا تم نے ؟'' بسٹر نے اونچی آواز سے پوچھا۔ اس کا لہجہ دھمکانے والا تھا۔

یہ سن کر بوڑھے نے نگاہیں اوپر کیں اور چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا۔ ''تم مجھے دھمکی مت دیا کرو۔'' اس کے لہجے سے ناراضی عیاں تھی۔

''زیادہ زور مت دکھایا کرو۔'' بسٹر کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''اس عمر میں ایسی باتیں صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتیں۔''

بوڑھے نے بسٹر کو گھورا اور اچانک چاقو والا ہاتھ اوپر کیا اور اس کی نوک اپنے سینے پر گڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے اس سے ڈرا رہے ہو۔''

جیک بدستور اپنی جگہ کھڑا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بظاہر بے ضرر دکھائی دینے والا یہ بوڑھا آخر کیا کرنے جا رہا ہے۔

''میں پہلے ہی کئی بے وقوفوں کو ٹھکانے لگا چکا ہوں، مزید دو چار کو بھی اوپر پہنچا دیا، تب بھی میرا کچھ نہیں بگڑنے والا۔'' بسٹر نے خباثت بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا شکاری چاقو بھی ساتھ ساتھ ہوا میں لہراتا جا رہا تھا۔

صورتِ حال گمبھیر ہو رہی تھی۔ جیک نے سامنے جانے کا سوچا۔ ویسے بھی اس کی گاڑی خراب ہو چکی تھی جسے ٹھیک کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور یہاں سے نکلنے کے لیے اسے کسی سواری کی اشد ضرورت تھی۔ یہ تو ظاہر ہو چکا تھا کہ بسٹر کوئی شریف آدمی نہیں، لہٰذا لفٹ ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لے دے کر صرف ایک ہی راستہ تھا کہ کسی طرح اُن سے پک اپ چھین لی جائے۔ جیک کے لیے مشکل یہ تھی کہ اسے کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور وہ بسٹر سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس کے کندھے پر رائفل اور

ہاتھ میں شکاری چاقو تھا۔ ایسے میں جیک کے لیے وہ ضرورت سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

''میرے خیال میں بات کرنا زیادہ بہتر رہے گا۔'' یہ کہتے ہوئے جیک درختوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں خنجر دبا ہوا تھا۔

بوڑھا اور بسٹر دونوں اس کے سامنے تھے۔ جیک کی آمد غیر متوقع تھی اور اُن دونوں کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ بسٹر کے چہرے پر سخت حیرت تھی البتہ بوڑھا پُرسکون نظر آرہا تھا۔ بسٹر نے کندھے سے لٹکتی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا۔

''ہوشیاری مت دکھاؤ۔'' جیک نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہارے کسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

رائفل کی طرف بڑھتا بسٹر کا ہاتھ واپس نیچے ہو گیا۔

''تمہیں کیا چاہیے؟''

''یہ...'' جیک نے پستول کی نال سے پک اپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے صرف اسی کی ضرورت ہے، باقی تم جانو اور تمہارا کام۔''

بسٹر کی نگاہیں جیک پر تھیں اور شکاری چاقو کے دستے پر انگلیوں کی گرفت نہایت مضبوط ہو چکی تھی اور پھر اچانک، اس نے تیزی سے چاقو جیک کی سمت اچھال دیا۔ وہ کسی بھی حملے سے بچاؤ کے لیے.... پوری طرح تیار تھا۔ جیک تیزی سے جھکا اور چاقو کے وار سے خود کو بچاتے ہوئے نہایت مہارت سے فائر کیا۔ گولی بسٹر کے ٹخنے کے اوپر لگی۔ بسٹر نے اپنا سارا وزن دوسری ٹانگ پر ڈالا اور کندھے سے رائفل اتارنے کی کوشش کی لیکن جیک نے موقع نہیں دیا۔ دوبارہ گولی چلی اور زخمی ٹانگ سے ایک بار پھر خون کا فوارہ پھوٹ گیا۔ بسٹر چلّاتے ہوئے تکلیف سے دُہرا ہو گیا۔ بوڑھا ہاتھ اوپر کیے کھڑا تھا۔ جیک کو علم تھا کہ یہاں خطرناک صرف بسٹر تھا اور وہ اسے نشانہ بنا چکا تھا۔

وہ زمین پر دُہرا پڑا تھا۔ دو گولیاں لگنے کے بعد، اس کی ٹانگ سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے زمین پر گرا دیکھ کر بوڑھا جیک کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر جیک نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔ بوڑھے کے قدم جہاں تھے، وہیں تھم گئے۔ وہ پہلے اس اجنبی حملہ آور کو اپنے لیے رحمت سمجھ رہا تھا لیکن جب جیک نے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا تو وہ بھی دل ہی دل میں ڈرنے لگا کہ کہیں کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔

جیک نے گہری نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بھی اُسی پر لگی تھیں۔ ''تو کیا تم اپنے دوست کی مدد کے لیے یہاں رکنا چاہو گے؟'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ بسٹر کے بارے میں اس کے خیالات جاننا چاہتا تھا مگر وہ خاموش رہا۔

چند لمحوں تک اطراف کا جائزہ لینے کے بعد جیک بسٹر کی طرف بڑھا۔ اس کی رائفل زمین پر پڑی تھی۔ جیک نے ٹھوکر مار کر اسے دور پھینک دیا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ گولی چلانے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں۔ اس نے بسٹر کے گرد چکر لگایا۔ وہ شدید تکلیف میں تھا۔ اس نے چلانا تو بند کر دیا تھا البتہ شدتِ درد سے اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ بہ آسانی یہاں سے باہر نکل سکتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر بسٹر پر نظر ڈالی، وہ کراہ رہا تھا۔ جیک کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ آگے بڑھا اور زمین پر پڑی رائفل اٹھا کر اس کا بٹ بسٹر کے سر پر زور سے دے مارا۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا، چوٹ برداشت نہ کر سکا اور... بےہوش ہو گیا۔ جیک آگے بڑھا اور اس کے چہرے پر پانی پھینکا۔ اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ جیک گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا اور بالوں سے پکڑ کر اس کا زرد پڑتا چہرہ اپنی طرف کیا۔ درد کی شدت سے اس کی پیشانی پر لکیریں ابھر چکی تھیں۔

جیک چند لمحوں تک اس کے زخموں کا جائزہ لیتا رہا۔ ''میں نے کہا بھی تھا لیکن پھر بھی...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک بار پھر بسٹر کا چہرہ تکنے لگا۔ ''میں یہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' جیک نے انگلی سے زخموں کی طرف اشارہ کیا۔ ''پتا نہیں کیوں تم نے مجھے اس پر مجبور کیا۔'' اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تاسف کی جھلک محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''میں یہ سب نہیں کرتا لیکن جب تم نے چاقو میری طرف اچھالا تو سمجھ گیا کہ تمہیں تو میری گردن کاٹنے کی فکر ہے۔'' اس نے غراتے ہوئے زخمی بسٹر کی نیم وا آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ان دونوں سے چند قدم دور بوڑھا کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے کبھی جیک تو کبھی بسٹر کا چہرہ تک رہا تھا۔ چند لمحے پہلے اس نے بے رحمی کا مظاہرہ دیکھا تو دہل گیا، اب وہی اجنبی... رحم دلانہ لہجے میں اپنے کیے پر افسوس کر رہا تھا۔ اسے رحم دل قاتل کی سمجھ نہیں آئی۔

جیک نے ایک بار پھر بسٹر کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر بدستور سخت تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ ''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم نے اس پرانی پک اپ کے لیے اپنی جان داؤ پر کیوں لگا دی؟ حالانکہ یہ تمہاری جان سے قیمتی تو ہرگز نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پک اپ کی طرف نگاہ ڈالی۔ بسٹر کچھ نہ بولا۔

جیک آہستگی سے اٹھا اور اس کے پاس آکر لانگ بوٹ اتارے۔ وہ خون میں تربتر تھے۔ بسٹر کی پتلون کا پائنچہ اوپر کیا۔ خون جمنے لگا تھا۔ اس نے زخم کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ گولیاں گوشت میں لگی تھیں، ہڈیاں بچ گئی تھیں۔ اس نے پیٹھ پر لدا تھیلا اتارا۔ جینی کی کار کے ڈیش بورڈ میں فرسٹ ایڈ کا چھوٹا سا باکس موجود تھا، اب وہی بسٹر کے کام آرہا تھا۔ اسپرٹ میں روئی بھگو کر جیک نے زخم صاف کیے اور مرہم پٹی کی۔ بوڑھا سمجھ چکا تھا کہ یہ اجنبی خطرناک نہیں۔ اگر بسٹر پہل نہ کرتا تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ بسٹر کے چہرے پر اب ہلکی سے طمانیت تھی۔ شاید وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ اس کی کرنی کا پھل ہے ورنہ اجنبی جان لیوا ہرگز نہیں۔

مرہم پٹی سے فارغ ہو کر جیک اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا پک اپ کی طرف بڑھا۔ وہ نہایت پرانی تھی۔ اصل رنگ کیا تھا، اسے دیکھ کر اب یہ بات کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ جگہ جگہ ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ٹائر خاصے پرانے تھے۔ اس پر سوکھے کیچڑ کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ایک سائڈ مرر غائب تھا، دوسرا ٹوٹا ہوا جسے رسیوں سے باندھ کر اپنی جگہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے اندر جھانکا۔ سیٹ کی حالت بھی خاصی خستہ تھی۔ وہ پلٹا اور بوڑھے کے قریب آکر بولا۔ ''کیا یہ کھٹارا چلتی بھی ہے؟''

''یس سر!'' بوڑھے نے لپک کر جواب دیا۔ ''اس کی حالت پر نہ جاؤ، چلنے میں یہ بالکل تیز رفتار گھوڑا ہے۔''

''یہ کباڑ کس کا ہے؟'' جیک نے پھر پک اپ کی طرف دیکھا۔

''میرا جناب۔'' بوڑھے نے بشاشت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ شیورلیٹ پک اپ ہے، سن سڑسٹھ کا ماڈل لیکن اب میں اسے ڈرائیو نہیں کرتا مگر پھر بھی چلتی بہت خوب ہے۔''

''تو پھر اسے کون چلا کر یہاں تک لایا؟'' جیک نے حیرانی سے کہا۔

''یہ...'' بوڑھے نے انگلی سے بسٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اب یہی اسے چلاتا ہے۔''

''یہ...''

''ہاں... یہی۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''بسٹر میرا بھتیجا ہے۔ یہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔''

''کیا...؟'' بوڑھے کی بات سن کر اسے شدید جھٹکا لگا۔ ''اور کون کون تمہارے ساتھ رہتا ہے؟''

''اس کے علاوہ میری ایک پوتی ہے۔ ہم تینوں ساتھ ہی رہتے ہیں۔''

جیک نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر کچی سڑک کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے زندگی میں دوسری بار کسی پر گولی چلائی تھی۔ اب وہ ان دونوں پر اپنی دہشت مزید سخت کرنا چاہتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ بوڑھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے پستول کی نال سیدھی کی اور باری باری ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سرد اور سخت لہجے میں کہا۔ ''اب میں تم دونوں کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کا لہجہ خوف زدہ کرنے والا تھا۔ یہ سنتے ہی بوڑھے کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے جلدی سے سر نیچے جھکایا اور آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگا۔ شاید اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا اور مرنے سے پہلے وہ آخری بار دعائیہ کلمات دہرا رہا تھا۔

جیک نے بسٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی بیوک جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ میں تھی جسے یہاں سے بہ آسانی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ سامان بیگ میں لدا تھا۔ یہ اتوار کی صبح تھی اور جیک کو یقین تھا کہ چرچ کی ہفتہ وار عبادت کے سبب سڑکیں بھی سنسان ہوں گی۔ نہ ٹیکسی ملنے کا امکان تھا نہ ہی لفٹ۔ یہاں سے نکلنے کے لیے جیک کی واحد امید اب یہی پک اپ تھی۔

جیک آگے بڑھا۔ اس نے بسٹر کی رائفل اور چاقو اٹھا کر سیٹ کے نیچے ڈالا اور بوڑھے سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی کو اٹھا کر ایک طرف لٹانے میں اس کی مدد کرے۔ جیک نے بسٹر کو شانوں سے پکڑا اور بوڑھے نے ٹانگوں سے۔ اس کی ٹانگیں خون میں لت پت تھیں۔ دونوں نے اسے اٹھا کر سڑک کنارے گھاس پر لٹا دیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ نقاہت اور تکلیف نے اسے بری طرح نڈھال کر دیا تھا، پھر اس نے بوڑھے سے پک اپ کا عقبی حصہ صاف کرایا۔ اس نے فرماں بردار غلام کی طرح بے چون و چرا حکم کی تعمیل کی۔

''چلو... اب چابی دو۔'' بوڑھا فارغ ہوا تو اس نے

نیا حکم دیا۔ یہ سن کر اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر مرے مرے ہاتھوں سے چابی نکال کر اسے تھما دی۔

”تو دادا جی! اب بات یہ ہے کہ چلو اور سیدھے چلتے ہوئے وہاں اپنی کشتی تک جاؤ۔“ جیک نے سپاٹ لہجے میں یہ کہتے ہوئے ہاتھ سے دریا کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پستول کی نال بوڑھے کے سینے کی جانب کر دی تھی۔ ”تم پہلے ہی بہت جی چکے۔ جو میں نے کہا، ویسا کیا تو شاید مزید کئی سال اور بھی جی سکو گے۔“

بوڑھا خالی خالی نگاہوں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

”چلو، آگے بڑھو۔“ جیک نے ایک بار پھر پستول کی نال اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے سختی سے کہا۔ جیک نے دو قدم آگے بڑھائے اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔ ”میں فالتو میں اپنی گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اگر نہ گئے تو مجبوری میں یہ نقصان برداشت کرلوں گا۔“

بوڑھا آہستگی سے مڑا اور ڈگمگاتے قدموں سے کنارے کی طرف بڑھنے لگا جہاں چھوٹی شکاری کشتی کھڑی تھی۔

”شاباش، واقعی تمہیں زندگی پیاری ہے۔“ جیک نے اسے آگے بڑھتا دیکھ کر کہا اور اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔ ”جب تم دریا کے سفر پر روانہ ہو گے، تب میں تمہیں الوداع کہوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی۔ بسٹر کو جس حالت میں لٹایا تھا، وہ ویسا ہی لیٹا تھا۔ ”جلدی کرو۔“ اس نے پستول کی نال سے بوڑھے کی پیٹھ پر ٹھوکا دیا۔

”رکو...“ کشتی کے قریب پہنچ کر جیک نے کہا اور آگے بڑھ کر چپو نکال کر ایک طرف ڈال دیے۔ یہ دیکھ کر بوڑھے نے جھنجلاہٹ میں سر ہلایا۔ شاید وہ غصے میں تھا یا پھر اسے توقع تھی کہ جیک کچھ ایسا ہی کرنے والا ہے۔

”تم سمجھتے ہو گے کہ یہ سفید فام بھی کچھ زیادہ ہی... بے وقوف ہوگا۔“ اس نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر چپو تمہارے پاس رہے تو پھر تمہیں کشتی میں بٹھا کر دریا کے بیچوں بیچ پہنچانے کا مقصد کیا خاک رہ جاتا ہے۔ تم بنا چپوؤں کی کشتی میں ڈولتے جاؤ گے۔“ یہ کہہ کر اس نے لحہ بھر توقف کیا۔ ”تم مزے سے، دریا کے بیچوں بیچ ڈولتی کشتی پہ بیٹھ کر گیت گاتے رہتا اور میں یہاں سے نکل جاؤں گا... بنا کوئی نئی مصیبت مول لیے۔“

”میں نہیں سمجھ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ بوڑھے نے منمنا کر جواب دیا۔

”سمجھنا چھوڑو اور کشتی میں بیٹھ جاؤ۔“ جیک کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

بوڑھا چپ چاپ کشتی پر چڑھ گیا اور جیک اسے خشکی سے پانی کی طرف دھکیلنے لگا۔ کشتی بالکل دریا کے کنارے پہنچا کر وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ بوڑھا اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ جیک کے سامنے تھا۔ اس کا جھریوں زدہ چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

”یہ وقت مچھلی پکڑنے کا نہیں ہے۔“ بوڑھے نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”تو کوئی بات نہیں، جاؤ اور کسی مچھیرے کو ڈھونڈ کر لاؤ تاکہ اپنے بے ہوش بھتیجے کی مدد کر سکو۔“ جیک نے سفاک لہجے میں کہا۔

بوڑھا چاہتا تھا کہ بنا چپو کے، وہ اس کی کشتی کو دریا میں نہ دھکیلے۔ ”تم جو کرنا چاہتے ہو کرو، میں تمہیں روک نہیں رہا۔“

”روک بھی نہیں سکتے۔“

چڑھتے دن کا سورج جیک کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا بنایا اور دریا کی طرف نظر ڈالی۔ وہاں دور دور تک کوئی کشتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ بات اس کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ اس نے ایک بار پھر بوڑھے کو دیکھا۔ ”ایک لمبے دن کی شروعات کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

یہ سن کر بوڑھا مسکرا دیا۔ اس کی نگاہیں جیک پر نہیں کسی اور طرف تھیں۔ ”تم جو کرنے جا رہے ہو، وہ اب نہیں کر سکو گے۔“ بوڑھے کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ وہ بدستور کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سن کر اسے طیش آ گیا، اس نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا۔

”اب تم مجھے نہیں مار سکتے۔“ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اپنے پیچھے دیکھو۔“

اس نے آہستہ سے گردن موڑی اور کندھوں کے اوپر سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے، وہیں زمین میں گڑ گئے۔

”اپنا ہتھیار پھینکو اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاؤ۔“ بوڑھے نے نہایت اعتماد سے کہا اور پھر چند لمحوں کا توقف کیا۔ ”جان پیاری ہے تو جیسا کہا ویسا کرو، ورنہ اس لڑکی کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔“

چند گز کی دوری پر اندازاً پندرہ برس کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اے ٹرپل ٹو رائفل تھی اور اس کا نشانہ جیک کی کھوپڑی پر تھا۔

”ہتھیار پھینک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔“ لڑکی کم عمر ضرور تھی لیکن اس کی پاٹ دار آواز میں بلا کا اعتماد تھا۔ جیک

حیران تھا کہ اچانک یہ مصیبت کہاں سے آ ٹپکی۔

”سنا نہیں تم نے۔“ اس نے ایک بار پھر دبنگ لہجے میں کہا۔

جیک نے اَن سنی کرتے ہوئے اس لڑکی کے سراپا کا جائزہ لیا۔ سفید ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس اس لڑکی کی رنگت بھی سرخی مائل تھی۔ بوڑھے کی طرح اس کے گالوں کی ہڈیاں بھی ابھری ہوئی تھیں۔ اس کی آواز میں اعتماد کا سبب بھی وہ جان چکا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود رائفل کا درست نشانہ بھی اس کی ایک وجہ ہو سکتی تھی۔ البتہ جس طرح دھمکی آمیز لہجے میں وہ اسے حکم دے رہی تھی، وہ کسی فوجی جیسا تھا اور جس طرح اس نے رائفل کندھے سے ٹکا رکھی تھی، اس سے لگتا تھا کہ وہ واقعی ماہر نشانہ باز ہے۔ جیک کو یقین ہو گیا کہ یہ بوڑھے کی وہی پوتی ہے جس کا اس نے کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا۔

”میرے خیال میں تمہیں جان زیادہ پیاری نہیں۔“ ایک بار پھر لڑکی کی آواز گونجی۔ ”غلطی مت کرو مسٹر... میں ضمانت دیتی ہوں اگر میری بات نہ مانی تو بنا سوچے سمجھے ٹریگر دبا دوں گی۔“

نہ جانے کیوں جیک کو لگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل بھی کر سکتی ہے۔ اس نے گردن سیدھی کی اور بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ’اس کی بات مان لوں ورنہ گھاٹے میں رہوں گا۔‘ جیک نے سوچا۔

”فائی...“ بوڑھے نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے کہا۔ ”جلدی مت کرنا، اسے ذرا حالات کی نزاکت سمجھنے دو۔“

”اے مسٹر...“ وہ پھر چلائی۔ ”میں کہہ رہی ہوں ہتھیار پھینک دو۔“

جیک نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔ پستول اور خنجر زمین پر پھینک کر وہ لڑکی کی طرف مڑا اور ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

فائی آگے بڑھی۔ اس کی نظریں جیک پر تھیں۔ ”پاپا... باہر آ جائیں، اب یہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔“ اس نے بوڑھے سے کہا۔

اب بوڑھا شیر اور اُس کا دشمن زیر ہو چکا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ بنا چپو کے وہ سارا دن دریا میں بھٹکتا رہے گا۔ یہ ماہی گیری کا وقت نہیں تھا، اس لیے اسے کسی قسم کی مدد ملنے کی بھی توقع نہیں تھی لیکن اچانک پوتی کی آمد نے پورے کھیل کا پانسا ہی پلٹ دیا تھا۔ جیک زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ فائی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے قریب آ چکی تھی۔ بوڑھا چھلانگ مار کر کشتی سے اترا اور اسے کھینچ کر پانی سے دور لے جانے لگا۔

”تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟“ بوڑھے نے بے ترتیب سانسوں کو درست کرتے ہوئے فائی کے قریب آ کر پوچھا۔ کشتی دھکیلنے سے اُس کی سانس پھول گئی تھی۔

”پاپا...“

”ہاں ہاں، میں جانتا ہوں۔“ بوڑھے نے اسے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ”ویسے تمہیں یہاں، اس وقت دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ورنہ تو یہ نہ جانے میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔“ اس نے شہادت کی انگلی سے جیک کی طرف اشارہ کیا۔

”لگتا ہے پاپا، اس نے آپ دونوں کو بہت تنگ کیا ہے۔“ فائی نے جیک کو بغور تکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی رائفل کہاں ہے، نظر نہیں آ رہی؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہمارے پاس تھی لیکن اب پک اپ کی سیٹ کے نیچے پڑی ہے، اس کی مہربانی سے۔“

”اوہ...“ فائی نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ ”اور بسٹر... وہ کہاں ہے؟“ فائی نے آنکھوں پر ہاتھ سے چھجا بنا کر چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ”وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔“

”وہاں پڑا ہے۔“ بوڑھے نے ہاتھ سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے بسٹر کو دو گولیاں ماری تھیں۔“ اس نے انگلی سے جیک کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا...“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اس نے بسٹر کو دو گولیاں ماریں اور وہ مر گیا؟“ فائی کا لہجہ استفساریہ تھا۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات اور تاثرات سے عاری تھا۔

”دو گولیاں ضرور ماری تھیں لیکن وہ اب تک مرا نہیں، صرف بے ہوش پڑا ہے۔“ بوڑھے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوتی کے سامنے وضاحت پیش کی۔

”چلو پاپا...“ اس نے کہا۔ ”دیکھتے ہیں کیا صورت حال ہے۔“ اس نے بوڑھے سے کہا۔

”ہاں ہاں...“ بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اٹھو مسٹر...“ فائی نے بندوق کی نال سے اسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ ”آگے بڑھو اور خبردار جو کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔“

بوڑھے نے آگے بڑھنے سے قبل لپک کر جیک کا پستول اور خنجر اٹھالیا۔

وہ تینوں کچی سڑک پر اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں پک اپ کھڑی تھی۔ سب سے آگے جیک تھا۔ وہ دونوں اس سے چند قدم پیچھے چل رہے تھے۔ فائی نے مستعدی سے رائفل تھام رکھی تھی۔

پک اپ کے پاس پہنچ کر بوڑھے نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر ہو کر رائفل نکالی۔ اس نے نال جیک کی طرف کی۔ ''اے مسٹر... ذرا چابی تو نکالو۔''

جیک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور بوڑھے کی طرف اچھال دی۔ ''یہ لو۔''

بوڑھے کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر فائی، بسٹر کی طرف بڑھی۔ وہ بدستور غشی کے عالم میں تھا۔ اس نے کچھ دیر تک بغور اس کا جائزہ لیا اور پھر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ''خون بہت زیادہ بہا ہے۔'' بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اگر اسے جلد اسپتال نہ پہنچایا گیا تو یہ مر بھی سکتا ہے۔''

''یقیناً...'' بوڑھے نے پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور اگر یہ مر گیا تو ذمے دار یہی ہوگا۔'' اس نے جیک کی طرف اشارہ کیا۔

یہ سن کر جیک پریشان ہوگیا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے ساری مصیبت جھیل رہا تھا لیکن معاملہ الجھتا جا رہا تھا۔ ''لعنت ہو...'' وہ بڑبڑایا۔ ''جینی بے وفا نکلی، اس کی کار نے بھی بے وفائی کی۔'' وہ خود کلامی کر رہا تھا۔

جیک سوچ رہا تھا کہ اگر رات میں گاڑی خراب نہ ہوتی تو نہ وہ یہاں آتا اور آ بھی گیا تھا تو ایک بار جب کار اسٹارٹ ہوگئی تو کم از کم اتنی دور تو ضرور چلتی کہ وہ اس جنگل سے نکل جاتا۔ یوں، خوامخواہ اس کھٹارا پک اپ کے چکر میں اس جھمیلے میں تو نہ پڑتا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ بوڑھا بندوق تھامے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فائی گھٹنوں کے بل جھکی بسٹر کا جائزہ لے رہی تھی۔

''اب بتاؤ...'' بوڑھے نے اسے اپنی طرف متوجہ پاکر کہنا شروع کیا۔ ''دریا بہت چوڑا ہے اور بہاؤ بھی تیز، کون اسے بنا چپو والی کشتی میں بیٹھ کر پار کرے گا۔'' اپنی بات مکمل کرکے اس نے جیک کی طرف بغور دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ بوڑھے نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''پاپا...'' فائی نے کہا۔ جیک بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟''

''یہ مر رہا ہے۔'' اس نے بلند آواز میں بتایا۔ ''اس کے دل کی دھڑکن بہت دھیمی ہے۔ نبض بھی رُک رُک کر چل رہی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اب یہ بچ پائے گا۔''

''بہت خوب...'' بوڑھا مسکرایا۔ ''میں نے کہا تھا کہ یہ اب تمہیں پریشان نہیں کرسکے گا۔ یہ تو اچھا ہوا جیک نے سب کچھ خود کردیا ورنہ تو پھر مجھے یہ کام کرنا پڑتا۔'' بوڑھے نے جیک کی طرف دیکھا۔ ''شکریہ تمہارا۔''

''لعنت ہو تم پر۔'' جیک نے بڑبڑاتے ہوئے منہ دوسری طرف کرلیا۔ ''تم سارے ہی ایک جیسے کمینے نکلے۔''

''لیکن پاپا...'' فائی نے بے چینی سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' فائی نے بوڑھے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں کیا کرنا ہے، کچھ سوچا آپ نے؟''

''اچھی طرح سوچ لیا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اس کے زخم سے بدستور خون کا رساؤ جاری ہے اور خون کا بہتے رہنا ڈاکٹروں کے نزدیک اچھی بات نہیں مگر ہمارے لیے ہے۔'' اس نے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے سازشی لہجے میں کہا۔ ''اس کا بہتا خون ہی ہمارے لیے اچھا ہے۔''

یہ سن کر فائی زور سے ہنس پڑی۔ ''اچھا سبق ملا اسے۔'' اس کا اشارہ بسٹر کی طرف تھا۔

''تم مینڈکوں کو دیکھو۔'' بوڑھے نے فائی سے کہا۔ ''آج رات ہم شاندار ڈنر کرنے والے ہیں، بسٹر سے چھٹکارے کی خوشی میں۔''

''اوکے!'' یہ کہتے ہوئے فائی مینڈکوں سے بھری بوری کی طرف بڑھی۔

جیسے ہی فائی مڑی، بوڑھا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اسے اٹھاؤ اور کشتی تک لے چلو۔'' اس نے رائفل کا رخ اس کے سر کی طرف کرتے ہوئے حکم دیا۔

''میں...'' جیک نے حیرت سے کہا۔

''ہاں تم...'' بوڑھا خباثت سے مسکرایا۔ ''یہ یاد رکھنا کہ اس بار تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ یہ کام تمہیں اکیلے ہی کرنا ہے۔'' بوڑھے نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اٹھو۔'' اس کا لہجہ درشت تھا۔

بسٹر بے ہوش تھا۔ جیک صحت مند آدمی تھا لیکن پھر بھی وہ خاصا بھاری تھا اور بے ہوش آدمی کا وزن تو ویسے ہی بڑھ جاتا ہے۔ جیک سوچ رہا تھا کہ اسے کشتی تک لے جانا آسان نہیں ہوگا۔

''یہ بیگ اتارو۔'' وہ بسٹر کو اٹھانے کے لیے جھکا تو بوڑھے نے اس کی پشت پر لٹکتے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

''کیا مطلب؟'' جیک پلٹ کر سیدھا کھڑا ہوا۔ وہ ایسا کرنے پر تیار نہ تھا۔ اسی دوران میں عقب سے گولی چلی اور اس کے سر سے ہوتی ہوئی سامنے لگے درخت کے تنے میں جا کر پیوست ہوگئی۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''جو پاپا کہتے ہیں، ویسا ہی کرو ورنہ اگلی گولی سر میں گھسے گی۔'' فائی رائفل تانے کھڑی تھی۔

اس نے بادل ناخواستہ بیگ اتارا۔ ''اس میں میرا سامان ہے۔'' اس کا لہجہ مرا مرا تھا۔

''کوئی بات نہیں، فی الحال تمہاری پیٹھ پر سوار ہونے کے لیے بسٹر کافی ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اسے اٹھالو۔'' اس بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے فائی سے کہا۔

دریا کنارے کھڑی کشتی تک، بسٹر کو پیٹھ پر لاد کر پہنچانا آسان نہ تھا۔ بھوکے پیاسے جیک کو کئی بار رُک کر اپنی سانسیں درست کرنا پڑیں۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

''اسے کشتی پر لٹادو اور کشتی کو پانی تک لے جاؤ۔'' بوڑھے نے حکم دیا۔

جیک نے بڑی مشکل سے بے ہوش بسٹر کو کشتی پر لادا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ہل چکا تھا۔

''تم میرے ساتھ کرنا کیا چاہتے ہو؟'' جیک نے بے چارگی سے سوال کیا۔

''بہت جلد جان لوگے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ کشتی پانی میں اتر چکی تھی۔ ''چلو... اب تم بھی اس پر سوار ہوجاؤ۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس بار جیک کے لہجے میں غصہ تھا۔

''ابھی سمجھاتی ہوں۔'' فائی نے رائفل سیدھی کی اور ٹریگر دبادیا۔ ایک اور گولی جیک کے سر پر سے ہوتی ہوئی دریا میں جا گری۔

جیک اچھل کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ ''تم جو کہو گے، وہی کروں گا لیکن میرا سامان...''

''کون سا سامان؟'' بوڑھے نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''جو ہمارے پاس ہے وہ ہمارا اور اگر سامان تمہارا ہے تو تمہارے پاس ہونا چاہیے۔''

یہ سنتے ہی جیک کے اوسان خطا ہوگئے۔ بیگ میں لوٹ کا سارا سونا اور ہیرے موجود تھے۔ انہی کے سہارے وہ نئی زندگی کی ابتدا کرنے کی سوچ رہا تھا۔ ''میرا بیگ۔'' یہ کہتا ہوا وہ پوری قوت سے اٹھا۔ ابھی اس نے کشتی سے چھلانگ نہیں لگائی تھی کہ ایک بار پھر گولی چلی۔ اس بار گولی اس کے شانے میں پیوست ہوئی۔ دوسری گولی اس کی ران میں لگی۔ وہ کشتی میں گر گیا۔

دونوں اس کے قریب آئے اور کشتی کو پانی میں دھکیلنے لگے۔ بہاؤ تیز تھا۔ کشتی ہلکورے کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ بسٹر نے تکلیف کی شدت کے باوجود سر اوپر اٹھایا۔ دور ہوتے کنارے پر وہ دونوں کھڑے تھے۔

''دھوپ بہت تیز ہوچکی ہے۔'' بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فائی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور وہ دونوں واپس اس طرف بڑھنے لگے جہاں پک اپ کھڑی تھی۔ کشتی دریا کے بیچوں بیچ پہنچ چکی تھی۔ جیک کے جسم سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور دریا میں دور دور تک بھی کسی کشتی کا نام و نشان نہ تھا۔ جیک کو اپنے بچ جانے کی امید بہت کم نظر آرہی تھی۔ خون بہنے کے سبب بے ہوشی طاری ہونے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

بوڑھا اور فائی کھٹارا پک اپ میں سوار ہوکر جنگل سے نکل چکے تھے۔ فائی نے بیگ کی تلاشی لی تو سونے کی اینٹیں اور ہیرے نکلے۔ دونوں حیرت زدہ تھے۔ ''کم از کم آٹھ دس لاکھ ڈالرز کا مال تو ضرور ہوگا۔'' بوڑھے نے خوشی سے کہا۔

''واقعی...'' فائی کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹ گئیں۔

''بس ایک بات یاد رکھنا۔'' بوڑھے نے فائی کو دیکھا۔ ''تم پچھلے کئی ہفتوں سے دریا اور جنگل کی طرف نہیں گئی ہو۔ اور یہ...'' اس نے رائفل کی طرف اشارہ کیا۔ ''گھر پہنچتے ہی اسے کھول کر ہر چیز کہیں دور علیحدہ علیحدہ دفن کردینا۔ میں نہیں چاہتا کہ پولیس کو فرانزک تحقیقات میں ہمارے پاس سے کوئی ثبوت مل سکے۔''

''اوہ...'' اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''لیکن پولیس کیوں؟''

''لنچ کے بعد مجھے پولیس اسٹیشن جاکر دو دن سے بسٹر کے لاپتا ہونے کی رپورٹ درج کرانی ہے۔ امید ہے کہ جب تک پولیس انہیں بازیاب کرانے میں کامیاب ہوگی، تب تک وہ دونوں جہنم میں پہنچ چکے ہوں گے۔''

''لیکن یہ...'' اس نے جیک کے بیگ پر ہاتھ رکھا۔

''بسٹر نے تم پر جو مظالم ڈھائے ہیں، یہ اُس کا کفارہ ہے۔'' بوڑھا مسکرادیا۔

جواری

احمد اقبال

بارہویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان
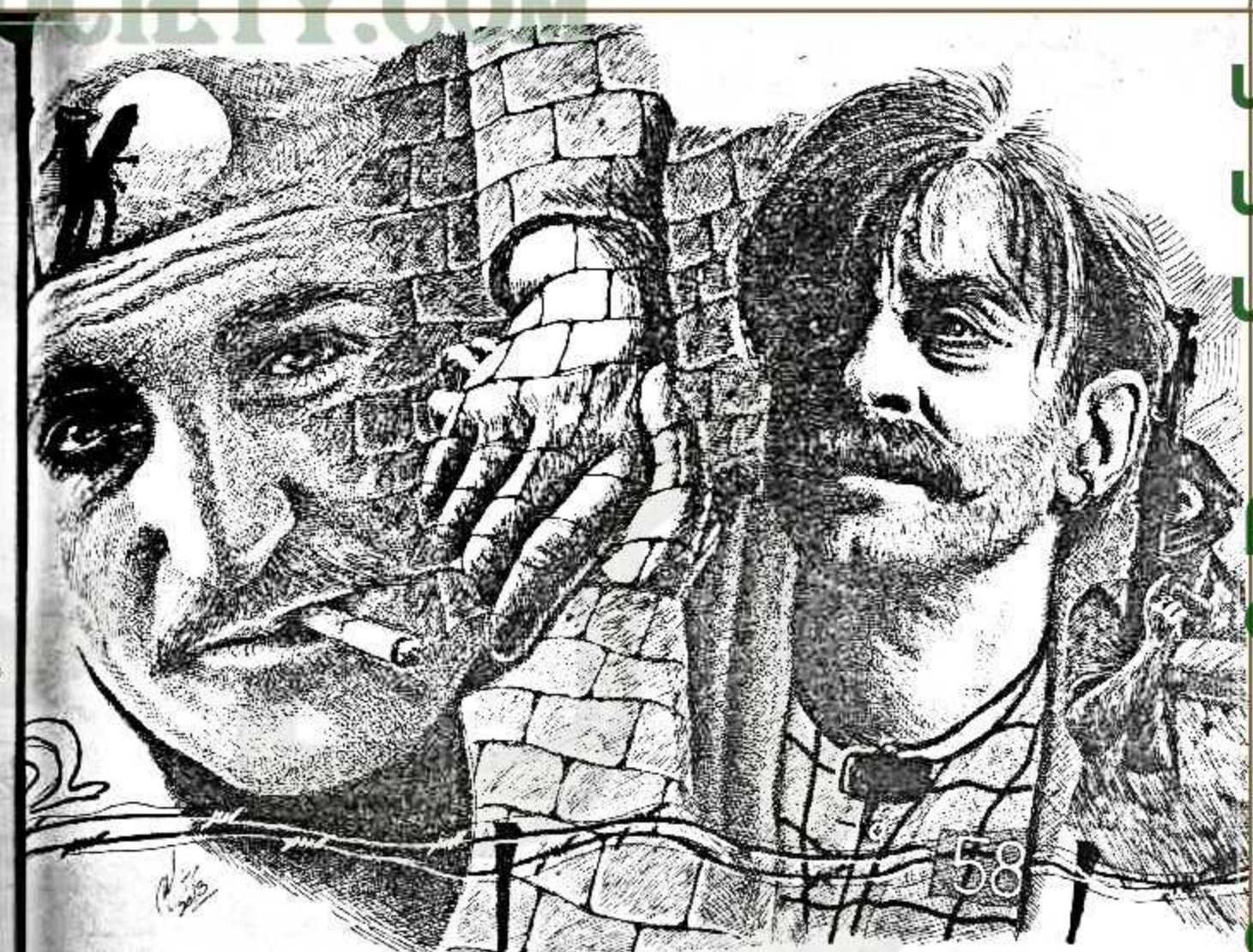
شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا.... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کرکے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کرکے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کرلیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کردیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آگئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا..... نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہوگیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کرلے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جسے نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا، نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ خاور کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آگئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جاسکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کردیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کرچکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہوگیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانیوال کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آگئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہوگئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کردیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے کارندے اٹھا کرلے گئے۔ خاور کو قید کردیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہوگیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کرلیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کردیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کردیا گیا۔ انور خاور کو لے کر شناختی کارڈ آفس گیا اور ملک سلیم اختر کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوادیا۔ حویلی میں کوئی سازش ہورہی تھی، ایک گارڈ کی موت کے بعد انور نے تمام گارڈ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ قبرستان میں ایک سرنگ کھودی گئی تھی جو پوری ہونے پر انور کے کمرے میں جانکلتی۔ تاحال یہ سازش بے نقاب ہوگئی تھی۔ ادھر اکبر کے سسر نے خاور عرف ملک سلیم کو زبردستی اٹھالیا اور آستانے کے تہ خانے میں قید کردیا۔ وہیں خاور کو نورین نظر آئی۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ رات کو کچھ نامعلوم لوگوں نے آستانے پر دھاوا بول دیا۔ خاور وہاں سے بھاگ نکلا اور نورین کی تلاش میں نکل گیا۔ لیکن وہ جب نورین کے گھر پہنچا جہاں نورین فاطمہ کے نام سے رہ رہی تھی تو اسے وہاں موجود نہ پایا۔ نورین کا فرضی باپ اسے لے کر شہر چلا گیا تھا۔ ادھر شاہینہ نے ریشم کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تاہم بروقت طبی امداد کے سبب اس کی جان بچ گئی۔ پیر اظہر علی کو قتل کے مقدمے کا سامنا تھا اور اپنی بیٹی کی کہیں اور موجودگی ثابت کرنے کے لیے اس نے ریشم سے انور کا جعلی نکاح کردیا اور اس نکاح کا خاور گواہ بنا۔ اکبر کو کسی نے زہر دے کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حویلی کے معاملات گڑبڑ ہوگئے۔ تاہم پیر صاحب نے معاملات کو سنبھالا۔ اچانک ایک اور بری خبر ملی کہ انور کا نکاح نامہ تیار کرنے والے مولوی کو قتل کردیا گیا ہے۔ ریشم کو زبردستی اظہر شاہ کے پاس پہنچا دیا گیا اور کہا گیا کہ اس پر جن آتے ہیں۔ تاہم خاور نے ریشم کے تحفظ پر چودھری کو راضی کرلیا۔ شاہینہ خاور کے کمرے میں تھی اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی کہ اچانک خاور کی نظر چودھری پر پڑی..... چودھری بندوق لیے دروازے میں کھڑا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایک لمحے کے لیے لہو میری رگوں میں خشک ہوگیا اور میں پلک جھپکائے بغیر چودھری کو دیکھتا رہا کہ کب اس کے کمزور بیمار ہاتھ شکاری بندوق اٹھا کے میرا نشانہ لیتے ہیں اور میں اس کے غیظ و غضب اور جاہ و جلال سے گونجتی آواز میں اپنی فردِ جرم تختۂ دار پر کھڑے مجرم کی طرح سنتا ہوں۔ ”نمک حرام، بے غیرت... اتنی عزت اور اپنایت دینے کا یہ صلہ دیا تو نے... میرے ہی گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالا... میرے ہی گھر میں...“ اور جملہ ختم ہونے سے پہلے

میرے کان جو آخری دنیاوی آواز سنتے ہیں، اس گولی کا دھماکا ہوتا ہے جو کسی وضاحت کی مہلت ملنے سے پہلے میری زندگی کا خاتمہ کرتی ہے۔ خود بڑی بھابی کا انجام مختلف نہیں ہوسکتا تھا لیکن میرے بعد دنیا میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا... اس کے بارے میں اب سوچنے کی مہلت بھی نہ تھی۔

وہ ایک ہی آخری لمحے کی ساری اذیت اور بے بسی رکھنے والا لمحہ تھا جس میں مجھے مرنے کے بعد اپنی لاش کے ساتھ ہونے والے سلوک کا خیال بھی آیا۔ جہاں ایک بھائی اپنے جوان بھائی کی لاش کو غیر انسانی بے حسی کے ساتھ قبر سے نکال کے پھینک سکتا ہو، وہاں میرے مردہ جسم کی توقیر کیا ہوگی۔ میرا ناپاک اور ملعون جسم کسی کتے کی لاش کی طرح گھسیٹ کر کسی گڑھے میں دبا دیا جائے گا۔ کیسی نماز اور کیسی دعائے مغفرت... یہاں کون ہے میرے خونِ ناحق پر آواز اٹھانے والا... جو آواز اٹھے گی مجھے ملعون و مطعون کرے گی۔ تاقیامت میں اپنی بے گناہی کی خلش کے ساتھ مردود خلائق بنا اپنے بے نشاں مدفن میں پڑا رہوں گا... جو سرِعام قتل کرکے کسی قانون اور شریعت میں مجرم نہیں ہوتے وہ اتنے ہی ذی شرف رہیں گے۔ انہیں خود کہیں صفائی پیش کرنے کی مجبوری بھی نہ ہوگی۔ ان کے نمک خوار مشہور کردیں گے کہ ہاں وہ اجنبی حویلی سے چلا گیا۔

وہ ایک پرآزار لمحہ اتنا طویل ہوگیا تھا کہ میری چشمِ تصور نے بھابی کے خاک و خون میں غلطاں بے جان جسم کا تصور بھی کرلیا تھا جو رحم کی بھیک مانگتے ہوئے حویلی کی غیرت پر قربان ہوئی کیونکہ خاندانی وقار کے محافظوں نے خود اسے بے حیائی اور بے شرمی کی انتہا کے ساتھ خود کو ایک کم ذات اجنبی کے سامنے محبت کے لیے گڑگڑاتے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت جب وہ عدت کے آزمائشی نفس کشی کے دور سے گزر رہی تھی۔ اس کی اچانک وفات کے لیے بھی وہ کوئی ایسی داستان تراش لیں گے جس سے خاندانی شرافت کا جھنڈا مزید بلند ہو۔ اتنی ہی آسانی سے جتنی آسانی سے انہوں نے اپنے بیٹے کے قتل کا جرم ایک دو ٹکے کی خادمہ پر ڈال کے اپنے دوسرے قاتل بیٹے کے دامن پر الزام کا داغ نہیں آنے دیا تھا۔

گولی کے دھماکے کے بجائے میرے کانوں نے چودھری کی آواز سنی جو مجھ سے سوال کررہا تھا۔ ”اوئے تجھے پتا ہے کچھ... یہ انور اتنا لمبا کدھر نکل گیا ہے اس ڈاکٹر کے ساتھ...؟“

سوال میں نے سنا اور الفاظ بھی میری سمجھ میں آئے تھے لیکن جواب میں کیسے دیتا... میں تو مرچکا تھا۔ دوبارہ زندہ اور متحرک ہونے کے لیے مجھے کچھ وقت بہرحال درکار تھا۔ بجلی جاکے پھر آئے تو ٹی وی پر بھی آواز اور تصویر کو آنے میں وقت لگتا ہے اور کمپیوٹر جو انسانی دماغ کے مقابلے میں اتنی ہی چھوٹی مشین ہے جیسے ہوائی جہاز کے مقابلے میں کسی بچے کی ٹرائی سائیکل... وہ بھی ایک دم ایکٹیویٹ نہیں ہو جاتا۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ میرے چہرے کی رنگت اور مردنی نے کس حد تک میرے رازِ جرم کو افشا کیا۔ چنانچہ بڑی بھابی کی آواز نے جیسے مجھے ایک دم توانائی کا انجکشن لگا دیا۔ معلوم نہیں کیسے اس نے اپنے اعصاب اور حواس پر قابو رکھا تھا... اس نے کہا۔ ”وہ ابھی تک آیا نہیں ابا جی...؟ بہت دیر کردی اس نے۔“

”ہاں، میں نے سوچا کہ یہ ڈاکٹر اتنا اصرار کررہا ہے تو چلو آج شکار کے بہانے باہر نکلوں... کام تو اتنا لمبا نہیں تھا۔“

میں نے بڑی بھابی کی طرف دیکھا۔ اس کی زیرِلب مسکراہٹ میری بزدلی اور کمزوری کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی کہ اچھے مرد ہو۔ مجھے دیکھو کہ اعتماد کا مظاہرہ نہ کرتی تو خود کو اور تمہیں کیسے بچاتی۔

میں نے ہمت کرکے کہا۔ ”فاصلہ کافی ہے شہر تک... اور گاڑی بھی مشین ہے۔“

اسی وقت پھاٹک پر ہارن سنائی دیا اور جیپ غراتی ہوئی اندر آکے عین میرے دروازے کے سامنے رک گئی۔ چودھری نے گھوم کے دیکھا اور اسی وقت میری نظر بھابی کی نظر سے ملی۔ چند منٹ پہلے کے میرے جذبات کچھ اور تھے۔ بڑی بھابی کا حوصلہ اور اعتماد دوچند ہوگیا تھا۔ آزمائش کے لمحے سے وہ زیادہ حوصلہ مندی کے ساتھ گزری تھی اور چودھری صاحب نے اس کی اور میری ملاقات کو بداعتمادی سے نہیں دیکھا تھا۔ دروازے کھلے تھے اور ہم ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے۔ مجھے گھر کے ایک فرد کی حیثیت خود چودھری صاحب نے دی تھی اور بڑی بھابی نے غیر معمولی عجلت سے کام لے کر ایک روایتی بیوہ کا رول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ صدمہ اپنی جگہ... ضروری نہیں کہ کوئی ماتمی لباس پہن کے اور چوبیس گھنٹے سوگوار چہرہ بنا کے اپنے غم کی شدت کا اظہار کرے۔ ایسی اداکاری کا مظاہرہ کرے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو

آجائیں۔ وہ آزادانہ گھر میں پھر رہی تھی اور اس نے مجھے غیر سمجھ کے میرے سامنے نہ آنے کا فیصلہ بھی قبول نہیں کیا تھا۔ انور کے بعد چودھری نے بھی اس بغاوت سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ بڑی بھابی لاوارث اور کمزور نہیں تھی۔ اس کے پیچھے پیر صاحب کی جذباتی حمایت تھی اور آنے والی بہن کی حمایت تھی جو حویلی کی مالکن بن کے آرہی تھی۔ چودھری صاحب کو شک ہی نہیں ہوا کہ ہم گھر کے مسئلے کے علاوہ کسی اور معاملے پر بات کررہے تھے۔

چودھری تو کوئی اور بات کیے بغیر ڈاکٹر کی طرف گیا اور بحث میں الجھ گیا۔ ''او یار! مجھ سے کہا کہ شکار پر جانا ہے اور خود نکل گیا آوارہ گردی کرنے۔''

ڈاکٹر جلالی صرف مسکرایا۔ ''آپ کے لیے کچھ دوائیں ضروری تھیں۔ وہ آسانی سے نہیں مل رہی تھیں۔ خیر، ابھی کون سی دیر ہوئی ہے، چلیں۔''

شاہینہ ایک دم اٹھی اور دروازے میں رک کے پلٹی۔ اس کے لبوں پر بڑی شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔ ''میری بات نہیں مانو گے تو نقصان میں رہو گے۔'' اس نے بل کھا کے کہا اور نکل گئی۔

اسی وقت انور اندر آیا۔ وہ کچھ دیر شاہینہ کو دیکھتا رہا جو بڑے پُرسکون اور پُراعتماد انداز میں قدم اٹھاتی جارہی تھی۔ ''یہ کیوں آئی تھی تمہارے پاس؟''

''بہتر ہوتا کہ تو اسی سے پوچھ لیتا۔''

انور بیٹھ گیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سازشی عورت کا کیا کروں۔ پہلے ہی مجھ پر الزام ہے کہ میں نے بھائی کو قتل کیا... ورنہ میں اسے قتل کردیتا۔''

''تو کچھ نہیں کرسکتا انور... تُو ایک بزدل آدمی ہے۔ بزدل اور بے وقوف... تُو نے ایک سال اپنے ہی بھائی کی قید میں گزارا۔ تو اس کے عزائم کا اندازہ نہ کرسکا۔ سات سال تو جلاوطن رہا۔ زمانے کی خاک چھانی اور بے مقصد تعلیم حاصل کی۔ لوٹ کے پھر وہیں آگیا جہاں سے چلا تھا اور وہی بن گیا جو تیرا اصل تھا۔ تیرا علم ضائع ہوا۔ آج وہ عورت جس سے تو منسوب تھا، تیری سب سے بڑی دشمن ہے جو سمجھتی ہے کہ تو اسے ٹھکرا کے چلا گیا تھا۔ جس شوہر کو اس نے قتل کیا، وہ ہمیشہ اسے ذلیل کرتا رہا کہ تو ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ انور تجھ پر تھوک کے چلا گیا تھا۔ اس تذلیل پر شاہینہ نے بالآخر شوہر کو خود مارا اور مجرم تجھے بنا دیا۔ سب کی نظر میں پہلے وہ خود ذہنی اذیت کا شکار تھی۔ اب تو ہے۔ اور دیکھ کیسی شیطانی ذہانت کے ساتھ اس نے ریشم کو تجھ سے بدظن کیا اور پھر اسے تیری دسترس سے دور کرکے اپنے بے ضمیر باپ کے حوالے کردیا کہ اب جو سلوک اس کے ساتھ چاہو کرو... تجھ پر اعتماد کے دھوکے میں ماری گئی... اور اب [illegible] تیری زندگی میں زہر گھولنے آرہی ہے۔ تمام عمر وہ [illegible] کے تجھ پر مسلط رہے گی کیونکہ وہ تجھ سے نفرت کرتی ہے، محبت وہ مراد سے کرتی تھی۔''

انور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا [illegible] سب سنتا رہا۔ خود مجھے یہ احساس ہوا کہ بھابی کے خلاف میرے دل میں جتنی نفرت تھی اور غصہ تھا، وہ میں انور پر [illegible] رہا ہوں۔ کچھ دیر ہمارے درمیان ایک زہریلی خاموشی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ ''مجھے بتا میں کیا کروں؟''

''میں بتاؤں گا اور تو مانے گا؟'' میں نے [illegible] حقارت سے اسے دیکھا۔ ''کیا اب تُو انکار کرسکتا ہے کہ تجھے روزینہ قبول نہیں؟ کہہ سکتا ہے کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں... اور جس نکاح نامے کی رو سے وہ میری بیوی بنی... وہ جعلی ہے... کاغذ کا ایک پرزہ ہے... اس پر دستخط تک روزینہ کے نہیں... اور میرا اس سے نکاح کبھی نہیں ہوا؟''

''انکار کردوں؟'' وہ خلا میں دیکھتا رہا۔

''ہاں انکار کردے۔ اس سے پہلے کہ وہ انکار کرے۔ مرد بن الو کے پٹھے... کھڑا ہوجا سینہ تان کے سب کے سامنے اور ریشم سے شادی کرلے۔ کیا بگاڑ لے گا کوئی تیرا... بڑے چودھری کا اب صرف نام رہ گیا ہے۔ وہ سانس بھی مشکل سے لے رہا ہے۔ اس پیر کا داخلہ بند کردے اس حویلی میں اور شاہینہ کو بند کردے اسی کے کمرے میں... اس کا سب سے رابطہ ختم کردے یا اسے بھیج دے باپ کے گھر... کرسکتا ہے تو یہ سب...؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، میں یہ سب نہیں کر سکتا۔''

''پھر میں تجھے خبردار کررہا ہوں۔ شاہینہ ناگن ہے۔ تو نے اس کا پھن نہ کچلا تو وہ تجھے ڈس لے گی... اور مجھے بھی...''

''تیری اس سے کیا دشمنی...؟''

''یہ بھی میں آج بتا رہا ہوں تجھے... شاہینہ نے خود مجھ سے کہا ہے آج... ابھی تیرے آنے سے پہلے... کہ میں اس سے شادی کرلوں۔''

انور بُری طرح چونکا۔ ایک دم کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا۔ ''نہیں، تو بکواس کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ کوئی نئی بات نہیں انور... بہت دن سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کہتی ہے اسے محبت ہوگئی ہے مجھ سے۔''

انور کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''اور... اسی لیے اکبر کا قتل کیا تھا اس نے... تو یہی ثابت کرنا چاہتا ہے؟''

''نہیں، وہ نفرت اس کے دل میں بہت پرانی تھی۔ اکبر اسے بہت ذلیل کرتا تھا مگر اسے چھوڑتا اس لیے نہیں تھا کہ وہ اپنے پیر باپ کی آدھی جائداد کی مالک تھی۔ اکبر بدکار تھا۔ ہر خادمہ اور پسند آنے والی ہر لڑکی یا عورت سے تعلقات استوار کرلیتا تھا۔ شہر سے پیشہ ور عورتوں کو حویلی میں لاکے رکھتا تھا۔ ریشم بھی اسے پسند آگئی تھی اور موقع ملتا تو وہ ریشم سے بھی شادی کرلیتا۔ دوسری شادی سے کون روکتا اسے؟''

''یہ سب بھابی نے بتایا تجھے؟''

''ہاں، اس نے اعتراف کیا میرے سامنے کہ اکبر آزاد ہوجاتا تو اس کی آزادی ختم ہوجاتی۔ اس کے ساتھ پھر وہی دن رات کی ذلت کا سلوک ہوتا۔ وہ بے بسی سے اکبر کو دوسری عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتی دیکھتی اور کچھ نہ کرپاتی۔ شراب کے نشے میں دھت ہوکے وہ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھتا تھا۔ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ عورت کون ہے کیسی ہے..... بوڑھی..... بچی..... جوان... کسی کی بیوی... ملازمہ... طوائف... سب اس کے لیے شاہینہ کے برابر ہوجاتی تھیں۔ یہ شاہینہ کے لیے بہت سخت عذاب تھا اور سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ اکبر نے شاہینہ کو قتل کرنے کا سوچ لیا تھا۔''

''کیا اس نے... شاہینہ کو دھمکی دی تھی؟''

''اس نے نشے میں بک دیا تھا کہ قتل کرکے میں تیری بہن سے شادی کروں گا۔ وہی تھی میری منگیتر... ایک ساتھ دو بہنوں کو رکھ نہیں سکتا ورنہ تیری سوکن بناتا تیری ہی بہن کو... اور جب تو نہیں ہوگی تو ساری جائداد کی مالک ہوگی روزینہ... تیرا باپ مرے گا تو اس کی زمین جائداد سب مجھے ملے گی۔''

''یا میرے خدا! پھر تو ٹھیک ہی کیا شاہینہ نے۔''

''اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ اکبر سے نجات حاصل کی اور سزا تجھے دی... میں یہ سب نہ بتاتا تو ساری عمر تو سب کی نظر میں مجرم رہتا اور اپنے احساسِ جرم سے بھی نجات نہ پاتا۔''

''مجرم تو میں رہوں گا۔ شاہینہ پر کسی کا شک نہیں... سارا الزام مجھ پر ہے... اور کیا کہا اس نے؟''

''دیکھ، میری بات پر تجھے اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ شاہینہ نے کہا کہ جب اس نے مجھے دیکھا تو پہلی نظر میں مجھے پسند کرلیا تھا اور میں پہلا مرد تھا جس کی محبت نے اسے پاگل کردیا تھا۔ اس حد تک کہ بالآخر اس نے اکبر کو قتل کرکے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ فیصلہ کوئی قبول نہیں کرے گا لیکن وہ سب کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ یہاں تک کہ میرے ساتھ جانے کے لیے بھی۔ یقین کر کہ مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا جذبات رکھتی ہے۔ خود میں نے کبھی اس کو بری نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ ایک خوب صورت پُرکشش عورت ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آتی۔ اشارے بازی خود اس نے شروع کی۔ پہلے پہل میں نے اسے غلط فہمی سمجھا۔ بعد میں وہ زیادہ بولڈ ہوگئی۔ اس کی اشارے بازی حد سے بڑھ گئی۔ وہ مجھے باقاعدہ ورغلانے لگی۔ مگر میں ڈر سے دور رہا۔ اس کی نظر بازی کو نظرانداز کرتا رہا۔ اب میں کیا تفصیل بتاؤں کہ وہ کس حد تک بے شرم ہوگئی تھی۔ ایک بار میں کسی کام سے اس کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ غلطی میری تھی کہ دستک نہیں دی۔ لیکن اسے بھی دروازے کو اندر سے لاک کرنا چاہیے تھا یا کم سے کم کنڈی لگا کے رکھتی۔ وہ نہا کے نکلی تھی اور بہت کم اور نامناسب کپڑوں میں تھی۔ مگر اس نے مجھے روک لیا اور دھمکی دی کہ وہ چودھری صاحب سے شکایت کردے گی۔ وہ فوراً باتھ روم میں جاکے کپڑے بدل سکتی تھی مگر وہ اسی طرح میرے سامنے رہی اور مجھے شرمندہ کرکے لطف لیتی رہی۔ میں بہت ڈر گیا تھا۔ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور موقع پاتے ہی نکل آیا۔ شاید میری خاموشی کا مطلب اس نے غلط لیا۔ میں تو کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ الزام الٹا مجھ پر آتا۔ ادھر تو نے مجھے روک رکھا تھا۔ میں بھی خود کو یہاں محفوظ سمجھتا تھا ورنہ شاید میں بھاگ جاتا۔''

''تو مجھ پر بھروسا کرسکتا تھا۔'' انور بولا۔ ''مجھے بتاتا۔''

''نہیں یار، یہ معاملہ کچھ اور تھا۔ شاید تو بھی یقین نہ کرتا۔ دو تین ہفتے بعد بھابی نے مجھے کسی کام سے طلب کیا۔ میں نے احتیاط کی اور دروازہ کھلا رکھا۔ بھابی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی، ریشم سے تیرے مراسم کی جس کی وجہ سے روزینہ کا مسئلہ اٹکا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں کافی آگئی اور اس نے نظر بچا کے کافی میں کچھ ڈال دیا۔ اس کام کی وہ ماہر

www.paksociety.com

ہے۔ اس نے ریشم کو بھی زہر دیا تھا اور مشہور یہ کیا تھا کہ بدنامی سے بچنے کے لیے ریشم نے خودکشی کی کوشش کی۔ معلوم نہیں میری کافی میں اس نے کیا ملایا تھا کہ میرے حواس برقرار نہ رہے۔“

”اور... اس کے بعد...“

”اس کے بعد... وہی ہوا... جو شاہینہ چاہتی تھی۔ میری خواہش اور ارادے کے بغیر... سب اس دوا کا اثر تھا۔“

انور غصے سے دانت پیسنے لگا۔ ”اب تو اسے قتل کرنا پڑے گا۔“

”جذبات پر قابو رکھ انور! کہیں ایسا نہ ہو میرے ساتھ تو بھی مصیبت میں پڑ جائے۔ کیا تو نے اس کے کہنے پر اکبر کی لاش کو قبر سے نکال کے دوسری جگہ دفن کیا تھا؟“

انور اچھل پڑا۔ ”یہ اس نے بتایا تجھے؟“

”اسی نے بتایا... اور اس نے چشم دید گواہ بھی بنا لیے تھے جنہوں نے یہ سب دیکھا تھا۔“

”کون... کون ہیں وہ چشم دید گواہ...؟“

میں نے، سلونی یا ریشم کا نام لینے سے گریز کیا۔ ”ایک میں خود ہوں۔ مجھے بھابی نے یہ ہولناک کارروائی دکھائی تھی۔ کیوں کیا تھا تو نے ایسا انور؟“

”مجھے... خود بھابی نے کہا تھا۔ دھمکی دی تھی کہ میں نے اس کی بہن سے شادی نہ کی تو وہ اپنے باپ کو بتا دے گی اور مجھ پر کیس ہو جائے گا۔ میں بھی ڈر گیا تھا۔ روزینہ سے شادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔“

”اسے شادی مت کہہ۔ ابھی شادی کہاں ہوئی ہے۔ صرف ایک کاغذ پر اس کا اور تیرا نام لکھا گیا ہے۔ یہ کام اپنی مرضی سے کیا تھا تو نے؟“

”کون سا کام؟“

”اکبر کی لاش غائب کرنے کا؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”میں کیا کرتا... مجبوری تھی۔“

”میری بھی مجبوری تھی۔ اس رات میں بھی بھابی کے کمرے میں اپنی مرضی سے نہیں رہا تھا اور صبح ہونے سے پہلے اس نے مجھے واپس اپنے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ آج تیرے آنے سے پہلے اس نے صاف کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور میں انکار نہیں کر سکتا۔ پھر جو اس کا ہے سب میرا ہو جائے گا۔ وہ دھمکی اور لالچ کے حربے آزما رہی ہے۔“

”یار! کوئی زبردستی نہیں کر سکتا تیرے ساتھ۔“

”لیکن انور! اس نے کہا ہے کہ اس کے پاس ثبوت ہیں۔ اس رات کے جب میں اس کے ساتھ تھا۔ خدا معلوم یہ جھوٹ ہے یا سچ... کیا پتا اس نے تصویریں بنا لی ہوں۔ کوئی فلم ہو... وہ خود تو مظلوم بن جائے گی کہ شوہر کے ڈر سے وہ بولی نہیں۔ میں نے زبردستی کی تھی۔ شوہر اسے قتل کر دیتا۔ شاہینہ کی دھمکی کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا مگر میں تجھے سب بتا رہا ہوں... اس لیے کہ تو ہی مجھے بچا سکتا ہے اور تجھے کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ بس تو مجھے جانے دے۔ چودھری صاحب نے قسم دے کر مجھے روک رکھا ہے ورنہ میں بھاگ جاتا۔“

انور کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھ ملک... بھاگنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اب ہم مل کے کچھ کریں گے۔“

”کیا کریں گے؟“

”شاہینہ کا قتل... اور کیا... یہ ضروری ہے۔“

میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں، یہ میں نہیں کر سکتا۔“

”اچھا مت کر... لیکن اس وجہ سے مجھے چھوڑ کے مت جا... شاہینہ کا بندوبست میں اکیلا ہی کر لوں گا۔ اب مجھے سب بتا دیا ہے تو نے تو یہ ضروری ہو گیا ہے۔ تو پریشان مت ہو۔“ وہ باہر نکل گیا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کیا یہ سب انور کو بتا کے میں نے اپنی مشکل آسان کی ہے یا معاملے کو مزید الجھا دیا ہے؟ کیا انور واقعی اتنی ہمت رکھتا ہے کہ شاہینہ کو ٹھکانے لگا سکے؟ اس طرح کہ کسی پر شک نہ جائے۔ نہ اس پر... نہ مجھ پر... شاہینہ کے پیچھے اس کے باپ کی قوت بھی ہے۔ وہ صرف پیر ہی نہیں، مریدوں کی ایک مافیا کا سربراہ بھی ہے۔

اس رات میں دروازے کو اندر سے لاک کر کے سویا۔ مجھے یاد تھا کہ کسی بہانے شاہینہ اندر نہ آ جائے یا مجھے کسی سے اٹھوا نہ لے۔ یقیناً اس حویلی کے اندر بھی اس کے اشارے پر چلنے والے جانثار تھے۔ وہ حویلی کی بڑی بہو تھی اور پیر صاحب کی بڑی بیٹی۔ اس کے پاس دولت کی طاقت بھی تھی اور اختیار بھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ حویلی کے درجنوں ملازموں میں سے کچھ اس کے باپ کے مرید ہوں جو اس کے اشارے پر جان دے بھی سکتے ہوں اور لے بھی سکتے ہوں۔

صبح میں نے شاہینہ کو ہر روز سے زیادہ مستعد اور خوش دیکھا۔ اب وہ بلا جھجک رنگین لباس پہن رہی تھی اور میک

اپ کر رہی تھی۔ اسے کچھ کہنے والا کون تھا۔ ساس، سسر بڑھاپے کی بے بسی اور بیماری کے علاوہ اپنے دکھوں کے اسیر تھے اور عملاً اپنے کمرے تک محدود ہو کے رہ گئے تھے۔ انور سے وہ ڈرتی نہیں تھی اور اب بڑی مالکن کی حیثیت سے اپنا حکم بھی چلاتی تھی۔ میں نے اسے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا لیکن وہ اشاروں کنایوں میں مجھے پیغام دیتی رہی اور مجھ سے پوچھتی رہی کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ کیا سوچا ہے تو نے میرے لیے اور اپنے لیے۔

میری حیثیت ہر گزرتے دن کے ساتھ کسی سیاسی قیدی جیسی ہو گئی تھی جس کو محدود نقل و حرکت کی آزادی بھی حاصل تھی۔ اپنی مرضی سے میں اس حویلی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا جو اب میرے لیے ایک اوپن جیل تھی۔ بڑے چودھری اور انور کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میری بدلی ہوئی شناخت کے بارے میں جانتے ہیں۔ انور کو اصل اسباب کا بھی علم تھا۔ شاہینہ یا اس کے پیر باپ کے بارے میں یقین کے ساتھ کہنا مشکل تھا کہ وہ میرے اصل ماضی کے حوالوں سے کس حد تک مطمئن ہیں۔ انور نے مجھے اپنا سمجھ لیا تھا تو باقی سب نے بھی قبول کر لیا تھا۔

پیر صاحب نے میرے ماضی کا سراغ لگانے کے لیے کوشش کی تھی تو انہیں کس حد تک کامیابی ہوئی تھی اور اگر انہیں حقیقت معلوم ہو گئی تھی تو کیا وہ کسی مصلحت کے تحت خاموش تھے؟

اگر پیر صاحب کو میری اصلیت کا علم ہوتا اور انہوں نے یہ راز اپنی بڑی بیٹی سے شیئر کیا ہوتا تو بڑی بھابی کے ہاتھ میں میری کمزوری کا ٹرمپ کارڈ ہوتا۔ وہ مجھے حاصل کرنے کے لیے خود کو میرے قدموں میں نہ ڈالتی۔ وہ مجھے بلیک میل کرتی اور صاف پوچھتی کہ بولو کیا منظور ہے۔ اس حویلی میں داماد کی طرح عزت سے اور عیش آرام کے ساتھ رہنا... یا واپس جیل جا کے تختۂ دار پر جانے کی نئی تاریخ کا انتظار کرنا۔ میرا نورین سے عشق جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا اور میں زندگی قربان کرنے کے بجائے اپنی انا کو قربان کرنے کا سودا کر لیتا۔ ہمیشہ کے لیے نہ سہی، ایک محفوظ راستہ ملنے تک ہی سہی... اب میری زندگی میں ایک اور خطرناک موڑ آ گیا تھا جب مجھے طے کرنا تھا کہ مجھے اپنے پیروں میں کوئی زنجیر قبول کرنی ہے یا ہر زنجیر توڑ کے نکلنا ہے۔ ظاہر ہے میرا فیصلہ مزید مصلحت کے تابع نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مجھے سب کچھ بھلا کے اور چھوڑ کے اور مستقبل کی پروا کیے بغیر یہاں سے جانا تھا۔ اس راستے کی طرف جس کی منزل نورین تھی۔

دوسرا دن معمول کے مطابق گزر گیا۔ چودھری صاحب بیماری اور علاج کے ساتھ چلتے رہے اور ڈاکٹر جلالی ایک فرض شناس مسیحا کی طرح حویلی کے تمام معاملات سے لاتعلق رہتے ہوئے ان کو آخری سانس تک زندہ رکھنے کی کوشش بڑے خلوصِ نیت کے ساتھ کرتا رہا۔

انور زمینوں کے اور فصلوں کے معاملات میں الجھا رہا۔ نہ جانے کون لوگ اس کے دربار میں حاضری دیتے رہے۔ جب وہ صحن میں کرسی ڈال کے بیٹھتا تھا تو حاضری کے خواہش مند یا طلب کیے جانے والے اس سے کافی فاصلے پر اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ بہت کم ایسے لوگ ہوتے تھے جن کو انور سامنے کسی خالی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتا تھا۔ اس خاندان کی زمینداری کے معاملات سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آمدنی فصلوں سے ہوتی تھی جس میں ہر قسم کی فصل تھی۔ نہری زمین سونا اگلتی تھی اور ان کے باغات کے ٹھیکے لاکھوں میں اٹھائے جاتے تھے۔ انور اپنی یورپ کی حاصل کردہ اعلیٰ تعلیم کو بھلا کے جاگیردار بن گیا تھا اور تمام معاملات سے بخوبی نمٹ رہا تھا۔

بڑے چودھری کی بیماری کے دوران بھی انور کی ماں کا حویلی پر کنٹرول تھا لیکن جب سے اکبر کا قتل ہوا تھا اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ اب حویلی کے سارے ملازم بڑی بھابی کے اشارۂ ابرو پر چلتے تھے۔ اس سانحے سے پہلے سلونی نے ہاؤس کیپر کی حیثیت سے جو خدمات سرانجام دی تھیں، ان کا اعتراف بڑے چودھری کے ساتھ انور بھی کرتا تھا مگر شاہینہ کے کنٹرول کے بعد سلونی کا کوئی مصرف نہ رہا تھا۔ انور کی وجہ سے اس کو نکالا بھی نہیں گیا تھا مگر تمام اختیارات اس سے لے لیے گئے تھے۔ اس بے قدری کے ساتھ ہی سلونی نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے عزت آبرو کے ساتھ حویلی سے نکل جانا بہتر سمجھا تھا ورنہ حویلی کے سازشی ماحول میں وہ یوں غائب ہوتی کہ پھر حشر تک اس کا سراغ نہ ملتا۔

شاید اب انور بھی مجبور تھا کہ امورِ خانہ داری میں دخل نہ دے اور حویلی کے اندر کا انتظام بڑی بہو کو چلانے دے۔ اس کی حیثیت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اکبر اور انور کی کزن تھی۔ پیر صاحب اس کے والد تھے جو طاقت اور اثر رسوخ میں بھی بالادستی رکھتے تھے۔ بیوہ ہو کے وہ زیادہ رحم اور تکریم کی مستحق ہو گئی تھی اور خود انور اس کے سامنے اپنی حاکیت یا اختیار کا استعمال ایسے نہیں کر سکتا تھا جیسے حویلی کے اندر پہلے

www.paksociety.com

چودھری صاحب کرتے تھے اور پھر اکبر نے کیا تھا۔

مجھے شک ہوتا تھا کہ زیادہ تر ملازم اور محافظ خود کو انور کا نمک خوار اور جانثار سمجھتے تھے مگر حکم شاہینہ کا مانتے تھے۔ اب خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہوں گے۔ ان کے لیے شاہینہ کے ناجائز حکم کی تعمیل بھی مشکل تھی اور اس کی شکایت انور سے کرنا بھی مشکل تھا۔ ان حالات میں بڑی بھابی یہ کرسکتی تھی کہ جس کی وفاداری پر شبہ ہو اس کو نکال باہر کرے۔ کسی بھی جھوٹے سچے الزام پر انہیں سزا دی جاسکتی تھی۔ پھر اس کی جگہ وہ اپنے کسی جانثار کو رکھے... رفتہ رفتہ حویلی کے اندر سب اس کے حکم کے غلام ہوجائیں... جو ضرورت پڑنے پر اس کی حفاظت کریں خواہ اس کے لیے انور کے سامنے ہی کھڑا ہونا پڑے۔ ایسی سیکیورٹی فورس ملازموں کے بھیس میں پیر صاحب فراہم کرسکتے تھے۔ میرے لیے شاہینہ کی دھمکی کو نظرانداز کرنا اتنا آسان نہ ہوگا، یہ میں نے سمجھ لیا تھا۔

میری شامتِ اعمال نے شاہینہ کو ایک اور موقع فراہم کردیا۔ اس رات کھانے کی میز پر انور کچھ اپ سیٹ تھا۔ کھانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آگیا تو میں نے پوچھا۔ ''کوئی نئی بات ہوئی ہے انور؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، وہ جو نکاح نامہ بنا تھا، وہ میں نے بڑی احتیاط سے اپنی الماری میں رکھا تھا۔ اب وہ نہیں مل رہا ہے۔''

''نکاح نامہ کہاں گیا... تجھے کیا شک ہے؟''

''نکاح نامہ غائب کیا گیا ہے۔ اور شک ہے مجھے سلونی پر بھی... اور ریشم پر بھی۔''

''ریشم کو الزام دیا جاسکتا ہے، حالانکہ اس کاغذ کے پرزے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اہمیت ہوگی نکاح نامے کی۔ لیکن سلونی پر شک کی وجہ نہیں بنتی۔''

''جس طرح وہ گئی ہے، اسے میں فرار سمجھتا ہوں۔ اس نے مجھے بائی پاس کرکے ان سب سے اجازت لے لی جو اس کا وجود حویلی میں محض برداشت کررہے تھے۔ اسے لانے والا تو میں تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا۔ یہ بے وقوفی تھی اس کی اگر وہ نکاح نامہ لے گئی۔''

''نہیں یار، مجھے تیرا شک بے سبب لگتا ہے۔ تو ناراض نہ ہو تو میں ایک بات کہوں؟''

''میں تجھ سے کیسے ناراض ہوسکتا ہوں؟''

''غصہ آئے گا تجھے... میرا خیال ہے کہ سلونی نے یہ کام کیا تو کسی اور کے کہنے پر...''

''کس کے کہنے پر؟'' انور کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

''روزینہ کے کہنے پر... یا روزینہ خود وہ نکاح نامہ لے گئی جاتے وقت۔ تو چاہے نہ مان میری بات... لیکن روزینہ اس زبردستی کے نکاح سے کبھی خوش نہیں ہوگی۔ تو میری صاف گوئی کا بُرا مانے گا لیکن دوست... حقیقت کو سمجھ... ابھی مراد کی موت کا غم تازہ تھا کہ اسے یہ خبر ملی ہوگی کہ باپ نے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے اسے استعمال کیا ہے۔ کسی مولوی سے ایک نکاح نامہ بنوا کے ثبوت حاصل کیا گیا ہے کہ جس رات قتل ہوا روزینہ سسرال میں تیرے ساتھ تھی۔ باپ کو صرف اپنی عزت کا خیال تھا، بیٹی کے جذبات کا نہیں۔ روزینہ کے دل پر کیا بیتی ہوگی... میں سمجھتا ہوں، اس روز اگر پیر صاحب بیٹی کو نکاح کے لیے مولوی کے سامنے بٹھا دیتے تو وہ پاگل ہوجاتی... اس پر جنون کا دورہ پڑ جاتا اور وہ چیخ چیخ کر نکاح سے انکار کردیتی اور وہ سب کہہ جاتی جو سچ تھا... پیر صاحب نے یہ رسک نہیں لیا تھا۔ روزینہ جذباتی شاک میں تھی مگر اس نے حواس پر قابو رکھا۔''

''لیکن نکاح نامہ اس کے کس کام کا؟''

''یار! کچھ عقل سے کام لے... اس طرح روزینہ نے ایک ثبوت ضائع کیا ہے اور تجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس سے شادی کے لیے تیار نہیں اور تو لکھ لے میری بات... وہ انکار کردے گی۔ خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ اس کی بہن شاہینہ صرف یہ دیکھ رہی ہے کہ دوسری بہن حویلی میں آئے گی تو اس کی طاقت دوچند ہوجائے گی۔ روزینہ کو معلوم ہوگا کہ اکبر نے اس کی بہن کو کتنا ٹارچر کیا تھا، کتنا ذلیل کیا تھا۔ تو بھی ایک مرد ہے جو شوہر بن جانے کے بعد زیادہ فراخ دل نہیں ہوجاتے۔ تو اسے مراد کا نام لے کر ساری عمر اس سے کہیں زیادہ عذاب دے گا جو اس کی بہن کو اکبر نے دیا۔''

غصے، بے بسی اور احساسِ شرمندگی سے انور کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''ایسا کیوں کرے گی وہ... میں اکبر نہیں ہوں... شوہر ہوں اس کا۔''

''شوہر سب صرف شوہر ہوتے ہیں۔ نام سے فرق نہیں پڑتا۔ سب کا سلوک اور رویّہ وہی رہتا ہے۔ خصوصاً اس حویلی کے اندر... تیرے پڑھے لکھے ہونے سے تیرا مزاج نہیں بدلا... وہ بھی روزینہ ہے۔''

''یہ غلط ہے... وہ انکار نہیں کرے گی۔''

''تیری جگہ اگر میں ہوتا انور تو اس شادی سے خود انکار کردیتا۔ کیا تو جانتا نہیں تھا کہ مراد اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات یہاں بھی پہنچی ضرور ہوگی کہ مراد نے روزینہ کا رشتہ مانگا تھا جسے انکار کردیا گیا۔ اس وقت تو آگے بڑھ کر یہ رشتہ کراتا، پیر صاحب کو سمجھاتا... ان سے کہتا کہ اب میرا خیال تو دل سے نکال دیں... مگر تو نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا... شاید تیری انا کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔ مگر انور... میری مان... ابھی وقت ہے... خاندان کی عزت کو بہانہ مت بنا۔ انکار کردے اس شادی سے... ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تیرے مستقبل کی خوشی اور زندگی کا سکون ریشم سے شادی کرنے میں ہے... ہمت سے کام لے۔''

انور میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ وہ میری بات مانتا اور حقائق کو تسلیم کرتا۔ اس کی مردانگی اور غرور کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ وہ ذہنی اذیت میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور مجھ سے نظر چراتا رہا پھر ایک دم اٹھا اور زخم خوردہ جانور کی طرح کمرے سے نکل گیا۔ مجھے اپنے کہے پر نہ افسوس تھا، نہ ندامت تھی۔ انور کے دوست کی حیثیت سے مجھ پر لازم تھا کہ اسے صحیح مشورہ دوں اور وہ بات سمجھاؤں جو اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی۔

شاید شاہینہ وہیں دروازے سے لگی ہماری گفتگو سن رہی تھی یا برآمدے کے کسی ستون کے پیچھے منتظر تھی کہ انور جائے تو میرے دروازہ بند کرنے سے پہلے وہ اندر آجائے۔ مجھے اٹھنے میں دو چار منٹ لگے ہوں گے۔ اچانک میں نے اسے اپنے مقابل دیکھا۔ اس کا چہرہ غم و غصے کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور خود اس کے ساتھ کمر لگا کے کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر وہ مجھے گھورتی رہی۔ وہ نائٹ گاؤن میں تھی۔ میں نے اس کے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے خود کو پُرسکون رکھا اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''شاہینہ! کیا بات ہے... کیوں آئی ہو؟''

''دیکھو سلیم... میرے ساتھ ایسا مت کرو...'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''تم نے مجھے میری نظر سے گرا دیا ہے۔ اتنی بے وقعت نہیں تھی میں سلیم... میں نے ایسا کبھی نہیں کیا لیکن میں جانتی ہوں کہ میں کیا کرسکتی تھی۔ میں کسی بھی مرد کی طرف ایک نظر دیکھتی تو وہ...''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تو وہ تمہارے قدموں میں کتے کی طرح لوٹنے لگتا۔ تم اتنی حسین اور پُرکشش عورت ہو کہ تمہیں کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ شادی سے پہلے تمہارے پرستار لائن بنائے ہاتھ باندھے ایک نظر التفات کے لیے کھڑے رہتے ہوں گے۔''

''تم کیا ہو؟ میں نے خود کو تمہارے قدموں میں ڈال دیا، کسی بے حیا بازاری عورت کی طرح... تو تم مجھے ذلیل کرتے ہو اور اس ذلت کو تماشا بنانا چاہتے ہو۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''تم نے انور کو کیا بتایا ہے... میرے بارے میں؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

''پھر وہ ایسا کیوں کررہا ہے میرے ساتھ...؟ اس کی نظریں بدلی ہوئی ہیں۔ اس نے کیوں سوال کیا مجھ سے کہ شاہینہ... ہاں... بڑی بھابی کے بجائے اس نے میرا نام لیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں یہ کیا کررہی ہوں... اور میں نے اسے کہا کہ تمیز سے بات کرو تو وہ مجھ پر گرم ہوگیا کہ میں نے اپنا رویّہ نہ بدلا تو وہ میرا دماغ درست کردے گا۔ اب خاندان کی عزت کا محافظ وہ ہے۔ بڑا آیا عزت کا ٹھیکے دار... آخر مجھے کیا سمجھتا ہے وہ... میں ریشم ہوں...؟''

''دیکھو... ریشم کو بیچ میں مت لاؤ۔ انور کو اعتراض ہے کہ تمہارا رہن سہن اور رکھ رکھاؤ ایک بیوہ جیسا نہیں ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق نہیں ہے۔''

''میں کیا کسی کمین کی اولاد ہوں؟ وہ اور اس کا عزت دار بھائی اور ان کا باپ... سب کے کرتوت کیا میری نظر سے اوجھل ہیں۔ انہوں نے چھوڑا ہے کبھی کسی کی بیوی یا بیٹی کو اور بہن کو... جیسے چاہوں گی... رہوں گی... کوئی لاوارث نہیں ہوں میں کہ وہ مجھ پر اپنی مرضی چلائے۔''

''شاہینہ! تم بھی میرا حوصلہ مت آزماؤ۔ اس سے پہلے کہ میں نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے تمہیں نکال باہر کروں۔''

''ہاں، بلا لو اپنے دوست کو... میں بھی ڈرتی نہیں... انجام میرا اور تمہارا ایک ہوگا۔ میں بھی کہہ دوں گی کہ ہاں... میں محبت کرتی ہوں تم سے... تم نے ہی مجھے ورغلایا۔ جب میرا شوہر قید میں تھا تو تم نے میرے جذبات کو بھڑکایا۔ مجھے اتنا مجبور کردیا کہ... میں اپنے شوہر کو قتل کرنے پر راضی ہوگئی۔ اس ملازمہ کو تم نے ہی لاکے دیا تھا۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی سلیم۔ میں ثابت کرسکتی ہوں کہ اگر میں اکبر کو قتل نہ کرتی تو میرے جرم اور گناہ کا راز

فاش ہو جاتا... تم نے ڈاکٹر کی مدد سے مجھے وہ دوا لا کے دی... وہ میری ضرورت تھی۔"

میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ "خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔"

"رحم؟ میں تو پیار کرتی ہوں تم سے... تمہارے ساتھ جینا اور تمہارے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔ دیکھو، میں سب ٹھیک کرلوں گی... تم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ تمہیں کبھی اپنے فیصلے پر افسوس نہیں ہوگا۔ میں تمہاری زندگی میں خوشی بھر دوں گی۔ تمہیں ہر آسائش دوں گی۔ ساری عمر تمہیں کسی دوسری عورت کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔" وہ اب رو رہی تھی۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ واقعی اپنے حواس میں نہیں تھی اور اس پاگل پن میں کسی بھی انتہا تک جاسکتی تھی۔

"او کے... او کے... مجھے کچھ مہلت تو دو سوچنے کی۔"

"تم سوچو گے؟ کیا سوچو گے؟ سوچنے کے لیے کیا ہے سلیم! میں نے تو کچھ نہیں سوچا... محبت میں دل کی مانی میں نے، دماغ کی نہیں۔ میں تو کل رات بھی آئی تھی لیکن تم دروازے بند کر کے سو گئے تھے۔ آج میں جانے کے لیے نہیں آئی۔ اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کے لائٹ آف کردی کیونکہ سوئچ بورڈ دروازے کے ساتھ ہی تھا۔

دوسرے لمحے وہ مجھ پر آگری اور میں نے بڑی مشکل سے خود کو اور اسے سنبھالا۔ میرا دماغ اب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے کہا۔ "شاہینہ!"

وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ "اب بلا لو جسے بلانا ہے۔" پلک جھپکتے میں اس نے نائٹ گاؤن گرادیا۔ میری مزاحمت ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔

لیکن ایک وقت ایسا آیا جب میں نے اپنی تمام قوتِ ارادی کو پھر مجتمع کر کے اس سے کہا۔ "یہ میری آخری ہار تھی شاہینہ۔"

"مت کہو اسے ہار... جیت تمہاری ہی ہوئی۔ ہاری تو میں ہوں۔"

"کل میں چلا جاؤں گا، بھاگ جاؤں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اور میں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے مجھے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ "تم چلے جاؤ گے؟ یہ آخری فیصلہ ہے تمہارا؟"

"ہاں... یہ تمہاری محبت نہیں... میری تذلیل ہے۔"

چند سیکنڈ بعد میں نے اسے تاریکی میں ایک زیادہ تاریک وجود کی طرح دیکھا۔ اس نے دروازے کی طرف حرکت کی۔ دروازہ کھلا اور وہ غائب ہوگئی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اتنی ہی تاریکی باہر بھی ہے اور شاید جب وہ آئی تھی تب بھی ہر طرف تاریکی کا پردہ تھا۔ برآمدے میں جلنے والی روشنی گل تھی۔ رات کے محافظوں کی نظر نے اس وقت بھی کچھ نہیں دیکھا تھا اور وہ اب بھی کچھ نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ کیوں اندھے ہو گئے تھے؟ کیسے اندھے کردیے گئے تھے؟ مجھے یاد تھا کہ ایک بار پہلے بھی برآمدے کی لائٹس کا فیوز اڑ گیا تھا یا اڑا دیا گیا تھا۔

میں اندر ہی اندر کسی زخم خوردہ سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ مجھے شکست کے احساسِ تذلیل سے دوچار کر کے نکل گئی تھی اور میں اپنی بزدلی کو مجبوری تسلیم کرنے کے سوا کچھ نہ کرسکا تھا۔ وہ پورا اعتماد رکھتی تھی کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ فاتح رہے گی اور میں مفتوح۔ بلاشبہ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی۔ صرف حسن و شباب سے، دولت سے مالا مال ہونے کے سبب بھی... اور اس سے زیادہ اپنی ہمت اور ذہانت کے باعث بھی۔ وہ ہر عورت کی طرح اپنی قوتِ تسخیر کے اسلحے کو کامیابی سے استعمال کرنے پر قادر تھی اور ذہانت سے ہر صورتِ حال کا بے خوف و خطر مقابلہ کرسکتی تھی۔ اس نے اکبر جیسے شوہر کو مقابلے سے خارج کردیا تھا جو حویلی کے چودھریوں کی طرح سفاک اور بے ضمیر تھا۔ مجھ سے مقابلہ سخت تھا لیکن وہ پُراعتماد تھی کہ بازی بالآخر اسی کے ہاتھ رہے گی۔

میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا تھا لیکن اس کے یقین میں کمی نہیں آئی تھی کہ اپنی شاطرانہ، مجرمانہ چالوں سے وہ مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردے گی۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہاں رہ کے میں اس کا مقابلہ نہیں کرپاؤں گا۔ ابھی وہ پُرامید تھی کہ وہ مجھے نورین سے بدظن یا مایوس کر کے اپنا بنالے گی۔ جب یہ امید نہ رہی تو وہ نہ جیوں گی اور نہ جینے دوں گی کا حربہ آزمائے گی کہ تم میرے نہیں تو کسی کے بھی نہیں ہوسکتے۔ ایسا وقت آنے سے پہلے میرا نکل جانا ضروری تھا۔ سب کا اعتماد حاصل کرلینے کے بعد یہ مشکل نہیں رہا تھا۔

رفتہ رفتہ احساسِ ندامت کے زخم پر اس فیصلے سے مجھے کچھ سکون حاصل ہوا تھا اور میں نیند کی پناہ لے کر اپنے شرمندہ کرنے والے خیالوں سے اور آزارِ گناہ سے چھٹکارا

پانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اٹھ کے دروازے تک جاتا اور اسے اندر سے لاک کرتا، دو سائے سے پھر نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے بھی کوئی تھا جو دروازے کے فریم میں ساکت ہوگیا۔

"کون ہو تم... کیا چاہتے ہو؟" میں نے ایک دم خطرے کو محسوس کرلیا۔

لیکن وہ بہت مستعد تھے اور جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ ان میں سے ایک نے سخت ربر کی گیند کسی فاسٹ باؤلر کی طرح میرے سر پر ماری جس سے میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں اور میں کلین بولڈ ہوگیا۔ ہوش کے آخری لمحے کا احساس یہ تھا کہ مجھے جسمانی طور پر اسیر کرلیا گیا ہے۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا، اس کا اندازہ میں نہیں کرسکتا تھا۔ ہوش کی طرف لوٹنے کا عمل بہت طویل اور جھٹکے لے کر چلنے رکنے والی گاڑی جیسا ہوتا ہے۔ دماغ کے تمام ہل جانے والے پرزے آہستہ آہستہ پھر کام کرنے لگتے ہیں اور صحیح صورتِ حال کو سمجھنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ ایک بار پھر میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

جب بالآخر میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے خود کو پھر اسی تاریکی میں دیکھا جو ہوش کے وقت میرے چاروں طرف مسلط تھی۔ یہ وہی رات تھی یا اس کے بعد والی۔ اس کا حساب صرف روشنی میں ممکن تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے روشن ڈائل والی رسٹ واچ دیکھی۔ گھڑی میرے ہاتھ سے اتار لی گئی تھی۔ اغوا کرنے والے اپنے قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کو وقت کا حساب سمجھنے نہیں دیتے اور ان کے اعتماد کو ختم کرنے کے لیے بے لباس کردیتے ہیں۔ اسے پنجرے میں قید جانور کی سطح پر لے آتے ہیں۔

زیادہ غور و خوض کی ضرورت ہی نہ تھی۔ طے شدہ طور پر یہ میرے انکار اور میری وارننگ کا جواب تھا۔ شاہینہ نے آخری قدم اٹھا لیا تھا۔ اس کے غلام مجھے اٹھا لائے تھے اور کسی نامعلوم اندھیرے غار میں پھینک دیا تھا کہ ہیرو... اب بھاگ کے دکھاؤ... یہ سراسر اس کی نادانی تھی۔ اس طرح کسی جانور کو مطیع کیا جاسکتا ہے، کسی کا دل نہیں جیتا جاسکتا۔ کسی کے انکار کو پیار کے اقرار میں نہیں بدلا جاسکتا تھا۔ ایک غلام تعمیلِ حکم میں محبت کے جسمانی تقاضے پورے کرسکتا ہے، محبت نہیں کرسکتا۔

میں پوری طرح آنے والے وقت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ مرحلے کتنے سخت اور طویل ہوں گے۔ مجھے بھوکا پیاسا رکھا جائے گا، غیر معینہ مدت تک۔ میری مزاحمت کو برین واشنگ سے ختم کیا جائے گا۔ وہ میرے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے کیا کرے گی؟ کب کرے گی اور کس انتہا تک جائے گی؟ یہ میں نہیں جان سکتا تھا لیکن ایک بات میں سمجھتا تھا جو شاہینہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ نورین کو میرے دل کے مندر سے نکال کے خود پرستش کے مقام پر کبھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

اس قید خانے کے نظام کے مطابق ایک نادیدہ ہاتھ کسی وقت میرے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے خوراک فراہم کرتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ پہلا کھانا میں نے کب کھایا۔ میں خواب یا بے ہوشی سے عالم ہوش میں آیا تو میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگی تھیں یا شاید اندھیرا مکمل نہیں تھا۔ یہ ایک عام سے گھر کا عام کمرا تھا، چودہ فٹ چوڑا اور لمبا۔ اس میں ایک دیوار کے ساتھ بیڈ پر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس بار مجھے پیر سائیں کے تہ خانے میں نہیں رکھا گیا تھا جہاں جن بھوت اتروانے والے مریض علاج کے وقفے میں رہتے تھے۔ شاید یہ جگہ ہی کوئی اور تھی۔ میری نظریں اندھیرے میں ایک سیاہ فریم کو دیکھ سکتی تھیں جو تین فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا تھا۔ ضرورت پڑنے پر میرے اندازے کے مطابق یہ باتھ روم کا دروازہ ثابت ہوا۔ ہاتھوں پیروں سے ٹٹول کے میں نے اس کی لمبائی چوڑائی کے علاوہ کموڈ اور واش بیسن کے محلِ وقوع کا اندازہ کیا۔ ایسا ہی دوسرا سیاہ فریم کسی اور سمت میں جانے کے لیے تھا۔ اس کے نیچے روشنی کی ایک لکیر بھی نہ تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میرے قید خانے کے باہر بھی ایسا ہی اندھیرا ہے۔

پہلی بار کھانے کو دیکھ کے میں نے نظر انداز کیا۔ اس وقت مجھے کھانے کی خواہش ہی نہ تھی لیکن یہ بھوک ہڑتال کب تک چلتی۔ بالآخر میرے معدے میں پڑنے والی گرہوں نے مجھے مجبور کردیا کہ میں جسم کی یہ مانگ بھی پوری کروں۔ مجھے شک تھا کہ کھانے میں کوئی خواب آور دوا شامل ہوگی۔ میرا پہلا تجربہ ایسا ہی تھا جب پیر سائیں خود مجھے اٹھا کے لائے تھے۔ اس بار میرا زیادہ بہتر انداز میں خیال رکھا جارہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ مجھے بیڈ اور باتھ کی سہولت فراہم تھی بلکہ اس کھانے کی کوالٹی بھی بہت بہتر تھی جو مجھے فراہم کیا گیا تھا۔ پہلا کھانا کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹی... ایک پلیٹ چاول... بہت عمدہ پکے ہوئے چکن قورمے اور فیرنی پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ پانی کی بوتل

تھی۔ میں نے سب صاف کر دیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنا بھوکا تھا۔

پھر میں لیٹ کر نیند یا بے ہوشی کے طاری ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن وقت گزرتا گیا اور میرے ہوش وحواس برقرار رہے۔ میں نے نہ سوچنے کی بہت کوشش کی۔ خود کو سمجھایا کہ میں حوصلے اور صبر سے وقت گزاروں۔ سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سارے سوالات کا جواب خود سامنے آجائے گا۔ اگر میں شاہینہ کے حکم پر قیدی بنایا گیا ہوں تو وہ خود مجھے قید میں ڈال کے بھول نہیں سکتی۔ میرے سامنے اس نے لفظوں اور آنسوؤں سے محبت کے دعوے تو بہت کیے تھے۔ وہ دعوے جھوٹے ہوں یا سچے، بے قراری اور پشیمانی کا احساس اس کی نیند بھی چھینے گا۔ وہ بھی میرے لیے سوچے گی۔ رات کو جاگے گی۔ روئے گی اور بالآخر آئے گی مہربانی کے پُرامید وعدوں کے ساتھ۔ میری منت ساجت کرنے... مجھے منانے... اور ڈرانے کہ میں انکار پر قائم رہا تو انجام کیا ہوگا اور اقرار کا انعام کیا ہوگا۔ محبت کے دعوے جھوٹے ہوں گے، تب بھی اس کے بدن کی پکار اسے مجبور کرے گی۔ وہ آئے گی۔

اور مجھے یہ سزا اس کے باپ نے دی ہوگی تو شاید اس بار میری نجات موت پر ہی ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ حویلی کے ملازم جاسوسوں نے اس کو شاہینہ کی مجھ سے خفیہ ملاقاتوں کی رپورٹ دے دی ہو۔ وہ حویلی کا نمک کھاتے ہوئے بھی وفاداری میں پیر سائیں کی عقیدت سے مغلوب ہوں۔ انور اس کی نقل وحرکت سے بے خبر تھا مگر ہر لحظہ لوگوں کی نقل و حرکت دیکھنے والے سب جانتے تھے۔ یقیناً اس خفیہ رپورٹ سے پیر سائیں کی غیرت جوش میں آئی ہوگی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے مراد ایسے جرم محبت کی سزا میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ معاملہ ان کی چھوٹی بیٹی کا ہو یا بیوہ کہلانے والی بڑی بیٹی کا... غیرت کے تقاضے وہی رہے تھے مراد پھر بھی خاندانی حسب نسب میں ان کے برابر کا تھا... میرا جرم یوں بھی زیادہ سنگین ہوجاتا تھا کہ میری ذات اور اوقات مشکوک تھی۔

اگر ایسا تھا تو پھر مجھے یہ مہلت کیوں دی گئی تھی؟ پیر سائیں کے ایک اشارے پر ان کے غلام مرید میری لاش بھی غائب کر دیتے۔ میرا وجود اچانک یوں مٹ جاتا جیسے میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ مجھے کسی گڑھے کی مٹی نصیب ہوتی۔ میں اس بیڈ روم میں نہ ہوتا جس کے ساتھ اٹیچ باتھ بھی تھا۔ مجھے یہ پُرتکلف کھانا بھی کیوں ملتا؟ ان سوالات کا

جواب پھر وہی آتا تھا کہ میں پیر سائیں کا نہیں شاہینہ کا
تھا۔ لیکن دوسری وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ خفیہ رپورٹ
سائیں نے پہلے بیٹی سے پوچھ گچھ کی ہو اور اس نے
کے منوالیا ہو کہ میرے سلیم کو زندہ رکھا جائے۔ بظاہر
ناممکن نظر آتی تھی۔ پیر سائیں کیسے اجازت دے سکتے
کہ ان کی بیٹی عدت کے زمانے میں کسی کم ذات سے عشق
نادانی کرے اور پھر اپنی بات بھی منوالے کہ اس کے محبوب
کی ذات نہ دیکھی جائے۔ بیٹی کو اجازت دی جائے کہ
عدت کے بعد اس سے نکاح کرے۔ یہ ناممکن تھا۔ کسی
کے جذبات کا خیال ہوتا تو وہ مراد کو کیوں مرواتے۔

چنانچہ دوسرا امکان مجھے یہ نظر آتا تھا کہ مجھے
سے غائب کرانے میں خود انور کا ہاتھ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ
احسان مند ہے۔ میں نے ہی اسے قید خانے سے رہائی
دلائی تھی جس کی وجہ سے وہ آج زندہ بھی تھا اور حاکم بھی
اس احسان کا بدلہ وہ میری جان لے کر چکانے کی ہمت نہیں
رکھتا تھا۔ ہاں، مصلحت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے
اس نے ریشم کا حویلی سے دور رہنا منظور کیا تھا۔ مجھے بھی
حویلی سے دور ہٹا سکتا تھا۔ جب تک شاہینہ کے نافرمان
حیوانی جذبات خود اپنی موت آپ نہیں مرجاتے۔ بات
بھی دل کو نہیں لگتی تھی۔ انور کو یہ سب کرنے کی ضرورت
تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں حویلی میں اپنی مرضی سے ٹھہرا
ہوا ہوں۔ وہ کہہ دیتا کہ ملک تو جا... اپنی نورین کے پاس
تا کہ یہاں شاہینہ کے مرضِ عشق کا علاج ہو۔ ابھی وہ دنیا
دکھانے کو رو رہی ہے کہ سہاگن نہ رہی... پھر سچ
گی کہ اس کی محبت نہ رہی۔ دنیا کو آنسوؤں میں فرق کیسے
آسکتا ہے کہ وہ اکبر کے لیے بہائے جارہے ہیں یا سلیم کے
لیے۔ یہ بہت آسان تھا۔ اس سے میں بھی خوش ہو جاتا
اس پر بھی احسان فراموشی کا الزام نہ آتا۔

وہ رات تھی یا دن تھا، اس کا نہ اندازہ تھا نہ حساب
پہلی بار چائے کے ساتھ ناشتا آیا تو میں نے جان لیا کہ
ہے پھر حساب آسان ہوگیا۔ ناشتے کے بعد آنے والے
کھانے میں کوئی خواب آور دوا نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے
کھانے کے بعد میں آدھے گھنٹے میں سوجاتا تھا اور پھر جاگتا
تھا تو ناشتا منتظر ملتا تھا۔ یہ سلسلہ تین دن چلا۔ چوتھے دن
نہیں ہوا۔ کھانے کے بعد میں جاگتا رہا۔ میرا جسم بیدار
کیونکہ دماغ کسی خواب آور دوا کا منتظر تھا۔ قدرتی طور پر نیند
اس ماحول میں کہاں سے آتی۔

کپڑے میرے جسم پر وہی تھے جو میں نے

رکھے تھے۔ گھڑی نہ ہونے سے وقت کا اندازہ مشکل تھا۔ میں فرض کر لیتا تھا کہ ناشتا اگر صبح سات یا آٹھ بجے کیا تھا تو مزید چھ سات گھنٹے بعد دوپہر کا کھانا آیا۔ وہ کیسے آیا؟ اگر میں جاگ رہا تھا تو میں نے کسی کو کھانا لانے اور ناشتے کے برتن لے جاتے نہیں دیکھا۔ اندھیرا مکمل تھا مگر میرے لیے نہیں... میں اندھوں کی طرح دیکھ سکتا تھا۔ مجھے سمت کا اندازہ تھا۔ میں کہیں دیوار سے نہیں ٹکراتا تھا لیکن جیسے اندھوں کی سماعت کی حس تیز ہو جاتی ہے، میں اس خاموشی میں ہلکی سی آہٹ کو بھی محسوس کر لیتا تھا۔ وہاں مکمل سکوت تھا۔ باہر سے بھی کوئی صدا سنائی نہ دیتی تھی۔ نہ پرندوں کی آواز تھی، نہ کسی ٹریفک کی۔ نہ انسان بات کرتے محسوس ہوتے تھے اور نہ کسی کی نقل و حرکت محسوس ہوتی تھی۔ یہ خاموشی نہیں... سناٹا تھا... قبر کی گہرائی جیسا بھیانک اور مکمل... دوپہر کا کھانا مجھے باہر والے دروازے کے قریب رکھا ملتا تھا۔ دروازہ کون کھولتا تھا اور کب... مجھے پتا کیوں نہیں چلا؟ کیا صبح اور دوپہر کے درمیان بھی میں کسی وقت سو جاتا تھا جس کا مجھے پتا نہیں چلتا تھا؟ تھک ہار کے میں نے سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اس رات میں نے آہٹ سنی تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ پھر دروازہ ایک دم کھلا اور بند ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے پوچھا کیونکہ میں نے کسی سیاہ ہیولے کو اندر آتا دیکھ لیا تھا۔

جواب سے پہلے کمرا روشن ہوا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں اس حد تک تاریکی کا عادی ہو گیا تھا کہ روشنی میری آنکھوں میں یوں چبھنے لگی جیسے آنکھوں میں ریت پڑ گئی ہو... پھر بھی میں نے شاہینہ کو دیکھ لیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔

”تم...؟ مجھے معلوم تھا...“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تمہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔“ وہ آہستہ آہستہ آگے آئی۔

اس نے بہت خوب صورت اور کشادہ گلے والی چست اور سرخ قمیص پہن رکھی تھی جس کے بازو بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ ظاہر ہے اس مختصر ستر پوشی کا مقصد ہی اپنے حسن و شباب کی فتنہ سامانی کو اجاگر کرنا تھا۔ اس کا اجلا رنگ دمک رہا تھا اور بدن کی کسی ہوئی ریشمی جلد سے نظر پھسلتی تھی تو خیال از خود ممنوعہ علاقوں تک لے جاتا تھا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا اور اس کے گھنے ریشمی کالے بال لہرا کے چہرے پر آ رہے تھے اور اس کے گرد ایک سیاہ حاشیہ بنا رہے تھے جس میں اس کا گلابی چہرہ چاند کی طرح روشن ہو جاتا تھا۔ اس تاثر کو مکمل کرنے کے لیے اس نے آنکھوں کو کاجل کی سیاہی سے ایک انوکھا تاثر عطا کر دیا تھا۔

میں کئی مہینے سے شاہینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی لیکن یہ ایک نیا احساس تھا کہ اس کے حسن میں ایک خطرناک کشش آ گئی ہے۔ وہ اکبر سے نفرت کرتی تھی کیونکہ اکبر اسے صرف ذلت دیتا تھا۔ اس نے کبھی اکبر کو شوہر سمجھ کے خود کو اس کے لیے بنایا سنوارا نہیں تھا۔ جب بالآخر اس کی نفرت نے جسمانی غلامی کا طوق اتار کے پھینکا تو اس کے اندر کی عورت رفتہ رفتہ انگڑائی لے کر اٹھی اور اس نے خود کو یوں سجایا جیسے مالی کسی اجڑے چمن کو آراستہ کرتا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ میری محبت میں گرفتار تھی۔ اس محبت کے نام پر اس نے اپنے حسن کے آتشیں اسلحے کو استعمال کیا۔

میں نورین سے محبت کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب میری نظر احساسِ حسن سے محروم ہو چکی تھی۔ کوئی مصوری کا اعلیٰ ترین نمونہ دیکھ کے دوسرے تمام فن پاروں کو گھٹیا اور بیکار نہیں سمجھ سکتا... بلاشبہ نورین کے مقابل کوئی نہ تھا۔ لیکن شاہینہ کے حسن کا انداز کچھ اور تھا... نورین اور شاہینہ میں یہی فرق تھا جو چاندنی اور آگ میں ہوتا ہے... ایک میں دل کو سکون دینے والی ٹھنڈک ملتی تھی تو دوسری میں جسم کو راحت دینے والی حرارت۔

شاہینہ نے جب بھی مجھے حاصل کیا، اپنے حسن و شباب کی شیطانی قوت سے تسخیر کر کے حاصل کیا۔ ایک بار پھر وہ میرے روبرو تھی اور میں ڈر رہا تھا کہ تمام نفرت کے باوجود کیا وہ پھر مجھ پر غلبہ حاصل کرنے آئی ہے؟ وہ جانتی ہے کہ میری نفرت اس کی طاقت کے سامنے کچھ نہیں... میری مزاحمت کچھ نہیں...

شاہینہ کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ”بولو... کیا معلوم تھا تمہیں؟“

مجھے اپنی محویت پر خاصی خفت ہوئی۔ اس نے میرے پلک جھپکائے بغیر دیکھنے کا مطلب یہ لیا ہوگا کہ وہ مجھے مسحور کرنے میں کامیاب رہی ہے جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی... ”یہی کہ مجھے تم نے اغوا کرایا ہوگا اور میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔“

”اس کے لیے تم نے مجبور کیا مجھے... تم میری بات مان لیتے تو مجھے یہ سب نہ کرنا پڑتا۔“ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

میں نے اپنے پیر سمیٹ لیے۔ ”تمہاری بات مان لیتا یعنی اپنی زندگی پر تمہارے اختیار کو تسلیم کر لیتا... جیسے میں انسان نہیں بے جان کھلونا تھا جو تمہیں اچھا لگا تو تم نے کھیلنے کے لیے رکھ لیا۔“

”تم نقصان میں نہ رہتے... تمہیں سب کچھ مل جاتا جس کی دنیا میں کوئی بھی خواہش کر سکتا ہے... دولت... عزت... طاقت... اور میرے جیسی عورت کی محبت۔“ وہ غرور سے سر اٹھا کے بولی۔

”مگر مجھے یہ سب درکار نہیں تھا... اور میرے لیے محبت کا مطلب صرف نورین تھا... نہ تم نہ کوئی اور...“

”ہونہہ...“ وہ حقارت سے ہونٹ سکوڑ کے بولی۔ ”نورین... جو کوئی وجود نہیں رکھتی... صرف ایک خیال ہے تمہارا... وہم اور خود فریبی۔“

”تمہارا... خیال کیا ہے کہ اس طرح تم میری محبت حاصل کر لوگی؟... وہم اور خود فریبی۔“

”میں ایک جیتی جاگتی حقیقت ہوں۔“ وہ برہم ہو گئی۔ ”اور ایک دن میں خود کو منوالوں گی... تم خود میری طرف آنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔“

”وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔“

”وہ دن ضرور آئے گا... جب تم میری ضرورت محسوس کرو گے... بالکل اسی طرح جیسے تم بھوک اور پیاس محسوس کرتے ہو... تم اپنے جسم کی طلب سے مجبور اور بے بس ہو جاؤ گے... کیونکہ تم پتھر کے بت نہیں ایک مرد ہو... اور میں ایک مکمل عورت... میں تمہارے سامنے آتی رہوں گی اور ہر بار تم پہلے سے زیادہ مجبور اور بے بس ہوتے جاؤ گے... کوئی جلدی نہیں ہے مجھے سلیم... بہت وقت ہے میرے پاس... آج... کل... پرسوں... ایک مہینے... ایک سال بعد... میں تمہیں پالوں گی۔“

”کیا وہ محبت ہوگی؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”ہاں، اور کیا ہوتی ہے محبت؟ یہ شبِ فراق اور شبِ وصال کیا ہے... مجنوں کیوں تڑپتا تھا... فرہاد کیا چاہتا تھا...؟ محبت کرنے سے کس نے روکا تھا انہیں... کرتے رہتے... مگر مجنوں کو لیلیٰ کی طلب تھی اور فرہاد کو شیریں چاہیے تھی۔ زندہ جیتی جاگتی... جسم و جاں کی ساری رعنائی کے ساتھ... تمہیں بھی نورین چاہیے ورنہ صرف اس کی محبت کیا ہے؟ اس کے وجود کے بغیر نورین کی محبت کچھ نہیں... تم اس کے خیال سے محبت کرتے رہو... مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر رہو میرے ساتھ۔“

ڈاکٹر! کسی طرح میری بیوی کو یقین دلا دو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں تا کہ وہ بھاگ جائے

یہ بحث لاحاصل تھی۔ یہاں وہ میرے ساتھ رہنے یا مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ صرف میرا حال دیکھنے آئی تھی۔ مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ میں اس کا قیدی ہوں اور صرف اس کا بن کے رہائی حاصل کر سکتا ہوں... مگر اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ خود بھی جلدی میں ہے۔

میں نے کہا۔ ”یہ کیا جگہ ہے شاہینہ؟“

”کیوں...؟ تمہیں کوئی تکلیف ہے یہاں تو بتاؤ...؟“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔“ میں نے طنز سے کہا۔

”تو پھر رہو آرام سے... میں آتی جاتی رہوں گی... لیکن اور کوئی نہیں آئے گا میرے سوا۔“

”تم بھی چھپ کر ملنے آئی ہو نا... تمہیں کس کا ڈر ہے؟“ میں نے کہا۔

”مجھے کسی کا ڈر نہیں۔“

”اچھا اگر میں کہوں کہ ابھی نہ جاؤ... یہاں رہو میرے ساتھ؟“

وہ مجھ پر جھک کر بولی۔ ”تم کہہ کے تو دیکھو... پھر دیکھو میں کیسے تمہیں اپنے ساتھ رکھتی ہوں... پھر کسی کا خوف نہیں ہوگا مجھے۔“

”لیکن ابھی ہے... مان لیا تم نے... یہاں تمہیں خوف اس لیے ہے کہ یہ جگہ تمہاری نہیں ہے... جہاں تم مالک نہیں ہو۔“

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ ”یہ میرا گھر نہیں ہے۔“

”یہ تمہارے ابا کا گھر ہے... مجھے معلوم تھا۔“ میں نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”کیسے معلوم تھا؟“ وہ بولی۔

”یہ مت پوچھو۔ معلوم ہو گیا تھا۔ بتا دیا تھا کسی نے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔“ اس نے اعتراف کر لیا کہ میری بات غلط نہیں۔ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر جا لگا تھا۔

”جس دن تمہارے پیر باپ کو معلوم ہوا...“

”کیا ہو گا اس دن؟ وہ قتل کرا دے گا مجھے؟“ وہ اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”تمہیں بھی... اور مجھے بھی...“

”نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ وہ باپ ہے میرا، دشمن نہیں۔ میں اس کو بھی منا لوں گی، تم دیکھنا۔“ وہ ایک دم پلٹ کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اسے نروس کر دیا تھا۔ دروازہ کھلا اور بند ہو گیا لیکن روشنی گل نہیں ہوئی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ قہقہہ مار کے ہنسوں۔ بہت چالاک بننے والی شاہینہ میرے ایک ہی پُراعتماد جھوٹ سے نروس ہو گئی تھی۔ یہ میرا صرف اندازہ تھا کہ مجھے حویلی سے اٹھوانے والی شاہینہ تھی تو اس کے لیے مجھے قید میں رکھنے کے لیے اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ان جاگیرداروں، وڈیروں اور پیروں کی جائدادیں اور عیاشی کے خفیہ اڈوں کا علم ان کے گھروں میں رہنے والی عورتوں کو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ چار دیواریوں میں خاندانی، سماجی اور مذہبی روایات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورتیں کھلا آسمان دیکھ سکتی تھیں۔ اس کی وسعت میں آزادانہ پرواز کرنے کے خوابوں پر بھی پابندی نہ تھی مگر عملاً یہ ناممکن تھا۔

شاہینہ کی ساری زندگی اپنے باپ کی حویلی میں زندگی کے اسرار اور ہر ”ممنوعہ علاقے“ سے وابستہ معاملات میں جھانکتے گزری تھی۔ مرد کی جو بالادستی خاندانی معاملات میں تھی، اس میں کوئی خرابی نہ تھی بلکہ خاندان کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے اور ڈسپلن کے لیے ایک مضبوط اور طاقتور حاکم ضروری تھا۔ خرابی اس اخلاقی حد بندی میں تھی جو مرد کو مادر پدر آزادی عطا کرتی تھی۔ اس کے گناہ و ثواب کا اور نیکی بدی کا معیار الگ مقرر کرتی تھی اور مرد کو ان سب سے بالاتر قرار دیتی تھی۔ مرد کو ہر وہ کام کرنے کی اجازت اور آزادی تھی جن پر عورت کے لیے سخت سزا تھی۔

شاہینہ خود کو بغاوت سے نہ روک سکی۔ وہ دیکھ سکتی تھی اور سوچ سکتی تھی۔ سوال کر سکتی تھی جس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی بہن کا ردِعمل بھی مختلف نہ تھا۔ شاید یہ موروثی ذہانت تھی۔ باپ ذہین نہ ہوتا تو اتنا لمبا چوڑا پیری مریدی کا کھڑاگ کیسے پھیلاتا جس کی بنیاد ہی دھوکے فریب پر تھی اور ہزاروں کو اپنا مرید اور جانثار کیسے بناتا۔ ان دو بہنوں کی بغاوت اس ماحول کا شاخسانہ تھی جس میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی اور ہوش سنبھالا تھا۔

شاہینہ کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ آخر شاہینہ کے لیے اس کھیل کا انجام کیا ہو گا۔ اگر وہ اکبر کو قتل نہ کرتی تو ساری زندگی سکون اور آرام کے ساتھ ایسے ہی گزار سکتی تھی جیسے اس کی ماں نے گزاری تھی یا اس کی ساس گزار رہی تھی۔ لیکن اکبر نے رات دن اس کی تذلیل کی اور اس کے سامنے اس عذاب سے چھٹکارا پانے کا دوسرا راستہ نہ چھوڑا۔ وہ اکبر کو قتل کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایسا نہ کرتی تو اس کا ذہنی اور جسمانی عذاب تمام عمر کے لیے اس کا مقدر ہو جاتا۔

میرے سامنے جیل سے فرار ہونا ہی بے گناہ موت سے بچنے کا واحد طریقہ تھا مگر اس کے بعد دوسرا مرحلہ خود کو محفوظ رکھنے کا تھا۔ ایسے ہی اب شاہینہ کے سامنے دوسرا مرحلہ باقی زندگی کے لیے کوئی سہارا تلاش کرنے کا تھا ورنہ وہ حویلی میں بیوگی کے اکیلے پن کی عمر قید بھگتنے پر مجبور ہوتی۔ اس کو کسی کا پیار نہ ملتا اور اس کا اپنا کوئی گھر نہ ہوتا۔ وہ حویلی میں رہتی تو یہاں اس کی بہن کا راج ہوتا۔ اس کی زندگی کے چالیس پچاس سال صرف محرومی کی آگ میں جلتے گزرتے۔ وہ لوٹ کے باپ کے گھر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کا بھائی کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ نہ رہتے تو جائداد اسے ضرور ملتی مگر تنہائی ختم نہ ہوتی۔ ضروری ہوتا کہ وہ دوسری شادی کرے اور اپنا گھر بسائے۔ اپنے بچوں کو ممتا دے اور محبت کی پیاس ختم ہو... شاید باپ بھی ایسا ہی سوچتا لیکن وہ اپنی زندگی کا یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دوبارہ باپ کو نہیں دے سکتی تھی کیونکہ اس کی پسند کے معیار مختلف تھے۔ اگر وہ پھر اکبر جیسے یا اس سے بھی بدتر کسی شخص کا انتخاب کر لیتا تو شاہینہ کی حالت آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے والے جیسی ہوتی۔ بیوگی کا لیبل الگ لگا۔ شوہر کا قاتل ہونے کا احساس اور اس گناہ کی اذیت الگ ملی اور انجام کار شوہر ملا تو پہلے سے بھی بدتر۔

چنانچہ آنے والی زندگی کے لیے اس نے کسی سہارے کی تلاش اپنی ذمے داری بنا لی۔ ایسے میں وارد ہوا ہیرو جب ہیروئن سہارے کی تلاش میں سرگرداں تھی اور شاہینہ نے محسوس کیا کہ اسے اپنی منزل مل گئی ہے۔ اگر اب

اس نے ہمت سے کام نہ لیا اور جرأت سے فیصلہ نہ کیا تو پھر ساری عمر روتی رہے گی۔ جیسا جیون ساتھی اس نے خوابوں میں تراشا تھا، وہ خود اس کے سامنے آ گیا تھا۔ کسی تلاش یا انتظار کے بغیر۔ پھر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا سب کچھ داؤ پر کیوں نہ لگاتی اور اس نے شرم و حیا، اخلاق، ضابطے اور خاندانی روایات سب کو بھلا کے مجھے حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مجھے اس پر ترس آیا۔ ایسا سمجھنا صرف اس کی نادانی تھی کہ وہ میرا دل جیت سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک خوب صورت پُرکشش عورت ہے اور میں بہرحال ایک مرد ہوں۔ اس نے جو مرد دیکھے تھے وہ تو صورت شکل بھی نہیں دیکھتے تھے اور عورت کی رضامندی بھی نہیں دیکھتے تھے۔ پھر بھلا میں انکار کیسے کر سکتا ہوں اور کب تک انکار کر سکتا ہوں... شاید وہ مایوس ہو گی مگر وہ ناامید نہیں تھی اور ناکام ہونے کا سوچتی بھی نہ تھی۔ میں اسے کیسے سمجھاتا کہ جسم سے الگ اور بالاتر ایک رشتہ روح کا ہوتا ہے۔ جنس سے الگ اور بالاتر دوسرا رشتہ محبت کا ہوتا ہے اور یہ رشتہ کوشش سے یا خواہش سے قائم نہیں ہوتا۔ نورین کے اور میرے درمیان یہ رشتہ گردشِ حالات نے قائم کیا تھا۔

اس رات لائٹ آف نہیں ہوئی۔ میں رات بھر جاگتا رہا۔ اس رات میں نے اپنے گرد محیط سناٹے کو محسوس کیا۔ رفتہ رفتہ میرا شک بھی یقین میں بدلنے لگا کہ یہ جگہ جہاں مجھے رکھا گیا ہے، پیر صاحب کی خانقاہ کا حصہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے وہاں اسیری کے چند روز گزارے تھے۔ ایک وہ تہ خانہ تھا جہاں میں نے نورین کو فاطمہ کے روپ میں دیکھا تھا۔ دوسرا وہ کمرا تھا جہاں سے میں فرار ہوا تھا۔

خانقاہ کوئی ویران جگہ نہیں تھی۔ وہاں ہر وقت عقیدت مند اور مرید عالمِ جذب و مستی میں نظر آتے تھے۔ نعرے لگاتے دیوانہ وار جھومتے اور رقص کرتے۔ ان کا شور و شغب دن رات کی قید سے آزاد تھا اور ہر وقت سنائی دیتا تھا۔ خانقاہ کی عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا جہاں یہ آوازیں نہ پہنچ پاتیں۔ شاہینہ نے جھوٹ بولا تھا یا میرے ایک بے بنیاد خیال کی تردید نہیں کی تھی۔ میرا قید خانہ کہیں اور تھا۔ اس کی تصدیق دیگر آوازوں سے بھی ہوئی... رات کو ایک بار میں نے ٹرین کی سیٹی سنی اور پھر سکوت میں اس کے آہنی پہیوں کے دوڑنے کی صدا جو دور سے آئی اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ دو بار کسی گاڑی کا ہارن بھی سنائی دیا۔ گاڑی کے لیے سڑک کی شرط نہیں تھی لیکن یہ بات سمجھ میں

آتی تھی کہ آس پاس انسانوں کی آبادی ضرور ہے۔
مجھے یہ بھی سمجھ آنے لگا کہ اپنے باپ کی اجازت کے بغیر شاہینہ مجھے خانقاہ کے کسی خفیہ مقام پر ایسے نہیں رکھ سکتی تھی کہ میری خبر گیری بھی جاری رہے۔ اگر وہ اتنی ہمت کرتی تو کم سے کم اپنی بہن کو شریکِ راز ضرور کرتی اور بہن اسے یہ بے وقوفی ہرگز نہ کرنے دیتی۔ جس انداز میں شاہینہ مجھ سے ملنے آئی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چھپ کر آئی ہے۔ وہ خوف زدہ بھی تھی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ رات کے وقت حویلی سے نکلی ہو اور لوٹ کے وہیں چلی گئی ہو۔
اس جگہ کے بارے میں یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ یہ اس کے مقتول شوہر کا کوئی ٹھکانا تھا جس کا شاہینہ کو علم تھا اور یہ جگہ حویلی سے دور بھی نہ تھی۔ اس نے حویلی کے اندر کسی وفادار، فرمانبردار، جاںنثار سے مدد لی اور مجھے یہاں پہنچادیا۔ وہی حکم کے غلام اب میرے نگراں بھی تھے۔ یہ اس کے باپ کے مرید تھے یا شاہینہ نے ان کی وفاداری کی قیمت ادا کی تھی۔ وہ دولت مند عورت تھی۔ اسے نقد کی کمی بھی نہ تھی مگر دیہات میں اکی خدمات کے لیے سونا بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس کے پاس سونے کے زیورات کا انبار بھی تھا۔
مجھے اندھیرے کا عادی ہونے کی وجہ سے پریشانی زیادہ ہوئی۔ اندھیرے میں دیکھنا میرے لیے اتنا مشکل نہ تھا جتنا اس رات روشنی میں سونا ہوگیا۔ معلوم نہیں یہ رعایت تھی یا کسی کو لائٹ آف کرنے کا خیال نہیں رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی میری آنکھ لگی اور پھر کھلی تو میز پر ناشتا موجود تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوراک کے معیار کی مجھے کوئی شکایت نہ تھی۔ ناشتے میں انڈے، مکھن، جام جیلی کے ساتھ سلائس ہوتے تھے یا پراٹھے۔ ایک ساتھ دو تھرماس آتے تھے۔ ایک چائے کا اور دوسرا کافی کا۔ مجھے دونوں گرم ملتی تھیں۔ ابھی تک میں نے کسی کو ناشتا یا کھانا لاتے اور خالی برتن لے جاتے دیکھا نہیں تھا۔
میں گزشتہ روز کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون تھا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میری جان کو خطرہ کوئی نہیں کیونکہ میں کسی اور کی نہیں، شاہینہ کی قید میں ہوں جو میری محافظ بھی ہو گی۔ میں اس کی مجبوری یا کمزوری بن گیا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے دو راستے شاہینہ کے سامنے تھے۔ ایک یہ کہ کسی رشتے کے بغیر مجھ سے تعلق کی یہی صورت برقرار رکھے۔ بیوگی قبول کرے یا کسی سے عقدِ ثانی پر مجبور ہوجائے۔ ہر صورت میں یہ تعلق جرم تھا اور ناممکن تھا۔ افشائے راز کی صورت میں وہ بھی ماری جاسکتی تھی اور میرا قتل ہونا تو ناگزیر تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ مجھے اکبر کی جگہ دے۔ یہ بھی کم مشکل نہ تھا۔ اس میں صرف میری رضامندی کافی نہ تھی۔ اسے اپنے باپ کو قائل کرنا تھا جو خاندانی اور معاشرتی روایات پر سختی سے کاربند تھا اور بیٹی کو رعایت نہیں دے سکتا تھا۔
اگر صرف میری رضامندی کی بات ہوتی تو میں آسان راستہ اختیار کرتا۔ شاہینہ کی مان لیتا۔ اس سے نکاح بھی کرلیتا اور جب موقع ملتا بھاگ جاتا۔ طلاق کے دو بول بولنا کون سا مشکل ہوتا۔ لیکن میں اپنے ضمیر کی وجہ سے مجبور تھا۔ نکاح میرے نزدیک سنتِ رسولؐ تھا اور اس میں دھوکے کی نیت رکھنا گناہ تھا۔ اگر میں خود کو قائل کرلیتا کہ جان بچانے کا معاملہ ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے، تب بھی بات نہ بنتی۔ شاہینہ کا باپ اس شادی پر بھی راضی نہ ہوتا۔ وہ ایک بیٹی کے چاہنے والے کو خود مرواچکا تھا، دوسری بیٹی کو اپنا دوسرا شوہر خود پسند کرنے کی اجازت کیسے دیتا؟
چنانچہ میرے لیے نہیں، یہ شاہینہ کے لیے آزمائش تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ اپنے باپ کو راضی کرلو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر شادی کی تو وہ تمہیں قتل کرے نہ کرے، مجھے ضرور زندہ گاڑ دے گا۔ بال کو شاہینہ کے کورٹ میں پھینک دینا ہی اس مسئلے کا حل تھا۔ اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاتی ہے تو مجھے آزادی مل جائے گی۔ بعد میں نورین کی تلاش کا سفر جاری رکھنے سے شاہینہ مجھے کیسے روک سکے گی۔ ایک بار یہاں سے نکلا تو پھر نکل جاؤں گا۔ لوٹ کے میں کیوں آؤں گا۔
اسی روز حالات نے نئی کروٹ لی۔ ناشتے کے برتن اٹھانے کے لیے ایک بوڑھی عورت اندر آگئی۔ وہ دبلی پتلی سخت جان نظر آتی تھی اور اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے۔ عمر کا اندازہ کرنا اس لیے مشکل تھا کہ یہاں لڑکیاں تیرہ سال میں بیاہ دی جاتی تھیں اور تیس بتیس سال میں نانی، دادی بن جاتی تھیں۔ چالیس سال کی عمر میں ان پر وہ بڑھاپا مسلط ہوجاتا تھا جو شہر کے اوسط گھر کی آسودہ حال عورت پر ساٹھ سال میں بھی اثرانداز نہیں ہوتا۔
جب وہ برتن اٹھا کے لے جانے لگی تو میں نے کہا۔
”ماسی... ایک منٹ رکو... کون ہو تم؟“
وہ رک گئی۔ ”میں پتر... میں آسو کی ماں...“
”آسو کون؟“
”آسو... میرا بیٹا اسلم جو ادھر حویلی میں ہے۔ چودھریوں کی حویلی میں۔“

میں نے کہا۔ ”اسلم کیا کرتا ہے وہاں؟“
”ڈیوٹی دیتا ہے جی... رات کو بھی دن کو... بندوق ملی ہوئی ہے... اس کا باپ تھا بڑے چودھری کے زمانے میں۔“
”کیا وہ مرگیا؟“
”نہ جی... رب نہ کرے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پیر سائیں کے ڈیرے پر ملنگ ہوگیا ہے۔“
”کون پیر سائیں... پیر اظہر علی شاہ... جو بڑے چودھری کے بھائی ہیں؟“
اس نے اقرار میں سر ہلا کے پھر برتن اٹھائے۔
”ماسی... یہ کس کا گھر ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم پتر۔“
”اچھا یہ بتاؤ... کیا یہ جگہ حویلی کے قریب ہے؟“
اس نے بے بسی سے کہا۔ ”میں کیا بتاؤں پتر... مجھے تو اسلم کل رات لایا تھا۔ کہنے لگا کہ اب تم نے یہاں رہنا ہے اور ادھر سارے کام کرنے ہیں۔ کھانا پکانا، صفائی کرنا۔“
”اسلم کیسے لایا تھا تمہیں... گاڑی میں...؟“
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”چودھریوں کی گاڑی تھی۔ پر مجھے راستے کا کچھ پتا نہیں۔ اندھیرا تھا باہر... نظر کچھ نہیں آتا تھا۔“
”کتنی دیر لگی تھی حویلی سے یہاں پہنچنے میں؟“
وہ گھبرا گئی۔ ”مجھے تو کوئی اندازہ نہیں پتر... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“
”کیا اب میں آزاد ہوں... میرا مطلب ہے باہر جا سکتا ہوں؟“
”کیوں نہیں جاسکتے... روکنے والا کون ہے ادھر۔“
جب وہ چلی گئی تو میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔ یہ دوسرا کمرا تھا جس میں پرانے گرد آلود صوفے لگے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں رکھی تھیں اور فرش پر قالین بھی تھا۔ غالباً یہ گھر کی بیٹھک تھی جس کے ساتھ ہی وہ بیڈ روم تھا جہاں میں قید تھا جس کے چار محراب دار دروازے بند تھے۔ ان دروازوں کے مقابل بھی دروازے تھے جو بند تھے۔ برآمدے کے آخر میں کچن تھا۔ وہاں وہی بوڑھی عورت برتن دھو رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا لیکن کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔
کچن سے پہلے دائیں طرف زینہ اوپر جارہا تھا۔ مجموعی طور پر یہ قدیم ساخت کا پرانا مکان تھا جس کی عرصہ دراز سے دیکھ بھال نہیں ہوئی تھی۔ اس کا رنگ و روغن جھڑ رہا تھا اور فرش پر گرد نظر آتی تھی۔ زینہ اوپر ایک موڑ پر ختم ہوا تو میں نے دوسری منزل کو دیکھا جو نچلی منزل کے نقشے پر تعمیر ہوئی تھی۔ یہاں بھی برآمدے اور کمروں کے سب دروازے بند اور مقفل تھے۔ یہ عجیب ویران اور آسیب زدہ سا ماحول تھا۔
میں چھت پر پہنچا تو مجھے اپنے چاروں طرف کھیت اور باغ دکھائی دیے۔ ایک طرف کافی فاصلے پر کنواں تھا جس پر رہٹ چل رہا تھا۔ باقی چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔ غور کرنے پر مجھے نہر ایک چمکیلی پٹی کی طرح نظر آگئی۔ تین چار فرلانگ پر مسجد کے مینار کسی آبادی کی نشاندہی کرتے تھے مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مرداں والی ہے۔ چودھریوں کی حویلی کی پہچان کوئی نہ تھی جیسے کہ برج یا فصیل... مجھے یقین تھا کہ میں حویلی سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ پھر بھی میرے یہاں سے نکل بھاگنے کے امکانات میں جان جانے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ مکان کے باہر کی دیوار چاروں طرف تھی اور بہت اونچی بھی نہیں تھی مگر مجھے ہر کونے پر پہرے دار نظر آئے جن کے ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ تھا۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ پیر سائیں کی درگاہ پر مامور تھا۔ شاید باقی بھی اس کے ساتھی تھے۔ ان کے حلیے یہی ظاہر کرتے تھے کہ وہ پیر صاحب کے جاںنثاروں میں سے ہیں۔ گرے کلر ملیشیا کی شلواروں پر قدرے اونچی قمیصوں کے ساتھ وہ سر کے گرد تنظیم آزادی فلسطین کے مجاہدین کی طرح سبز چارخانے کا ایک رومال رکھتے تھے اور اس کو اپنی جگہ رکھنے کے لیے پیشانی پر سیاہ رنگ کے الاسٹک کا بینڈ باندھتے تھے۔ چاروں محافظ اسی حلیے میں تھے اور ان کی مشت بھر داڑھی پر مونچھوں کی باڑھ بھی تقریباً یکساں تھی۔ ان کے کندھوں پر خودکار اے کے 47 یا کلاشنکوف رائفلیں تھیں اور ہاتھوں میں ریپیٹر جن کو وہ ڈنڈوں کی طرح پکڑے ہوئے تھے۔ میرے جیسے معمولی اور نہتے شخص کے لیے اس قسم کا حفاظتی حصار یہ ظاہر کرتا تھا کہ مجھے قید میں رکھنے والوں کو میری کتنی فکر تھی۔
پیر سائیں کے جاں فروش مریدوں کا یہاں موجود ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ چودھریوں کی حویلی کے معاملات اب کس حد تک پیر سائیں کی نگرانی میں چلے گئے ہیں۔ اکبر کے قتل کے بعد پیر صاحب کے لیے اپنی بیوہ ہونے والی بیٹی کی ذمے داری بڑھ گئی تھی اور انہوں نے

محافظوں کے بھیس میں وہاں اپنے جانثار داخل کردیے تھے۔ اگر انور کو یہ بات معلوم تھی، تب بھی وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ انکار کرسکے۔ شاہینہ کی عیاری اور مکاری کے باعث قتل کا الزام انور پر تھا۔ خاندان کی ضرورت یا مصلحت کو دیکھتے ہوئے آخری وارث کو بچالیا گیا تھا مگر پیر صاحب یہ کہہ سکتے تھے کہ تم تو خود اپنے بھائی کی حفاظت نہ کرسکے۔ میری بیٹی کی کیا ذمے داری لوگے۔ اب اس کی حفاظت کا انتظام میں خود کروں گا۔ وہ انور کے سسر کے عہدے پر بھی فائز ہوچکے تھے اگرچہ شرعی اعتبار سے یہ نکاح ابھی ہوا نہیں تھا۔ وہ چودھری کے بھائی بھی تھے چنانچہ ان کو حویلی کے اندر اپنے کمانڈوز داخل کرنے سے روکنا مشکل تھا۔

میرے اغوا میں شاہینہ نے انہی کمانڈوز سے مدد لی تھی۔ وہی اب میری حفاظت بھی کررہے تھے اور مجھے ان کے نرغے سے نکلنے کے لیے جان کی بازی لگانے میں بازی ہارنے کے امکانات بہت زیادہ نظر آتے تھے۔ مجھے کوئی جلدی بھی نہیں تھی ورنہ میں یہ ایڈونچر پلان کرتا۔ بائیس چوبیس فٹ کی بلندی سے نیچے اترنے کے لیے میں چادر پھاڑ کے رسّی بنانے کا پرانا فارمولا استعمال کرتا۔ پہلے کسی ایک گارڈ کو قابو کرکے یوں غائب کرتا کہ دوسرے کو خبر نہ ہو۔ پھر اس کی یونیفارم اور اسلحہ لے کر باقی تین کو عدم آباد روانہ کرتا لیکن فوری طور پر یہ رسک لینا حماقت ہوتا۔

میں نیچے اتر آیا۔ کچن کی خادمہ بھی حویلی کی پرانی نمک خوار تھی اور اس کا بیٹا پیر صاحب کا معتمد... اس کا شوہر درگاہ پر ملنگ۔ مجھ سے مہربانی کا برتاؤ وہ عادت کے مطابق کررہی تھی لیکن مجھے اس سے کوئی کام کی بات اگلوانا مشکل کام لگتا تھا۔

میں نے اس سے چائے کی فرمائش کی اور ایک چوکی پر بیٹھ گیا۔ ''اماں! کب سے چودھریوں کی خدمت کررہی ہو؟''

''جب سے ہوش سنبھالا پتر... ہمارا تو یہی ٹھکانا ہے۔''

''تمہارا اپنا کوئی مکان ہے یا زمین؟''

''سب چودھریوں کی مہربانی ہے۔ ہم انہی کی خدمت کے لیے جیتے مرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا شوہر کیوں ملنگ ہوگیا؟''

''اللہ نے اس کا دل دنیاداری سے موڑ دیا۔ اب اِدھر سائیں کے ڈیرے پر پڑا رہتا ہے۔ اپنا ہوش نہیں۔ کبھی تو کپڑے بھی پھاڑ دیتا ہے اپنے... پیر سائیں کہتے ہیں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

''بیٹے کتنے ہیں... اور بیٹیاں؟''

''بیٹا ایک یہی ہے... بیٹیاں دو تھیں۔ ایک کی شادی چودھری صاحب کے ڈرائیور سے کی تھی۔ حویلی میں رہتی تھی۔ شوہر کے ساتھ حویلی سے نکل گئی۔ پتا نہیں کدھر گئی۔ دوسری اِدھر رہی مگر اس پر جن آتے تھے۔ شادی نہیں ہوسکی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ جن عاشق ہوگیا۔ میں نے منع کیا تھا کہ شام کے وقت نہا کے بال کھولے اس درخت کے نیچے مت جا... وہ جو حویلی کے درمیان جوہڑ تھا۔ اب کٹوا دیا ہے۔ فوارہ ہے اِدھر... اس پر جنات کا ڈیرا تھا۔''

میں نے سوچا کہ اس سے جن کا نام پوچھوں۔ کہیں اکبر تو نہیں تھا۔ پھر بڑھیا کی دل آزاری کے خیال سے یہ ارادہ ترک کردیا۔ ''اب کہاں ہے وہ؟''

''چار من مٹی کے نیچے۔ یہ لے چائے پتر۔''

اس مظلوم و مجبور عورت سے سوال جواب کرنا مجھے اچھا نہیں لگا ورنہ پوچھتا کہ شاہینہ بی بی کیسی عورت ہے۔ کیا اس کے حکم سے مجھے یہاں رکھا گیا ہے۔ وہ کچھ نہ بتا پاتی۔ چائے پی کے میں پھر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اب مجھے چلنے پھرنے کی آزادی تھی تو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے الماریاں کھول کے دیکھیں۔ ایک کے سوا سب خالی تھیں۔ ایک میں زنانہ، مردانہ کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ کچھ میلے کچھ صاف۔ اس کی درازوں میں مجھے میک اپ کا استعمال شدہ سامان بھی ملا۔ تین چار لپ اسٹکس... نیل پالش اور فیس پاؤڈر... ایک دراز میں عام استعمال کی چند دواؤں کے ساتھ کچھ ایسی گولیاں تھیں جو میرے اندازے کے مطابق صرف عیاشی کے وقت استعمال کی جاتی ہوں گی۔ مجھے ان کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہیں مجھے اس قسم کی معروفیات کے دیگر لوازمات بھی نظر آئے۔ ایک الماری کا خانہ فحش تصاویر والے رسالوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے خانے میں مجھے ایک پورا البم ملا اور ان میں اکبر کو میں نے صاف پہچان لیا اُس کے ساتھ مختلف عورتیں تھیں۔ سوائے چند تصاویر کے جو انہوں نے اپنی مرضی سے پوز دے کر بنوائی تھیں۔ باقی کسی کیمرے کی موجودگی اور منظر کشی سے لاعلم نظر آتی تھیں۔ معلوم نہیں اپنی مردانگی کا یہ تصویری ریکارڈ اکبر نے خود دیکھ کے خوش ہونے کے لیے رکھا تھا یا دوسروں کو دکھانے کے لیے... مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ بڑی

بی کو کچن سے بلا کے یہ البم دکھاتا اور پوچھتا کہ ان میں سے کتنی عورتوں کو پہچانتی ہو اور تمہاری دو بیٹیاں بھی ان میں ہیں یا نہیں۔ تمام عمر ایسی ہی ذلت کو اپنی تقدیر سمجھ کے قبول کرنے والی عورت سے اعترافِ جرم و گناہ لینا، اسے مزید ذلیل کرنے کے مترادف تھا۔ اس عمر میں وہ اپنی مجبوری کو تقدیر کا نام ہی دے سکتی تھی۔

شراب کی خالی بوتلیں جابجا پڑی تھیں۔ اپنے شوہر کی عیاشی کے اس غیر خفیہ اڈے کو میری رہائش کے لیے منتخب کرتے وقت شاہینہ عجلت میں ہوگی کہ اس کی صفائی ضروری نہیں سمجھی۔ اس گھر میں کیا ہوتا تھا، یہ وہ بہت پہلے سے جانتی ہوگی۔ چھپ کر گناہ کرتے ہیں کمزور لوگ۔ اکبر اور اس کے آباؤ اجداد سب سینہ ٹھوک کے بدمعاشی کرتے تھے اور بندوں سے کیا خدا سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ مجھے امید ہی نہیں یقین بھی تھا کہ بہت جلد مجھے رہائی مل جائے گی۔ جلدی کی خاطر جان پر کھیل جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ شاہینہ جیسی عورت مجھے اپنا بنانے کے لیے کیا کرتی ہے اور کس انتہا تک جاسکتی ہے۔ ابھی اس کی نظر صرف ایک سمت ہی دیکھ رہی ہے۔ وہ ناکامی کا سوچ ہی نہیں رہی ہے۔

دوپہر کا کھانا اچھا تھا۔ بڑی بی کے ہاتھ میں عمر کے تجربے کا ذائقہ تھا۔ شام کے لیے اس نے مجھ سے پوچھا کہ کوئی خاص چیز کھانے کو دل چاہتا ہو تو اسے بتا دوں۔ میں یہاں دعوتیں اڑانے نہیں آیا تھا مگر محض شرارت میں میرے منہ سے نکل گیا کہ بھنی ہوئی مرغابی اور بٹیر کا پلاؤ مل جائے تو کیا بات ہے۔ وہ خاموش رہی۔ جیسے اس نے میرے مذاق کو مذاق ہی سمجھا ہو۔

میرے پاس مصروفیت کوئی نہ تھی، کھانے کے بعد مجھ پر نیند غالب آنے لگی تو میں سوگیا اور چار گھنٹے بے ہوشی کی نیند سو کے اٹھا تو کچھ حیران ہوا۔ اتنی لمبی گہری نیند مجھے پہلے نہ آئی تھی۔ شاید یہ بھی کسی دوا کا اثر ہو جو کھانے میں شامل ہو۔ میں نے سوچا۔ شاہینہ ایسی بامقصد دواؤں کے استعمال میں ماہر تھی۔ یہ علم اس نے اپنے گھر سے بھی حاصل کیا تھا۔ عام عورتوں کا مشاہدہ اور مطالعہ اتنا مکمل نہیں ہوتا۔

پیاس سے میرا حلق سوکھ رہا تھا مگر پانی پینے کے بعد پہلے میرا سر گرم ہوا۔ پھر یہ گرمی سارے بدن میں پھیل گئی۔ میں نے بار بار پانی ڈال کے اس اندر کی آگ کو بجھانے کی بے سود کوشش کی۔ ایک گھنٹے بعد میرا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا اور پانی سے نہ بجھنے والی آگ کی جگہ دوسری قسم کی پیاس نے لے لی۔ میں دوسرے کمرے میں گیا اور ان رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا جو اکبر کے ذوق و شوق کی عکاسی کرتے تھے پھر میں بڑی دلچسپی سے وہ پرائیویٹ البم دیکھتا رہا جن کو میں نے پہلے واہیات قرار دے کر چھوڑ دیا تھا۔

نہا کے کافی پینے کے بعد میں عجیب اضطرابی کیفیت کا شکار ہوا اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتا جاتا رہا پھر چھت پر چڑھ گیا اور ٹہلتا رہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سارے کپڑے اتار پھینکوں اور کسی ٹھنڈے پانی کے تالاب میں کود جاؤں اور تیرتا رہوں۔ اس وقت تک جب تک میرے اعضا شل نہ ہوجائیں۔ میرے وجود میں ایک انوکھی سنسنی اور اضطرابی بلکہ ہیجانی کیفیت بھر گئی تھی جس کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر تھا۔

رات کو مجھے قبل از وقت بھوک محسوس ہوئی۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو بڑی بی نے کہا کہ کچھ دیر لگے گی۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ میں نے سوچا شاہینہ سے کہوں گا کہ مجھے اخبار، کتابیں، ریڈیو اور ٹی وی تو فراہم کرے۔ اگر مجھے گنی پگ کی طرح رکھنا مقصود ہے۔ یہ آزمانے کے لیے کہ میرے دل میں اس کی محبت کے جراثیم پرورش پا کے کتنے طاقتور ہوتے ہیں اور کیا بالآخر میں اس کی محبت کے شدید اٹیک کا شکار ہوکے جان دینے کے بجائے اپنا جسم اس کے حوالے کرتا ہوں یا نہیں۔

معلوم نہیں کیوں میں پھر وہی رسالے اور البم لے کر بیٹھ گیا۔ شاید اس لیے کہ وقت گزاری کا وہاں اور کوئی وسیلہ تھا ہی نہیں۔ جب بالآخر بڑی بی نے رات کا کھانا میرے سامنے رکھا تو میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ ایک بڑی ڈش میں سالم بھنی ہوئی مرغی رکھی ہے۔ درحقیقت یہ مرغابی تھی۔ دوسری ڈش میں جو چاولوں کا ڈھیر تھا اُس پر رکھے ہوئے چار بٹیر بہت نمایاں تھے۔

میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''یہ مرغابی... اور یہ بٹیر...؟''

''تم نے کہا تھا نا پتر...''

''کہا ضرور تھا... لیکن... یہ آئے کہاں سے... کون لایا؟''

''میرا بیٹا دے گیا تھا۔ نہر پر مرغابیاں اترتی ہیں جہاں وہ موڑ کاٹ کے دریا سے ملتی ہے۔ بٹیر ایک بندہ رکھتا ہے۔ فصلوں کے بعد آتے ہیں تو وہ پکڑ لیتا ہے۔''

میں حیرانی سے سنتا رہا اور کھاتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ میں بڑی بی سے افریقی زیبرے کا مغز اور سمندر کی اندھی

کہلانے والی مخلوق ڈولفن فرائی مانگتا تو وہ بھی مل جاتی۔ پکانے والے کے ہاتھ کا ذائقہ الگ تھا۔ نہیں معلوم میں کتنا تھکا گیا۔ رات کو معاملہ الٹ ہوگیا۔ شاید میں دن کے وقت زیادہ سولیا تھا کہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ پھر وہی کیفیت ہوئی کہ مجھے لگتا تھا کہ میرے اندر آگ بھر گئی ہے۔ جسم جیسے بخار کی کیفیت میں تھا اور دل میں خواہش تھی کہ کہیں ٹھنڈے پانی کا تالاب یا سوئمنگ پول ہو تو سارے کپڑے اتار کے مچھلی کی طرح پانی کے اندر ہی تیرتا رہوں۔ اس کے ساتھ پیاس کا غلبہ رہا لیکن پانی پینے سے تو جیسے پیاس اور بھڑک جاتی تھی۔ دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور عجیب خیالات آرہے تھے۔ وہ خواہشات جنم لے رہی تھیں جن کا دل سے پہلے گزر نہ ہوا تھا۔

اسی کیفیت میں معلوم نہیں کیسے میں پھر ساتھ والے کمرے میں گیا اور الماری کی تلاشی لینے لگا۔ خالی بوتلوں سے اٹھنے والی مہک مجھے اچھی لگی جو درحقیقت مستی پیدا کرنے والی شراب کی بو تھی۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد مجھے ایک بوتل ایسی ملی جس کا منہ بند تھا۔ اسے ابھی کھولا ہی نہیں گیا تھا۔ اس کے وزن سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خالی نہیں ہے۔ نہ میں نے پہلے کبھی شراب چکھی تھی اور نہ اس کے ذائقے سے واقف تھا۔ جیل میں قیام کے دوران قیدی جو شراب اسمگل کراتے تھے، وہ بہت گھٹیا اور دیسی شراب ہوتی تھی۔ اس بوتل پر لکھا ہوا تھا کہ یہ اسکاچ وھسکی ہے۔ قیدیوں کی باتوں سے ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ فرانس کی شیمپئن اور بلیک ڈاگ اسکاچ وھسکی اعلیٰ ترین اور انتہائی بیش قیمت ہوتی ہے۔

معلوم نہیں مجھ پر کیا شیطان سوار تھا کہ میں نے بوتل کھول کے ایک گھونٹ حلق سے اتار لیا۔ میرے سینے میں آگ سی بھڑک اٹھی اور میرے دماغ میں آتش بازی ہونے لگی۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں جو کر رہا ہوں غلط ہے، میں نے دوسرا گھونٹ بھی لے لیا۔ اس کے بعد میرا حوصلہ جواب دے گیا اور میں نے بوتل کو دیوار پر کھینچ مارا۔ اس کے ٹکڑے بکھر گئے اور شراب سے دیوار پر ایک داغ پھیل گیا جس میں سے لکیریں نیچے بہنے لگیں۔ میں نے کچھ رسالے نکالے اور اکبر کا البم لے کر لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ نہ جانے کب ان کی ورق گردانی کرتے کرتے میں بیڈ پر اوندھا گرا اور سو گیا۔ وہ نیند سے زیادہ بے ہوشی تھی۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ اس آواز پر کھلی جو دروازہ کھلنے سے قبضوں کی چرچراہٹ تھی۔ جب میں سویا تھا تو میں نے لائٹ آف نہیں کی تھی لیکن اب کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اب میری کیفیت پہلے جیسی نہیں۔ میں نارمل اور ہوش میں تھا اگرچہ جسم ٹوٹ رہا تھا جیسے میں نے سارا دن سخت مشقت کی ہو۔ اب میں سیدھا تھا اور تکیے پر سر رکھے لیٹا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کے پوچھا۔ ”کون؟“

جواب مجھے کسی نے نہیں دیا مگر مجھے تاریکی میں ایک زیادہ سیاہ وجود کے حرکت کرنے کا احساس ہوا۔ پھر وہ ہوا جو پہلے بھی ہوا تھا اور ناقابلِ فہم تھا۔ ایک جانی پہچانی مہرباں خوشبو نے میرے حواس پر یلغار کی اور میں نے بے اختیار کہا۔ ”نورین... نورین... یہ تم ہو؟“

اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”ہاں، مگر تم لیٹے رہو۔ تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں... معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے... اس وقت میں اتنی کمزوری کیوں محسوس کر رہا ہوں۔“

اندھیرے میں اس کی چوڑیوں کی کھنک قریب سے آئی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”مجھے نہیں معلوم... میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے... اور کیوں؟“

”تم نے... تم نے شراب پی ہے؟“ اس کی آواز میرے قریب سے آئی۔ ”کیوں خاور...؟“

”پتا نہیں، مجھے لگا کہ شراب ہی میرے اندر کی آگ بجھا سکتی ہے۔ یہاں آؤ، میرے قریب... ہر بار تم آتی ہو اور میری پیاس بڑھا کے چلی جاتی ہو۔“

وہ ہنسی۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ تم کیسا محسوس کرتے ہو۔“

”اپنا ہاتھ دو۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”ہر بار کی طرح آج مجھے ترسا کے مت جانا... میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں... محسوس کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کا نرم و نازک سرد ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔

”بہت محبت کرتے ہو نا تم مجھ سے؟“

میں نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگایا۔ ”ہاں، اتنی کہ آج تک کسی مرد نے کسی عورت سے نہیں کی ہوگی۔“

”کیوں؟ ایسی کیا بات ہے مجھ میں آخر...؟“ وہ بولی۔

”کیا بات ہے؟ مجھے تم دنیا کی سب سے حسین عورت

لگتی ہو۔“

”صرف تمہیں لگتی ہوں۔“ وہ مجھ پر جھک آئی۔

”نہیں... تم ہو... تمہارا یہ جسم حسن کا شاہکار ہے اور تمہارا یہ چہرہ... تمہاری آنکھیں... یہ ہونٹ... تم نے پاگل کر دیا ہے مجھے۔“ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور کسی مزاحمت کے بغیر وہ مجھ میں سما گئی۔ ایک عالم بے خودی میں اس کا نام میرے لبوں پر آتا رہا... نورین... نورین...

یہ بھی فریبِ خیال تھا۔ خواب تھا لیکن پہلے سے زیادہ پُرفریب۔ ابھی میں بیدار بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے کہا۔ ”سلیم... اٹھو بہت سو لیے، صبح کب کی ہو چکی...“

پوری طرح ہوش میں نہ ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ یہ نورین کی نہیں، شاہینہ کی آواز ہے۔ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ”تم...؟“

وہ میرے سامنے مجھ سے چند قدم دور کھڑی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس کے بال گیلے ہیں مگر اس نے سنوار لیے تھے۔ نمی اس کے لباس میں نظر آرہی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو... اب تو ہوش میں آجاؤ۔“ وہ ہنسی۔ ”کیا اب بھی انکار کرو گے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟ رات بھر تو میرا نام لے کر مجھے یقین دلاتے رہے کہ تمہیں کتنی محبت ہے مجھ سے... کتنی اچھی لگتی ہوں میں تمہیں۔“

”یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو... وہ میں تم سے نہیں، نورین سے کہہ رہا تھا۔“ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ ہنسی۔ ”نورین سے...؟ کون نورین... یہاں تو میں تھی تمہارے ساتھ... کیا تم نشے میں تھے؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں... نشے ہی میں تھا میں... شراب پی تھی میں نے۔“

”شراب کہاں سے آئی تمہارے پاس...؟“

”دیکھو شاہینہ... یہ کھیل مت کھیلو میرے ساتھ۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ تمہارے اس شوہر کا عشرت کدہ ہے جسے خود تم نے قتل کیا تھا اپنے ہاتھوں سے۔“

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”تم واقعی اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔ پوری رات میں کیا کچھ نہیں کہا تم نے مجھ سے... میرا نام لے کر... تمہیں کچھ یاد نہیں... آخر تم کب تک دھوکا دیتے رہو گے خود کو... کب تک انکار کرتے رہو گے کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو... ڈر کس کا ہے تمہیں جب مجھے کسی کا ڈر نہیں؟“

اب میں بے وقوفوں کی طرح اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کیا واقعی تمام رات میں نورین سمجھ کے اس سے اظہارِ محبت کرتا رہا؟ ہر بار حواس مجھے دھوکا دیتے تھے اور میں اپنے خیال کو نورین سمجھ کے اسے چھونے اور پانے کی کوشش کرتا تھا۔ گزشتہ رات میں نے دھوکا کھایا۔ وہ شاہینہ تھی جسے میں نے نورین مان لیا تھا اور شاہینہ اسی پر خوش تھی۔

شاہینہ مجھ سے چند قدم دور کھڑی تھی۔ کمرے میں لائٹ تھی لیکن باہر شاید صبح بہت دیر پہلے طلوع ہو چکی تھی۔ مجھے نہ اس وقت کا اندازہ تھا جب وہ آئی تھی اور نہ اب پتا تھا کہ اس نے کتنے گھنٹے مجھے فریبِ خیال کا اسیر رکھا تھا۔ یقیناً یہ شراب کا اثر تھا جو حواس کو مختل کر دیتی ہے۔ میں نے تو اس خوشبو کو بھی محسوس کیا تھا جو نورین سے منسوب تھی۔ آخر کیا ہو گیا تھا مجھے؟ شاہینہ نے سیاہ کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کے بدن کا ایک ایک نشیب و فراز پوری دلکشی کے ساتھ نمایاں تھا اور اس کے بدن کی اجلی سفیدی زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے گزرے ہوئے دن کی باتیں یاد آنے لگیں۔ شک کی اب کوئی بات نہ رہی تھی۔ اس عورت نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے یہاں رکھا اور اپنے روایتی طریقے سے میرے اعصاب اور جذبات، عقل و حواس اور دل و دماغ پر اپنا کنٹرول حاصل کیا۔ اس نے میرے اندر کے حیوان کو جگایا۔ یہاں تک کہ مجھے خود اپنے قول و فعل پر اختیار نہ رہا اور میں نیکی بدی میں تمیز بھول گیا۔

بلاشبہ وہ بے حد شاطر اور فطین عورت تھی جس نے سب کچھ اپنے شوہر کے کرتوت دیکھ کے سیکھا تھا اور پھر اس کے حربوں سے خود اسے شکست دے دی تھی۔ وہ محکوم اور غلام بن کے نہیں رہ سکتی تھی۔ اکبر نے اس کے غرورِ حسن کو سخت مجروح کیا تھا اور اس کی انا کی تذلیل کی تھی۔ وہ ایک زخم خوردہ ناگن بن گئی جو بدلہ لینے کے لیے وقت کے انتظار میں تھی۔ اور جب وقت آیا تو اس نے ایک عیاش، بے ضمیر اور بے غیرت مرد سے نجات حاصل کر لی جو اس پر شوہر ہونے کا حقِ ملکیت رکھتا تھا۔

شوہر پیار محبت، اعتماد اور تحفظ دینے والے رشتے کا نام ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کو خدا نے حسن کی وہ قوتِ تسخیر دی ہے کہ وہ جس مرد کو چاہے اپنا غلام بنا سکتی ہے۔ اس کا یہ غرور بے جا نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ ہر لحاظ سے ایک حسین اور پُرشباب مکمل عورت تھی۔ اکبر کے بعد اس نے دنیا کی پروانہ

کرتے ہوئے میرا انتخاب کرلیا تھا اور اب مجھے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے تیار تھی۔

’’اب ایسے کب تک دیکھتے رہو گے مجھے؟‘‘ میری بےخودی کو اس نے اپنے حسن وشباب کا جادو سمجھ لیا تھا۔ ’’چلو اب اٹھو... مجھے بھوک لگی ہے۔‘‘

احساسِ شکست نے مجھ سے میرا اعتماد چھین لیا تھا۔ وہ مسلسل مجھے ایک کھلونے کی طرح استعمال کررہی تھی اور میں کھلونے سے زیادہ بےبس تھا۔ کہیں نہ کہیں میری مزاحمت کو شکست ہوجاتی تھی۔ وہ خود ایک خطرناک کھیل کھیلنے میں مصروف تھی اور میں بھی اس میں اپنی خوشی سے شریک نظر آتا تھا جبکہ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ غسل کرتے ہوئے مجھے یہ سوال پریشان کرتا رہا کہ کیا اس طرح وہ میری برین واشنگ کرکے یا مجھے بلیک میل کرکے اپنے مقصد سے دور کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ اس کی پیش قدمی جاری تھی اور میں ہارنے پر مجبور ہوتا جارہا تھا۔ ایک عجیب احساس یہ تھا کہ وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ یہ خیال مجھے خوف میں مبتلا کرتا تھا۔ کیا میرا انجام وہی ہوگا جو سرکس کے شیر کا ہوتا ہے؟ وہ جنگل کا بادشاہ ہو تو کتنا خونخوار ہوتا ہے مگر سرکس والے اس کو کیسا سدھا لیتے ہیں کہ وہ ان کے اشاروں پر چلنے لگتا ہے۔ کیا میرے خیالات اور جذبات بدل جائیں گے؟ وہ اپنے اس دعوے کو سچ ثابت کردے گی کہ وہ نورین کی جگہ لے سکتی ہے؟

جب میں باہر نکلا تو وہ ناشتا لیے میری منتظر تھی۔ اس نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ’’کتنے ہینڈسم اور اسمارٹ لگ رہے ہو تم۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’شاہینہ! یہ سب تم کیسے کررہی ہو... میرا مطلب ہے کس کی مدد سے... اور کیا کسی کو معلوم نہیں...؟‘‘

’’کیا معلوم نہیں...؟‘‘ وہ بولی۔

’’یہ... کہ میں یہاں تمہاری قید میں ہوں... اور تم میرے ساتھ ہو؟‘‘

’’سب سمجھتے ہیں کہ تم فرار ہوگئے۔‘‘ اس نے پُرسکون انداز میں کہا اور سر کو جھٹک کے بالوں کو پیچھے کیا۔

’’مجھے یہاں کون لایا... جگہ تو اکبر کی ہے؟‘‘

’’وہ سب جو اکبر کا تھا، اب میرا ہے۔‘‘ وہ غرور سے بولی۔

’’میں اس کو چیلنج نہیں کررہا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تمہارے دل میں کیا سوالات بےچینی پیدا کررہے ہوں گے، یہ جانتی ہوں میں۔ حویلی تو بڑے چودھری کی کہلاتی ہے مگر راج انور کا ہے۔ پھر میں اپنی مرضی سے سب کچھ کیسے کرلیتی ہوں... تو جواب یہ ہے کہ میں نے کبھی اکبر کی حاکمیت قبول نہیں کی جو میرا شوہر تھا... تو انور کی تابع داری کیسے کرسکتی تھی۔ یہ بغاوت میری فطرت میں تھی۔ میرا باپ بھی یہ بات سمجھتا تھا اور میرے لیے پریشان ہوتا تھا کہ میری زندگی کتنی مشکل ہوگی اس معاشرے میں... لیکن باپ کی حیثیت سے اس نے مجھے یقین ضرور دلایا تھا کہ جہاں تک ممکن ہوگا، وہ میری مدد کرے گا اور یہ اسی کی حمایت کا نتیجہ ہے کہ آج بھی میری خودمختاری برقرار ہے اور میں زندہ بھی ہوں۔ ورنہ حویلی میں عورت کو سر اٹھا کے بات کرنے کی اجازت نہیں۔ باغی کی سزا کیا ہوتی ہے؟ موت... میں ابھی تک اپنی زندگی پر اپنا اختیار رکھنے کے لیے لڑ رہی ہوں۔‘‘

’’کسی احساسِ گناہ یا جرم کے بغیر۔‘‘ میں نے کہا۔

’’دیکھو سلیم... جنگ کی کوئی اخلاقیات نہیں۔ نہ پہلے تھی نہ آج ہے۔ اس میں جائز، ناجائز اور اچھا برا کچھ نہیں۔ یہی بقا کے لیے ضروری ہے۔ کوئی جو مجھ سے بڑا گناہگار... ہو، مجھ سے بڑا مجرم ہو... وہ مجھ پر انگلی اٹھاتا ہے تو اٹھاتا رہے... مجھے پروا نہیں۔ تم سے تو میں نے پہلے بھی کچھ چھپایا نہیں اور سیدھی صاف بات ہے جب میری زندگی کی پروا کسی کو نہیں تو مجھے کسی اور کی زندگی کی فکر کیوں ہو۔ مجھے کیوں حق حاصل نہیں لائف کو انجوائے کرنے کا۔ میں کیوں ان کے اخلاقی معیار کی سولی پر چڑھائی جاؤں جن کا اپنا اخلاقی معیار ایسا ہو کہ ان کے سامنے شیطان بھی نیک لگے۔‘‘

میں حیرانی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کی بات سے اتفاق کرنے پر مجبور تھا۔ ’’ایسی باتیں تم نے کہاں سے سیکھ لیں؟‘‘

’’سلیم! تم میرے باپ کو جعلی پیر، دھوکے باز اور مجرم... جو چاہو کہہ سکتے ہو لیکن وہ انتہائی ذہین آدمی ہے۔ ذہانت کے بغیر وہ پیری مریدی کا اتنا بڑا بزنس نہیں چلا سکتا تھا۔ چلاتا تو فیل ہوجاتا۔ میں اسی باپ کی بیٹی ہوں۔ میری ذہانت کا وہ بھی قائل تھا۔ اگر تم میری بہن روزینہ کو دیکھو گے تو اس کی اور میری فطرت میں تمہیں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہ ماں پر گئی ہے۔ میرے باپ کو افسوس یہ تھا کہ میں بیٹی کیوں ہوں، بیٹا کیوں نہیں۔ بیٹا اس کی گدی سنبھال سکتا تھا۔ عورت سجادہ نشین نہیں ہوسکتی۔ وہ میری

اولاد کو اس گدی پر بٹھا دیتا۔ اگر اولادِ نرینہ ہوتی۔ اب یہ آس بھی نہیں رہی۔ اس کی ساری امیدیں اب انور سے اور روزینہ سے وابستہ ہیں کہ وہ اسے ایک جانشین ضرور دیں گے۔“

”ایک بات پوچھوں؟ برا مت ماننا... پیر صاحب نے دوسری شادی کیوں نہیں کی تھی؟ چار تو وہ شرع کے مطابق کر سکتے تھے۔ اولادِ نرینہ کے لیے دوسری تیسری یا چوتھی شادی کا بہانہ بھی موجود تھا؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ”کیا یہ بات تمہیں کسی نے نہیں بتائی کہ میرا ایک بھائی تھا جو مجھ سے بڑا تھا؟“

میں چونکا۔ ”نہیں... کیا وہ مر گیا تھا؟“

”نہیں، چودہ سال کی عمر میں وہ غائب ہو گیا تھا۔ اغوا ہو گیا تھا یا خود اپنی مرضی سے نکل گیا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔“

”تمہیں بھی معلوم نہیں؟“

”نہیں، میں اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ روزینہ چار سال کی۔ اب وہ تیس سال کا ہو گا۔ گھر میں کسی کو بھی اس کے بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے اس کی صورت یاد ہے لیکن اور میں کچھ نہیں جانتی۔“

”تمہاری ماں نے بھی نہیں بتایا؟“

”ماں اس قسم کی پابندی تھی جو شوہر نے دے رکھی تھی۔ وہ بیٹے کو یاد کر کے روتی ضرور تھی لیکن اس کا نام نہیں لے سکتی تھی۔“

”کیا تھا اس کا نام؟“

”قاسم... تم ٹھیک کہتے ہو... اولادِ نرینہ کے لیے پیر صاحب دوسری شادی کرتے تو انہیں روکنے والا کوئی نہ ہوتا لیکن انہوں نے خود نہیں کی۔ مجھے شک ہے کہ وہ پیر صاحب کی کسی بات پر ناراض ہو کے گیا۔ کوئی ایسی بات تھی جو میرے والد کے دل میں کانٹا بن کے چبھتی رہی اور میرا یقین بھی بے سبب نہیں۔ میرے والد کا یقین ہے کہ قاسم واپس آئے گا۔ اس یقین کا سبب بھی مجھے پتا نہیں۔ مگر یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ بات میری تھی۔ میں نے شادی ہونے تک بہت کچھ دیکھا سنا اور پڑھا۔ میری آنکھیں اور میرے کان بہت تیز تھے۔ پیری مریدی کے سارے ڈرامے کی حقیقت مجھے معلوم ہے۔ میں وہ بھی دیکھ لیتی تھی جو ممنوع تھا۔ خصوصاً کسی لڑکی کے لیے... مگر میرے اندر تو ایک جن کی بے چین روح تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ عورتیں جن پر آسیب ہوتا تھا، یہ کہا جاتا تھا کہ ان پر جن آتے ہیں، جب پیر صاحب کے پاس لائی جاتی تھیں تو پیر صاحب ان کا جن کیسے اتارتے تھے۔ جن کیوں آتے تھے؟ ان کی حقیقت کیا تھی؟ میں سب سمجھتی تھی اور کھوج لگا کے سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔“

”کسی نے تمہیں روکا نہیں... کبھی تم پکڑی نہیں گئیں؟“

وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی۔ ”حویلی میں کب پکڑی گئی؟ یہاں تو بڑے سیانے تھے تم جیسے بھی... آج کون پکڑ سکتا ہے مجھے... کس میں ہمت ہے؟“

”اگر انور یہاں آ جائے... پھر...؟“

وہ ہنسی۔ ”انور یہاں نہیں آ سکتا۔“

”کیوں نہیں آ سکتا؟ کون ہے اسے روکنے والا؟“ میں نے کہا۔

”اسے معلوم ہی نہیں کہ تم یہاں ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا، اسے کیا معلوم ہے؟“

”وہ سمجھتا ہے کہ تم بھاگنا چاہتے تھے، بھاگ گئے... اپنی خیالی نورین کی تلاش میں نکل گئے۔“

”نورین خیالی نہیں ہے۔ لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیا جادو سے یہاں منتقل کیا گیا تھا کہ کسی نے بھی دیکھا کچھ نہیں۔ وہ معلوم کرے گا۔“

”کیا بتائے گا اسے کوئی... اور اب تک وہ معلوم کیوں نہیں کر سکا؟ کوشش بہت کی ہو گی اس نے بھی لیکن کچا کام کرنا میں نے نہیں سیکھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس حویلی میں جتنے اس کے نمک خوار ملازم ہیں، ان میں سے کتنے میرے حکم کے غلام ہیں۔ کتنے میں نے بدل دیے اور اسے خاک پتا نہیں چلا۔ یہ میرے پیر باپ کے عقیدت مند ہیں جو اس کے لیے جان نذر کرنا بہت معمولی نذرانہ سمجھتے ہیں۔ سیدھا جنت میں جانے کا پروانہ... ان میں سے دو کو میں نے تاڑا کہ زیادہ احمق ہیں۔ اور تمہیں کیا بتاؤں... قصور ان کا بھی نہیں۔ وہ مرد بھی ہیں۔ دونوں سے میں نے علیحدگی میں حلف لیا کہ جو کام میں ان سے کرانا چاہتی ہوں، اس کی خبر مجھے اور میرے خدا کے سوا کسی کو نہیں ہو گی۔ انہوں نے وعدہ کیا تو میں نے کہا کہ یہ ان کی وفاداری کی آزمائش ہے اور اس کا انعام دوں گی میں۔ بے چارے خوش فہمی کا شکار ہوئے کہ شاید یہ انعام وہ ہو گا جس کا وہ خواب دیکھتے ہیں... یعنی میں خود...“

”تم نے جانتے بوجھتے انہیں خوش فہمی میں مبتلا کیا؟“

”سب کرنا پڑتا ہے سلیم، محبت میں اور جنگ میں۔ پھر میں نے ان سے حلف لیا... انہوں نے تمہیں رات کے وقت سوتے ہوئے اٹھا لیا اور یہاں لے آئے۔ ان چار میں سے جو باہر پہرے پر ہیں دو وہی ہیں... دو میں نے بعد میں بھیجے۔“

”اگر میں فرار کی کوشش کرتا... تو کیا یہ مجھے مار دیتے؟“

”نہیں، وہ تمہیں زخمی کرتے۔ تمہاری ٹانگ پر گولی مارتے۔ ان کا نشانہ بہت اچھا ہے۔“

”اس بات کو کتنے دن ہو گئے؟“

”ابھی صرف ایک ہفتہ گزرا ہے۔ انور تمہاری بات بھی نہیں کرتا اب۔ مجھ سے ویسے بھی بات نہیں کرتا۔“

میں نے کہا۔ ”تم یہاں کیسے موجود ہو؟“

وہ ہنسی۔ ”میں پیر سائیں کے گھر میں ہوں۔ اپنے میکے میں۔“

”اور وہ پہنچ جائے اپنے سسرال... پھر؟“

”یار! کتنی بار بتاؤں کہ کچا کام میں نہیں کرتی۔ اسے اباجی اور ان کے ڈاکٹر جلالی کے ساتھ لاہور شہر جانا تھا۔ ان کی طبیعت بگڑی اور ساتھ ہی مانیٹر بگڑ گیا۔ اباجی کا چیک اپ ہو گا کسی اسپتال میں۔ اور انور اس کمپنی میں جا کے مانیٹر کے خراب ہونے کی رپورٹ کرے گا جس نے سارا سامان سپلائی کیا تھا۔ ان کی گارنٹی ہے۔ وہ کل رات اسپتال میں ہی ہو گا۔ یا قریب کسی ہوٹل میں چلا گیا ہو گا۔ آج اسے بہت سے کام ہوں گے۔ کمپنی جائے گا، اباجی کو اور پھر ڈاکٹر جلالی کو اس کے گھر سے لے گا... شام تک آئے گا۔“

ماسی خاموشی سے آئی اور ہمارے درمیان سے برتن اٹھا کے لے گئی۔ جو کچھ شاہینہ نے بتایا تھا، مجھے قائل کرنے کے لیے بہت کافی تھا کہ واقعی وہ کچا کام نہیں کرتی۔ وہ بے باکی یا بے شرمی سے اعتراف کرتی تھی تو یہ بھی اس کی ہمت تھی۔ لگی لپٹی رکھے بغیر اس نے مجھ سے محبت کا عملی اظہار کر دیا تھا اور اس یقین کا بھی کہ وہ مجھے حاصل کر کے چھوڑے گی۔ میں اب اس سے کچھ خوف محسوس کرتا تھا۔ اب تک میرے انکار نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ہوا وہی تھا جو اس نے چاہا تھا۔ اس نے جب چاہا تھا، مجھے حاصل کر لیا تھا۔ خواہ اس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا۔ کسی طریقے کو وہ غیر اخلاقی یا غیر قانونی مانتی کہاں تھی۔ وہ تو اس اصول پر عمل کرتی تھی کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ اس کے اعتماد اور جارحانہ انداز سے مجھے لگتا تھا کہ جو کہتی ہے سچ کر کے دکھا دے گی اور میں اپنی خود اعتمادی کی خوش فہمی میں ہی مارا جاؤں گا۔ مجھے براہِ راست اسے چیلنج کرنے اور اس سے تصادم کے بجائے مصالحت کی پُرفریب پالیسی بنا لینی چاہیے۔ جب اسے یقین آنے لگے گا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے اور میں اس کا بن گیا ہوں تو میری مشکل آسان ہو جائے گی۔ زنجیر ٹوٹے گی تو دیواریں خود راستہ دے دیں گی۔

اس نے میری ناک کے سامنے چٹکی بجائی اور ہنسی۔ ”تم تو یوں دیکھ رہے ہو جیسے کہ پلک جھپکائی تو میں غائب ہو جاؤں گی۔“

”میں سوچ رہا تھا کہ عورت کے پاس حسن و شباب کی تابکاری کے ساتھ عقل و ذہانت کی طاقت بھی ہو تو وہ کیسی خطرناک دو دھاری تلوار بن جاتی ہے۔ ایسی عورتوں کے لیے جنگیں لڑی گئی ہیں۔ بہت خون بہا ہے۔“

”اچھا، مجھے بھی بتاؤ کون تھیں وہ...؟“

”ہیلن آف ٹرائے تھی۔ بڑی مشہور فلم بنی ہے اس پر جس میں ایلزبتھ ٹیلر کا مرکزی کردار تھا۔ قلوپطرہ تھی جس کے حسن کا غلام سیزر تھا۔ نور جہاں تھی جس نے جہانگیر کو بندۂ بے دام بنایا۔ اور ایوا براؤن تھی جو ہٹلر کے دل پر آخری لمحے تک حکمراں رہی۔“

”تم بہت قابل آدمی ہو۔“ اس نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ”مگر کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ میں بھی ان جیسی ہوں؟“

”انہیں میں نے نہیں دیکھا۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اب تک تو ایسا ہی ہے کہ میری ایک نہیں چلی۔ تم ہر بار جیتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اور شاید آخری جیت بھی تمہاری ہو گی... لیکن...“

اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ ”لیکن کیا...؟“

”جب خدا نے تمہیں یہ حسنِ بے مثال اور ایسی قیامت خیز شباب کی رعنائی دی ہے تو پھر تم یہ سب کیوں کرتی ہو؟“

”یہ سب سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ وہ بولی اور ایک انگڑائی لے کر مسکرائی۔ ”سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اب یہ مت پوچھنا کیوں...“

میں اس وار سے خود کو بچانے کے لیے انجان بن گیا۔ ”مجھے یہاں کھانے میں کچھ دیا گیا۔ معلوم نہیں وہ کیا تھا۔“

www.paksociety.com

"تم جان بھی نہیں سکتے۔" وہ بولی۔

"اس نے میرے تن بدن اور جذبات میں آگ لگا دی۔ میرے ہوش وحواس کو مختل کر دیا۔ اور تمہارے آنے سے پہلے بھی میں نے کیا الٹی سیدھی حرکتیں کی تھیں، مجھے اندازہ ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ رات کو میں نے تمہیں نورین سمجھا۔"

"نہیں، تم نے مجھے دیکھا، پہچانا اور تم جانتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ نورین کا نام تم نے ایک بار بھی نہیں لیا۔"

میں نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ "میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟"

وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی رہی۔ "یہ ضروری تھا۔"

"کیا ضروری تھا... اور کیوں...؟"

"اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے... میں وہ جواری ہوں جس کو ہار منظور نہیں۔ میں ہار افورڈ نہیں کر سکتی سلیم! یہ پہلی اور آخری بار ہے کہ میں نے خود کو... اپنے غرور کو... اپنی انا اور خودداری کو داؤ پر لگایا ہے۔ اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ میں تمہاری مزاحمت کو بھی ختم کروں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تم مضبوط اعصاب کے مرد ہو۔ میں نے سب کچھ تمہیں آفر کیا۔ اپنی محبت، اپنی دولت جائداد، ایک باعزت زندگی، قابلِ رشک مستقبل... کوئی اور مرد ہوتا تو خود کو میرے قدموں میں ڈال دیتا لیکن تم دور تھے، دور ہی رہے۔ اس کے بعد میرے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔ تمہاری ذہنی مزاحمت ختم کرنا ضروری تھا۔ تمہیں بدلنا ضروری تھا۔"

"اور اس کے لیے تم نے دوائیں استعمال کر لیں؟ یہ کس نے بتایا تمہیں کہ انسانی دماغ کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ اپنی مرضی کا غلام... یہ عام دوائیں نہیں ہیں شاہینہ؟"

"ہاں، یہ بہت خاص دوائیں ہیں۔" وہ سیدھی سامنے دیکھتی رہی۔

"ایک زمانے میں ایف بی آئی اور سی آئی اے... یعنی امریکی اور روسی جاسوس ادارے... ایک دوسرے کے جاسوس پکڑ لیتے تھے تو ان کی مزاحمت ایسی ہی دواؤں سے ختم کرتے تھے۔ پھر وہ سب کچھ اگل دیتے تھے جو ان کے دماغ میں ہو۔ یہ کام تشدد کے سارے حربے آزما کے بھی نہ ہوتا۔ ہماری پولیس جب سراغ نہیں لگا پاتی تو ناقابلِ برداشت جسمانی تشدد آزما کے سخت جان مجرموں سے سب اگلواتی ہے۔ اس عمل میں بعض اوقات وہ مر جاتے ہیں مگر بتاتے کچھ نہیں۔ سائنٹیفک طریقے بہت موثر تھے۔ یہ برین واشنگ کہلاتی ہے۔ ملک دشمن جاسوس پکڑے جاتے ہیں تو پہلے ان سے وہ سب پوچھ لیا جاتا ہے جو وہ جانتے ہیں۔ ان کے دماغ کو کسی کورے کاغذ جیسا کر دیا جاتا ہے۔ وہ پہلے کی ہر بات بھول جاتے ہیں۔ پھر ان کے دماغ میں وہ ڈالا جاتا تھا جو ان سے کرانا ہو... اور ایسا ہو جاتا تھا۔ روسی جاسوس واپس جا کے خود اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کرتے تھے اور امریکن جاسوس امریکی راز روس کو ارسال کرتے تھے مگر یہ پرانی بات ہے۔ اب تو ہر ملک کی انٹیلی جنس ایجنسی یہ کر سکتی ہے۔"

"ہاں، برین واشنگ ہوتی ہے۔ مگر تم اس سائنس سے کیسے واقف ہو؟ تم نے ریشم کو زہر دیا تھا۔ وہ غلہ محفوظ رکھنے والی گولیاں تھیں۔ عام دیہاتی عورت بھی ان کا استعمال جانتی ہے۔ خودکشی کے لیے وہ سب سے آسان دستیاب ہونے والا زہر ہے اور انتہائی موثر۔"

"پھر ریشم مری کیوں نہیں؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اس لیے کہ گولیاں بہت پرانی تھیں۔ ان کا اثر سو فیصد نہیں رہا تھا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے رپورٹ حاصل کر لی تھی اور ڈاکٹر کو بھی دکھا دی تھی۔ خواب آور گولیاں بھی گھر میں ہو سکتی ہیں اور شاید اکبر کچھ مخصوص دوائیں استعمال کرتا ہو یا کراتا ہو۔ حیوانی جذبات کو بھڑکانے والی۔ مگر یہ دوائیں جن کی بات تم کر رہی ہو... جن سے آدمی کا ذہن اور شخصیت بدل جائیں... ان کا استعمال تم نے کہاں سے سیکھا... کہاں سے لاتی ہو تم یہ دوائیں؟"

اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ "پیر سائیں کے ڈیرے سے۔"

مجھے احساس ہوا کہ اپنی قابلیت بگھار کے میں نے بے وقوفی کی ہے۔ اگر میں لاعلم اور انجان بنا رہتا تو شاہینہ کو دھوکے میں رکھ سکتا تھا کہ میں بدل گیا ہوں۔ اس کے حسن کا اسیر بن گیا ہوں اور نورین کو بھول کے اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ لیکن اب شاید یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ کمان سے نکلے تیر کو واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔

"پیر سائیں کے ڈیرے سے...؟" مجھے حیرت کا سخت جھٹکا لگا۔

"ہاں، ورنہ اس گاؤں میں جہاں سر درد کی گولی بھی نہیں ملتی ہے، ایسی دوائیں مجھے کون لا کے دیتا۔ میں نے کوئی ڈاکٹری تو نہیں پڑھی تھی اور ڈاکٹری تو میرے باپ نے بھی نہیں پڑھی تھی لیکن اس نے ایک کام شروع کیا تو بہت کچھ سیکھ لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ راستہ اسے کس نے دکھایا تھا اور اس پیشے کی ضروریات کو اس نے کیسے سمجھا۔ اس کی کامیابی سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ذہانت کے ساتھ محنت کی۔ ایک بات وہ ہمیشہ دہراتا ہے کہ جب تک دنیا میں بے وقوف زندہ ہیں، عقلمند عیش کریں گے اور بے وقوفوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہے گی۔ ہر پیشے میں اور ہر شعبے میں یہ بات ثابت ہے۔ ان دواؤں کو وہ جن اتارنے کے لیے بھی استعمال کرتا تھا اور جن چڑھانے کے لیے بھی۔"

"جن اتارنے کے لیے ڈاکٹر کون سی دوا دیتے ہیں؟"

"جن ہوتا کیا ہے عموماً؟ ہسٹریا کا دورہ... نروس بریک ڈاؤن، ڈپریشن، ایک انتہا جب اندر کا اور باہر کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے تو اعصاب کی قوتِ برداشت ختم ہو جاتی ہے۔ دماغ بغاوت کرتا ہے جیسے ایک حد کو پہنچ کے پریشر ککر پھٹ جاتا ہے۔ اس کا علاج سکون ہے اور سکون آور دوا کام کرتی ہے۔"

"یہ تمہیں پیر صاحب نے بتایا؟"

"کچھ میں نے سنا، کچھ پوچھا اور کچھ جانا۔ جتنی دیر میں پیر سائیں اپنا کوئی وظیفہ یا عمل پورا کرتے تھے، کوئی طاقتور دوا اپنا اثر دکھانے لگتی تھی۔ چالیس منٹ میں اعصابی کشیدگی پر غنودگی غالب آ جاتی تھی۔ جو کسی کو جن اتروانے لاتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ وظیفہ کامیاب رہا۔ مگر ایک گولی سے علاج مکمل نہیں ہوتا۔ پیر سائیں پھر بلاتے تھے یا پانی پڑھ کے دیتے تھے۔ کیا ہوتا تھا اس میں؟ وہی سکون آور دوا... پانچ سات دن یا دس پندرہ دن میں عورت نارمل ہو جاتی تھی۔"

"عورت... مریض ہمیشہ عورت ہوتی ہے... کیوں؟"

"اس سوال کا جواب تمہیں معلوم ہونا چاہیے... دباؤ کس کا ہے؟ دباؤ کا شکار کون ہے؟ شادی کے بعد یہ دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ ایک سو ایک اسباب ہیں۔ ساس، بچے، شوہر کا سلوک... دوسرے گھر والوں کا رویہ۔ مرد کتنا آزاد ہے، یہ تم نے پہلے بھی دیکھا ہوگا۔ میں نے ان عورتوں کو دیکھا ہے جو پیر سائیں کے پاس لائی جاتی تھیں۔ وہ کیا کہتی تھیں... ہوش میں اور بے ہوشی یا دیوانگی اور جنون کی کیفیت میں۔ بعض اوقات وہ انتہائی فحش کلامی کرتی تھیں۔ مردوں کی طرح۔ تم نے ان عورتوں کو دیکھا تھا؟"

"ہاں، ان میں فاطمہ بھی تھی جو درحقیقت نورین تھی۔"

"غلط ہے تمہارا خیال۔"

"یہ میرا یقین ہے۔"

"تمہارا یقین بھی بے بنیاد ہے۔ وہ فاطمہ ہی تھی۔ میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کر لی تھیں۔"

"میری معلومات کا ذریعہ کچھ اور تھا مگر مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ نورین ہی تھی۔ اسے کسی نے نہر سے نکالا تھا۔ اسی طرح جیسے ریشم نے مجھے نکالا تھا۔ شاک کا اثر نورین پر زیادہ تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ کون ہے اور اسے بچانے والے نے فاطمہ بنا کے رکھ لیا تھا۔"

"کس نے کہا یہ سب تم سے؟"

"ہے ایک نوجوان... اسی گاؤں کا رہنے والا جہاں فاطمہ رہی۔"

وہ مسکرائی۔ "کیا تم نے فاطمہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے کے لیے کسی انعام کا اعلان کیا تھا؟"

"اعلان کیا کرتا... ہاں اسے میں نے انعام ضرور دیا تھا اور کہا تھا کہ مزید معلومات حاصل کر کے بتائے۔"

"وہ پھر آیا نئی معلومات کے ساتھ... اور پھر انعام لے گیا؟"

"ہاں، کیا کہنا چاہتی ہو آخر تم... یہ کہ اس نے انعام کے لیے مجھے وہی بتایا جو میں سننا چاہتا تھا؟"

"ہاں۔" شاہینہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بالکل ایسا ہی ہوا۔ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں۔"

"چھوڑو شرط کو... تم کچھ اور بتا رہی تھیں مجھے۔ سکون آور دوا کا استعمال تو عام ہے۔ نام میں نے بھی سنے ہیں۔ لیکن ان سے برین واشنگ نہیں ہوتی۔ وہ عام دوائیں نہیں ہیں۔"

"پیر صاحب خاص آدمی ہیں۔" وہ مسکرائی۔ "خاص دوائیں حاصل کر لیتے ہیں۔ پہلے مشکل ہوگی، اب ریگولر سپلائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خطرناک دوائیں ہیں۔ ماہرین انہیں احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ پیر صاحب نے ڈاکٹری نہیں پڑھی۔ ان کے لیے دواؤں کے

بارے میں معلومات دینے والے لٹریچر کو سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اس کا ایک آسان حل نکال لیا تھا انہوں نے... کسی ڈاکٹر نے ان کو جو سمجھایا، وہ انہوں نے ایک پرچے پر لکھ لیا۔ پرچہ اردو میں تھا اور ہر دوا کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ ساری دوائیں ہمارے گھر کے ایک کمرے کی الماری میں رہتی تھیں۔ میں نے اپنے تجسس سے مجبور ہو کے الماری کو دیکھا۔ میرے لیے وہ حیرت کا خزانہ تھی اور معلومات کا بھی۔ الماری کو مقفل رکھنا ضروری نہیں تھا۔ گھر میں ہم دو بہنوں کے سوا کون تھا اور ہم سے پیر صاحب کو کیا خطرہ ہوتا۔ مجھے کون سا پیری مریدی کے بزنس کو چلانا تھا۔"

"پیر صاحب کو کبھی شک نہیں ہوا؟"

"جب شک ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ خود ماہر ہو گئے تھے اور انہیں دوائیں استعمال کرنے کے لیے کسی پرچے پر لکھی ہوئی ہدایات کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ان پر لوگوں کا اعتقاد اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ وہ سادہ پانی دم کر کے دیتے تھے تو وہ بھی کام کر جاتا تھا۔ کلامِ الٰہی شفا کی نیت سے پڑھا جائے تو اثر کرتا ہے۔ یہ میرا عقیدہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔"

"ایک بہت ذاتی سوال پوچھوں؟ تمہیں برا نہ لگے تو..."

"زندگی میں جو بھی میں نے دیکھا اور بھگتا ہے اس میں اچھائی کہاں تھی، نیکی کہاں تھی... جو میں نے دیکھا اور جانا... بہت تکلیف دہ تھا اور بہت باعثِ شرم بھی... کیا ہے تمہارا سوال؟"

"سوال ان عورتوں کے استحصال کے بارے میں ہے۔ ان کے ساتھ کیا ہوتا تھا؟"

"وہی جو ہر جگہ ہوتا تھا۔ اس میں ان کے لیے کوئی انوکھی یا افسوس ناک بات کہاں تھی۔ ان کے جسم کی بے حرمتی میں ان کے لیے دکھ یا صدمے کی بات ہی نہ تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی، جوانی آنے سے پہلے بھی یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ گھر کے باہر... کھیتوں کھلیانوں میں... ندی نالوں میں جہاں وہ گائے بھینسوں کو لے جاتی ہیں۔ جنگل میں جہاں سے وہ لکڑیاں کاٹ کے لاتی ہیں اور جہاں سے وہ پانی بھرتی ہیں اس کنوئیں پر... وہ حیوان جو گلیوں بازاروں میں آدمی کا لباس پہنے دو ٹانگوں پر چلتا نظر آتا تھا، اپنی حیوانی شکل میں کہیں بھی مل جاتا تھا۔ اس کے اپنے باپ اور بھائی مختلف نہ تھے۔ اسے چھوڑ دیتے تھے مگر دوسروں کی بہن بیٹیوں کے ساتھ عام مرد تھے۔ وہ خود اپنی ماں کو بھی اسی استحصال کا شکار دیکھتی تھیں۔ پھر ان کے لیے یہ مقدر کی بات ہو جاتی تھی۔ جو سب کے ساتھ ہوتا ہے، وہی ہوا ہے۔ دکھ یا صدمہ کیسا۔ لکڑی جلانے کے لیے ہے تو جلتی ہے۔ درگاہ کا تجربہ شاید بہتر لگتا تھا انہیں کیونکہ وہاں ان کے ساتھ مریضوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا جس میں رحم اور ہمدردی کو دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ میں اپنے آپ کو الگ یا برتر کیسے ثابت کروں۔"

"بہت تلخ ہے تمہاری زندگی کا تجربہ۔"

"تلخ مجھے لگتا ہے جیسے تمہیں لگتا ہے کیونکہ میں عام لڑکی نہیں تھی۔ میری ذہانت میرا عذاب بن گئی۔ میں بہت حساس تھی اور اس طرح استعمال ہونا نہیں چاہتی تھی جیسے عورت ہو رہی تھی۔ ہر سطح پر، خواہ وہ میراثن ہو یا چودھرائن۔ چنانچہ میں نے اکبر کے رویّے پر احتجاج کیا۔ اس سے عزت مانگی۔ وہ بہت حیران ہوا میری باتوں پر۔ میں نے رفاقت اور اعتماد کی بات کی۔ گھر بنانے اور بچوں کو انسان کا بچہ بنانے کی بات کی تو وہ بھڑک گیا۔ ایک انتقامی ردِعمل کا شکار ہو کے اس نے مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میری ذلت کو اس نے کھیل بنا لیا جس میں اسے مزہ آتا تھا۔ اب میں تفصیل میں کیا جاؤں۔ اس نے عیاشی میں باپ کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ کیسی کیسی عورتیں آتی تھیں اور لائی جاتی تھیں۔ نہ اس کا کوئی معیار تھا اور نہ پسند... اور میں سب دیکھنے پر مجبور تھی۔ لیکن مجھے خود پر بھروسا تھا۔ جہاں میں انکار پر اڑ جاتی تھی تو اس کا جسمانی تشدد بھی میری نہ کو ہاں میں نہیں بدل سکتا تھا۔ مثلاً میں نے شراب پینے سے انکار کر دیا تھا اور نہیں پی۔"

"تم نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی۔"

"ہاں، میں جانتی تھی کہ میں پیر اظہر علی شاہ کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ مجھے بہت پہلے مار کے گاڑ دیتا کہیں... یہ میں نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ کسی گمان میں نہ رہنا... میرے پیچھے میرے وارث ہیں۔ میرا محافظ میرا باپ بھی ہے۔ وہ میرا خون معاف نہیں کرے گا۔ میں بھی ڈراتی رہتی تھی اسے ورنہ قتل تو آدمی اشتعال میں کرتا ہے اور اس وقت نتائج کے بارے میں نہیں سوچتا۔ یہ میں نے سمجھ لیا تھا کہ ایک دن بالآخر وہ مجھے مار دے گا اور اسی وقت سے میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اس بار بازی الٹ جائے گی۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنی ہے تو پھر یہ غلامی کی زنجیر کاٹنی پڑے گی جو نکاح سے بندھی تھی۔ میں نے مارنے کی نیت رکھنے والے کو مار دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے

مارتا۔ یہی بقا کا فارمولا ہے۔"

"کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں، اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا... یہ تو تمہارا ایک طرفہ فیصلہ ہے جو تم زبردستی مجھ پر بھی تھوپ رہی ہو کہ تمہاری اچھی اور مثالی زندگی صرف میرے ساتھ گزر سکتی ہے چنانچہ مجھے مزاحمت ترک کر کے تمہارے فیصلے کو قبول کر لینا چاہیے۔"

"ہاں، میری مجبوری ہے۔"

"مگر میری مجبوری کچھ اور ہے۔" میں نے کہا۔

"اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں... فائدہ ہے۔"

"فائدہ تم کہتی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں غلط تو نہیں کہتی۔ تم ایک خیال کے پیچھے زندگی خراب کرنا چاہتے ہو۔ نورین کا وجود ہوتا تو میں تمہیں نہ روکتی۔ لیکن وہ تو اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔ کب کی مر کھپ گئی۔ پھر میں تمہیں کیوں جانے دوں... اور میں بھی تمہیں اپنا غلام بنا کے رکھنا نہیں چاہتی۔ محبت کے ساتھ میں تمہیں وہ عزت بھی دوں گی جو میں اپنے پہلے شوہر کو نہ دے سکی۔ میرا جو کچھ ہے تمہارا ہوگا۔ یہ بڑے عیش آرام کی زندگی ہوگی۔ سب کچھ تمہارے پاس ہوگا اور تم کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاؤ گے نہیں۔ میں تمہیں ایک مثالی بیوی بن کے دکھاؤں گی۔ اپنا سب کچھ تمہارے نام بھی کر دوں گی اگر تم کہو گے۔ جو آج تمہیں زبردستی لگ رہی ہے، کل اپنی خوش قسمتی لگے گی۔ میرے ساتھ تم ایک قابلِ رشک زندگی گزارو گے۔"

"شاید تمہارا یہ خواب ہمیشہ خواب رہے۔"

"اس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے مجھے محنت کرنی پڑے گی۔ مجھے معلوم ہے، یہ آسان کام نہیں۔ لیکن آسان پسند میں کبھی نہ تھی۔ آسان کچھ نہیں ہوتا۔ آج تم میرے نہیں لیکن میں تمہیں اپنا بنا لوں گی... تم بدل جاؤ گے۔"

"نہیں، اب ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم مجھے بدلنے کے کیا طریقے اختیار کر رہی ہو... میں اب یہاں پانی بھی نہیں پیوں گا۔ چائے، کافی کچھ نہیں۔ میں بھوک سے مر جاؤں گا مگر یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"اچھا ابھی تو کھالو... میں تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔ اس میں کچھ نہیں ہوگا۔" وہ اٹھی اور میرے گلے میں جھول گئی۔ "چلو اٹھو... پھر مجھے جانا ہے۔"

ماسی اسی وقت کھانا لے کر اندر آئی۔

شاہینہ نے خفگی سے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے... تمہیں اندر آنے سے پہلے دستک دینی چاہیے۔"

کھانے کے بعد وہ مجھ سے یوں رخصت ہوئی جیسے نئی نویلی دلہن میکے جاتی ہے۔ اس کی وارفتگی میں عجیب دیوانگی تھی اور ایسی اپنائیت تھی جیسے یہ صرف خواہش کی بات نہیں۔ وہ مجھے اپنا چکی ہے۔ نہ وہ پریشان تھی اور نہ پشیمان۔ وہ خوش تھی اور بے حد مطمئن اور پُراعتماد۔

میں نے کہا۔ "آخر کب تک اس قید میں رہنا ہوگا مجھے؟"

"اسے قید کیوں سمجھتے ہو؟ کوئی تکلیف ہے تو بتاؤ؟"

"یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے؟ سارا دن میں کیا کروں؟ وقت کیسے گزاروں؟ بات کرنے والا بھی کوئی نہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "اچھا... کیا چاہیے تمہیں، کتابیں؟ ریڈیو اور ٹی وی... فون مت مانگنا۔ باقی سب کر دوں گی تمہاری وقت گزاری کے لیے۔ اور یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ مجھے بھی جب موقع ملے گا، میں آجاؤں گی۔ بس اب تم مجھ سے محبت کرنا سیکھ لو۔ میں اتنی بری عورت بھی نہیں ہوں۔ صرف خوب صورتی کی بات نہیں۔ ایسی کون ہے جو تم پر یوں فریفتہ ہو، تمہیں پوجتی ہو... اور ملے گی بھی کہاں؟" اس نے مجھے چوما اور نکل گئی۔

میں کسی شکست خوردہ سپہ سالار کی طرح محاذِ جنگ پر بیٹھا رہ گیا جس کی طاقت اور فتح مندی کا غرور خاک میں مل گیا ہو۔ اس نے مجھے ایک بار پھر بتا دیا تھا کہ وہ بھی جواری ہے لیکن صرف جیت قبول کرتی ہے خواہ اس کے لیے وہ تمام غیر اخلاقی حربے، ہتھکنڈے اور داؤ استعمال کرتی ہو۔ میں جتنے دعوے رکھتا تھا، باطل ہوئے تھے اور وہ مجھے مستقبل کے لیے چیلنج دے کر گئی تھی کہ کچھ کر سکتے ہو تو کر کے دکھاؤ ورنہ خود کو میرے سپرد کر دو۔ میں تو بالآخر تمہیں حاصل کر ہی لوں گی۔

اپنی ہار اور بے بسی کے ساتھ مجھے ایک عورت کی للکار نے اندرونی ہیجان اور اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ میرے وجود میں غصہ بھرنے لگا اور بالآخر میں آتش فشاں کی طرح پھٹ گیا۔ "الو کی پٹھی... فاحشہ... مجھے خریدے گی؟ کیا ہوں میں... اس کے استعمال کی چیز... بڑا غرور ہے اسے اپنی قوتِ خرید پر... کیا اتنا آسان حاصل سمجھتی ہے وہ مجھے؟ ہوس کو محبت کا نام دے کے یہ چاہتی ہے کہ میں بھی مانوں؟ دیکھ لوں گا میں بھی... جھوٹے اور باسی کھانے کی طرح کتوں کے آگے نہ ڈالا تو اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔ شیطان کی ناجائز اولاد... وہ مجھے بدلے گی؟... میرے دماغ پر

کنٹرول حاصل کرے گی؟ روبوٹ کی طرح مجھ میں اپنی محبت ڈالے گی؟ غلام کو خصم کا نام دے کر دنیا کو دکھائے گی۔ اپنا گھر... اپنے بچے اور مثالی بیوی کا روپ...؟

یہ اس غلیظ، نفرت بھرے لاوے کا کچھ صاف ستھرا نمونہ ہے جو میں نے اگلا... اصل بہت فحش گالیوں کا مرکب تھا۔ اس کے ساتھ میں نے چیزیں اٹھا کے پھینکیں اور توڑیں۔ شامتِ اعمال سے بڑی بی اسی طوفان میں میرے لیے چائے لے کر آگئیں اور میرے غیظ و غضب کا نشانہ بنیں۔ میں نے فلائنگ کک مار کے ٹرے کو اڑا دیا اور اس کی عمر اور مجبوری کا خیال کیے بغیر چڑیل اور شیطان کی چیلی وغیرہ بھی کہا۔ وہ بھاگ گئی اور شاید کچھ دیر کے لیے باہر نکل گئی۔

جب میرا دماغ ٹھکانے آیا تو میں ردِعمل کا شکار ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ میں کیا کر رہا تھا اور کیوں؟ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ اعصابی کمزوری اور دیوانگی ازخود میری بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میرا اپنے دماغ اور ارادے پر کنٹرول ہوتا تو میں سکون سے بیٹھ کے جوابی حکمتِ عملی بناتا۔ وہ طریقہ سوچتا جن سے میں بچ سکتا تھا اور شاہینہ کے عزائم کو ناکام بنا سکتا تھا۔ شاید میرا اعتماد متزلزل ہو چکا ہے اور اب یہ خوف غالب ہے کہ وہ جیت جائے گی اور میں ہار کو بھی ہنسی خوشی تسلیم کر لوں گا۔

ایک گھنٹے بعد میں باہر نکلا تو بڑی بی مجھے کچن میں بیٹھی نظر آئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا رکھا تھا۔ اب مجھے اس پر ترس آیا اور اپنی بدتمیزی پر زیادہ شرمندگی ہوئی۔ وہ صرف حکم کی غلام تھی۔ تعمیل نہ کرنے کی سزا جانتی تھی۔ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے والی وہ نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ اور سہم گئی۔

''سائیں! میرا کوئی قصور نہیں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور کانپتے ہوئے بولی۔ ''آپ مجھ بڑھیا کو مار کے کیوں گناہ گار ہوتے ہو؟''

میں نے اس کے پاس جا کے نرمی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ''مجھے معاف کر دو۔ میں پاگل ہو گیا تھا کہ تم کو بُرا بھلا کہا۔ تم میری ماں کے برابر ہو۔''

اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہم بڑے مجبور لوگ ہیں سائیں۔ آپ کو بھی حق ہے ہمیں جوتے مارو۔ ہماری عزت اتارو۔''

''نہیں اماں، ایسا بندہ نہیں ہوں میں۔ شیطان غالب تھا مجھ پر۔ غصہ کسی اور کا تھا جو تم پر اترا۔ مجھے معاف کر دو۔ بڑا گناہ کیا میں نے۔''

وہ رفتہ رفتہ پُرسکون ہو گئی لیکن میرے رویے نے اسے حیرانی میں ڈال دیا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ میں نشے میں نہیں تو پھر مجھ پر جنون کے ایسے دورے پڑتے ہیں۔ آگے کا کیا پتا۔ ابھی معافی مانگ رہا ہوں۔ میرے جیسے عزت دار کسی کمی کمین سے کبھی مانگ نہیں سکتے۔ کل کو پھر میرا دماغ الٹا تو میں اس کی عزت پھر دو کوڑی کی کر دوں گا۔ لیکن معاف کرنا بھی اس کی مجبوری تھی۔

میں واپس آتے وقت کہنا چاہتا تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کچن کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ چائے، کافی بھی نہیں پیوں گا لیکن پھر ایک خیال سے رک گیا۔ یہ اعلان کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے اور اس سے فائدہ نہیں الٹا نقصان ہوگا کہ خبر فوراً شاہینہ تک پہنچا دی جائے گی۔ اپنے فیصلے پر قائم رہنا آسان نہ تھا۔ اس وقت بھی مجھے کافی کی طلب تھی۔ میں نے خود کو کمرے کی صفائی میں مصروف کیا اور دن ڈھلنے تک چھت پر ٹہلتا رہا۔ میں نے ہر طرف سے جائزہ لیا کہ آنکھوں میں دھول جھونک کے نکلنے کی کتنی گنجائش ہے اور محافظوں سے نمٹنے کے بعد زندہ سلامت نکلنے کی کتنی۔ صورتِ حال زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی لیکن ناامیدی سے بھی فائدہ نہ تھا۔

بڑی بی نے ڈرتے ڈرتے رات کا کھانا پہنچایا۔ کھانے کو چھوڑا جا سکتا تھا لیکن پانی پیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے پانی کو چکھا۔ اس کا ذائقہ نارمل تھا۔ شاید اس میں کچھ ملانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی دوا کے ذائقے کو سالن میں دبانا آسان ہوگا۔ اس میں مرچ مسالوں کا ذائقہ اور خوشبو سب پر غالب آ جاتا ہے۔ ایک گلاس بھر پانی پینے کے بعد میں نے سارا کھانا ایک شاپنگ بیگ میں ڈالا اور اندھیرے میں چھت پر جا کے دور پھینک دیا۔ اس کے معمولی سے دھماکے نے ایک پہرے دار کے کان کھڑے کیے۔ اس نے تیز روشنی والی ٹارچ لائٹ کو آواز کی طرف گھمایا اور شاید یہ سوچ کے مطمئن ہو گیا کہ کوئی جانور ہوگا۔

رات کو نیند مجھ سے روٹھ گئی۔ خالی پیٹ فریاد کرنے لگا اور میں عجیب سی بے کلی کا شکار ہو گیا۔ بھوک سے زیادہ یہ دوسری دواؤں کی طلب تھی۔ نشہ کرنے والے کی حالت زیادہ خراب ہوتی ہے۔ اس کا جسم نشہ مانگتا ہے اور اس کی اذیت کو صرف نشے کی ایک خوراک ختم کر سکتی ہے۔ سکون آور یا ذہن پر اثرانداز ہونے والی ہر دوا سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے۔ سونے کی کوشش میں ناکام ہو کے میں نے سوچا

کہ ایک رات گزار بھی دی تو اگلا دن ہے اور پھر اگلی رات۔ کیا اب تک جو تھوڑا بہت حوصلہ باقی ہے، یہ بھی ہوگا؟ نہیں، مجھے آج اور ابھی کرنا چاہیے جو کرنا ہو۔

میں دبے پاؤں چھت پر گیا۔ یہ مستطیل چھت تھی جس کا سامنے والا حصہ کم چوڑا تھا۔ پیچھے یہ چھت تقریباً دگنی لمبائی تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق سامنے کا حصہ چالیس فٹ چوڑا تھا تو پیچھے کا اسّی فٹ لمبا تھا۔ محافظ ایک ہی رفتار سے اس کے چاروں طرف گشت کر رہے تھے۔ اس میں ریاضی کا ایک نکتہ قابلِ غور تھا۔ چالیس فٹ کی چوڑائی سے ایک محافظ گشت کا آغاز کرتا تھا تو اسی فٹ تک سیدھا جاتا تھا۔ پھر دوسرا ٹرن آتا تھا۔ جب ایک کونے کا محافظ آدھی لمبائی طے کر لیتا تھا تو دوسرا محافظ اس کی جگہ پہنچتا تھا۔ پھر وہ بھی اسّی فٹ کے سفر پر روانہ ہو جاتا تھا۔ درمیان کا وقفہ ایسا تھا جب دونوں محافظ ایک ہی سمت میں ہوتے تھے۔ پہلا چالیس فٹ آگے... دوسرا چالیس فٹ پیچھے... ایسی ہی صورتِ حال دوسری طرف ہوتی تھی۔ ایک مختصر وقت کے لیے سامنے کا اور پیچھے کا حصہ کسی محافظ کی نظر میں نہیں رہتے تھے۔ دو محافظ ایک طرف کی لمبائی کو طے کرتے تھے۔ دو دوسری طرف۔ اور آگے والوں کو مزید چالیس فٹ آگے جا کے موڑ کاٹنا تھا۔ وہ کتنی دیر میں چالیس قدم اٹھاتے ہیں؟ میں نے نبض پر ہاتھ رکھ کے دیکھا۔

نبض کی رفتار سے سامنے وقت کا اندازہ لگایا۔ لمبائی کے رخ سفر کرنے والا گارڈ اسّی فٹ کا فاصلہ تقریباً چار منٹ میں طے کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سامنے کا حصہ جو گیٹ کے سامنے تھا، دو منٹ کے لیے خالی تھا۔ چھت پر کوئلے پڑے تھے۔ میں نے نقشہ بنا کے حساب لگایا کہ کون سا گارڈ کتنی دیر میں کہاں ہوگا۔ وہ کلاک وائز حرکت کر رہے تھے یعنی بائیں سے دائیں چل رہے تھے۔ حساب درست تھا۔ مجھے دو منٹ دستیاب تھے جو میرے خیال میں کافی تھے۔ اگر میں چادریں پھاڑ کے کوئی رسّی بناتا اور اس سے لٹک جاتا تو چند سیکنڈ میں نیچے ہوتا۔ دیوار کو پھاندنے تک ایک منٹ پورا ہو جائے تو ایک منٹ میں خود کو گم کرنا بھی مشکل نہ تھا۔

گم ہونے کے لیے گھر کے بالکل سامنے تھوڑے بہت درخت تھے اور کچھ جھاڑیاں۔ کھیت سو گز کے بعد تھے اور فصل کی اونچائی تین فٹ تھی۔ اس میں جھک کر چلنا یا چاروں ہاتھوں پیروں پر جانا بھی آسان تھا۔ گردوپیش کے جغرافیے کو ذہن نشین کرنے کے بعد مجھے فرار مشکل نہ لگا اور مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کام کو اب تک التوا میں کیوں رکھا۔

میرے اندازے کے مطابق رات آدھی گزر چکی تھی۔ بڑی بی آج بھی کچن کا دروازہ بند کر کے سوئی تھی۔ شاید ڈر سے کنڈی بھی لگالی ہو۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور بیڈ شیٹ کھینچ لی۔ اس کی چوڑائی کچھ کم تھی۔ شاید سات فٹ اور لمبائی ایک فٹ زیادہ۔ میں نے چھ انچ چوڑی پٹی پھاڑنے کی کوشش کی مگر کنارے سلے ہوئے تھے اور یہ

کام آسان نہ تھا۔ چاقو چھری یا قینچی جیسی وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ باتھ روم سے مجھے پرانے استعمال شدہ بلیڈ مل گئے۔ میں نے چھوٹا سا کٹ لگا کے آٹھ فٹ لمبی پٹی پھاڑی۔ حساب کے مطابق اس میں سے چودہ پٹیاں نکالی جا سکتی تھیں۔ چھ انچ چوڑی اور آٹھ فٹ لمبی۔ ان کو ملا کے باندھتا تو کل لمبائی سو فٹ سے زیادہ ہو جاتی جبکہ مجھے مشکل سے چوبیس فٹ کی رسّی درکار تھی۔ مضبوطی کی خاطر میں نے چوڑائی دگنی کر دی اور ایک سمت کی پٹیاں پھاڑ لیں۔ ان کو باہم گرہ دے کر مضبوطی آزمائی اور مطمئن ہو گیا۔

میں دوبارہ چھت پر گیا تو اس عزم کے ساتھ کہ اب واپس نہیں آنا۔ چھت کے چاروں طرف چار فٹ کا کٹہرا تھا جس میں چھ چھ انچ کے فاصلے سے خوب صورتی کے لیے پائے لگائے گئے تھے۔ کسی پائے سے رسّی باندھ کے سارے وزن کے ساتھ لٹکنا غیر محفوظ تھا۔ پایہ ٹوٹ جاتا یا نکل جاتا تو میں سیدھا فرش پر گرتا اور ساتھ ہی پایہ میرے سر پر آتا۔ ایک کونے میں بجلی کا کھمبا موجود تھا جس پر مین لائن سے تار لا کے نیچے میٹر تک اتارے گئے تھے، یہ سب سے اچھا سہارا تھا۔

آسمان پر نصف کے قریب چاند روشن تھا۔ اب میں نے غور سے محافظوں کی نقل و حرکت کو دیکھا۔ رات بھر گردش کرنا ایک بیزار کن اور تھکا دینے والا عمل تھا۔ خصوصاً اس وقت جب خطرہ غیر یقینی ہو اور محسوس بھی نہ ہوتا ہو۔ صرف کوئی روبوٹ ہی مشین کی طرح مستعد اور چوکس رہ سکتا ہے۔ یہ محافظ بھی سو فیصد الرٹ نہیں تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نے رک کر دوسرے کے قریب آنے کا انتظار کیا اور اس سے جلتی سگریٹ لے کر اپنی سگریٹ سلگائی۔ کچھ کہا اور سست رفتاری سے آگے چل پڑا۔ دوسرے نے اس کے کونے تک پہنچنے کا انتظار کیا تو پیچھے سے تیسرا آ پہنچا۔ انہوں نے بھی کوئی بات کی اور اپنے وقفے کو برابر کرنے میں انہیں کچھ وقت لگا۔

اگر میں انتظار کرتا تو مجھے دو منٹ سے کہیں زیادہ کی مہلت مل جاتی۔ محافظ جو ڈیوٹی دے رہے تھے، انتہائی مشکل تھی۔ صرف چلتے رہنا۔ مسلسل اور ایک ہی رفتار سے۔ کچھ کھائے پیے بغیر۔ آرام کے وقفے کے بغیر۔ کھانا پینا کچھ نہیں۔ تھکان دور کرنے کے لیے چائے تک نہیں۔ بے چارے مجبور لوگ حکم کی تعمیل کے پابند تھے۔ اس طرح چار کا ایک گروپ زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے تک ڈیوٹی پر رہتا ہو گا۔ صبح سے شام تک کے محافظ الگ ہوں گے۔ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہو گا۔ لاحول ولاقوۃ۔ مجھے یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔

رات کے آخری پہر میں تھکن کا غالب آنا ایک فطری بات تھی۔ وہ اب چل نہیں رہے تھے۔ ٹہل رہے تھے۔ ان میں ہمت نہ تھی کہ آسانی پیدا کرنے کے لیے دو گشت کریں اور دو آرام... یا ہر ایک دو گھنٹے کے بعد بیٹھ کر تھکن دور کر لیں۔ کسی بھی کوتاہی کی سزا کیا ہو گی، یہ خیال انہیں ڈراتا تھا اور وہ چلتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں کسی وقفے کا انتظار کروں... پھر مجھے ایک طریقہ سوجھا۔

میں پیچھے گیا اور منڈیر پر سے آدھی اینٹ کا ٹکڑا اکھاڑ لیا۔ ایک جگہ سے فصیل ٹوٹی ہوئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے نشانہ لے کر وہ ٹکڑا سب سے پیچھے کونے پر موجود محافظ کو مارا۔

میں نے نشانہ سر کا نہیں لیا تھا۔ اوپر سے آنے والی اینٹ سے سر پھٹ جاتا۔ آدھی اینٹ اس کے شانے پر لگی اور وہ درد سے بلبلایا۔ مجھے یقین تھا کہ آگے جانے والا اس واویلے پر پلٹ کر دوڑے گا کہ ساتھی پر کیا آسمان گر گیا۔ اسی طرح چالیس قدم پیچھے جانے والا آگے دوڑ لگائے گا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی کی درد بھری آواز کا نوٹس لیے بغیر چلتے جائیں۔ جتنی دیر میں ان کو پتا چلے گا کہ اسے کسی نے اوپر سے اینٹ کا ٹکڑا پھینک کے مارا ہے، تین محافظ ایک جگہ اکٹھے ہوں گے۔ چوتھا بھی نظر سے اوجھل ہو گا۔ صورتِ حال کو سمجھ کے وہ ڈیوٹی پر دوڑ لگائیں گے۔ اس دوران پانچ منٹ تو گزر ہی جائیں گے۔

گارڈ کی آہ و بکا بلند ہوتے ہی میں نے دوڑ لگائی اور چھت کے کونے سے لٹکنے والی رسی پر جھول گیا۔ ایک بندر جیسی پھرتی اور مستعدی کے ساتھ میں ہاتھ پیر چلاتا نیچے گیا۔ ہر گانٹھ میری مددگار تھی۔ میں ایک کو پکڑتا تھا تو دوسری سے پیروں کو سپورٹ مل جاتی تھی۔ قدم نیچے لگتے ہی میں دیوار کی طرف لپکا اور ہاتھ اٹھا کے باقی جسم کے وزن کو بھی اوپر کھینچا۔ اس تمام وقفے میں میرے کان مسلسل ان آوازوں پر لگے رہے جو رات کی خاموشی میں صاف سنائی دیتی تھیں۔

نشانہ بننے والے گارڈ نے ہائے ہائے کرتے ہوئے بتایا کہ اس کو کسی نے اوپر سے اینٹ ماری ہے یا کٹہرے کی دیوار اکھڑ کے گری ہے۔ دوسرے نے چلا کے کہا۔ ”کہاں چوٹ لگی ہے؟“

تیسرے نے کہا۔ ”سر میں لگتی تو سر پھٹ جاتا۔“

پہلے نے انہیں گالی دی۔ ”اوئے... آگے جا کے

دیکھو... جس تمہاری ماں کے یار نے اینٹ پھینکی... وہ بھاگ تو نہیں گیا اور کون ہے اندر اس کے سوا... بڈھی مائی تو سوئی پڑی ہو گی۔“

میں دیوار بھی پھاند گیا تھا اور ابھی آگے کی طرف لپکنے والے دور تھے۔ شانے پر اینٹ کا وار سہنے والا بیک وقت کسی تکلیف سے چیخ پکار الگ کر رہا تھا اور گالیوں کے ساتھ ہدایات بھی جاری کر رہا تھا۔ ”جو نظر آئے گولی مارو... ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔“ وہ غالباً باقی تین کو کمانڈ کرتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میرے اندازے درست ہیں اور میرے پاس کافی وقت ہے کہ دیوار سے باہر اتر کے سیدھا جاؤں اور درختوں، جھاڑیوں کے پیچھے رہ کے آگے بڑھوں تو کھڑی فصل میں گم ہو جاؤں۔ یقیناً وہ میرے پیچھے آئیں گے۔ کوئی میری پکڑ میں آ گیا تو دبوچ لوں گا اور ناک آؤٹ کر کے وہیں ڈال دوں گا۔ پھر اس کا اسلحہ بھی میرے پاس ہو گا۔

لیکن یہ غیب کا علم تھا۔ اس پر یقین اور بھروسا کرنا ہی مجھے مہنگا پڑ گیا۔ چار میں سے ایک گارڈ سب سے پیچھے تھا۔ اس نے بھی اپنے نظر نہ آنے والے ساتھی کا واویلا سنا۔ اسے وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ خطرے کو سمجھنے میں اس کی عقل دوسروں جیسی نہیں تھی۔ آگے جانے کے بجائے وہ وہیں سے پلٹ گیا اور میں نے اچانک اس کی وارننگ سنی۔ ”رک جاؤ... میں گولی مار دوں گا۔“

اب پلٹ کر دیکھنے میں مزید ایک سیکنڈ ضائع ہوتا۔ میں خطرے کی آگ میں کود چکا تھا۔ واپسی کا سوچنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں سیدھا دوڑا۔ میرا رخ ایک درخت کے ساتھ ملی ہوئی جھاڑی کی طرف تھا۔ اچانک دھماکا ہوا اور میری ٹانگ میں انگارہ اتر گیا۔ میں لڑکھڑا کے گرا اور پھر اٹھ کے بھاگا۔ دوسرے فائر کی آواز آئی۔ اس وقت میں درخت کے پیچھے تھا لیکن اب میرے تعاقب میں ایک نہیں تین مسلح گارڈ تھے۔ دو فائر اور ہوئے جو نہ جانے کسے لگے۔ پہلی گولی چلانے والے نے باقی دو ساتھیوں کو بتا دیا کہ قیدی فرار ہوا ہے۔ ان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ مجھ سے تیز دوڑے اور ایک نے آگے جا کے مورچا جما لیا۔ دو میرے دائیں بائیں جھاڑیوں کے پیچھے سے مجھے خبردار کرنے لگے۔ ”بھاگنے کی کوشش مت کرو۔ ہم گولی مار دیں گے۔“

”باہر آ جاؤ۔ تم کہیں نہیں جا سکتے۔“

میں نے پنڈلی کے زخم کو چھو کے دیکھا تو میرا ہاتھ اپنے ہی خون سے بھر گیا۔ اتنا اندازہ مجھے ہو گیا کہ گولی نے گوشت ادھیڑا ہے۔ ہڈی کو نہیں توڑا۔ ایک ٹانگ سے میں کہاں جاتا۔ کچھ دیر میں زیادہ خون بہہ جانے سے میں خود ہی گر جاتا۔ شدید مایوسی کے ساتھ میں نے کہا۔ ”گولی مت چلانا، میں خالی ہاتھ ہوں۔ باہر آ رہا ہوں۔“

دوروٹی کا سوال ہے بابا!

انہوں نے مجھے تین طرف سے دبوچ لیا۔ دو نے میرے دونوں ہاتھ قابو کیے۔ تیسرا میرے پیچھے یوں چل رہا کہ بندوق کی نال میری کمر میں چبھتی رہی اور احساس دلاتی رہی کہ موت مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر ہے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا۔ چند منٹ بعد میں پھر وہیں تھا جہاں سے آزادی کے لیے نکلا تھا۔ بیڈ پر اب چادر کی جگہ ایک فٹ چوڑا ٹکڑا رہ گیا تھا۔ مجھے بستر پر ڈال کے ایک مجھ پر بندوق تانے کھڑا رہا۔ دوسرا باہر گیا اور بڑی بی کو جگا کے لوٹا تو اس کے پاس پانی کا جگ تھا۔ خون بہہ کر بیڈ کو خراب کر رہا تھا۔ اس نے پانی کا جگ زخم پر ڈالا اور پھر چادر کے باقی ماندہ ٹکڑے سے پٹی پھاڑ کے اپنی عقل اور مہارت کے مطابق زخم کو اوپر نیچے سے باندھ دیا۔ کسی نے میرے ساتھ بداخلاقی یا بدکلامی نہیں کی۔

”ابھی آپ صبح تک ٹھہرو ادھر۔“

”صبح کیا ہو گا؟“ میں نے تلخی سے کہا۔

”جو آرڈر ہو گا۔ ڈاکٹر ادھر آئے گا یا آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے گا۔“ اس نے کہا جس کے شانے پر اینٹ لگی تھی۔ وہ اب بھی تکلیف میں تھا۔

زخم بڑا اور گہرا تھا۔ شاید گولی نے پنڈلی کے گوشت کو پھاڑا تھا اور دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ زیادہ خون بہہ جانے سے میری خودکشی مکمل نہ ہو جائے۔ میں نے نرسنگ کرنے والے کو ہدایات دیں کہ زخم کو اوپر سے کس کر باندھے اور پیر کو اوپر اٹھا کے رکھے۔ اس سے رساؤ کم ہوا مگر بند نہیں ہوا۔ مجھے کچھ دیر بعد کمزوری محسوس ہونے لگی۔

میں نے کہا۔ ’’صبح کا انتظار مت کرو۔ ابھی لے کر چلو مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس۔‘‘

انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور خاموش رہے جس کا مطلب صاف تھا کہ میرے حکم پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ مجھے اپنا سر بھاری اور کمرا گھومتا ہوا نظر آیا۔ افسوس یہ ہے کہ مجھے کلمہ پڑھنے کا خیال نہیں آیا حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ میں مر رہا ہوں۔

دوبارہ زندگی کا یقین آیا تو میں کسی اور جگہ تھا۔ یہ دوسرا بیڈ تھا جس پر میں سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ یہ کمرا بھی وہ نہیں تھا۔ یہ کمرا بہت چھوٹا تھا اور اس میں صرف ایک چھوٹا سا بیڈ تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ دروازہ بھی بند تھا اور چھت سے لگا ساٹھ واٹ کا بلب اپنی بیمار روشنی پھیلا رہا تھا۔ مجھے میلی دیواروں پر جالے نظر آئے اور کچھ دیر بعد میں نے ایک چھپکلی کو دیوار پر رینگتا دیکھا۔ وہاں عجیب سی بو تھی۔ میرا لباس بدلا ہوا تھا۔ میں نے نہ جانے کس کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ میری ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جب میں نے اٹھنا چاہا تو مجھے شدید کمزوری کا احساس ہوا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آزادی کے حصول میں ناکامی کے بعد مجھے ایک زنداں سے دوسرے میں منتقل کر دیا گیا ہے اور کچھ بھی بدلا نہیں ہوگا۔ اطلاع شاہینہ کو ملی ہوگی تو اس نے بھی فیصلہ صادر کیا ہوگا کہ اس باغی کو اب کہاں رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کسی قیدی کو اعتماد کی بنیاد پر سہولتیں فراہم کی جائیں اور وہ ناجائز فائدہ اٹھائے تو ایک سزا یہی ہوتی ہے کہ اس سے ہر سہولت واپس لے لی جائے۔ میری ایک خاص حیثیت تھی۔ میں شاہینہ کے پیار کا قیدی تھا اور خرابی یہ تھی کہ زنجیر میں نے خود نہیں پہنی تھی۔ شاہینہ مجھے زبردستی باندھ کے رکھنا چاہتی تھی۔ میرا بھاگنے کی کوشش کرنا بھی بے سبب نہ تھا۔ میں نورین کے خیال سے بندھا ہوا تھا اور یہ عشق تو محبت کے اعتبار سے عشقِ حقیقی جیسا تھا۔ غائبانہ اور عقیدے کی طرح... میں کسی طرح یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ نورین کا اب کوئی وجود نہیں۔ سوائے میرے دماغ کے... اور وہ گم گشتہ ماضی کی ایک یاد ہے۔ شاہینہ کی ہر ممکن کوشش کے باوجود میرا ذہن اس خیال کو قبول نہیں کرتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

جیسے شاہینہ میرے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی ایسے ہی نورین اب شاہینہ کے لیے ایک چیلنج بنتی جا رہی تھی۔ مجھے رفتہ رفتہ اسیری کے ختم ہو جانے والے دور کی ہر بات یاد آئی۔ آزادی حاصل کرنے کی کوشش محض اس لیے ناکام رہی کہ قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ قسمت ساتھ نہ دے تو کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔

میرے پاؤں کے زخم میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس کی ڈریسنگ بھی بہت اچھی طرح ہوئی تھی۔ میرے زخمی ہونے کا واقعہ بہت زیادہ پرانا نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید درمیان میں ایک دن ہوگا جب مجھے اپنی خبر نہ تھی اور اس حالت میں مجھے وہاں سے نکال کے یہاں پہنچا دیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسی گھر میں لیکن کسی اور کمرے میں پہنچا دیا گیا ہو۔ اس گھر کے زیادہ تر کمرے بند تھے۔ یہ اس گھر کا کوئی اسٹور بھی ہو سکتا تھا۔

دروازہ کھلا اور ایک تنومند شخص اندر آ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’میں ڈاکٹر حکیم ہوں۔‘‘ اور اپنا بیگ نیچے رکھ دیا۔

’’یعنی حکیم بھی اور ڈاکٹر بھی؟‘‘

’’حکیم میرا نام ہے۔ عبدالحکیم۔‘‘ اس نے میری ٹانگ پر بندھی پٹی کو کھولنا شروع کیا۔ معائنہ کرنے کے بعد اس نے دوا لگائی اور نئی ڈریسنگ کی۔ ’’زخم بہت بہتر ہے۔‘‘

’’کتنے دن لگیں گے اسے ٹھیک ہونے میں؟‘‘

’’ایک ہفتہ... میرا خیال ہے ایک ہفتے بعد تم چلنے پھرنے لگو گے۔ انجکشن کی جگہ اب میں گولیاں دے رہا ہوں۔ وہ کھاتے رہو۔‘‘ وہ بات یوں کرتا تھا جیسے حکم دے رہا ہو۔ اس سے کچھ پوچھنا لاحاصل لگتا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس کی قید میں ہوں۔ جگہ کا انتخاب بھی شاہینہ کا ہوگا اور معالج کا بھی۔ اس کو کچھ پتا نہیں ہوگا اور ہوا تو وہ بتائے گا کہاں۔ میرے سرہانے رکھی چھوٹی سی میز پر پانی کا جگ اور ایک گلاس رکھا تھا۔ وہ گولیاں وہیں رکھ کے چلا گیا۔ یقین کرنے کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس معمولی زخم کی وجہ سے میں ایک ہفتہ بے ہوش رہا یا مجھے بے ہوش رکھا گیا۔ میں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ کوئی بات مجھے صحیح نہیں لگتی تھی۔ جو مریض کھا پی نہ سکے اور بے ہوشی کی کیفیت میں ہو اسے مائع خوراک یعنی گلوکوز کی ڈرپ دی جاتی ہے۔ میرا معمولی زخم تھا اور مجھے کسی اسپتال لے جانا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ مجھے اس چھوٹے سے کمرے میں ڈال دیا گیا تھا جو اسی گھر میں تھا یا کہیں اور... یہ گزری ہوئی رات کی بات ہی ہوگی ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں بے ہوشی میں کھاتا پیتا رہا۔

مجھے بہت زیادہ غور فرمانے کی مہلت نہیں ملی۔ اس ڈاکٹر کے جانے کے کچھ دیر بعد دو افراد دروازہ کھول کے اندر آئے۔ یہ انہی محافظوں جیسے تھے جن کا پہرا توڑ کے میں نے فرار کی ناکام کوشش کی تھی۔ میری منصوبہ بندی غلط نہ تھی۔ اندازے غلط ہو گئے جو اس دلیل کو درست ثابت کرتے تھے کہ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ... وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ ایک بندے نے ویسا نہیں سوچا جیسا میں نے سوچا تھا کہ وہ سوچے گا۔

دونوں اندر آنے والوں میں سے ایک نے مؤدبانہ کہا۔ ’’چلو سائیں! ہم آپ کو لے جانے کے لیے آئے ہیں۔‘‘

مجھے یوں لگا جیسے ابھی تک میں سکھر کی کال کوٹھری میں اس صبح کا منتظر تھا جب جیل کے وارڈن اندر آ کے مجھ سے یہی بات کہیں گے۔

میں نے کہا۔ ’’کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے... اور کیوں؟‘‘

’’ہم کو حکم ہے۔‘‘

’’کس کا حکم ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

جواب دینے کے بجائے ان دونوں نے مجھے کندھے پر بغل میں ہاتھ دے کر اٹھا لیا۔ میں ایک پاؤں اب بھی زمین پر نہیں رکھ سکتا تھا چنانچہ دوسرا بھی اٹھانے پر مجبور تھا۔ باہر آتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں پیر سائیں کی درگاہ پر ہوں۔ ایک گلی جیسے کاریڈور کے اوپر روشن دان میں سے دھوپ کے ساتھ باہر قلندروں اور ملنگوں کے نعرے لگانے کی اور ڈھول ڈھمکے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

پیر سائیں کے ڈیرے کو میں نے یا تو باہر سے دیکھا تھا یا پھر کچھ دن اس کے تہ خانے میں گزارے تھے... مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اس عالی شان درگاہ کا پھیلاؤ کتنا ہے اور اس کے کتنے حصے اور کتنی منزلیں ہیں... یہ کسی حد تک ملتان کے مزارات جیسی تھی..... اس کا آخری حصہ بہت لمبا چوڑا پلیٹ فارم تھا... درمیان میں گنبد والی عمارت اسی طرح اٹھائی گئی تھی جیسے مزار قائداعظم کا مرکزی حصہ ہے لیکن اس کی بلندی کم تھی... اس کے چاروں طرف محرابی دروازوں والا برآمدہ تھا۔ مریدوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ آمدنی بڑھ رہی تھی اور اسی طرح درگاہ کی شان و شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سے مریدوں پر درگاہ کی عظمت کا دبدبہ قائم ہوتا تھا۔

اب مجھے جس کمرے میں شفٹ کیا گیا، وہاں آسائش اور آرام کے تمام لوازمات تھے۔ ضرور یہ کسی مہمان خانے کا حصہ ہوگا جہاں وی آئی پی یا خود پیر صاحب قیام فرماتے ہوں گے۔ ان کے اپنے گھر کا رہائشی حصہ درگاہ سے بالکل الگ تھا اور میرا تجربہ تھا کہ اس عمارت کے گرد کتنا مضبوط حصار تھا۔ آزادی کے حصول کی ایک کوشش کی ناکامی نے میرا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ فوری طور پر میں نے یہ خیال ہی ترک کر دیا تھا۔ ڈیڑھ ٹانگ کا آدمی بھاگنے کا کیسے سوچے۔ مجھے تو اب شاہینہ کا انتظار تھا۔ اب وہ کیا کہتی ہے اور کیا کرتی ہے۔

میرے کپڑے بہت صاف ستھرے تھے اور مجھے یہاں لانے والے ملازمین کا رویہ بھی بہت احترام کا تھا۔ اس پُرتکلف بیڈ روم میں کسی ہوٹل کے ڈی لکس سوئٹ والا نقشہ تھا۔ بیڈ کے عین مقابل ٹی وی لگا ہوا تھا جو ذرا دائیں جانب دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ کے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ سیون سیٹر صوفے کا بڑا حصہ کسی کھڑکی کے ساتھ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اسی کی سیدھ میں کمرے کے آخری کونے میں ایک فریج رکھا ہوا تھا۔ باتھ روم میرے دائیں ہاتھ پر چند فٹ دور تھا۔ ٹی وی کا ریموٹ تکیے کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اسے آزمانے کے لیے چلایا اور بند کر دیا۔

سرہانے کے پیچھے ایک کال بیل کا سوئچ لٹک رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ طلب کرنے پر کوئی آتا ہے یا نہیں، میں نے اس کا بٹن بھی دبا دیا۔ اب مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں نے بزر کی ہلکی سی آواز سنی ہے۔ عموماً یہ سوئچ کچن سے منسلک ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ ایک منٹ بعد ایک گوری چٹی عورت نمودار ہوئی جس کے نقوش میں نسوانیت کی کشش ازخود بولتی تھی۔ وہ پینتیس چالیس سال کی ساڑھے پانچ فٹ سے زیادہ قد کی عورت سفید شلوار قمیص اور دوپٹے میں تھی۔ دوپٹے کو اس نے شانے پر لٹکا رکھا تھا کہ نمائش کے اسباب پر کوئی پردہ نہ رہے۔ جو ہے حاضر ہے۔

’’حکم سائیں!‘‘ وہ میرے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔

میں نے سوچ کے کہا۔ ’’کھانے میں کتنی دیر ہے؟‘‘

’’ایک گھنٹا تو ضرور لگ جائے گا سائیں۔‘‘

مجھے واقعی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ’’اچھا... پھر مجھے کافی لا دو اور اس کے ساتھ بسکٹ۔‘‘

وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ ثابت ہو گیا تھا کہ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ کافی دس منٹ میں آ گئی جو بہت اچھی تھی۔ سکون کے باوجود میرے انداز میں اضطراب تھا۔ یہ جاننے کی خواہش کہ آگے کیا ہوگا، میرے وجود میں ایسے کروٹ لے رہی تھی جیسے زمین کی ساکت سطح

کے نیچے زلزلے کی کوئی لہر باہر نکلنے کے لیے سرگرداں ہو۔ اب میرے سامنے وال کلاک تھا جو مجھے وقت کے ساتھ تاریخ بھی بتا رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، میں نے ٹی وی آن کر دیا۔ یہ جان کر میں دم بخود رہ گیا کہ پاکستان کے صدر ضیاالحق کا جہاز کریش ہونے سے وفات ہو چکی ہے۔ حیرانی مجھے اس بات پر بھی ہوئی کہ گاؤں مراداں والی بھی اسی دنیا کا حصہ تھا اور وہ حویلی بھی جہاں میں کئی ماہ سے موجود تھا۔ وہاں کسی کے منہ سے میں نے یہ ذکر نہیں سنا تھا۔

بلاشبہ حویلی والے اپنی سیاست میں الجھے ہوئے تھے لیکن وہ ملکی سیاست سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹی وی دیکھتے ہی نہیں تھے حالانکہ ٹی وی بڑے چودھری صاحب کے کمرے میں الگ تھا۔ شاہینہ کے کمرے میں الگ اور اس ہال میں الگ جہاں ہم سب کھانے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ یقیناً مہمان خانے میں ایک سے زیادہ ٹی وی ہوں گے جہاں اب کسی کا جانا نہیں ہوتا تھا۔ بڑے چودھری کی جوانی اور صحت مند رہنے تک مہمان خانے میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ وہ یار باش اور شوقین آدمی تھا۔ آج بھی شکار کھیلتا تھا۔ اس کی اولاد نے عیاشی کے سارے اوصاف اپنا لیے تھے مگر ان میں خوئے دوستی نہ تھی۔ وہ صرف دشمن بنانا جانتے تھے، دوست نہیں۔

حادثہ اس وقت پیش آیا تھا جب میں شاہینہ کی قید میں تھا۔ اس سے پہلے چودہ اگست کی تاریخ گزری تھی تب بھی گاؤں یا حویلی میں کوئی ذکر نہ ہوا تھا اور شاید وہی حویلی میں میرا آخری دن تھا۔ خبر افسوسناک تھی۔ خود میرا ذہن دیگر تفصیلات میں الجھ گیا۔ تبصرے کرنے والے ہر طرف خیالات کے گھوڑے دوڑا رہے تھے اور بہت سے سوالات اٹھا رہے تھے۔ اس انہماک نے مجھے ذاتی مسائل کی کشیدگی سے ہٹا دیا اور میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگا۔

ڈھائی بجے پیر سائیں نے دیدار فیضیاب کیا۔ میں فوری طور پر جارحیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ لڑ بھڑ کے میں آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے مجھے صبر سے مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا اور جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہوگی۔ میرا مقابلہ پہلے صرف باپ سے تھا، اب بیٹی زیادہ طاقتور حریف ہو گئی تھی۔ یک نہ شد دو شد...

دشمن کے قلعے کے قیدی کو اچھے سلوک کی امید تابع داری کے رویے پر رکھنی چاہیے، باغیانہ اور سرکش رویے پر نہیں۔ اور ایسا رویہ بہادری نہیں بے وقوفی کہلائے گا۔ بہادری کا مظاہرہ شکست تک میدانِ جنگ میں کیا جاسکتا تھا۔ قید ہونے کے بعد یہ لاحاصل... اسی دانش پر عمل کرتے ہوئے میں نے پیر سائیں سے نفرت کے اظہار کو احترام اور عقیدت میں بدل دیا۔ یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔

میں نے ادب سے اٹھنے کی واجبی سی کوشش کی۔ مجھے ہی اس قابل ہوتا تو ان کی قدم بوسی کرتا۔ ''پیر سائیں... پیر سائیں... آپ؟... کیا یہ آپ کی درگاہ ہے؟ مجھے علم نہیں تھا۔''

اس عزت افزائی نے پیر سائیں کو تھوڑا سا حیران کیا۔ ''اوئے پتر سلیم... لیٹے رہو آرام سے۔ کیا حال ہے؟... انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

''اس وقت یہ جان کر مجھے بڑا سکون حاصل ہوا کہ میں آپ کی پناہ میں ہوں... میں بہت مایوس تھا۔''

پیر سائیں نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال تھا... کہاں ہو تم...؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے تو ادھر سے اٹھایا گیا تھا... چودھری صاحب کی حویلی سے... وہ بھی رات کے وقت جب میں سو رہا تھا۔''

''اچھا؟ یہ کب کی بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی اندازہ نہیں... ایک ہفتہ ہوا یا دس دن۔''

''اور اتنا عرصہ کہاں رہے تم؟''

''یہ بھی نہیں معلوم... میرا ایسا کوئی دشمن نہیں۔ ہاں حویلی والوں کے دشمن ہیں... ان کی کارروائی ہو سکتی ہے۔''

شکوک اور شبہات پیر سائیں کی آنکھوں سے عیاں تھے مگر اس نے اظہار نہیں ہونے دیا۔ ''یہ زخم کیسے آیا؟''

''میں نے فرار کی کوشش کی تھی۔ محافظ نے گولی چلائی۔ میں یہاں کیسے آ گیا؟''

پیر سائیں نے کہا۔ ''میرے بندے اٹھا کے لائے تھے تمہیں... تم جنگل میں بے ہوش پڑے تھے۔''

میں نے یوں سر ہلایا جیسے ساری بات سمجھ لی ہے۔ مجھے یہاں لانے کا فیصلہ شاہینہ نے کیا ہوگا۔ اسے صبح ہونے کے بعد اطلاع دی گئی ہوگی کہ آپ کا قیدی فرار کی کوشش میں زخمی ہو گیا ہے۔ کیا پتا وہ مجھے دیکھنے بھی آئی ہو... باپ سے اور انور سے دونوں سے چھپا کے مجھے محبت سکھانے کے لیے اپنی قید میں رکھنا اسے مشکل اور خطرناک کام لگا ہو گا... یا اتنا آسان ثابت نہیں ہوا ہوگا جتنا اس کا خیال تھا۔ اس نے تو سوچا ہوگا کہ شکار کو زخمی تو پہلے ہی کر دیا ہے۔ اب مارنا کیا مشکل ہوگا۔ کم وقت میں اپنے حسن و شباب اور عقل و حکمت کے سارے حربے آزمانے کے بعد اس نے دیکھا کہ... مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر... اور پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر نہیں کٹ رہا تو اس نے مجھے پیر سائیں کی سینٹرل جیل میں شفٹ کرا دیا۔ یہاں میری حفاظت اس کا دردِ سر نہیں تھی اور نہ یہ خطرہ کہ انور کو خبر ہو جائے گی۔ یہاں مجھے طویل عرصے رکھا جا سکتا تھا اور وہ باپ کے گھر میں وہ سب کر سکے گی جو کرنا چاہتی تھی۔ احتیاط یہاں بھی ضروری ہوگی۔ مواقع یہاں بہتر ملیں گے۔

''مجھے کس نے اغوا کیا تھا پیر سائیں...؟'' میں نے معصوم بن کے سوال کیا۔

پیر سائیں نے سوچ کے جواب دیا۔ ''میں نے انور سے پوچھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم فرار ہو گئے... کسی لڑکی کا چکر تھا... کون لڑکی ہے یہ؟''

''لڑکی نہیں پیر سائیں... بیوی تھی میری... جب حادثہ پیش آیا تو میرے ساتھ تھی... وہ بھی نہر میں گری ہو گی... ریشم نے مجھے بچا لیا تھا، اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی... پھر پتا چلا کہ وہ زندہ ہے... میں نے اسے یہاں دیکھا تھا۔''

''یہاں... درگاہ پر...؟''

''جی پیر سائیں... نام تو نورین تھا اس کا... لیکن وہ خود کو فاطمہ بتاتی تھی۔ ایک شخص ساون خان اسے یہاں لایا تھا... آسیب کا اثر بتاتا تھا۔ وہی نورین تھی۔ اس کا دماغ حادثے سے متاثر ہوا تھا۔ وہ بہت دیر پانی میں رہی تھی اور جب نکالی گئی تو تقریباً مر چکی تھی۔''

''تم نے یہاں دیکھا تھا... بات کی تھی اس سے؟''

''کی تھی پیر سائیں... لیکن وہ بضد تھی کہ نورین نہیں... وہ فاطمہ ہے اور ساون خان اس کا باپ ہے... آپ کا مرید تھا وہ ساون خان اور اس کا بھانجا... دونوں جیل کاٹ چکے تھے۔''

پیر سائیں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''اچھا... وہ... ہاں ساون خان اپنی بیٹی فاطمہ کو لایا تھا۔''

''بعد میں اسے تلاش کیا میں نے... تو وہ غائب ہو گیا... نورین کو لے کر نکل گیا نہ جانے کدھر... اسی کی تلاش میں جانا چاہتا تھا میں۔''

''میرا خیال ہے یہ بڑی بھول ہے تمہاری... کہ تم فاطمہ کو نورین سمجھے... اسے جانتا ہوں میں... وہ ساون خان کی بیٹی ہے... مجھے یاد آ گیا اس کا... وہ علاج کے لیے لایا تھا۔ اس پر جن آتے تھے... میں نے ہی کہا تھا کہ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ یہ جن تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا... بڑا ضدی جن تھا۔''

''کیا جن تعاقب بھی کرتے ہیں... اگر کوئی سات سمندر پار چلی جائے لڑکی... امریکا، لندن... تو یہ وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں؟''

''یہ کسی جن کے لیے کیا مشکل ہے... لیکن اس جن کی ایک مجبوری تھی... شاہِ جنات کے حکم سے وہ نظر بند تھا۔ اس علاقے سے باہر نہیں جا سکتا تھا... خیر ابھی تم آرام سے رہو یہاں۔''

''میں واپس حویلی جانا چاہتا ہوں پیر سائیں... بڑے چودھری صاحب نے بھی کہا تھا کہ انور کو میری ضرورت ہے... اس لیے میں رکا ہوا تھا۔''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے... ''وہاں تم محفوظ نہیں ہو... جو لوگ تمہیں پہلے اٹھا کے لے گئے تھے، وہ پھر کارروائی کر سکتے ہیں... نہ انور انہیں جانتا ہے کہ وہ کون تھے نہ تم... یہاں کوئی خطرہ نہیں... تکلیف ہو تو مجھے بتانا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے پیر سائیں کو ایک ہزار ایک گالیاں دیں... اس نے مجھے طفلِ مکتب کی طرح ٹریٹ کیا... ثابت کیا کہ وہ استادوں کا استاد ہے... میں سیر ہوں تو وہ سوا سیر ہے... اس نے میرے جھوٹ کو بڑے تحمل کے ساتھ سنا اور بظاہر قبول بھی کیا... اور جواب میں ایک پُر فریب رویہ اختیار کیا کہ بیٹا... استادوں سے استادی کرتے ہو... اصل حقیقت کچھ اور تھی... میرے خیال میں پیرزادی نے مجھے یہاں پہنچایا۔ اس نے باپ کو کیا کہانی سنائی اور مجھے سخت پہرے میں رکھنے کے لیے کیا کہہ کے باپ کو قائل کیا... ظاہر ہے وہ ایک مکار باپ کی ذہین بیٹی کی کہانی تھی۔ باپ نے اصل حقیقت کو جانا یا محض بیٹی کا دل رکھنے کے لیے یہ ذمے داری قبول کی، اس کا اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید وہ بھی سمجھ رہا ہوگا کہ میرا احترام آمیز رویہ میری اداکاری اور ایک ڈھکوسلا ہے اور میں بھی اس مہربانی اور میزبانی کے پس منظر میں غرض مندی دیکھ رہا تھا۔ زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ دونوں فریق جان لیں گے کہ گیم کیا ہے اور سب کے پتے سامنے آ جائیں

گے۔

ابھی میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میری آزادی کی حد کہاں تک ہے۔ میں اس کمرے میں معزز مہمان ہوں۔ باہر کیا کرسکتا ہوں اور کیا نہیں کرسکتا... مجھے جلدی کرنے سے فائدہ کچھ نہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ صورتِ حال خودبخود واضح ہوتی چلی جائے گی۔ میرے لیے دوپہر کا کھانا ایک ٹرالی میں سجا کے لایا گیا۔ خادمہ ٹرالی چھوڑ کے رخصت ہو گئی۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ خالی پیٹ کا دباؤ تھا کہ زہر بھی کھالوں... شاہینہ بے خوفی سے بتا چکی تھی کہ مجھے اپنی ضرورت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے وہ کیا طریقے اختیار کرے گی۔ یہ نسخے وہ مجھ پر آزما چکی تھی اور اس کے نتائج بھی خاطرخواہ نکلے تھے۔ وہ ایک لیبارٹری تھی تو یہ پورا اسپتال تھا جہاں سے اس نے تربیت حاصل کی تھی۔

بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب جو ہو سو ہو... کھانا کھائے بغیر چارہ نہیں... یہاں وہی ملے گا جو جیلر دیں گے... نہ کھا کے قیدی خود کو ہلاک کرنے کے سوا کیا کرسکتا ہے۔ یوں فاقہ کشی کرکے خودکشی کرنا تو بہت تکلیف دہ عمل ہو گا۔ حرام موت ہی مرنا ہو تو دس طریقے ہیں جو فوری اور یقینی ہیں... مگر خودکشی کا مطلب ہوتا ہے مقابلے سے فرار... ہار کو تسلیم کرنا بھی آسان نہیں۔ زندہ رہ کے میں امید تو رکھ سکتا ہوں کہ شاید کبھی قدرت رہائی کی کوئی صورت پیدا کردے۔

کھانے کے بعد میں بہت دیر تک منتظر رہا کہ کچھ ہو... مجھ میں وہ علامات نمودار ہوں جن کا ایک تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ مجھے نیند آئے یا بے چینی محسوس ہو لیکن کچھ بھی نہیں ہوا... میں ٹی وی پر ملکی حالات کے بارے میں سیاسی بازی گروں کے تبصرے اور اعلانات سن رہا تھا کہ ایک ڈاکٹر نمودار ہوا۔ وہ صورت سے شریف آدمی لگتا تھا۔ معقول لباس اور مسکراتے چہرے کے ساتھ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ بیگ خود اس نے اٹھا رکھا تھا اور اس کی کوئی اسسٹنٹ نرس کے لباس میں ساتھ تھی۔ وہ بھی کم عمر اور بہت خوب صورت لڑکی تھی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے انگریزی میں سوال کیا اور میرے زخم کو دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''آپ بہتر جانتے ہوں گے۔''

نرس نے میرا ٹمپریچر اور بلڈ پریشر دیکھ کے اطمینان کا اظہار سر کی جنبش سے کیا اور پھر میرے زخم پر بندھی پٹی کھولنے لگی۔

''کوئی تکلیف؟'' ڈاکٹر نے ٹانگ کو اوپر نیچے سے دبایا۔

''بس یہی جو آپ کے سامنے ہے۔''

''یو آر لکی... بلٹ نے ہڈی کو ٹچ نہیں کیا۔ یہ زخم تو بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے پلکیں اٹھا کے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں... اگر انہی ہاتھوں نے مسیحائی کی۔'' میں نے نرس کو مسکرا کے دیکھا۔

ڈاکٹر ہنسا۔ ''ایسا ہی ہوگا۔ میں اور وائف ایک ٹیم کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ روز یہی آئے گی میرے ساتھ۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''یعنی آپ بازی لے گئے۔''

اس نے بیگ سے تین شیشیوں میں سے گولیاں نکال کے میرے سرہانے رکھ دیں اور مجھے طریقۂ استعمال سمجھانے لگا۔ ''یہ اینٹی بائیوٹک ہے جو آپ کو ہر چھ گھنٹے بعد کھانی ہو گی۔ پانچ دن تک... یہ درد کا احساس نہیں ہونے دے گی اور یہ آپ رات کو سونے سے پہلے کھائیں گے۔ سکون آور...''

میں نے کہا۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟''

ڈاکٹر نے کچھ حیرانی سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا میں۔''

میں نے کہا۔ ''میں وضاحت کے لیے سوال بدل دیتا ہوں اگر میں یہ دوائیں نہ کھاؤں... تو کیا ہوگا؟''

نرس نے بیگ بند کیا تو ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''درد کی دوا نہ لینے سے بھی تکلیف آپ کو ہوگی جو ابھی آپ کو محسوس نہیں ہورہی ہے کیونکہ انجکشن کا اثر باقی ہے۔''

''آپ کے خیال میں زخم کتنا پرانا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ابھی چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوئے... سکون کی گولی کھا کے آپ کو نیند اچھی آئے گی جو بحالیِ صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔ ایک دوا میں لکھ کر دوں گا۔ وہ آجائے گی... آپ کو ملٹی وٹامن اور فالک ایسڈ کی اشد ضرورت ہے۔ آپ انیمیا یعنی خون کی کمی کا شکار ہیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے بہت کچھ بتاتے ہیں۔ شاید آپ کا وزن بھی خاصا کم ہوا ہے۔ اب آپ کو ملٹی وٹامن کے ساتھ اچھی خوراک چاہیے... آپ کو بیماری تو نہیں ہے کوئی... بلڈ پریشر یا شوگر... یا کچھ اور...؟''

''بالکل نہیں۔ آپ نے میری صحت کے بارے میں تشویش پیدا کر دی۔ میرا خیال تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک نظر آنا اور ٹھیک ہونا الگ بات ہے۔'' وہ ہاتھ ملا کے چلا گیا اور میں سوچتا رہ گیا کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ جسمانی کمزوری اتنی واضح ہے کہ ڈاکٹر نے صاف محسوس کی۔ زخم کے بارے میں میرا اندازہ درست تھا۔ یہ گزشتہ رات ہی لگا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے جتنا وقت شاہینہ کی قید میں گزارا تھا، اس میں بہت کچھ ایسا ہوا تھا جس نے میری صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اب دوا میں کیسے نہ کھاؤں؟ کیسے سمجھوں کہ جو ابھی میرا معائنہ کرکے گیا تھا، وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور دوائیں وہی ہیں جو شاہینہ مجھے استعمال کرا رہی تھی۔ نہیں... یہاں شاید ایسا نہ ہو۔ اب میں پیر سائیں کی تحویل میں ہوں۔ وہ عورت مجھے اپنی خواہشات کی تسکین کا کھلونا نہیں بنا سکتی۔

میں نے دوا کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیا۔ شاید ڈاکٹر نے میری میڈیکل رپورٹ کے مطابق خوراک کی سفارش پیر سائیں سے بھی کر دی تھی کہ مینیو ایک دم بدل گیا۔ کچن سے کھانا لانے والی خادمہ نے مجھے بتا دیا کہ فریج میں بھی جوس اور پھل رکھے ہیں اور میں جب چاہوں کچن سے کچھ بھی طلب کرسکتا ہوں۔ رات تک میں ٹی وی دیکھ کر وقت گزارتا رہا اور منتظر رہا کہ پیر سائیں یا کوئی اور میری مزاج پرسی کے لیے آئے۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ کمرے کا دروازہ مقفل ہے یا نہیں اور میں کہاں تک جاسکتا ہوں۔

اس رات میں گولی کھا کے سکون سے سویا مگر صبح ہوئی تو ناشتے کے بعد مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ جسمانی آسائش کی ہر سہولت میری قیدِ تنہائی کی اذیت کو کم نہیں کرسکتی تھی۔

جب میں چلتا تھا تو پاؤں میں ٹیس اٹھتی تھی ورنہ تکلیف کوئی نہ تھی۔ زخم کے مکمل طور پر مندمل ہونے تک ایسا ہونا لازمی تھا۔ تاہم چلنے سے نہ پاؤں کے زخم سے خون رستا محسوس ہوا اور نہ مجھے اس کی اذیت ناقابلِ برداشت محسوس ہوئی۔ بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں دروازے تک گیا اور اسے کھول کے دیکھا۔ اس کے مقفل نہ ہونے سے بھی مجھے اطمینان ہوا۔ باہر دائیں بائیں ہاتھ پر ایک برآمدہ تھا یا گیلری... اس میں میرا کمرا درمیان والا تھا۔ دونوں طرف دو دروازے یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہاں دو

ازدواجیات

''کیوں میاں...... شادی سے خوش تو ہونا؟''

''ہاں بھئی...... بڑا خوش ہوں۔ بڑا آرام ہو گیا ہے ہر چیز کا...... وقت پر اٹھ جاتا ہوں، وقت پر ناشتا کرتا ہوں، دفتر سے دیر بھی نہیں ہوتی، وقت پر کپڑے استری ہوتے ہیں، صاف ستھرا گھر رہتا ہے، کھانے پینے کے اوقات بھی صحیح ہیں، صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔''

''چلو اچھی بیوی مل گئی تمہیں...... جو اتنے سارے تمہارے کام کرتی ہے؟''

''نہیں...... سارے کام تو میں خود کرتا ہوں۔ بس بیگم نے ہر کام کا وقت مقرر کر دیا ہے اور بڑی سختی سے عمل کرواتی ہے۔''

مغربی ازدواجیات

ہماری شادی بہت کامیاب ہے۔ ہم خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ ہم ہفتے میں دو راتیں گھر سے باہر اپنی من پسند تفریحات میں گزارتے ہیں۔ وہ منگل کی شام گھر سے چلی جاتی ہے۔ میں ہفتے کی ساری رات عیش و عشرت میں گزار کر اتوار کو گھر واپس آتا ہوں۔

امتیاز احمد، کراچی کی حوصلہ مندی

کمرے اور بھی ہیں۔ دائیں طرف کے آخری حصے میں بھی ایک دروازہ تھا جو کاریڈور کو بند کرتا تھا۔ ابھی میں برآمدے میں کھڑا تھا کہ یہ دروازہ کھلا اور کچن سے میرے لیے کھانا لانے والی ملازمہ نمودار ہوئی۔

''آپ کو کچھ چاہیے سر...؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں، میں کمرے میں بیزار ہو گیا تھا اس لیے باہر نکل آیا۔ ان دو کمروں میں کون رہتا ہے جو دائیں بائیں ہیں؟''

وہ کچھ حیران ہوئی۔ ''ابھی کوئی نہیں۔ اگر کوئی مہمان آجائے تو یہ کمرے کھولے جاتے ہیں۔ وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''یعنی یہ مہمان خانہ ہے۔ پھر گھر والے کہاں رہتے ہیں... میرا مطلب ہے پیر سائیں کے گھر والے؟''

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''اس کے دوسری طرف... ایک دروازہ کچن کا ان کی طرف کھلتا ہے۔''

''تم کچن میں سب کچھ خود کرتی ہو... سارا کام؟''

''صرف کھانا پکاتا... میری مدد کے لیے ایک لڑکی ہے... مگر اسے ادھر آنے کی اجازت نہیں ہے ابھی۔''

''وہ کیوں...؟'' میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔

''وہ کم عمر ہے... ڈرتی ہے کچھ۔'' وہ شاید میرے دوستانہ اور مہربان رویے کی وجہ سے باتوں میں لگ گئی تھی۔

''کیا مطلب؟ تم کم عمر نہیں ہو؟ کتنی عمر ہے تمہاری... پچیس ہوگی زیادہ سے زیادہ... ڈرنا تمہیں بھی چاہیے۔''

میں نے عام نظرانداز کی جانے والی عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے سپاٹ چہرے پر تھوڑی سی لالی اور بے جان ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک نمودار ہوئی۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے سر! کچھ زیادہ ہے میری عمر پچیس سے... اور ڈر تو نکل گیا ہے۔''

''تمہاری عمر نظر تو نہیں آتی اور رنگ روپ بھی تمہارا کسی سے کم نہیں۔ مگر ڈرنے کی بات نہیں... میں شریف آدمی ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''شریف آدمی نہ ہوتے تو...''

''تو کیا ہوتا...؟'' میں نے کہا۔

وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ''مجھے رات کو بھی خدمت کے لیے طلب کرتے... ہاتھ پیر دبانے کے لیے... کئی مہمان ایسا کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو ترس گیا تھا کسی سے بات کرنے کے لیے... اس لیے کمرے سے نکلا تھا۔ تم سے بات کر کے اچھا لگا۔''

''پیر سائیں نے تو کہا تھا... کہ آپ کا دل بہلاؤں۔''

''اچھا تو جب فرصت ملے... آجانا... بس باتیں کروں گا میں... یہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

میرا لہجہ، رویّہ اور میری مسکراہٹ اس کے لیے ایک اشارہ تھا کہ مجھے اس میں دلچسپی ہے۔ جب میں نے اسے مدعو کرلیا تو اس کے لیے شک کی بات ہی نہ رہی۔ شاید میں کچھ شرمیلا تھا کہ اب تک اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اب اس نے خود وضاحت کر دی تھی کہ اس کا تو کام ہی مہمانوں کی خدمت ہے۔

ان حویلیوں، حجروں میں عورت کے دو روپ نمایاں نظر آتے تھے۔ اگر وہ خاندانی ہو تو نسل کو آگے چلاتی ہے اور امورِ خانہ داری پر نظر رکھتی ہے۔ اس سے زیادہ اختیارات نہ وہ مانگتی ہے نہ اسے دیے جاتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ہے خدمت گزاروں کا... مزارع... کمی کمین اور غلام... سب حاکم کا دیا کھاتے ہیں۔ اس کی مرضی کی زندگی جیتے ہیں اور اس کے حکم پر مار دیے جاتے ہیں... اس طبقے کی ہر عورت اپنی جوانی کے کچھ دن کچھ ماہ و سال ان مالکوں کو خراج میں دیتی ہے۔ وہ کتنے دن کس کی منظورِ نظر رہتی ہے اور کس کس کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، یہ اس کی جوانی کی چمک دمک پر منحصر ہے۔

کچن میں کام کرنے والی عورت کا دوسرا روپ سلونی تھی جس کو میں نے چودھریوں کی حویلی میں دیکھا تھا۔ میں نے ذرا ''شرافت'' برتی تھی تو اس نے خود ہی بتا دیا تھا کہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی ایک سویٹ ڈش ہے۔ اب ذائقہ پہلے جیسا نہیں رہا لیکن رات کے کھانے کے بعد کھائی جاسکتی ہے۔ اس کی جگہ لینے والی ایسی ہی خدمت گزاری کے لیے زیرِ تربیت تھی۔ شاید کسی خاص مہمان کو پیش کی جائے۔ میرے لیے وہ شجرِ ممنوعہ تھی۔ یہ سب سمجھ لینے کے بعد مجھے اس عورت پر ترس نہیں آیا جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں تھا بلکہ میں نے اس کا بہتر استعمال کرنے پر غور کیا۔

یہ پسے ہوئے اور بے بس طبقے کی عورت کسی سے بھی ہمدردی اور ذاتی توجہ کی توقع بھی نہیں رکھتی تھی۔ حالات کی چکی میں پسنے والی عورت کی ذہنی کیفیت کیا ہوسکتی ہے۔ اس کے جذبات کا خون ہو تو وہ کیا محسوس کرے۔ وہ خواہشات کو مارنے پر مجبور ہو اور اس کے لیے اپنی خوشی کو قربان کر کے دوسروں کو خوش کرنا ضروری سمجھا جائے تو اس پر کیا گزرتی ہے، یہ کون پوچھتا ہے۔ شاید اس کے دل کا بند دروازہ کھولنے سے مجھے دشمنوں کے درمیان کوئی ہمدرد مل جائے۔

رات کو وہ کھانا دے کر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ برتن اٹھانے کے لیے آئی تو رات کے صرف دس بجے تھے مگر یہاں نصف رات کے سناٹے جیسی کیفیت تھی۔ اس نے بڑا نپا تلا سوال کیا۔ ''اور کسی چیز کی ضرورت ہے سر؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں، کسی رفیقِ تنہائی کی... جس سے میں باتیں کرسکوں۔ اکیلا پن تو مجھے ڈس رہا ہے۔ تم پر یہ نیلا رنگ بہت کھل رہا ہے۔''

میرے جملے پر وہ چونکی۔ توجہ حاصل کرنے کے لیے اس نے صرف لباس کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک عورت بن کے خود کو سنوارا تھا اور زیادہ پُرکشش بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اب اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر غازے کی گلابی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں

کی سیاہی میں کاجل کا نکھار اپنی جگہ اور لبوں کی لالی کے گلاب اپنی جگہ... اب بھی وہ حسین نہ تھی۔ شاید اس بھونڈے پن سے اس نے جنس کو نمایاں کیا تھا۔ خوب صورتی جو سادگی میں تھی، اسے ختم کر دیا تھا۔ تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا حسن نہیں، شباب ہی سارا اثاثہ ہے... جو اب لٹ چکا تھا۔

اس کے دوبارہ آنے تک میں نے محسوس کیا کہ یہاں میری حیثیت قیدی کی نہیں تو مہمان کی بھی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میرے کھانے پینے کا خیال رکھنا ہی اہم تھا۔ رات کی میزبانی کے لیے... کچن کی پرانی خادمہ میرے لیے کافی تھی۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ نئی لڑکی کو مجھ سے دور رکھا جائے۔ میری خواہش پر وہ کافی لائی تو پھر دروازہ بند کر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ ''ابھی تک نہ تم نے اپنا نام بتایا، نہ میں نے پوچھا۔''

''میں وزیراں ہوں۔ غلام علی موچی کی بیٹی۔ غلام کی بیٹی وزیر، ہے نا عجیب بات...؟'' اس نے بالوں کو جھٹک کے پیچھے کیا۔

اس کی آخری بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اَن پڑھ عورت بھی اپنی تقدیر کے المیے کو سمجھتی ضرور ہے۔ ''نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''مولوی صاحب کہتے ہیں کہ پڑتا ہے۔ نام سوچ سمجھ کے رکھنا چاہیے۔ میرے باپ کو میرا نام کنیز فاطمہ رکھنا چاہیے تھا۔'' وہ ہنسی۔

''تم ہنس بھی سکتی ہو؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''پھر ہنستی کیوں نہیں ہو؟ کیا کسی نے نہیں بتایا تمہیں کہ ہنستے ہوئے تم زیادہ حسین لگتی ہو؟''

میں ایک مقصد کے لیے جھوٹ بول رہا تھا لیکن عورت تو ایسا جھوٹ سننے کی بھی منتظر رہتی ہے۔ ''میرا شوہر کہتا تھا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور دکھ کا خفیف سا عکس اس کی آنکھوں میں جھلکا۔

''میں پوچھنے والا تھا تم سے کہ وہ خوش نصیب کون ہے؟''

اس نے مجھے عجیب طرح سے دیکھا۔ ''خوش نصیب؟''

''ہاں، تمہارا شوہر۔''

''جو صرف ایک ہفتہ میرا شوہر رہا... وہ خوش نصیب تھا؟''

میں نے کہا۔ ''کیا... ایک ہفتے بعد وہ مر گیا؟''

''یہی سمجھو... میرے لیے مر گیا۔ جب پیر سائیں کی مہربانی سے مجھے خاص خدمت گار بنا لیا گیا تو یہ رشتہ ختم ہوگیا... کر دیا گیا... ایسا تو ہوتا ہے یہاں... وہ بھاگ گیا۔''

''بھاگ کے کہاں گیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں معلوم... یہ تو چودہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں بھی چودہ کی تھی۔''

''اس نے بدلہ لیا تھا۔''

''ہاں، اور سنا ہے پیر سائیں کو وہ تحفہ دے گیا تھا جو اس کے جسم کا حصہ تھا... میں زیادہ بول گئی... تم نے کہا تھا کہ باتیں کرو۔''

''ہاں... میں سن رہا ہوں سب... اور دیکھ بھی رہا ہوں اس دنیا کو... جو میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ عورت کے لیے یہ جہنم ہے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تم یہاں کے نہیں ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا تم نے مجھے پہلے کبھی دیکھا؟ تمہاری تو زندگی یہاں گزری ہے؟''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ ''تم مہمان بھی نہیں ہو۔''

''نہیں، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہیں... باہر جانے کی اجازت جو نہیں... یہ زخم کیسے آیا؟''

''زخم کیسے آتے ہیں... جب کوئی گولی چلاتا ہے اور گولی جان لینے کے لیے چلائی جاتی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ... جب تمہیں یہاں کا دستور معلوم تھا تو تمہیں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ بھاگ جانا چاہیے تھا۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا ہوگا میرے ساتھ بھی... میرا خیال تھا کہ میں ایسی کون سی حور پری ہوں۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تم پہلی عورت ہو مجھے جو اتنی حسین ہونے کے باوجود یہ سمجھتی ہو... یہاں تو آئینہ دیکھ کر چڑیل بھی خود کو پری سمجھتی ہے۔ جس سے تمہارا نکاح ہوا تھا، اس نے تو کہا ہوگا؟''

اچانک اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور اس نے ایک قطرہ اشک کو انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔ ''وہ تو پاگل تھا۔ کبڈی کھیلتا تھا تو کسی کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اور جسے پکڑ لیتا تھا چھوڑتا نہیں تھا۔ مجھے پتا ہے کتنی لڑکیوں کی نظر تھی اس پر... سب کی نظر لگی اسے۔''

میں نے اس کے زخم کو مزید کریدا۔ ''وہ محبت کرتا تھا

تم سے؟''

''ہاں، محبت ہی تھی جو وہ کہتا تھا کہ تُو نے کسی اور کو قبول کیا تو زہر کھا کے مرجاؤں گا... حالانکہ جب ہم چھوٹے تھے تو بہت مارتا تھا مجھے... میں بہت خوش تھی شادی کے بعد... اس نے کہا تھا مجھ سے کہ چل میرے ساتھ شہر... یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں نے ہی انکار کیا کہ شہر جا کے ہم کیا کریں گے۔ کہاں رہیں گے کیا کھائیں گے۔ وہاں کون ہے ہمارا... اس نے کہا کہ یہاں کون ہے اپنا۔ دیکھنا سب پرائے ہو جائیں گے اگر وقت پڑا۔ اور شہر میں تو لاکھوں لوگ رہتے ہیں جن کے اپنے گھر نہیں۔ میں کہیں محنت مزدوری کرلوں گا یا وہاں کرائے پر رکشا چلاؤں گا تو گزارہ ہوجائے گا۔ میں نے ہی نہیں مانی اس کی۔''

''بہت مس کرتی ہو اسے... میرا مطلب ہے بہت یاد آتا ہے؟''

اس نے دوپٹے کے کونے سے آنسو صاف کیے۔ ''میں بے غیرت ہی نہیں... بزدل بھی ہوں... ورنہ...''

''ورنہ کیا کرتیں؟'' میں نے کچھ انتظار کے بعد پوچھا۔

''کچھ نہیں... اب تو خیال ہی نہیں آتا۔ پہلے سوچتی تھی کہ خود مرجاؤں اور مرنے سے پہلے اسے ماردوں۔''

''کسے... پیر سائیں کو؟''

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ''میں بے وقوف ہوں جی... بات منہ دیکھ کے کرنی چاہیے۔ یہاں سب سننے والے ہیں اور سنانے والے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ تمہارا راز میرے دل میں دفن رہے گا۔ جو کہنا ہے آج مجھ سے کہہ کے دل کا بوجھ ہلکا کرلو۔''

صبح تک اس نے بہت کچھ اگل دیا۔ کچھ مجھے معلوم تھا مثلاً یہ کہ جن بھوت اتارنے کا سارا کھیل پیسے بٹورنے کا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مجھے شاہینہ بتا چکی تھی اور میں خود بھی دیکھ چکا تھا۔ جس بات نے مجھے چونکایا اس کا تعلق روزینہ سے تھا اس نے کہا کہ وہ انور سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔

''یہ شادی تو ہوچکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بی بی کہتی ہے اس کا کوئی نکاح نہیں ہوا۔''

''یہ اس نے تم سے کہا؟''

وہ ہنس پڑی۔ ''لو جی، آپ بھی کیا بات کرتے ہو۔ میں نے سنا... وہ اپنی ماں سے لڑ رہی تھی۔ کہتی تھی کہ میں بھاگ جاؤں گی۔''

''وہ بھاگ کے کہاں جاسکتی ہے؟''

وہ کچھ تذبذب کے ساتھ بولی۔ ''ایک بات کہوں؟ آپ مانو گے نہیں... مگر یہ مجھے سچ لگتا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے وزیراں؟'' میں نے کہا۔

''وہ مراد کے ساتھ بھاگ جائے گی۔''

اب میں ہنس پڑا۔ ''مراد کے ساتھ... جو مرچکا ہے۔''

''نہیں جی۔'' اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''وہ زندہ ہے۔''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''زندہ ہے؟ اس کا تو پوسٹ مارٹم ہوا اور جنازہ... قتل کا مقدمہ ہے پیر سائیں کے خلاف۔''

''سب جھوٹ ہے جی... مرنے والا کوئی اور تھا۔ اسے مراد بنا کے دفن کردیا گیا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں جی... مراد کے ٹھیکے دار باپ نے دشمنی کی ہے اپنے سالے کے ساتھ... وہ مراد کا رشتہ لایا تھا پیر سائیں نے انکار کردیا... وہ کئی بار آئے اور ہر بار پہلے سے زیادہ بے عزت ہو کے گئے۔''

''یہ تو اندر کی باتیں ہیں وزیراں۔''

''میں بھی تو اندر ہی رہتی ہوں جی۔ سب دیکھتی اور سنتی تھی۔ مراد کے باپ نے بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے قتل کا مقدمہ کیا۔''

''وہ کون تھا جس کو مراد بنا کے دفنا دیا؟ یہ نہیں ہو سکتا... آخر اس کی ماں تھی اور بہن بھائی تھے۔''

''وہ اکلوتا تھا۔ باپ نے اسے شہر بھیج دیا تھا۔ ماں کو بھی پتا ہے اور باقی کسی نے لاش کا چہرہ نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ لاش رات بھر پانی میں پڑی رہی پھر اسپتال گئی۔ ڈاکٹروں نے چیرا پھاڑا... کفن دینے کے بعد اس کا چہرہ دیکھنے لائق نہیں رہا۔ پتا نہیں کس کو دفنایا۔ مراد کے دوستوں میں سے ہوگا کوئی یا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔''

''کیوں آئے تھے؟ روزینہ کو نکال کر لے جانے کے لیے؟''

''جب آپ کو پتا ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟'' اس نے اٹھلا کے کہا۔

اس سنسنی خیز اطلاع نے میری نیند اڑادی تھی کہ مراد

زندہ ہے۔ ''دراصل... مجھے یقین نہیں آتا۔''

''آجائے گا جی... جس دن وہ روزینہ کو لے جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''تم سمجھتی ہو... یہ ہوگا؟''

''ہاں جی اور قسمت نے ساتھ دیا تو پہلے بچ گیا تھا، اب مارا جائے گا مراد... یہ خود گاڑ دیں گے یہاں... دنیا کے لیے تو وہ مرچکا، اس کے باپ کو پتا ہی نہیں چلے گا۔''

''کیا... وہ بعد میں بھی آیا تھا... یا اس کا پیغام؟''

''پتا نہیں جی... کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ لاہور میں بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر کہاں ہے؟''

''ولایت چلا گیا ہے وہ اور بی بی کو بھی لے جائے گا کسی دن... میرا دل کہتا ہے۔''

''تمہارا دل پاگل ہے۔ وہ زندہ ہوتا تو روزینہ اتنا ماتم کیوں کرتی؟ اتنا روتی پیٹتی کیوں؟''

وہ ہنسی۔ ''کرنا پڑتا ہے جی... میں بھی کرتی... دنیا کو بے وقوف بنانے کے لیے... میں تو اندر کی بات جانتی ہوں۔ روزینہ بی بی ڈراما کرتی ہے... انور کے ساتھ جانے سے پہلے وہ زہر کھالے گی۔''

''وزیراں... اگر پیر سائیں کو پتا چل گیا؟''

''کس بات کا پتا چل گیا؟ وہ مجھ سے پہلے جانتے تھے کہ مراد زندہ ہے۔ وہ بی بی کے ماموں کا لڑکا تھا۔ بی بی کی ماں کے بھائی کا بیٹا۔ ان کو پتا ہے کہ مراد مرا نہیں۔ اسے باپ نے باہر نکال دیا ہے۔ پیر سائیں سمجھتے ہیں کہ ٹھیکے دار کو اکلوتے بیٹے کی جان عزیز ہے اور مقدمہ اس نے پیر سائیں کو رسوا کرنے کے لیے کیا ہے۔ ٹھیکے دار بہت بڑا بدمعاش ہے۔ شہر کے بدمعاش اس کے پاس آتے ہیں۔ وہ برابر کا نہ ہوتا تو مقابلہ کیسے کرتا پیر سائیں کا... اب پیر سائیں کو تسلی ہے کہ روزینہ نے انور چودھری سے نکاح کرنے سے انکار نہیں کیا۔ مراد کا معاملہ ختم ہوا... ان کو کیا پتا کیا ہونے والا ہے۔ بی بی ان کو ایسا بے وقوف بنارہی ہے۔ آپ نے نہیں بتایا کہ پیر سائیں کی آپ سے کیا دشمنی تھی؟''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنی وہ کہانی سنائی جو سب کو سناتا تھا۔ میری گھر والی میرے ساتھ نہر میں گری تھی۔ وہ ڈوب کے مرگئی۔ مجھے ریشم نے بچالیا۔

''میں نے سنا ہے چودھری انور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔'' وزیراں بولی۔

''چاہتا تو تھا مگر پھر پیچھے ہٹ گیا۔ روزینہ سے نکاح پڑھوالیا۔''

''بی بی کیوں کہتی ہے کہ نکاح نہیں ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''نکاح نامہ تو بنا تھا، نکاح بھی ہوجائے گا۔ ریشم کو کہاں رکھا ہے پیر سائیں نے؟''

''اب وہ اندر رہتی ہے۔ چودھری انور نے بہت بُرا کیا ریشم کو چھوڑ کے اب پیر سائیں کی نظر ہے اس پر۔''

یہ الفاظ جیسے بم کا دھماکا بن گئے۔ ''پیر سائیں... کس نے کہا ہے تم سے؟... یہ غلط ہے۔''

''چلاتے کیوں ہو جی۔ میں نے جو سنا آپ کو بتا دیا۔'' وہ ڈر گئی۔

''یہ کس سے سنا تھا تم نے؟''

''بی بی کی ماں کی اور پیر سائیں کی لڑائی میں... وہ کہتی ہے کہ شرم کرو تمہاری چھوٹی بیٹی سے بھی چھوٹی ہے... پیر سائیں نے کہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بے سہارا لڑکی ہے۔ یہاں آرام سے رہے گی۔''

''وزیراں... یہ نہیں ہوسکتا... کبھی نہیں۔''

''آپ کیوں غصہ کرتے ہو جی؟''

میں نے کہا۔ ''ریشم بہن ہے میری... سگی نہ سہی... سگی سے زیادہ ہے۔ اور اسی کی وجہ سے میں پیر سائیں کی قید میں ہوں... دیکھو میرا ایک کام کروگی؟''

وہ تذبذب میں پڑگئی۔ ''کیسا کام جی؟''

''ریشم کو میرا ایک پیغام دے سکتی ہو؟'' میں نے کہا۔

اس نے صاف انکار کردیا۔ ''نہیں جی، یہ کام نہیں کر سکتی میں۔''

''دیکھو... میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ تمہارے ساتھ بڑا ظلم ہوا، اب یہی ظلم ریشم کے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''کیا انعام دوگے آپ مجھے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک لاکھ... دو لاکھ... تم بولو کیا چاہیے؟''

وہ ہنسی۔ ''لاکھوں لے کر میں کیا کروں گی؟ کہاں رہوں گی؟''

''اچھا پھر تم بتا دو، میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سب کچھ؟'' وہ بولی۔ ''میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نا؟ اب تمہاری بیوی بھی نہیں ہے۔ تم نے بتایا وہ ڈوب کے مرگئی۔ تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ یہ میرے ہی التفات کا نتیجہ تھا کہ اس عورت نے وہ بات کہہ دی جو ایک طرح سے اس کی حسرت ناتمام تھی۔ ”ساتھ لے چلوں؟“ میں نے سوچ کے کہا۔

”ہاں، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ شادی آج نہ سہی کل کرو گے۔ میں بھی اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں۔ چودہ سال کی جیل تو کاٹ لی ہے میں نے۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی تو میں نے سنبھل کے کہا۔ ”میں ضرور اپنے ساتھ لے جاتا تمہیں... لیکن پہلا مسئلہ تو قانونی اور شرعی ہے۔“

اس نے پھر میری بات کا غلط مطلب نکال لیا۔ ”لیکن میں کب کہتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ یہ گناہ کی زندگی گزاروں گی، جو اب گزار رہی ہوں۔ ہم شادی کرلیں گے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے وزیراں... تمہارے شوہر نے تمہیں طلاق نہیں دی ہے۔“

”لیکن وہ شوہر کہلانے کے لائق کہاں رہا تھا۔“

”ٹھیک کہا تم نے... اس صورت میں تم پر لازم تھا طلاق لینا اور اسے بھی تمہارا خیال کرتے ہوئے تمہیں آزاد کردینا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب یہ بات کہ وہ چودہ سال سے لاپتا ہے، یہ بھی شرع اور قانون کا مسئلہ ہے۔ اس کی موت کا کوئی ثبوت مل جاتا تو کوئی بات نہ تھی۔ موجودہ صورت میں تمہارا نکاح قائم ہے اور شرعی طور پر تمہیں ننانوے سال تک اس کے واپس آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔“

”ننانوے سال؟“ اس کے حلق سے مردہ آواز نکلی۔

”ہاں، تم معلوم کرلینا۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ تمہارا نہیں میرا انعام ہوتا لیکن تم فکر مت کرو... ہمارے ملک میں دوسرا قانونی راستہ ہے۔ شوہر سات سال لاپتا رہے تو عورت نکاح فسخ کرانے کے لیے عدالت میں جاسکتی ہے۔ یہ ملکی قانون ہے۔ کوئی صورت نکل آئے گی۔“

وہ بالکل سمجھ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے چکر میں اس کے جذبات اور خواہشات کو جگا دیا تھا اور وہ بھی بالکل پیار کی بھوکی تھی کہ میرے التفات کو پیار سمجھ بیٹھی۔ مجھ سے وہ توقعات وابستہ کرلیں جو پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ اب اسے مایوس کرنا ایسا ہی تھا جیسے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا کے کھینچ لیا جائے۔ ایک طرف میرے خودغرضی پر مبنی ارادے تھے کہ میں اسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس کا جذباتی عدم توازن تھا کہ وہ اپنی حد سے آگے بڑھ آئی۔ یہاں اس کے ساتھ ہونے والا ظلم اپنی جگہ... اگر بعد میں بھی وہ اپنا گھر بسا سکتی تو شاید اس کے دکھ کا درماں ہوجاتا۔ لیکن وہ یہاں ایک ملازمہ کی طرح مہمانوں کی دل بستگی کا سامان بنی رہی اور شاید مجھ سے پہلے کسی بھی مہمان نے اس سے ایسی باتیں نہ کی ہوں گی۔

اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ شرمندہ بھی تھی اور پریشان بھی کہ اس نے مجھ سے وہ سب کہہ دیا جو اس کا جرم بن سکتا تھا۔ افشائے راز پر نمک حرامی کا الزام آتا تھا۔ اسے پریشانی سے بچانے کے لیے میں نے بہت زور دے کر کہا کہ وہ فکرمند نہ ہو۔ میں اسے ساتھ لے جانے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالوں گا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ خود زندہ رہا۔

وہ صبح میرے لیے ناشتا بنا کے لائی تو چپ چپ تھی مگر دوپہر تک اس نے خود کو سنبھال لیا اور پھر امیدوں کا سہارا لے کر انداز دلبری اختیار کرلیے جواب مجھے برے لگ رہے تھے مگر میں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ مجھے اندر کے حالات جاننے کے لیے اس کی مدد درکار تھی۔ سارا دن میں اس کی فراہم کردہ معلومات پر غور کرتا رہا۔ اگر مراد واقعی زندہ تھا اور وہ روزینہ کو اپنے ساتھ بھگا لے جانا چاہتا تھا تو میں اس معاملے میں کہیں نہ آتا تھا۔ لیکن مسئلے کا دوسرا پہلو بہت سنگین تھا۔ روزینہ فرار ہوجاتی تو ناک انور کی کٹتی اور وہ صرف نکاح نامہ چاٹتا رہ جاتا۔

پریشانی کی بات پیر سائیں کے عزائم تھے۔ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوکے وہ ریشم سے دوسری شادی کرنے پر تلے بیٹھے تھے اور بلاشبہ یہ ایک شرعی حق تھا۔ ان کی مہربانی تھی یا غلطی کہ اب تک وہ ایک پر اکتفا کیے بیٹھے تھے۔ شاید کیے رہتے اگر ریشم ان کی تحویل میں نہ جاتی۔ ریشم کا حسن معصوم اور اس کی شوخ ادا ہی اس کی جان کا عذاب بن گئی تھی جس نے ڈالی، بری نظر ڈالی۔ اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے۔ پہلے اکبر نے اسے لاوارث مالِ غنیمت سمجھ کے ہتھیانا چاہا تھا۔ قسمت مہربان ہوئی تو جس حویلی میں وہ داشتہ بن کے رہتی، اسی میں مالکن بن کے باعزت زندگی ملنے کا خواب انور کی محبت کی صورت میں پورا ہوتا دکھائی دیا۔ انور کی وفا کے قدم ڈگمگائے تو سیاسی مصلحت کے تحت شاہینہ نے اسے والد صاحب کی تحویل میں دے دیا کہ انور کو پھر نہ ورغلائے۔ انور نے روزینہ سے شادی پر رضامندی ظاہر کی تو یہ ضروری ہوگیا تھا کہ ریشم کو اس کی نظر کے سامنے

بھی نہ رہنے دیا جائے کہ ریشم کا حسن اور اس کے آنسو دونوں پھر انور کو نہ کھینچ لیں۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق دوسری شادی کرکے ریشم کا ہوجائے۔ روزینہ گھر کی مرغی دال برابر کی مثال بنی حویلی میں سڑتی رہے۔

شاہینہ کے وہم و گمان میں نہ ہوگا کہ انور کی نظر سے دور ہوگی تو ریشم والد ماجد کے دل کے قریب ہوجائے گی اور ان کی نیت اس حد تک خراب ہوگی کہ وہ بیٹیوں کی ناراضی اور شرمندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے اپنانے پر تل جائیں گے۔ پیر سائیں کے لیے شرع کی پناہ موجود تھی۔ اس خبر نے میرے اندر غم و غصے کی آگ بھر دی تھی۔ جانا تو مجھے تھا لیکن اب مجھے ریشم کے ساتھ جانا تھا اور اس سے پہلے جانا تھا کہ وہ پیر صاحب کی زوجیت میں میری دسترس سے بھی باہر ہوجائے۔ مجھے پھر انور کی مدد کی ضرورت تھی۔

زندگی کا ایک اور دن بیزاری اور بے بسی کے اضطراب کی نذر ہورہا تھا۔ مجھے یہاں پہنچانے کی ذمے دار شاہینہ تو جیسے مجھے بھول ہی گئی تھی۔ دو دن سے میں نے پیر سائیں کا دیدار بھی نہیں کیا تھا۔ ان سے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اب میں یہاں کس جرم کی پاداش میں قید تنہائی کا عذاب کاٹ رہا ہوں۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ مجھ سے پہلے سے ریشم اس جہنم میں ہے۔ اس کا بھی جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ انور سے سچ مچ محبت کرنے لگی تھی اور یہ بھول گئی تھی کہ ان وڈیروں، جاگیرداروں کی ترجیح میں محبت کہیں نہیں آتی۔ انور اسے محبت کے گرداب میں چھوڑ کے نکل گیا تھا اور وہ اس روحانی اذیت گاہ میں پہنچادی گئی تھی۔

اچانک دوپہر کے بعد پیر سائیں کا نزول ہوا۔ انہوں نے اخلاقاً پوچھا۔ ”کیا حال ہے ملک؟“

میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو پل پل کی خبر ہوگی تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تم کچھ ناراض لگتے ہو۔“

میں نے طنز سے کہا۔ ”جی نہیں، بہت خوش ہوں میں۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں کب تک یہاں قید رہوں گا اور مجھے کس خطا پر قید کی سزا ملی ہے؟“

وہ ہنسنے لگے۔ ”انسان خطا کا پتلا ہے ویسے تو... لیکن تم کسی خطا کی پاداش میں یہاں ہو... یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم زخمی ہو۔“

”یعنی زخم ٹھیک ہوجانے کے بعد مجھے اسپتال سے ڈسچارج کردیا جائے گا؟ روحانی کے ساتھ یہاں جسمانی امراض کا علاج بھی ہونے لگا ہے؟“

”چودھریوں کی حویلی میں تم کون سے آزاد تھے؟“

”مجھے بڑے چودھری نے روک لیا تھا کہ میں انور کے ساتھ رہوں۔“ میں نے کہا۔

”اب یہی بات میں کہوں کہ میرے ساتھ رہو... آخر یہ بھی تو انور ہی کا گھر ہے۔“

”میں یہاں رہوں... کس حیثیت سے؟“

”گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل رہے گی تمہیں... جو چودھری کی حویلی میں بھی حاصل تھی۔“

”آپ مجھے اس دھوکے بازی کے گناہ میں پارٹنر بنانا چاہتے ہیں؟ یہ جو آپ کا پیری مریدی کا فراڈ ہے؟“

”تم بلاوجہ جذباتی ہورہے ہو۔ غریبوں کا استحصال کہاں نہیں ہورہا ہے اور کون نہیں کررہا ہے؟ یہ جو اینٹوں کے بھٹے پر بیگار میں رکھتے ہیں، غلام بنا کے شیوخ کی منڈی میں بیچتے ہیں، منشیات کے دھندے میں استعمال کرتے ہیں... میں ان کی طرح تو غریبوں کی دنیا اور عاقبت خراب نہیں کررہا۔ بہت ہیں ایسے جن کو فائدہ پہنچتا ہے۔ خواہ نفسیاتی علاج سے ہو... لیکن تمہاری سوچ غلط ہے۔ میں تمہیں اپنا جانشین بنانا نہیں چاہتا لیکن تمہیں ایک فیملی ممبر کی حیثیت اور عزت ضرور دینا چاہتا ہوں۔“

مجھے اس کی بات نے حیرانی میں مبتلا کردیا۔ ”میں بہت کم ذات شخص ہوں جس کے بارے میں آپ نہیں جانتے کہ اس کا باپ میراثی تھا یا موچی۔“

وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتا رہا۔ ”حسب نسب کا کیا ہے۔ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ آدمی ذی شرف اور محترم ہوسکتا ہے۔ جیسے جعلی پی ایچ ڈی کی ڈگری سے ڈاکٹر ہوجاتا ہے، قابل سمجھا جانے لگتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں سب جانتا ہوں۔ اس مسئلے پر پھر بات کریں گے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ کمرے کے باہر اس کے دو روحانی مرید اور جانثار موجود تھے جو پیر سائیں کے محافظ تھے اور سائے کی طرح ساتھ رہتے تھے۔

جانتے بوجھتے میں نے ریشم کا مسئلہ نہیں اٹھایا اور ان تمام انکشافات کے حوالے سے بھی گریز کیا جو وزیراں نے اپنی بے وقوفی یا جذباتی کمزوری کے ایک لمحے میں کردیے تھے۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نکل جاتا تو شاید وزیراں پھر کسی کو نظر نہ آتی۔ دن میں یہ ممکن نہیں تھا لیکن رات کے ساتھ پھر وزیراں نہیں آئی تو میں نے محسوس کیا کہ

میں مضطرب ہوں۔ دن بھر اس کا رویّہ بڑا امید اور حوصلہ افزا رہا تھا۔ وہ مایوس نہیں ہوئی تھی اور مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین بھی نظر آتی تھی۔ اس کے نزدیک مجھے ہاتھ میں رکھنے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا کہ وہ مجھے اندر کی باتیں بتاتی رہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ریشم تک رسائی کیسے ممکن ہے۔ ملاقات نہ سہی کیا وہ اس تک میرا پیغام پہنچا سکتی ہے؟ اگر ایسا ہو جاتا تو میں وزیراں کے ساتھ مل کر ریشم کو یہاں سے نکال لے جانے کا کوئی پلان بناتا۔ اس کے نہ آنے سے مجھے خاصی مایوسی کا سامنا تھا۔

بہت دیر تک میں پیر سائیں کے ارشاداتِ عالیہ پر غور کرتا رہا۔ آخر مجھے فیملی ممبر کی حیثیت دینے کا مطلب اور مقصد کیا تھا؟ اس کی ضرورت کیا تھی اور وہ مجھے کہاں اور کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے؟

دوائیں برابر کھا رہا تھا۔ مجھے جلد از جلد اس قابل ہونا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں اور دوڑ سکوں۔ ڈاکٹر نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا کہ دوا نہ کھانے کا انجام کیا ہوگا۔ یہاں اصل خوف دوسری دواؤں کا تھا جو ابھی مجھے نہیں دی جا رہی تھیں۔ دل میں ایک اندیشہ تھا کہ کہیں اینٹی بائیوٹک گولیوں اور دوسری دواؤں کا صرف لیبل ہو۔ اصل وہی ہوں۔ لیکن تین دن بعد بھی وہ علامات نمودار نہیں ہوئی تھیں جن سے مجھ پر وحشت سوار ہوئی تھی اور میں بہتر بھی محسوس کر رہا تھا۔ سوچ سوچ کے پاگل ہونے سے بہتر تھا کہ جو ہو رہا ہے ہوتا رہے۔ جب وقت اور حالات نے کوئی سازشی کروٹ لی تو دیکھا جائے گا کہ اس کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔

میں سونے کی کوشش میں مصروف تھا کہ ایک آہٹ سی ہوئی۔ دروازہ کھلا اور باہر سے تھوڑی سی روشنی شاہینہ کے ساتھ اندر آئی۔ اس نے دروازہ اپنے پیچھے بند کیا اور بے خوفی سے ایک لائٹ جلا دی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ لباس یا آرائشِ حسن کے کسی اہتمام کے بغیر آئی تھی۔ اس کے کپڑے وہی تھے جو وہ گھر میں استعمال کرتی تھی۔ بال بے ترتیبی سے بنے ہوئے تھے اور میک اپ بالکل نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھے وہ خوب صورت لگی تو میرے دل میں ایک خوف جاگا۔ کہیں یہ میرے اندر کی تبدیلی تو نہیں؟

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے مسکرا کے کہا۔

''مجھے انتظار تھا تمہارا... بہت انتظار کرایا تم نے... تم چاہو تو اسے رومانٹک ڈائیلاگ سمجھ لو۔''

''ایک دن تم دل سے کہو گے... پورے جذبات کے ساتھ۔''

''تم اسی لیے مجھے یہاں لائی ہو؟ اپنے ابا کی لیبارٹری میں جسے وہ درگاہ کا نام دیتا ہے۔ مجھے تبدیل کرنے کے لیے تاکہ میں سچ مچ تمہارے عشق کی دیوانگی میں مبتلا ہو جاؤں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔ اس کے لیے وقت اور مہارت کی ضرورت تھی۔ میں یہ نہیں کر سکتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ تمہارا باپ یہ کام کر لے گا؟ مجھے نورین کے عاشق سے شاہینہ کے عاشق میں بدل دے گا؟''

''ہاں، رویّے ذہنی ہوتے ہیں اور ذہن کو متاثر یا تبدیل کرنے کا عمل سائنسی بھی ہے۔ میڈیکل سائنس نے دوائیں بنائی ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ روحانی طریقے ہیں۔ ہپناٹزم ہے اور... شاید سفلی علوم... جادو اور کالا علم وغیرہ... ان کا مجھے پتا نہیں۔''

''شاہینہ! خدا کے لیے مجھے اس پاگل پن کا مطلب بتاؤ۔ فرض کرو میں انسان سے الّو کا پٹھا بن گیا۔ بھول گیا نورین کو اور سوتے جاگتے شاہینہ شاہینہ کی مالا جپنے لگا... تو کیا تمہارا غیرت مند عزت دار باپ برداشت کر لے گا... جس نے مراد کو برداشت نہیں کیا تھا؟''

''مراد کی بات کچھ اور تھی۔ اگر انور کا معاملہ نہ ہوتا تو ابا کو کیا اعتراض تھا۔ میرا معاملہ کچھ اور ہے۔ میں نے خود ان سے کہہ دیا ہے۔''

''کیا کہہ دیا ہے؟'' میں نے سانس روک کے پوچھا۔

''یہی... کہ میں ملک سلیم کو چاہتی ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں مگر وہ مانتا نہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ہوگا تو تمہیں یقین آجائے گا خود بخود۔ اب اکبر نہیں ہے اور میرے سامنے ایک پوری زندگی ہے۔ جو میں اکیلے پن کے عذاب میں گرفتار رہ کے گزارنا نہیں چاہتی۔ یہ احساس ان کو بھی تھا اور میری بات پر انہیں خیال یہ بھی آیا ہوگا غصے کے ساتھ... کہ آج میں نے اعتماد کے رشتے پر اعتبار کرتے ہوئے باپ سے دل کی بات کہہ دی۔ باپ بیٹی کا رشتہ ذرا مختلف ہوتا ہے جیسے ماں بیٹے کا۔ کل کو ایسا نہ ہو کہ میں جائز ضرورت کو ناجائز ذرائع سے پوری کرنے لگوں۔ فاقے کا مارا حلال نہ ملے تو حرام کھاتا ہے... اس وقت کون

ہوگا مجھے روکنے والا... کون سمجھے گا میری مجبوری؟"

"چنانچہ اس نے شوہر بنوانے کا منصوبہ منظور کرلیا؟"

"وہ پہلے غصہ ہوئے، چیخے چلائے کہ ابھی اکبر کا چہلم بھی نہیں ہوا اور تو کیا اپنا مسئلہ لے کر آ کھڑی ہوئی، میرے سامنے بے غیرت بے حیا... میں نے صاف کہا کہ آپ قتل کر دیں ابھی مجھے... لیکن کسی اور اکبر کے حوالے نہ کریں... آپ کے ایک غلط فیصلے کی کتنی کڑی سزا بھگتی ہے میں نے... آپ کو کچھ اندازہ نہیں۔ کسی دن میں خودکشی کرلیتی تو جنازہ آپ ہی پڑھاتے۔ اب میں خود آپ سے باعزت اور پُرسکون زندگی مانگ رہی ہوں۔ آپ کوشش تو کریں۔"

"پیر سائیں نے یہ نہیں کہا کہ یہی کیوں...؟"

"نہیں، انہوں نے کہا کہ لڑکا اچھا ہے... بہت اچھا ہے، بُرا نہیں۔ شریف تعلیم یافتہ اور باضمیر... کسی اور کے لیے پاگل ہے... میں نے کہا کہ اس کا یہی پاگل پن ختم کرنا ہے آپ کو... وہ ہوا کے پیچھے نہ بھاگے... اس کے دماغ سے اس عورت کا خیال نکالنا کیا مشکل ہے جس کا وجود ہی نہیں۔"

"وہ جانتا ہے کہ نورین زندہ ہے۔" میں نے چلّا کے کہا۔

"تم قائل کر سکتے ہو تو کوشش کرنا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دماغ سے ایک خیال کے جنون کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ہپناٹزم بڑا موثر طریقہ ہے لیکن اس کی کیا گارنٹی کہ نورین کو بھولے گا تو وہ تمہیں اس کی جگہ دے گا۔ میں نے کہا کہ ایسا ہو جائے گا، یہ آپ مجھ پر چھوڑیں۔ اگر وہ میری طرف آتا ہے تو کیا آپ اسے اپنی فیملی میں شامل کرلیں گے؟"

میرے دماغ میں بجلی کا کوندا سا لپکا۔ مجھے پیر سائیں کے الفاظ یاد آئے کہ تمہیں فیملی ممبر کی حیثیت اور عزت حاصل ہو سکتی ہے۔ او مائی گاڈ! یہ مطلب تھا اس کی بات کا۔ یہ جان کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے کہ اب شاہینہ اپنی کوشش میں تنہا نہیں، باپ اس کے ساتھ ہے۔ معاملہ پہلے کسی اناڑی کے ہاتھ میں تھا تو اب شکاری کے ہاتھ میں ہے۔

"شاہینہ... خدا کے لیے مجھے بخش دو۔" میں نے کہا۔

"اگر اس میں تمہارا نقصان نظر آتا تو میں بالکل کوشش نہ کرتی۔"

"میرے فائدے نقصان کو تم کیسے سمجھ سکتی ہو؟" میں چلّایا۔

"کوئی بھی سمجھ سکتا ہے۔ سامنے کی حقیقت ہے کہ تم سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔"

"نورین سراب نہیں ہے، حقیقت ہے۔"

"تمہارے خیال میں... اس خیال کو تمہارے دماغ سے نکال دیا جائے گا۔ پھر تم خود میری طرف آؤ گے اور میرا وعدہ ہے... صرف میں ہی نہیں، میرا جو کچھ ہے تمہارا ہوگا۔"

اب میں شاہینہ کو کیسے سمجھاتا کہ پاگل وہ خود ہے۔ اگر میں کسی سراب کا تعاقب کر رہا ہوں تو اس کے لیے میری محبت بھی سراب ہے۔ دو پاگل آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو عقلمند تو نہیں کہہ سکتے۔ سارے معاملات خودبخود میری سمجھ میں آرہے تھے۔

میں نے کہا۔ "کیا تمہارے باپ کو پتا ہے کہ اکبر کو خود تم نے قتل کیا تھا؟"

وہ بے پروائی سے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم۔ نہ میں نے کہا نہ اس نے پوچھا۔ دنیا کی طرح اس کو بھی انور پر شک زیادہ ہوگا۔"

"اگر میں اسے بتادوں؟"

"بتادو... مجھے یا اسے کیا فرق پڑے گا۔"

میرا دماغ اُتھل پتھل ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس آزمائش سے کیسے نکلوں۔ اب مجھے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں سچ مچ ویسا ہی نہ ہو جو شاہینہ چاہتی ہے اور بتا رہی ہے۔ میں اس حد تک نہ بدل جاؤں کہ وہ نہ رہوں جو تھا... جو ہوں۔ میں صرف ملک سلیم اختر رہ جاؤں جس کے دماغ سے ماضی کا ہر نقش صاف کر کے اس پر ایک نیا ماضی تحریر کر دیا جائے۔ جیسے کمپیوٹر کی میموری کو ڈیلیٹ کر کے نیا پروگرام ڈالا جاتا ہے۔ یہ آج کی سائنس میں ناممکن نہیں۔

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔ میں کل سے یہاں تھی اور کل واپس چلی جاؤں گی اپنے سسرال۔ یہاں تم سے ملنا تو ممکن ہے مگر میں ٹھہر نہیں سکتی۔ میں پھر آؤں گی۔" اس نے آگے بڑھ کر مجھے چوم لیا۔

میں شکست خوردگی کے احساس سے دوچار تھا۔

"شاہینہ! اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں بھی بتادوں۔ میں مزاحمت کروں گا۔ سارا رسک تمہارا ہے کہ اس لیبارٹری سے جو شوہر تمہیں بنا کے دیا جاتا ہے، وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہوگا۔"

"ہاں، وہ رسک میرا ہے۔ آگے میں سنبھال لوں گی تمہیں۔ اپنے پیار کے شکنجے میں ایسا کس کے رکھوں گی کہ آزاد ہو کے بھی تم کہیں نہیں جاؤ گے... سرکس کے شیر کی

طرح... پنجرے کے پنچھی کی طرح۔"

"کیا تمہارا باپ ریشم سے شادی کر رہا ہے؟"

وہ دروازے کے پاس تھی جب میں نے یہ سوال پیچھے سے داغ دیا۔ وہ یوں پلٹی جیسے میں نے اس پر خنجر سے وار کر دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اب مجھے آتشِ غضب کے شعلے بھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔

"اچھا... تو یہ بھی بتادیا تمہیں کسی نمک حرام نے؟" وہ غرائی۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پھر بھی میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "یہ مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ کل تک تو خود مجھے معلوم نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس میں میرا کیا قصور؟"

"میں کل صبح آئی تھی۔ دن میں میری روزینہ سے بات ہوئی تو وہ بہت خفا تھی۔ افسوس مجھے بھی تھا، ریشم کے لیے نہیں۔ اس کے تو دن پھر گئے۔ اب وہ پیر بیگم کہلائے گی۔ اس کے بچے پیرزادے ہوں گے۔ افسوس مجھے اپنی ماں کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہ ایک بھائی تھا، وہ گنوا دیا۔ اب سوتیلے آئیں گے میرے شریک۔"

"جن کا جائداد میں حصہ ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، لڑکا ہوگا تو مجھ سے دگنا لے جائے گا۔"

میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ "چچ... چچ... کتنا نقصان ہوا تمہارا... بڑی ہمدردی ہے مجھے تم سے۔"

وہ آہستہ آہستہ پلٹ کے میری طرف آئی۔ "روزینہ چاہتی تھی کہ ہم ابا سے بات کریں۔ ہم مل کے انہیں اس ارادے سے باز رکھیں۔ اور اگر میں مخالفت کرتی اور اماں کی حمایت میں کھڑی ہو جاتی تو ان کو اپنا ارادہ بدلنا پڑتا لیکن میں نے اس کا الٹ کیا۔"

"تم نے حمایت کی ابا کی؟"

"ہاں، حالانکہ یہ بہت نقصان کا سودا تھا۔ میں نے اپنی بہن اور اپنی ماں کی ناراضی بھی مول لی۔ پوچھو کس لیے؟"

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ "اس میں بھی تمہارا کوئی فائدہ ہوگا۔"

"ہاں، میں نے تمہیں پالیا۔ تین پتوں کے کھیل میں اچھا جواری اپنے پتے شو کیے بغیر بازی جیت لیتا ہے۔ خواہ حریف کے ہاتھ میں کتنے ہی اچھے پتے ہوں، وہ بلف ہو جاتا ہے۔ میری بہن بھی مجھ سے خفا ہے اور ماں بھی سخت ناراض ہے لیکن میں خوش ہوں۔ میں نے ابا سے کہا کہ تم شادی کیوں کر رہے ہو؟ صرف اپنی خوشی کے لیے۔ اس لیے کہ ریشم تمہیں اچھی لگتی ہے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی اگر تم میری خوشی کے لیے میرا ساتھ دو۔ ورنہ میں اپنی بہن اور ماں کے ساتھ الگ ہو جاؤں گی۔ تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ سوچو کتنی رسوائی ہوگی تمہاری۔ اس نے کہا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ پھر میں نے صاف کہا کہ ملک سلیم اختر کو... اسے میرے لیے تو کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ صرف اپنی رضامندی میں سر ہلانا تھا۔ وہ اس نے ہلا دیا۔ کیا اب بھی تم میری قدر نہیں کرو گے؟ کتنی جائداد چلی جائے گی، اس کا مجھے غم نہیں۔ اگر میں نے تمہیں پالیا تو سب پالیا۔"

"کتنا ہوس پرست ہے تمہارا پیر باپ... تم نے دیکھی ہے اس کی ساری بدمعاشی جو وہ جوان عورتوں کے جن اتارنے کے لیے کرتا ہے؟"

"وہ جیسا بھی ہے، باپ ہے اور میں اسے روک نہیں سکتی تھی مگر یہی وقت تھا جب میں اپنی بات کر سکتی تھی۔ تم کو یہ بات کیسے پتا چل سکتی تھی۔ میرے باپ نے ابھی تین دن پہلے اپنے ارادے کا اظہار ماں کے سامنے کیا تو ان کی بہت لڑائی ہوئی تھی۔ ضرور تمہیں کسی اندر کے نمک حرام نے بتایا ہے۔ میں معلوم کرلوں گی ایسا کس نے کیا تھا۔ پتا چل جائے گا۔"

میرے منہ سے بلاارادہ نکل جانے والی بات نے خرابی اس سے کہیں زیادہ پیدا کی تھی جتنا میں نے سوچا تھا۔ اب یہ بات مجھے یقینی نظر آتی تھی کہ شک کا نشانہ وزیراں بنے گی۔ اور کسی کا مجھ سے رابطہ کہاں تھا اور وہ اندر کی ہر بات جانتی تھی۔ بدبخت عورت پہلے میری محبت کے جھوٹ کے جال میں پھنسی۔ اب اپنی جان دے کر اس غلطی کا خمیازہ بھگتے گی۔ میری ساری پلاننگ ختم جو میں نے اس کے ذریعے ریشم سے رابطہ کرنے اور اندر کے حالات جاننے کے لیے کی تھی۔ شاہینہ پھر دروازے تک پہنچ گئی تھی جب مجھے ایک بات سوجھ گئی۔

میں نے کہا۔ "شاہینہ!"

میری آواز سے زیادہ میرے لہجے نے شاہینہ کے قدم روکے اور اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ "کوئی بات ہے؟"

"ہاں، تمہارا اندازہ درست تھا۔ مجھے اندر کے کسی بندے نے یہ خبر دی تھی۔"

"کس نے؟ وزیراں نے؟" وہ مسکرائی۔

"ہاں، غلطی اس کی نہیں تھی۔"

"پھر کس کی تھی؟"

"میں نے اسے مجبور کیا تھا، لالچ دیا تھا۔ ایک لاکھ

میں اس کی وفاداری کا سودا کیا تھا۔ وہ غریب اور لاوارث عورت لالچ میں آگئی۔"

"نمک حرامی کی اس نے... سزا تو ملے گی اسے۔"

میں نے کہا۔ "میں ریشم سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی سمجھی کہ میں اسے چاہتا ہوں۔ اس نے میری ہمدردی میں کہہ دیا کہ اب اسے بھول جاؤ۔ وہ پیر سائیں سے شادی کررہی ہے۔ یہ بات اس کے منہ سے بلاارادہ نکل گئی تھی۔ اس نے ایک لاکھ نہیں لیے، ریشم سے میرا رابطہ نہیں کرایا۔"

"اندر کی ایک بات تو پہنچائی تم تک۔"

میں نے کہا۔ "اسے معاف کردو۔ پلیز میری خاطر۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ "تمہاری خاطر... اچھا۔"

"تم کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤ گی... تمہیں میری قسم۔"

وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہ رہی۔ "اوکے... تم نے اپنی قسم دے دی ہے تو مجبوری ہے۔"

"تم کسی سے ذکر بھی نہیں کرو گی اس بات کا۔ لیکن وزیراں کو کچھ ہوگا تو مجھے معلوم ہوجائے گا۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ "ایک بات بتاؤ۔ یہ نورین والی کہانی تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے میں جھوٹ بولتا رہا ہوں؟"

"یہ تم خود جانتے ہو کہ تم نے کتنے جھوٹ بولے ہیں اور کیوں... تم وہ نہیں ہو جو تم نے یہاں بتایا کہ تم ہو... اور سب کو یقین بھی دلا دیا کہ وہ سچ ہے۔ اپنی کہانی کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے تم نے اس میں ایک ایسی لڑکی ڈال دی ہے جس کا وجود محض خیالی ہے۔"

"تمہیں شک کیوں ہے؟"

"ایک تو... اس نورین کو تم نے دنیا کی سب سے حسین، سب سے ذہین، وفادار اور محبت کرنے والی لڑکی بنا دیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ وہ تمہاری بیوی تھی۔ یہ کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں رہتی تھی، تمہاری کیا لگتی تھی، تمہارے ساتھ کیوں فرار ہورہی تھی۔ جو تمہارے دشمن تھے اس کے کیوں تھے؟ بہت کچھ ہے جو مجھے فرضی لگتا ہے۔ نورین کوئی ہے ہی نہیں۔ خیر مجھے کیا۔" وہ پلٹی اور نکل گئی۔

میں پہلے بھی جانتا تھا اور ابھی ابھی شاہینہ کی ذہانت نے مجھے پھر قائل کیا تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس کی ذہانت ایک تخریبی قوت بن گئی تھی۔ قصوروار اس کا باپ اور شوہر دونوں تھے۔ آگے کیا ہوگا؟ کیا واقعی وہ مجھے تسخیر کرکے اپنا بنا لے گی؟ اس کے پاس مثبت حربے بھی تھے اور منفی بھی۔ وہ صرف جیت کی جواری تھی۔ اگر وہ ہاری تو کیا کرے گی؟ خودکشی؟ یا میرا قتل؟

میں نے ڈاکٹر کے لیے شکرگزاری کے جذبات محسوس کیے جو مجھے سکون آور گولی دے گیا تھا ورنہ اس رات میرے دماغ میں طوفان آیا ہوا تھا۔ میں ساری رات لوٹتا رہتا اور سونہ پاتا۔ مجھے دیر سے سہی مگر نیند آگئی اور آنکھ کھلی تو وزیراں کی آواز سے۔ وہ ناشتا رکھ کے جارہی تھی۔

میں نے اسے آواز دی۔ "وزیراں..."

وہ رک کر پلٹی تو مجھے اس کا چہرہ اترا ہوا اور آنکھوں میں نمی نظر آئی۔ "جی سر! کیا بات ہے؟"

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بولی۔ "آپ نے شاہینہ بی بی کو سب بتا دیا۔ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔" اور پھر پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس نے مجھے وضاحت یا معذرت کا موقع ہی نہیں دیا۔ یہ ہم سب کا المیہ ہے، ہم جن سے کوئی امید وابستہ کرلیتے ہیں، وہی ہمارے اعتماد پر پورے نہیں اترتے۔ میں نے وزیراں کو فریب آرزو میں مبتلا کیا تھا اور وہ زمانے کی ٹھوکروں میں رہنے والی کسی مزاحمت کے بغیر ایک جھوٹے سہارے پر خواب دیکھنے لگی تھی کہ کوئی اسے بھی محبت اور عزت دینے والا آگیا ہے۔ میں نے جھوٹ کا جال فائدہ اٹھانے کے لیے بنا تھا جس میں وہ ایک دم گرفتار ہوگئی۔ ڈوبنے والا تو تنکے کا سہارا بھی لیتا ہے۔ اب میری وضاحت بھی لاحاصل تھی۔ شاہینہ وعدہ ضرور کرگئی تھی کہ وہ شاہینہ کی نمک حرامی کو معاف کردے گی لیکن معاف کرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

دوپہر سے پہلے ڈاکٹر اپنی خوب صورت نرس بیوی کے ساتھ آیا اور اس نے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد اطمینان کا اظہار کیا۔ "آپ دوا کھا رہے ہیں باقاعدگی سے۔ اچھی بات ہے، آپ خون کی کمی کا شکار ہیں۔"

میں نے کہا۔ "زخم سے کافی خون بہا تھا۔"

"عام طور پر اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ہر تین مہینے بعد ایک بوتل خون دے کر صحت میں بہتری آتی ہے۔ تازہ خون پیدا ہوتا ہے۔ آپ کے جگر کا فعل درست نہیں لگتا۔ کچھ یرقان کے سے آثار ہیں۔"

"پھر کیا مجھے لیور فنکشن ٹیسٹ کرانا چاہیے؟"

"یہ یرقان نہیں ہے۔" اس نے بیگ سے گولیوں کی ایک شیشی نکالی۔ "یہ آپ ایک مہینے استعمال کریں۔ اینٹی بائیوٹک دو دن بعد روک دیں۔ درد کی دوا بھی۔ سکون آور آپ کی مرضی ہے۔ آپ کو اے ٹی ایس کا انجکشن تو نہیں لگا تھا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ زخم جنگل میں آیا تھا۔"

"میں لگا دیتا ہوں... احتیاط بہتر ہے۔"

یہ ڈاکٹر پر میرے اعتماد کی سزا تھی۔ اس نے مجھے جو انجکشن دیا وہ اے ٹی ایس کا نہیں تھا۔ خواب آور تھا لیکن جو بات اس نے کی تھی اس میں شک وشبے کی گنجائش نہ تھی۔ جب غنودگی نے یلغار کی تو میں سمجھ گیا کہ خوب صورت نرس بیوی والا اچھا ڈاکٹر میرا دوست نہیں، پیر سائیں کا مرید اور اس کے حکم کا غلام تھا۔

جب میں جاگا تو منظر بدلا ہوا تھا۔ دوسرے ہفتے میں تیسری بار میرا قید خانہ بدل دیا گیا تھا لیکن کچھ دیر بعد میں نے اس جگہ کو پہچان لیا۔ یہاں پہلی بار مجھے پیر سائیں خود اٹھا کے لائے تھے۔ دوسری بار یہ سعادت پیرزادی شاہینہ کے حصے میں آئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں دوسرے بہت سے جن بھوت اتروانے والوں کے درمیان مجھے فاطمہ نظر آئی تھی۔ یہ درگاہ کا وہ تہ خانہ تھا جہاں خطرناک سمجھے جانے والے ذہنی مریضوں کو رکھا جاتا تھا اور ان کا علاج بھی پُرتشدد روحانی طریقوں سے کیا جاتا تھا۔

پہلے قسمت نے یاوری کی تھی اور میں یہاں سے صحیح سلامت نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ پیر سائیں نے مجھے کچھ ذمے داریاں دی تھیں جو میں نہیں نبھا سکا تھا مگر دوبارہ ان کے قابو نہیں آیا تھا۔ اس بار ان کی بیٹی مجھے لے آئی تھی۔

اب مجھے ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے نئی شخصیت دینے کا عمل شروع ہوگا۔ میں نے بے بسی سے سوچا۔ میں شاہینہ سے نفرت کرنے والا اس سے اتنی محبت کرنے لگوں گا کہ زندگی میں اس کی رفاقت کو خوش بختی تسلیم کروں گا۔ نورین کا نام بھی میرے لیے اجنبی ہوجائے گا۔ آج تک میں نے ایسا نہ دیکھا تھا نہ سوچا تھا مگر سنا ضرور تھا کہ جدید سائنسی طریقوں سے انسان کو روبوٹ کی طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ جینیٹک سائنس بہت آگے جارہی تھی۔ ایک سیل سے ڈولی نام کی بھیڑ بنالی گئی تھی۔ ڈی این اے بدل کے بہت کچھ ہوجائے گا۔ جسم سے بیمار سیل نکال کے صحت مند سیل ڈالے جائیں گے تو کینسر باقی نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ اپنی مرضی سے پسندیدہ شکل وصورت کا... اچھی عادات والا... انتہائی ذہین انسان بنا لیا جائے گا۔ خواہ وہ رحم مادر میں بنے یا ٹیسٹ ٹیوب سے لیبارٹری میں۔

شاید وہ مستقبل ابھی دور تھا مگر امکان کی حد میں تھا۔ آج تو یہ تجربہ مجھ پر ہوگا کہ میری نفرت کو محبت میں بدلا جائے۔ مجھے باغی سے حکم کا غلام بنایا جائے۔ میرے دماغ سے نورین کے خیال کو بھی خارج کیا جائے۔ اس میں شاہینہ کی محبت ڈالی جائے اور علاج مکمل ہونے کے بعد مجھے شاہینہ کے حوالے کردیا جائے کہ حاضر ہے آپ کے خوابوں کا شہزادہ۔ آپ کا آئیڈیل۔ آپ کے آرڈر کے مطابق تیار کیا ہوا۔ خامی رہ گئی ہو کوئی تو بتائیں۔ بعد میں دور کرنے کی گارنٹی۔

کیا واقعی ایسا ہوگا میرے ساتھ؟ میں اب بھی یقین کرنے پر آمادہ نہ تھا اور نہ ہوتا اگر اسی دن میں ایسے ہی ایک زیرعلاج مریض کو نہ دیکھتا۔ اس بار مجھے عام مریضوں والی کوٹھری نہیں دی گئی تھی۔ یہ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں میرے سونے کے لیے تخت پر بستر بچھا دیا گیا تھا۔ اس کے ایک کونے میں کموڈ تھا اور واش بیسن۔ اوپر ایک گول روشن دان میں لگا ہوا پنکھا اندر کی ہوا کو باہر پھینکتا رہتا تھا چنانچہ کوئی بو نہ تھی۔

دن بھر میں نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری مزاحمت بہت جلد دم توڑ جائے گی۔ کھانا برا نہیں تھا اور میں نے نہیں کھایا تو پڑا رہا۔ مجھے کافی بھی دی گئی جو میرے اے کلاس قیدی ہونے کی دلیل تھی۔

رات کو میں نے پھر وہی منظر دیکھا۔ کوٹھریوں سے نکل کر نیم پاگل عورتیں، بچی، جوان اور بوڑھی... دائرہ نما صحن میں گشت کررہی تھیں۔ خود سے باتیں کررہی تھیں۔ ہنس رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ گا رہی تھیں یا گالیاں دے رہی تھیں جو مرد بھی دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ جو فحش کلامی وہ کررہی تھیں ان کو بھی احساس نہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

اس بار درمیان میں ایک نیا کھیل کھیلا گیا۔ شاید میری تفریح طبع کے لیے۔ ایک پاگل عورت کو درمیان میں بٹھایا گیا۔ وہ کسی کے قابو نہیں آرہی تھی اس لیے دو مریدوں نے اسے دبوچا۔ پیر سائیں اس کو کچھ پڑھ کے پھونکتے رہے اور گرج برس کے جن کو دفع ہونے کا حکم دیتے رہے مگر جن سرکش تھا چنانچہ عورت کو مرچوں کی دھونی دی گئی۔ نافرمان جن پیر سائیں کو گالیاں دینے لگا تو مرید ایک اسٹینڈ اٹھا کے لائے۔ ایسا اسٹینڈ گاڑیوں کے انجن اٹھانے کے لیے مکینک استعمال کرتے ہیں۔ عورت کو زمین سے چند فٹ اوپر الٹا لٹکایا گیا۔ آس پاس دیگر مریض اب اپنی دیوانگی بھول کے یہ انسانیت سوز تماشا دیکھنے میں محو تھے۔ ان کے چہروں پر خوف تھا جو نفرت اور غصہ پیدا کرتا ہے مگر وہ بے بس تھے۔

اس عورت کو پولیس تھانوں کی تفتیش والی اذیت دی گئی۔ وہ تڑپتی رہی، چیختی رہی۔ پیر سائیں اس پر کچھ پڑھ کے پھونکتے رہے اور اس کے گرد حصار قائم کرتے رہے۔

www.paksociety.com

ان کے دو معاون عورت کے جسم پر سوئیاں چبھوتے رہے۔ گرم سلاخوں سے داغتے رہے۔ میرے خیال میں وہ چوبیس پچیس سال کی صحت مند جسم والی عورت تھی مگر اس کی مدافعت کی قوت بالآخر ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے دہکتی سلاخوں پر چیخنا اور تڑپنا چھوڑ دیا تو اسے اتار لیا گیا۔ پیر سائیں اپنے معاونین کی طرف دیکھ کے فخر سے مسکرائے۔ ”بڑا کمینہ اور سرکش جن تھا۔ مارا گیا۔“

میرا سانس اوپر کا اوپر تھا اور نیچے کا نیچے۔ میرا خیال نہیں یقین تھا کہ جن نہیں، عورت کے جسم سے جان نکال لی گئی ہے۔ وہ یقیناً مرچکی تھی۔ جیسے تھانوں میں بعض اوقات تشدد کی تاب نہ لا کے حوالات میں مرجاتے ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حوالات میں ازاربند سے خودکشی کرلی۔ تفتیشی رپورٹ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

ایک سوال میرے دماغ میں ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کیا یہی میرے ساتھ ہوگا؟ میرے اندر سے فریدالدین عرف خاور عرف ملک سلیم کی سرکش روح کو جن کی طرح نکالا جائے گا؟ علاج کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا تھا۔ دماغ اور جسم دونوں کی بغاوت ختم کر کے اطاعت گزاری پیدا کی جائے۔ یا خدا... میں کس شیطانی دنیا میں آگیا۔ یہاں ایک عورت چاہتی ہے کہ میرے جسم کے ساتھ دماغ پر بھی قبضہ کرلے۔ کیا ایسا ہوگا؟ ہوا تو یہ اس سے زیادہ عذاب ناک ہوگا جو میرے ساتھ سکھر جیل میں ہورہا تھا۔ وہاں میں ایک بار مرتا، یہاں ہر روز مروں گا۔

رہائی کی مجھے کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں خود کو غیر مشروط طور پر ہمیشہ کے لیے شاہینہ کے قدموں میں ڈال دوں۔ اگر میں یہ کرتا تو شاہینہ کو اعتبار کیسے آتا؟ اور صرف زندہ رہنے کے لیے میں یہ ذلت آمیز سمجھوتا کرلیتا تو خود کو منہ کیسے دکھاتا؟ یہ بھی غیر یقینی تھا کہ اس کے بعد میں اپنی زندگی میں خودمختاری حاصل کرلوں گا۔ شاہینہ کے سامنے جھوٹ بولنا اور ڈراما کرنا ہی ناممکن تھا۔ اگر اس نے یہ دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا تو اب میرا پورا علاج ہوگا اور مکمل شفایابی تک مجھے ڈسچارج نہیں کیا جائے گا۔

میں ایسے ذہنی عذاب سے دوچار تھا کہ باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ نہ مجھے انور کا خیال آیا نہ کسی اور کا۔ میں نے تو ریشم کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ یہ نورین سے محبت کرنے کی سزا تھی۔ ابھی تک میرے ارادے میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی کہ شاہینہ میری جان نکال سکتی ہے، اس کی محبت کو میرے دل سے نہیں نکال سکتی۔

صبح تک میں خود کو بیمار محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا دماغ فضول خیالوں میں بھٹک رہا تھا اور میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ رات بھر جاگنے کے دوران میں نے واش بیسن سے بار بار پانی پیا تھا کیونکہ میرا حلق خشک ہورہا تھا اور پھر بار بار کموڈ کا استعمال کیا تھا۔ خالی پیٹ میں مروڑ الگ اٹھ رہے تھے۔ اس اذیت ناک رات کی صبح جیسے کئی راتوں کی مسافت پر تھی۔ صبح کا اجالا اترا تو میں نے وہی دیوانوں کی دنیا دیکھی۔ ان پر جن بھوت کا اثر تھا۔ میرے دماغ پر نورین کے عشق کا بھوت سوار تھا۔

صبح ایک مرید میرے لیے ناشتے کی ٹرے لے کر آیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ ترجیحی سلوک ہے۔ باقی سب قیدی کسمپرسی میں پڑے تھے اور ہاتھ بڑھا کے یا چلّا کے اور اشاروں سے کچھ کھانے کو مانگ رہے تھے۔ میں ناشتا لانے والے کی طرف نہیں ان بھوکے جانوروں کی طرف دیکھ رہا تھا جو پنجروں میں بند تھے۔

اچانک ملازم نے کہا۔ ”ملک صاحب! ناشتا کرلیتا۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کیا یہ بی بی کا حکم ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”چھوٹی بی بی کا... دن میں کھانا بھی کھانا ہے اور رات کو بھی... مجھے پہچانا آپ نے؟“

میں نے کہا۔ ”تم کون ہو؟ صورت دیکھی ہوئی لگتی ہے۔“

”میں سلونی کا بھائی ہوں۔“ وہ بولا۔

میرے ذہن میں بجلی سی چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ سلونی نے کہا کہ باپ تو مرچکا مگر ایک بھائی ہے جو پیر سائیں کی درگاہ پر ان کا مرید ہوگیا ہے۔ اس کی صورت کے نقوش سلونی سے بہت ملتے تھے۔

”چھوٹی بی بی نے کہا ہے کہ رات کو تیار رہنا۔“

میں چونکا۔ ”چھوٹی بی بی! کون چھوٹی بی بی... روزینہ؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ریشم بی بی نے ایک رقعہ دیا ہے آپ کے لیے۔“ اس نے جیب سے تعویذ بنا ہوا کاغذ نکالا اور مجھے پکڑا دیا۔

اسی وقت کسی نے چلّا کے کہا۔ ”اوئے نمونے... حرام زادے... جہاں جاتا ہے بکواس کرنے بیٹھ جاتا ہے...“

وہ ایک دم پلٹا اور اوپر جانے والے راستے پر چڑھ گیا۔ غائب ہونے سے پہلے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

نقب زن

تنویر ریاض

ہر شخص کے نزدیک کوئی ایک چیز ایسی ضرور ہوتی ہے جو بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ چاہے وہ محبت کی نشانی ہو... یا کسی عقیدت یا چاہت کے جذبے سے منسلک ہو... اسے بھی اپنی انگوٹھی عزیز تھی جو اچانک ہی اس کی دسترس سے نکل گئی۔

حسینوں کے جھرمٹ میں رہنے والے سراغ رساں کی وارفتگیاں

خوب صورت لڑکیاں میری کمزوری ہیں لیکن میرا پیشہ ایسا ہے کہ مجھے ہر طرح کے گاہک سے نمٹنا ہوتا ہے، خواہ وہ خوب صورت ہو یا بدصورت، کالا ہو یا گورا، بوڑھا ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، میرے لیے سب برابر ہیں۔ لیکن وہ عورت اتنی خوب صورت اور دلکش تھی کہ میرے لیے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ دل نشیں مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”تم ہماری فرم کے لیے کام کرچکے ہو اس لیے تمہارا نام ہی میرے

ذہن میں آیا۔"

وہ اگر چاہتی تو مجھے اپنے دفتر میں بھی بلا سکتی تھی لیکن اس کے بجائے وہ خود ہی میرے دو کمروں کے سوئٹ واقع براڈوے پر آگئی۔ وہ گوبر نیورلین پارٹنرز میں کام کرتی تھی۔ یہ ایک مالیاتی کمپنی تھی جو عالمی مارکیٹ میں کام کرتی تھی۔ اس کی سرگرمیوں میں یورو بانڈ، سونے اور حصص کی خریداری شامل تھی۔ وہ کمپنی کسی بھی نئے ملازم کو رکھتے وقت اس کا پس منظر جاننے کے لیے میری خدمات حاصل کیا کرتی تھی۔ دو سال پہلے میں نے اس لڑکی کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں، اس کا نام الزبتھ بیل تھا۔ اس کا ریکارڈ بالکل بے داغ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ریاست لووا کی رہنے والی تھی۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی ذاتی کام کے سلسلے میں آئی ہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ اپنی گمشدہ انگوٹھی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔ "میرے پاس اس انگوٹھی کی کوئی تصویر نہیں ہے۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ اس نے اپنے دستانے پہلے ہی اتار دیے تھے۔ اب کوٹ بھی شانوں سے نیچے سرکا دیا۔ میں اس جلوے کی تاب نہ لا سکا اور اپنی نگاہیں نیچی کرلیں۔ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

"اگر تم انگوٹھی واپس لا سکو تو یہ اچھی بات ہوگی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا چارلس نے یہ انگوٹھی چرائی ہے۔"

"کیا وہ قیمتی انگوٹھی ہے؟"

"شاید۔۔۔ تھوڑی بہت۔"

"تمہارے خیال میں اس کی مالیت کیا ہوگی؟" میں نے اصرار کیا۔

"اس کی جذباتی اہمیت زیادہ ہے۔ میری دادی نے لووا میں اسے خریدا تھا۔ یہ سونے کی انگوٹھی ہے جس میں یاقوت لگا ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دادی کو یہ انگوٹھی کہاں سے ملی تھی۔" وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "ایک فیملی فرینڈ نے مجھے ڈنر میں دادی کی انگوٹھی پہنے دیکھا تو میرے ڈیڈی کی طرف مڑی اور چلاتے ہوئے بولی..... ارے یہ تو جپسی کی ہے۔ جب لوگ اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھتے تو میں انہیں یہ قصہ سنا دیتی۔ حالانکہ میری دادی خانہ بدوش نہیں تھیں۔"

"مجھے چارلس کے بارے میں بتاؤ؟"

"وہ ایک مصور ہے۔"

"غریب ہے؟"

"بالکل نہیں۔ اس وقت بھی اس کی تصویروں کی ایک نمائش کلائن گیلری اور دوسری پیرس کی آندرے ویل میں ہو رہی ہے۔"

"پھر وہ تمہاری انگوٹھی کیوں لے گا؟"

"تاکہ اس کے پاس میری کوئی نشانی موجود رہے۔ میں شادی کر رہی ہوں۔"

"یہ شادی چارلس سے نہیں ہو رہی؟"

"نہیں۔ میں جس شخص سے شادی کر رہی ہوں، وہ اخبار میں کام کرتا ہے اور واقعی غریب ہے۔"

"اور وہ تمہاری انگوٹھی نہیں چرائے گا؟"

"ہاں۔ کم از کم میری نہیں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"چارلس نے یہ انگوٹھی کب چرائی؟"

"وہ جمعرات اور جمعے کو میرے گھر رک گیا تھا۔" اس نے اتنی بے پروائی سے کہا جیسے اس میں کوئی برائی نہ ہو۔ "میں نے اتوار کے دن دیکھا کہ نائٹ ٹیبل پر سے انگوٹھی غائب ہے۔"

وہ بدھ کا دن تھا۔ میں نے ایک پیڈ پر تفصیلات لکھنا شروع کردیں۔

"کیا تمہارے گھر صفائی کرنے والی عورت آتی ہے؟ اس کے علاوہ دوسرے دوست جن کا آنا جانا لگا رہتا ہو؟"

"صفائی کرنے والی عورت منگل کو آتی ہے اور اس دوران میں صرف چارلس ہی میرے گھر آیا تھا۔"

"کیا تم نے اس سے انگوٹھی کے بارے میں پوچھا؟"

"وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ مجھے ان دکانوں پر جانا چاہیے جہاں زیورات گروی رکھے جاتے ہیں۔"

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ویسے بھی مجھے لوگوں سے سوال جواب کی عادت نہیں تھی۔ میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ انٹرنیٹ سے ہی ساری معلومات مل جاتیں یا ایک دو فون کرنا پڑتے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آخری بار سامنے بٹھا کر کس کا انٹرویو کیا تھا، سوائے اپنی بیوی کے بوائے فرینڈ کے۔

"کیا تم نے اس بارے میں سوچا کہ اس معاملے کو یہیں ختم کردو؟"

"ہاں، میں نے سوچا تھا لیکن یہ جاننا میرے لیے بہت اہم ہے کہ وہ انگوٹھی کس کے پاس ہے۔"

اس نے اپنا اونی کوٹ اور ہیٹ اٹھایا اور دفتر کی جانب چل دی۔ جانے سے پہلے اس نے میری فیس میز پر

رکھ دی۔ اس لمحے میں تھوڑا سا جذباتی ہوگیا اور میرے دل میں خواہش ابھری کہ مس بیل کو آنے والے خطرے سے آگاہ کردوں اور اسے کہوں کہ وہ معاملے کو یہیں ختم کردے ورنہ سچ جان کر اسے زیادہ صدمہ ہوگا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھ پر پیشہ ورانہ سوچ غالب آگئی اور میں اپنے ارادے پر عمل نہ کرسکا۔

چارلس سورل ایک ماڈل کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھا۔ جب میں ہوسٹن اسٹریٹ پر واقع اس کے اسٹوڈیو پہنچا تو اس کے طویل قامت معاون نے یہ کہہ کر مجھے اندر جانے سے روک دیا کہ کام کے دوران چارلس کسی سے نہیں ملتا لیکن جب میں نے اپنا کارڈ دکھایا تو اس کی ساری اکڑ دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میرا نام مائیکل ہے۔ چارلس ایک نشست میں صرف ڈیڑھ گھنٹا کام کرتا ہے اور وہ اب فارغ ہونے والا ہے۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ بیل کی انگوٹھی گم ہونے کا سن کر افسوس ہوا۔"

"تم اس انگوٹھی کی گمشدگی کے بارے میں جانتے ہو؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "بیل بہت پُرعزم لڑکی ہے۔ اس نے گزشتہ رات چارلس کے گھر کی تلاشی لی تھی۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔ چارلس تمہیں اس بارے میں بتائے گا۔"

کچھ دیر بعد ماڈل پسینا پونچھتی ہوئی باہر نکلی اور کوٹ پہن کر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چارلس بھی آیا اور اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ قد میں اپنے معاون سے چھوٹا تھا۔ اس کے جبڑے چوڑے اور بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی جھلک رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تقریباً میری ہی عمر کا ہوگا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی خوش مزاجی سے بولا۔

"شکر ہے کہ صرف تم ہی آئے ہو ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ پولیس نہ بھیج دے۔"

"تم مجھے بالکل بھی پریشان نہیں دکھائی دے رہے۔"

"اگر وہ مجھ سے علیحدہ ہونا چاہ رہی ہے تو کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ پہلے بھی ایسا ہوچکا ہے۔ تاہم مجھے اس پر بالکل بھی غصہ نہیں آیا جب اس نے مجھ سے اس فضول سی انگوٹھی کے بارے میں پوچھا۔ شاید وہ کسی غلط جگہ پر رکھ کر بھول گئی ہے۔ وہ ذہین تو ہے لیکن بدسلیقہ بھی ہے۔"

"اس کا خیال ہے کہ تم ایک نشانی چاہتے تھے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ وہ تھوڑی سی بے وقوف ہے اور سمجھتی ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں۔ ہم ایک سال تک ساتھ رہے۔ تین یا چار ماہ قبل اس نے مجھے اس شخص کے بارے میں بتایا جس سے وہ واشنگٹن میں ملی تھی۔ اب بیل نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔"

"تم نے جمعرات اور جمعے کی راتیں اس کے گھر پر گزاریں؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، سنیچر کی دوپہر تک میں وہیں تھا۔ اکثر اختتام ہفتہ وہ اس شخص سے ملنے واشنگٹن جایا کرتی تھی۔ ورنہ کبھی کبھی ہمیں بھی ساتھ رہنے کا موقع مل جاتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔"

"کیا تم نے اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھی تھی؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی اس کی جانب توجہ نہیں دی۔ میں خوبصورت چیزوں کی تصویر بناتا ہوں۔ وہ انگوٹھی میرے لیے کچھ خاص نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ اس کی دادی نے دی تھی اور کسی نے اسے خانہ بدوشوں کی انگوٹھی کہا تھا۔ کیا اس نے تمہیں یہ بات بتائی؟"

"ہاں۔"

"اسی لیے اسے وہ انگوٹھی بہت عزیز ہے۔"

"نقب زنی کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"میرا اپارٹمنٹ اسی عمارت میں ہے۔ کسی نے گزشتہ رات نقب لگائی۔ میں ایک پارٹی میں گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بس تھوڑی سی رقم چلی گئی۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس میں بیل کا ہاتھ ہے؟"

"میرا فوری ردِعمل یہی تھا لیکن بعد میں ٹھنڈے دل سے سوچا تو میرا خیال بدل گیا۔ بیل کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کسی نقب زن کی خدمات کیسے حاصل کی جاسکتی ہیں اور وہ کبھی ایسا خطرہ مول نہیں لے گی۔ تم جانتے ہو کہ گزشتہ سال اس کی آمدنی مجھ سے بیس گنا زیادہ تھی جبکہ میرے لیے بھی وہ سال بہت اچھا رہا تھا۔ ایک انگوٹھی کی خاطر وہ یہ حرکت نہیں کرسکتی۔"

میں نے واپس آکر بیس منٹ تک انٹرنیٹ پر کلائن اور ویل نامی گیلریوں کی ویب سائٹ دیکھی۔ چارلس کی تقریباً تمام تصاویر فروخت ہوچکی تھیں۔ صرف ایک چھوٹی

www.paksociety.com

سی تصویر باقی رہ گئی تھی جس میں ماڈل کو تقریباً عریاں حالت میں دکھایا گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اہل فرانس کا ذوق تبدیل ہو گیا ہے جو یہ تصویر ابھی تک فروخت نہیں ہو سکی؟ مجھے پورا یقین تھا کہ اس تصویر کی ماڈل ایلزبتھ بیل نہیں تھی۔ ساتھ ہی یہ پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اب میری عمر آرٹ اسکول میں داخلہ لینے کی نہیں رہی۔

میں بیل کو ٹیلی فون کرنے کے لیے جواز تلاش کر رہا تھا۔ گو کہ میرے پاس اسے بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا لیکن میں اس سے یہ تو کہہ سکتا تھا کہ کیوں نہ آج رات ہم ایک ساتھ ڈنر کریں تاکہ اس معاملے کے مزید پہلوؤں پر گفتگو کی جا سکے لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوسری جانب سے ویزلی بیرمین بول رہا تھا۔

''اب تک تم ہمارے لیے جو کچھ کرتے رہے ہو، یہ معاملہ اس سے تھوڑا سا مختلف ہے۔''

وہ گوویر نیورلین پارٹنرز نامی فرم کا چیئرمین تھا۔ مجھے اس کمپنی سے مستقل کام ملتا رہتا تھا لہٰذا اس کی ٹیلی فون کال کو نظر انداز کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔۔۔۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ فوراً اس کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں اس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ مس بیل بھی یہیں کام کرتی تھی لیکن میں اسے ابھی تک دیکھ نہیں سکا تھا۔

''ہمارا ایک ملازم یہاں سے کچھ چرا رہا ہے۔'' ویزلی نے بھاری آواز میں کہا۔ ''ہم پولیس کو بلانا نہیں چاہتے۔ ہمارے تمام سافٹ ویئر ہماری ملکیت ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ کوئی حریف انہیں ہمارے خلاف استعمال کرے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''کیا تمہارا کوئی سافٹ ویئر گم ہو گیا ہے؟''

''گم نہیں ہوا، چرایا گیا ہے اور شاید اسے کسی حریف کو بیچ دیا گیا ہو۔''

''یہ کس قسم کا سافٹ ویئر تھا؟''

''ہم انتہائی تیز رفتار تجارت کرتے ہیں اور اس معاملے میں دوسروں سے بہت آگے ہیں کیونکہ ہماری پروگرامنگ ان سے بہت بہتر ہے۔ حصص کے کاروبار میں ایک ایک سیکنڈ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ سافٹ ویئر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہونے والی قیمت میں تبدیلی کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ خواہ وہ آدھے سینٹ کی کیوں نہ ہو۔ تم سوچ سکتے ہو کہ چوبیس گھنٹے میں اس کی کارکردگی کیا ہوگی؟''

''اس طرح تو تمہیں خوب آمدنی ہوتی ہوگی؟''

''ہاں بہت زیادہ۔ ہر روز اسٹاک ایکس چینج میں ستر فیصد کاروبار تیز رفتار ٹریڈنگ سے ہوتا ہے۔ ہم دن میں ہزاروں مرتبہ اس سافٹ ویئر کی مدد سے حصص کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اس تیز رفتاری میں ہمارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس میں کوئی خطرہ ہے۔ یہ ایک شاندار کاروبار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا عملہ مسلسل حساب کتاب میں مصروف رہتا ہے۔ ان میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کے مطابق حسابی ماڈل تیار کر سکیں۔ ہم انہیں غیر معمولی تنخواہ دینے کے علاوہ فرم کے منافع میں سے بھی حصہ دیتے ہیں۔''

اس نے میز کی دراز سے ایک سبز رنگ کی فائل نکالی اور بولا۔ ''یہ اسٹین ایلسٹن کی فائل ہے۔ جب ہم نے اٹھارہ ماہ پہلے اسے ملازمت دی تو تم نے ہی اس کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔''

میں نے فوری طور پر کچھ کہنے سے گریز کیا تو ویزلی بولا۔ ''عمر اٹھائیس سال۔ حساب میں پی ایچ ڈی۔ ہر اتوار کو چرچ جاتا ہے۔ معمولی خاندانی پس منظر۔ جلد دولت مند بننے کا خواہش مند۔''

''مجھے تو یہ تمہارے جیسا شخص لگتا ہے۔''

ویزلی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت رہتی ہے جو زندہ رہنا چاہیں اور پیسوں کے لیے سانس لیں تاکہ پینتیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ان کے بینک اکاؤنٹ میں دو کروڑ ڈالرز جمع ہو جائیں۔''

''تمہارے خیال میں اس سافٹ ویئر کی قیمت کیا ہوگی؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ہماری کمپنی نے گزشتہ برس اس سافٹ ویئر کے ذریعے پچیس کروڑ ڈالر کمائے۔ اس سے تم اس کی قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔''

''یعنی اسٹین ایلسٹن کی آمدنی سے زیادہ۔''

''تمہارا حساب بہت کمزور ہے۔'' وہ چڑتے ہوئے بولا۔ ''اس سافٹ ویئر کی قیمت میری آمدنی سے بھی زیادہ ہے۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک سوئٹ میں لے گیا جس کی کھڑکیوں سے ایسٹ ریور کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اس جگہ ایسی کوئی خاص بات نہ تھی جو میرے مشاہدے سے نہ گزری ہو۔ وہاں ایک درجن سے زیادہ میزیں پڑی ہوئی تھیں جن پر کمپیوٹر کے مانیٹرز رکھے ہوئے تھے لیکن مجھے وہاں ایسی کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ کمپنی سال میں پچیس کروڑ منافع کماتی ہے۔

''یہ کمپیوٹر ہماری حساب کتاب کے لیے رکھے گئے ہیں۔'' ویزلی ایک اور دروازے میں اپنا کارڈ پھیر کے

اندر چلا گیا اور ساتھ ہی اس نے مجھے دروازہ پکڑنے کا اشارہ کیا جو تیزی سے واپس آ رہا تھا۔ دروازے کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت سلیٹی کوٹ اور سیاہ پتلون پہنے کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ ان کا تعلق اندرونی سیکیورٹی سے تھا اور وہ کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھے تینوں افراد کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایلزبتھ بیل تھی لیکن اس نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

''اسٹین آج نہیں آیا۔'' ویزلی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''وہ کل بھی جلدی چلا گیا تھا۔ اس کے معدے میں درد ہو رہا تھا۔ وہ اپنا لنچ بھی یہیں پر چھوڑ گیا۔ جس سیکیورٹی پروگرام کے ذریعے سسٹم کی نگرانی کی جاتی ہے، وہ بھی خاموش ہو گیا تھا اور اس کے جانے کے چالیس منٹ بعد اس کا الارم بجا۔ میرا خیال ہے کہ ایلزبتھ بہتر طریقے سے وضاحت کر سکتی ہے۔''

وہ مجھے ایلزبتھ کی میز پر لے گیا اور اس سے میرا تعارف کروایا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔ ویزلی نے اس سے کہا۔ ''مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ بتا دیا ہے۔ باقی تفصیل تم بیان کر دو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اسٹین نے سیکیورٹی سسٹم کو ناکارہ بنا دیا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں جان سکے کہ سافٹ ویئر کاپی یا چوری ہو رہا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری سیکیورٹی فول پروف ہے لیکن اسٹین ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔''

''اس نے سیکیورٹی کو ہی سلا دیا۔'' ویزلی نے بیزاری سے کہا۔

''تم نے کل کے بعد اسٹین ایلسٹن کو نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی؟''

''بالکل۔ ٹوبی فورسٹر اور میں فوراً ہی اس کی تلاش میں گئے۔ ٹوبی اس کمپنی کا چیئرمین تھا۔ اس وقت اسٹین کو گئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا۔ ہمارا سیکیورٹی گارڈ کین بھی ساتھ تھا لیکن ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اسے تلاش کرنا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔''

''باہر جانے سے کیا مطلب ہے؟ کیا تم اس کے اپارٹمنٹ گئے تھے؟''

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم جان کینیڈی ائرپورٹ پر گئے تھے کہ شاید ملک سے فرار ہونے سے قبل اسے پکڑ سکیں لیکن وہ دوسرے راستوں سے بھی باہر جا سکتا ہے۔ اگر اسٹین نے ہمارا پروگرام باہر بھیج دیا ہے تو وہ خود بھی نکل جائے گا۔ اس سے پہلے اسے گرفتار ہو جانا چاہیے، بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔ اگر اس نے وہ پروگرام روسیوں یا ایرانیوں کے ہاتھ فروخت کیا ہے تو شاید وہ زندہ نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے میں بھی وہی کرو جو عام طور پر کیا کرتے ہو۔۔۔ یعنی خاندانی پس منظر۔ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔ اس کی نقل و حرکت کا ریکارڈ چیک کرو۔ اس کے دوستوں سے ملو۔ اگر اس نے کسی مقامی فرم کو وہ پروگرام فروخت کیا ہے تو ہم عدالت کے ذریعے اسے روک دیں گے۔ میں ایک ٹیلی کانفرنس کرنے والا ہوں۔ اس میں غیر ملکی لوگ بھی موجود ہوں گے۔ اگر وہ کسی دوسرے ملک میں ہے تو وہ اسے تلاش کر لیں گے۔''

''کیا تم نے اس کا اپارٹمنٹ چیک کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہم گزشتہ شب گئے تھے۔ اسٹین کہیں دور چلا گیا ہے۔ اس کی بیوی بھی بہت پریشان تھی۔ اس نے ہمیں کبھی پسند نہیں کیا۔''

''ہمیں۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''کرنسی کا کاروبار کرنے والے۔ اگر تمہیں مزید کچھ پوچھنا ہے تو ایلزبتھ تمہاری مدد کرے گی۔''

ویزلی کو جانے کی جلدی تھی۔ دونوں سیکیورٹی والے بھی اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ گھوڑا چوری ہو چکا تھا اور ایلزبتھ مجھے خالی اصطبل دکھا رہی تھی۔

''کیا تمہاری انگوٹھی ابھی تک نہیں ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اسے تم ہی تلاش کرو گے۔''

''تمہیں اپنے دفتر میں دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔''

''میں بہت سوچ سمجھ کر تمہارے پاس آئی تھی۔ جانتی تھی کہ یہاں ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ پھر چارلس نے مجھے بتایا کہ گزشتہ شب کسی نے اس کے گھر پر نقب لگائی ہے تو میرے لیے ضروری ہو گیا کہ کسی ایسے شخص سے رابطہ کروں جو اس معاملے کو ہر زاویے سے دیکھ سکے۔''

''گویا اس نقب زنی میں تمہارا ہاتھ نہیں؟''

''نہیں۔ یہ کسی ایسے شخص کا کام لگتا ہے جسے میرے اور چارلس کے تعلقات کا علم ہے۔ غالباً اسے کسی ثبوت یا اس سافٹ ویئر کی تلاش تھی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے

اسٹین ایلسٹن کی مدد کی ہے۔"
"وہ شخص کون ہوسکتا ہے..... ہیر مین؟"
"اس کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہے۔ اگر خریدار کو معلوم ہو جائے کہ اس کے ہاتھ کیا چیز لگ گئی ہے تو اس کے وارے نیارے ہوجائیں گے۔ وہ اس سے کم از کم پانچ کروڑ یا دگنا بھی کما سکتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اسے کتنی اچھی طرح استعمال کرتا ہے۔"
"کیا اسٹین نے ہی یہ پروگرام ڈیزائن کیا تھا؟"
"نہیں۔" اس نے کمپیوٹر کے پاس بیٹھے ہوئے مرد اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کارنامہ مائیک اور سوزن نے انجام دیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ انہوں نے اس پروگرام کو بہتر بنایا ہے جو وہ اپنی پہلی کمپنی میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اس کمپنی کا روبار کی نوعیت ہم سے مختلف ہے۔ وہ میوچل فنڈ اور پنشن فنڈ کی خریداری میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"
"میرا خیال ہے کہ یہ غیر قانونی ہے۔"
"ہاں بشرطیکہ آپ احمق ہوں۔ بڑے کھلاڑی احمق نہیں ہوتے۔ آؤ، میں تمہیں کچھ اور دکھاؤں۔" وہ ایک بڑے ہال سے گزرتی ہوئی ایک شیشے کی دیوار کے پاس لے گئی اور بولی۔ "تمہیں بائیں جانب اسٹاک ایکس چینج کی عمارت نظر آرہی ہے..... تمہارے خیال میں اس کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہوگا؟"
میں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ دوسو گز۔"
"اسے دگنا کرلو۔ تم بھول رہے ہو کہ ہم اٹھائیسویں منزل پر ہیں۔ اگر ہم ایکس چینج سے منسلک ہونا چاہیں تو اس کے لیے بہت زیادہ وائرنگ کی ضرورت ہوگی۔ کچھ حصص صرف ایک سیکنڈ کے لیے نمودار ہوتے ہیں۔ جو بھی پہلے ان تک پہنچ جائے، وہی فائدے میں رہتا ہے۔ کئی کمپنیوں نے اپنے کمپیوٹر ایکس چینج میں ہی لگا رکھے ہیں لیکن ہمیں اس میں خطرہ محسوس ہوتا ہے اس کام کے لیے ہمارا سافٹ ویئر بہترین ہے اور ہم اس کے ذریعے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بھی کاروبار کرسکتے ہیں۔"
میں نے اپنے ذہن میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا تصور کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں نے اپنا سر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔ "اسٹین ایلسٹن کے جانے کے بعد کاروبار کی کیا صورت حال ہے؟"
"فی الحال تو معمول کے مطابق ہے۔ نئے کھلاڑی کو یہ سافٹ ویئر ہمارے خلاف استعمال کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔"
"تمہارے خیال میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟"
"ایک یا دو دن لگ سکتے ہیں۔ پہلے تو اسٹین انہیں بتائے گا کہ وہ اپنے ہارڈ ویئر کو کس طرح نئے سرے سے ترتیب دیں پھر وہ سافٹ ویئر انہیں استعمال کرنے کے لیے دے گا۔"
"کیا تم بھی اسٹین کے ساتھ کام کررہی تھیں؟"
"نہیں، میں دوسرے کام میں مصروف تھی۔ ورنہ اسٹین کے ساتھ ہی ہوتی۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ تم نے سنا نہیں کہ ویزلی کیا کہہ رہا تھا۔ اسٹین مارا جاسکتا ہے۔ میں اس قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔"
اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور ہم شائن نامی ریستوران میں چلے گئے جو اپنی کامیابی کا جشن منانے والے کاروباری لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہاں موجود ہر شخص جیت کر آیا ہے۔ میں ان لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کوک سے دل بہلانے لگا اور ایلزبتھ مجھے اسٹین کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ اس کی بیوی سے کبھی نہیں ملی تھی اور نہ ہی اسٹین سے اس کی دوستی تھی۔ وہ دفتر کے دوسرے ساتھیوں مائیک اور سوزن سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔
"وہ اپنے آپ کو جوان ظاہر کرتا ہے۔" بیل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اور بعض اوقات لڑکوں جیسی حرکتیں کرتا ہے جو احمقانہ لگتی ہیں۔"
"تمہیں اس مسئلے کے بارے میں کب علم ہوا؟"
"گزشتہ سہ پہر جب سیکیورٹی پروگرام خاموش ہوگیا تو چند سیکنڈ بعد ہمیں معلوم ہوگیا کہ سافٹ ویئر چوری ہوگیا ہے۔"
مجھے کمپیوٹر سیکیورٹی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ پتا لگایا جاسکتا ہے کہ یہ سافٹ ویئر کسے منتقل ہوا؟"
"صرف ورچوئل ایڈریس سے پتا لگایا جاسکتا ہے لیکن وہ بھی غائب ہوگیا۔ یہ صرف اتنی دیر موجود رہتا ہے جب تک ہمارا پروگرام اس پر منتقل نہ ہوجائے پھر بند ہوجاتا ہے۔"
"تم نے اس کا محلِ وقوع معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟"
"نہیں۔ جیسے ہی یہ مسئلہ سامنے آیا، ویزلی نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس وقت سافٹ ویئر گروپ کا ہر فرد مشتبہ سمجھا جارہا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کچھ معلوم نہیں کرسکے گا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کردیا اور کین کے ساتھ اسٹین کو پکڑنے ائرپورٹ چلا گیا۔"

ایلزبتھ نے اپنا کوٹ اتار دیا تھا۔ خوب صورت سبز لباس میں وہ اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر باہر کی جانب دیکھنا شروع کردیا۔ وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "کیا تم اس کی بیوی سے ملنے جاؤ گے؟"
"ہاں، میرا خیال ہے وہیں سے شروع کرنا بہتر ہوگا۔"
میں نے اسٹین کی فائل نکالی اور اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس علاقے میں واقعی دوسری کمپنیوں کے بارے میں جانتی ہو جو یہی کاروبار کرتی ہیں؟"
"اچھی ساکھ والی کمپنیوں کے بارے میں تھوڑا بہت پتا ہے لیکن سب کے بارے میں نہیں جانتی۔"
"میں روسیوں اور ایرانیوں کی بات نہیں کررہا۔ تمہارے خیال میں کون سی مقامی کمپنی یہ سافٹ ویئر چرا سکتی ہے؟"
"بہت سی کمپنیاں مائیک، سوزن یا مجھے اچھی تنخواہ پر بلا سکتی ہیں لیکن اسٹین کو ساتھ ملانے کا مطلب ہے کہ یہ معاملہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ویزلی نے کہا کہ ہم عدالت کے ذریعے مقامی کمپنیوں کو یہ سافٹ ویئر استعمال کرنے سے روک سکتے ہیں۔ ان کے اثاثے ضبط ہوسکتے ہیں اور ان سے ہرجانہ طلب کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم ان باتوں پر غور کرو تو یہی لگتا ہے کہ اس سافٹ ویئر کا خریدار غیر ملکی ہے۔"
"جب گزشتہ روز اسٹین کی طبیعت خراب ہوئی تو تم اس کے پاس ہی تھیں؟"
"ہاں۔" وہ اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے بولی۔ "اس کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ وہ کافی دیر تک ردی کی ٹوکری پر جھکا رہا۔ بعد میں مائیک نے اس جگہ کی صفائی کی۔"
وہ چند منٹوں کے لیے اپنے دفتر گئی۔ میں سڑک پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ واپس آئی تو میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی سب وے یا بس اسٹینڈ کی طرف جائے گی لیکن وہ شائن کے باہر کھڑی کسی کا انتظار کرتی رہی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد اس کا سابق بوائے فرینڈ چارلس آیا اور وہ ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے ایک جانب چل دیے۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک کشتی میں سوار ہوگئے جو جنوب کی طرف جارہی تھی۔ میں نے شیڈول پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ کشتی بیٹری کی طرف جارہی ہے۔
میں اپنے دفتر واپس آگیا اور اسٹین ایلسٹن کی فائل دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ مقروض تو نہیں تھا۔ اس نے اپنے کریڈٹ کارڈ کا بل بھی ادا کررکھا تھا۔ اس کے ریکارڈ کا بغور جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کسی قسم کی مالی پریشانی میں مبتلا نہیں تھا۔
چھ بجے میں گھر جانے کے ارادے سے اٹھا۔ صبح میں نے بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ ڈنر گھر پر ہی کروں گا لیکن ایلسٹن کی بیوی سے ملنا بھی ضروری تھا لہٰذا میں نے اس کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں لیسی ایلسٹن کی ماں، بھائی شامل تھے جو اس کی دل جوئی کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک الگ کمرے میں لے گئی اور بولی۔ "میرے بھائی کو ڈر ہے کہ اگر ہم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ میری وجہ سے گیا ہے۔"
"تمہاری اس سے فون پر بھی بات نہیں ہوئی؟"
"نہیں۔" وہ لیونگ روم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں اتنی پریشان ہوں کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ تم اس کے مالک کے لیے کام کررہے ہو لیکن انہوں نے مجھے کل کچھ نہیں بتایا سوائے اس کے کہ وہ اسٹین سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ عجیب و غریب قسم کے سوالات کررہے تھے۔ مثلاً وہ کہاں گیا ہے؟ اس کے دوست کون ہیں؟ کیا ہم اس کی چیک بک دیکھ سکتے ہیں؟ اس کا فون کہاں ہے؟"
"ان کا خیال ہے کہ اسٹین نے وہ سافٹ ویئر کسی کو فروخت کردیا ہے۔"
"وہ ایسا نہیں کرسکتا۔" اس نے ایک بار پھر لیونگ روم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔"
ہم لیونگ سے گزرتے ہوئے کچن تک پہنچے۔ اس نے میرے لیے کافی نکالتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔"
"تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا؟"
"سات سال۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں، وہ ایمان دار شخص ہے اور کبھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔"
"ہوسکتا ہے کہ کسی نے اس کے ساتھ چال چلی ہو۔"
"وہ اتنا سادہ لوح نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا کوئی دوست اس کے کام کے بارے میں جانتا ہے پھر کون اس کے ساتھ چال چلے گا؟"
"کیا دفتر میں اس کے کسی کے ساتھ تعلقات تھے؟"
"شروع میں اس نے کوشش کی تھی لیکن جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ سب کھوکھلے لوگ ہیں۔ اسٹین کو موسیقی سے گہری

دلچسپی ہے اور ہم دونوں کے قریب آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی جبکہ اس کے ساتھ کام کرنے والے انتہائی بدذوق لوگ ہیں اور موسیقی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ صرف پیسوں کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں۔"

ایک طویل قامت سیاہ بالوں والا شخص لیونگ روم سے برآمد ہوا۔ وہ غالباً لیسی کا بھائی تھا۔ اس نے میری طرف متوجہ ہوئے بغیر تیز لہجے میں کہا۔ "لیسی!"

"کوئی خاص بات نہیں۔ یہ اپنے باس کی طرف سے کچھ مزید سوالات کرنے آئے ہیں۔"

"تمہیں ان لوگوں کے بجائے پولیس سے بات کرنا چاہیے۔"

"میں چند سیکنڈ میں فارغ ہو رہی ہوں۔ تم جا کر مما کے پاس بیٹھو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "میری خواہش تھی کہ اسٹین ان لوگوں کے ساتھ کام نہ کرتا۔"

لیونگ روم سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ لیسی مجھ سے معذرت کر کے چلی گئی۔ میں نے کچن کا جائزہ لیا۔ وہاں بہت سارے کیبنٹ لگے ہوئے تھے۔ میں نے سنک کے نیچے جھانکا اور میرے ذہن میں گھنٹوں سے جو کچھ چل رہا تھا، اس کی تصدیق ہو گئی۔

لیسی واپس آئی اور بولی۔ "میں تم سے صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا کمپنی چاہتی ہے کہ یہ معاملہ پولیس کے علم میں لایا جائے کیونکہ وہ مجھے اس کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔"

"شاید نہیں۔"

"پھر مجھے بتاؤ کہ کل کیا ہوا تھا؟ کیونکہ ان لوگوں نے تو کچھ نہیں بتایا۔"

"لنچ ٹائم میں تمہارے شوہر کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ دفتر سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سیکیورٹی سسٹم نے اطلاع دی کہ فرم کا ایک سافٹ ویئر چوری ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کسی نے اسٹین کو نہیں دیکھا۔"

"کیا اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی؟ کسی نے اسپتال جا کر دیکھا؟ ان لوگوں کو مجھے یہ بات بتانا چاہیے تھی۔"

"کیا اسٹین پہلے سے بیمار تھا؟"

"نہیں۔"

"کیا تمہیں چوہوں سے کوئی پریشانی ہے؟"

"ہم اسٹین کی بات کر رہے تھے، یہ چوہے بیچ میں کہاں سے آگئے؟"

"وہ اپنا کھانا بھی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اسے فلو ہو گیا ہے۔ تم لوگوں کو اسپتالوں سے معلوم کرنا چاہیے۔"

"وہ تو ہم ضرور کریں گے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

میں نے ایلزبتھ کا سیل نمبر ملایا تو پس منظر میں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ کسی ریستوران میں بیٹھی ہو۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دفتر میں فلو پھیل رہا ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔" میں نے اس کی آواز میں بے چینی محسوس کی جیسے میں نے اس کے خوش گوار لمحات میں مداخلت کی ہو لیکن اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اسٹین کو فلو ہو گیا تھا۔"

"تم کہاں پر ہو؟ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

وہ دونوں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس میز پر کسی تیسرے فرد کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا میں اس کے برابر والی میز پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں چوہوں کو دیے جانے والے زہر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

ایلزبتھ نے ارد گرد نگاہ دوڑائی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "کیا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اس کے کھانے میں کوئی زہریلی چیز ملی ہوئی تھی یا پھر کسی نے اسے زہر دیا ہے۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے؟" ایلزبتھ نے پوچھا۔

"میں نے اس کے گھر کا کچن چیک کیا ہے۔ آج کل جو چوہے مار دوا استعمال ہو رہی ہے، اس میں زہر کے بجائے ایک ایسا عنصر شامل کیا جاتا ہے جو خون کو جمنے سے روکتا ہے اور چوہوں کے لیے یہ زہر قاتل ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ اسے زہر دیا گیا یا اس کے کھانے میں کچھ شامل تھا، تاہم اسے کوئی ایسی چیز دی گئی جو کافی مؤثر تھی۔ میں راستے بھر یہی سوچتا ہوا آیا ہوں کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔ میرا دھیان تمہاری طرف بھی گیا تھا چارلس۔"

ایلزبتھ نے حیرت سے ہم دونوں کو باری باری دیکھا اور بولی۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے چارلس؟"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "مجھے کیا معلوم۔ تم

خود پوچھ لو۔"

"چارلس کی رسائی ایلسٹن کے کھانے تک نہیں ہو سکتی جب تک تم اس کی مدد نہ کرو۔"

وہ دونوں بری طرح بوکھلا گئے تھے۔ میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی اور بولا۔ "میرے ذہن میں ایک اور بات آئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہارے اپارٹمنٹ میں نقب لگائی گئی ہے۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ہم تینوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوسٹن اسٹریٹ کی جانب روانہ ہو گئے جس عمارت میں چارلس کا اسٹوڈیو اور اپارٹمنٹ تھا۔ وہاں کافی سخت حفاظتی انتظامات تھے اور کسی معمولی چور کے لیے نقب زنی کرنا ممکن نہ تھا۔ ہم پہلے اس کے اسٹوڈیو میں گئے جو چوتھے فلور پر واقع تھا۔

"تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟" چارلس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود تمہارے اپارٹمنٹ میں نقب زنی کی واردات ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا مقصد تھا۔"

"شاید وہ ایلزبتھ کی گمشدہ انگوٹھی کی تلاش میں آئے ہوں۔" چارلس بولا۔

"میں نے کسی چور کی خدمات حاصل نہیں کی تھیں۔" ایلزبتھ چلاتے ہوئے بولی۔ "یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری فرم کسی کو نقب زنی کے لیے کہہ سکتی ہے اگر انہیں یہ شبہ ہو کہ تم بھی اسٹین کے ساتھ سافٹ ویئر کی چوری میں شامل ہو؟"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "شاید یہ حرکت ویزلی کی ہو۔"

"اگر انہیں کسی ثبوت کی تلاش تھی تو یقیناً تمہارا کمپیوٹر بھی ہیک ہو گیا ہوگا۔"

"یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔"

"کیا تم نے اپنا کمپیوٹر چیک کیا تھا؟"

"نہیں۔ میں نے صرف یہ دیکھا کہ اپارٹمنٹ میں سے کچھ پیسے غائب ہیں اور اس سے یہی اندازہ ہوا کہ کوئی شخص نقب لگا کر آیا تھا۔"

"اسٹوڈیو کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے چوری ہونے کا اندیشہ ہو۔ یہاں میں صرف کام کرتا ہوں۔"

میں نے میز پر ایک چھوٹا کمپیوٹر دیکھا۔ "کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"یہ پانچ سال پرانا ہے۔ میں اسے صرف تصویروں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔" چارلس بولا۔

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں فائلیں دیکھ لوں؟"

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

میں ایک کرسی گھسیٹ کر کمپیوٹر کے پاس بیٹھ گیا اور فائلیں دیکھنا شروع کر دیں۔ ایلزبتھ بولی۔ "تم کیا تلاش کر رہے ہو؟ میرے اور چارلس کے خلاف ثبوت؟"

وہ بالکل بھی ناراض یا پریشان نہیں تھی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، مجھے اسی کی تلاش ہے۔"

"نیچے چل کر دیکھتے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

چارلس کے گھر کا کمپیوٹر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس میں پچیس سے زائد ای میلز مٹا دی گئی تھیں۔ اسی طرح مختلف ویب سائٹ سے ایک درجن مضامین ڈاؤن لوڈ کیے گئے تھے جن کا تعلق تیز رفتار کاروبار اور وال اسٹریٹ میں اس کی اہمیت سے تھا۔ ایک مصور کو ان مضامین سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہ بات سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے دوبارہ ای

ہائی اسکول کے طالب علموں سے ٹیچر نے دریافت کیا۔ "کیا تم میں سے کوئی لڑکا بتا سکتا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کی غزلیات کا کن کن غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے؟"

ایک طالب علم نے اٹھ کر کہا۔ "جہاں تک میری معلومات اور میرے مطالعے کا تعلق ہے، میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب کی غزلیات کا ابھی تک اردو میں بھی ترجمہ نہیں کیا گیا۔"

کافی ہے؟

جھکی اور خردماغ شوہر سے بیوی کا جھگڑا ہو گیا۔ بیوی نے غصے میں کہا۔ "ذرا پرے ہٹو!"

شوہر اٹھا اور سفر کر کے تقریباً سوا سو میل چلا گیا، وہاں سے بیوی کو خط لکھا۔ "میں تم سے ہٹ کر سوا سو میل دور چلا آیا ہوں۔ اتنا فاصلہ کافی ہے یا کچھ دور اور ہٹ جاؤں؟"

میلز دیکھنا شروع کیں۔ ان میں زیادہ تر ایلزبتھ نے بھیجی تھیں جبکہ کئی ای میلز کسی نامعلوم شخص کی طرف سے بھیجی گئی تھیں جس کے پتے کے آخر میں آر یو کے حروف درج تھے جس کا مطلب روس ہی ہوسکتا تھا۔ میں نے ایلزبتھ کی ایک ای میل بند کی اور کہا۔

"تمہارا دماغ بہت تیز ہے۔"

"شاید لیکن یہ میں نے نہیں بھیجی۔"

"نقب زن یہاں ثبوت تلاش کرنے نہیں بلکہ نصب کرنے آیا تھا۔" میں نے چارلس سے کہا۔ "وہ تمہارے گھر سے نقد رقم لے گئے تاکہ یہ چوری کی واردات معلوم ہو لیکن بہت جلد پولیس یہاں آکر تمہارا کمپیوٹر چیک کرے گی تو تم پر ہی شک کیا جائے گا۔"

"میں انہیں بتادوں گا کہ یہ سب جعلی ہے۔"

"شاید۔" میں نے ایلزبتھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارے گھر کو بھی چیک کرلیا جائے۔"

چارلس جماہی لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو نیند آرہی ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "تم یہاں محفوظ نہیں ہو۔"

ایلزبتھ کا اپارٹمنٹ بہت شاندار تھا۔ اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور حیران رہ گئی۔ اس کے کمپیوٹر میں چارلس کے مقابلے میں بہت زیادہ مواد تھا۔ "یہ سب......" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں ثابت کرسکتی ہوں کہ یہ سارا کام پانچ منٹ میں ہوا ہے۔"

"شاید تم ایسا کرسکو لیکن تمہیں اس کا موقع نہیں ملے گا۔ اگر اسٹین ایکسٹن کو غائب ہونے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، اسی طرح تم دونوں بھی غائب ہوسکتے ہو۔"

چارلس اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہمارے خلاف ثبوت ڈالے گئے ہیں؟"

"نقب زنی کی کوئی وجہ ہونی چاہیے تھی۔ اگر صرف تمہارے گھر یہ واردات ہوتی تو سمجھا جاسکتا تھا کہ مس بیل نے کسی پیشہ ور چور کی خدمات حاصل کی ہوں گی کیونکہ اسے شک تھا کہ وہ انگوٹھی تمہارے پاس ہے لیکن اسے محض اتفاق نہیں کہا جاسکتا کہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ ایلزبتھ کے گھر میں بھی گھس گئے۔ اس کا کمپیوٹر دیکھنے کے بعد مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ اس میں انہوں نے ایسا مواد ڈال دیا ہے جسے تم دونوں کے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ دوسری اہم بات یہ کہ نقب گزشتہ رات ہوئی یعنی سافٹ ویئر چوری ہونے کے بعد جبکہ ایلزبتھ کی انگوٹھی دو دن پہلے سے غائب ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس میں ویزلی بھی شامل ہے؟" چارلس نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ایلزبتھ کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون سنا اور بولی۔ "ویزلی چاہتا ہے کہ میں دفتر واپس آجاؤں۔"

"اسے کہہ دو کہ تمہیں واپس آنے میں چالیس منٹ لگ سکتے ہیں۔"

مجھے تھوڑی سی چڑچڑاہٹ ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے کوئی اور مجھ سے بھی زیادہ تیزی دکھا رہا ہے۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور گھر کی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے فون کیا۔ حسبِ توقع دوسری طرف سے میری بیوی کے بوائے فرینڈ نے جواب دیا۔ اصولاً تو مجھے اسے گولی ماردینی چاہیے تھی لیکن ہمیشہ یہ سوچ کر برداشت کرتا رہا کہ کھوٹا سکہ بھی کبھی کام آجاتا ہے اور آج وہ وقت آن پہنچا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد فون میری بیوی کو پکڑا دیا۔

اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "شاید تمہیں یاد نہیں رہا کہ آج گھر پر ڈنر کرنے والے تھے۔"

"میں واقعی بھول گیا تھا۔" میں نے صاف جھوٹ بولا۔ ہم دونوں اس طرح کی باتوں کے عادی ہوچکے تھے۔

"اب تم چاہتے ہو کہ میں تم سے ملنے آؤں؟"

"ہاں اگر تمہارے پاس وقت ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے پتا سمجھا دیا۔

ہم نے گوویر نیور لین پارٹنرز کے دفتر کے سامنے سڑک پر ٹیکسی اس طرح کھڑی کی کہ کین اور سیکیورٹی کے دوسرے عملے پر نظر رکھی جاسکے۔ ٹیکسی کا میٹر چل رہا تھا اور ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ایلزبتھ نے باہر کی جانب دیکھا اور جھکتے ہوئے بولی۔

"عمارت کے کونے پر برنیڈا کارل نظر آرہی ہے۔ وہ کین کی معاون ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس معاملے میں کین ملوث ہے؟"

"تم دونوں کے اپارٹمنٹ میں وہی شخص داخل ہوسکتا ہے جو سیکیورٹی کا ماہر ہو اور اگر اسے سائبر سیکیورٹی میں بھی مہارت حاصل ہے تو وہ تمہارے دفتر کے سسٹم کو ناکارہ بنا سکتا ہے۔ کیا تم نے کسی اور کو بھی دیکھا؟"

"نہیں۔"

"ویزلی تو کہیں نظر نہیں آرہا؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی۔ "نہیں۔ تمہارے خیال میں اسٹین کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ وہ جیسے ہی عمارت سے باہر نکلا، کین کے کسی ساتھی نے اسے جھپٹ لیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں کوئی حساب داں تو نہیں ہوں لیکن اتنا اندازہ ضرور ہے کہ جب پچاس سے لے کر سو ملین ڈالرز آمدنی کی توقع ہو تو اسٹین جیسے لوگوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔"

ہمارے عقب میں ایک سیاہ رنگ کی سیڈان بیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ جب ہم پہنچے تو وہ کار پہلے سے وہاں موجود تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہی باہر نکلوں گا۔" میں نے ایلزبتھ سے کہا۔ "وہ تمہیں سڑک پر گولی نہیں ماریں گے۔"

"تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو؟"

"ہمیں ہمیشہ امکانات پر نظر رکھنی چاہیے۔"

ہم دونوں ٹیکسی سے باہر آ گئے جبکہ چارلس ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ کین تیزی سے چلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور اس نے اپنا دستانے والا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ برنیڈا اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ بلیک سیڈان کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد مجھے میری بیوی کی آواز آئی۔ وہ میرے پاس آ کر رک گئی تھی۔ "کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں بات کر رہے تھے؟"

کین نے اس عورت کو پہچاننے کی کوشش کی اور بولا۔ "مادام۔"

اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں چلا گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ دو کے بجائے تین افراد سے بھی بہ آسانی چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا، کلیئر اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا اور اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی سیڈان کار سے دو افراد باہر آئے اور انہوں نے کین کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کا خالی ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ یہ منظر اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" کلیئر اس کی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

کین اور برنیڈا دونوں مسلح تھے۔ ان کی جیبوں سے ہتھیار برآمد ہوئے تو کلیئر نے مجھ سے کہا۔ "انہوں نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ورنہ تمہارے ثبوتوں کی بنیاد پر انہیں فوری طور پر گرفتار کرنا مشکل ہو جاتا۔"

صبح کے تین بجے ایلزبتھ اور چارلس پولیس اسٹیشن سے روانہ ہوئے جبکہ برنیڈا کارل اپنی صفائی پیش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ بیل کی انگوٹھی بھی واپس کر دی جو اس کے کوٹ کی جیب سے گر گئی تھی۔ اس نے اسٹین کے ساتھ بھی کوئی زیادتی نہیں کی پھر پولیس سراغ رساں اس سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ ویزلی کو پولیس اسٹیشن لے کر آئے تو اس کی سانس رک گئی اور اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس سازش کا سرغنہ ویزلی تھا جس نے کین کی مدد سے یہ سافٹ ویئر چوری کیا تاکہ اسے کسی غیر ملکی کمپنی کو بیچ کر لاکھوں ڈالر کما سکے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باوجود اس کے کاروبار کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ غیر ملکی کمپنی اسے اپنے ہی ملک میں استعمال کرے گی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اسٹین کو راستے سے ہٹایا جائے۔

ویزلی نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا کہ اسٹین زندہ ہے اور اسے ایک محفوظ جگہ پر اس لیے قید کیا گیا ہے تاکہ سافٹ ویئر برآمد کیا جا سکے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسٹین کو رہا کر دے گا اور اس کے خلاف پولیس میں سافٹ ویئر کی چوری کی رپورٹ درج کروا کر اسے ایک لمبے چکر میں پھنسا دے گا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے چارلس اور ایلزبتھ کے گھروں میں نقب زنی کیوں کروائی تو اس کا جواب تھا کہ وہ ایلزبتھ کو پسند کرنے لگا تھا اور اس نے اسے شادی کی پیشکش بھی کی تھی لیکن جب وہ دوبارہ چارلس سے ملنے لگی تو اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر ان دونوں کے کمپیوٹر ہیک کر کے ان میں اپنی مرضی کا مواد ڈال دیا۔

اگلے روز مجھ ایلزبتھ نے فون کیا اور کہا۔ "چارلس میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ اس شخص کا نام بتاؤں جس سے میں شادی کرنے والی تھی۔ بتاؤ اسے کیا جواب دوں؟"

"اس سے کہہ دو کہ ایسا کوئی شخص کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آیا۔ تم نے مذاق میں یہ بات کہہ دی تھی۔"

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں نے اپنی بیوی کے جس بوائے فرینڈ کا ذکر کیا تھا، وہ کلیئر ہے۔ جی ہاں... جسے میں کھوٹا سکہ سمجھتا تھا، وہی میرے کام آیا۔ وہ دونوں پانچویں جماعت سے دوست ہیں اور یہ دوستی چالیس سال سے قائم ہے۔ میری بیوی اس پر فدا ہے لیکن کلیئر نے آج تک میری ازدواجی زندگی میں خلل ڈالنے کی کوشش نہیں کی، اس لیے میں بھی اسے برداشت کر رہا ہوں۔

انسانی جسم کو خالی ڈھانچے میں بدل دینے والے خونی معاہدے کا احوال...

حالات و واقعات... اتفاقات و حادثات... بعض اوقات سوچ کی نئی راہیں سجھانے کا باعث بن جاتے ہیں... مشینوں کے اس دور میں ہر دم کوئی نہ کوئی نئی چیز رونما ہوتی رہتی ہے... دورِ جدید میں فکرِ معاش سے آزادی دلانے کا ایک خوفناک حربہ... ایک خاص ماحول میں پروان چڑھتی کہانی کے تقاضے...

کانٹریکٹ

روبینہ رشید
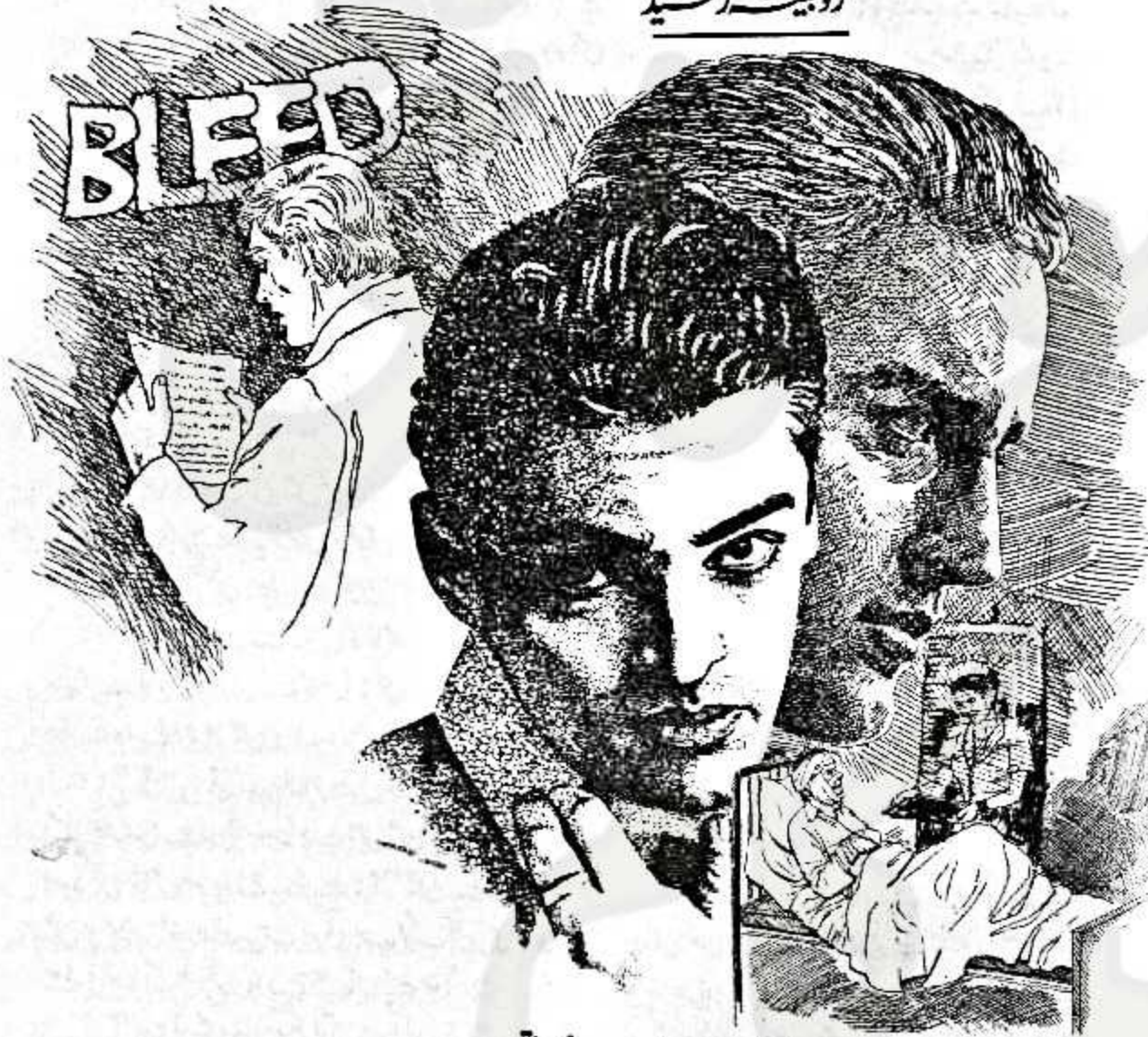
یہ کوئی ماننے والی بات ہی نہیں تھی۔ مگر مارک صبح سے اس پر مصر تھا۔ بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

مارک میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ ہم کئی سالوں سے ایک دوسرے کے پڑوسی بھی رہے ہیں۔ دوستوں کے حلقے میں ہماری دوستی ضرب المثل سمجھی جاتی ہے۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا، اس کا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم تھا۔ اپنے بھورے بالوں، گہری آنکھوں اور پُرمزاح

.......گفتگو کی وجہ سے وہ خواتین کے حلقے میں خاصا ہر دلعزیز تھا مگر اس سے پوچھا جاتا تو مجھے یقین تھا کہ وہ سنہری بالوں والی کسی حسینہ کے مقابلے میں کمپیوٹر گیم کھیلنے کو ترجیح دیتا۔

''مارک! مجھے تو یہ حماقت لگ رہی ہے اور وہ بھی خاصی سنگین۔'' میں نے ڈونر لوٹو ان کارپوریشن کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ ''تم اب بھی سوچ لو۔''

''اس میں سوچنا کیا ہے۔ یار! واقعی بہت مزہ آتا ہے اور پھر فائدہ الگ... یوں سمجھ لو آم کے آم اور وہ بھی گٹھلیوں کے دام۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''یوں بھی مجھے یہاں آئے پورے ساٹھ دن ہو گئے ہیں۔ اب میں دوبارہ کھیل سکتا ہوں۔ یہاں کوئی بھی ممبر ساٹھ دن سے پہلے دوبارہ نہیں کھیل سکتا۔ اس معاملے میں یہ قوانین کی انتہائی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔''

''مجھے تو یہ جگہ ہی آسیب زدہ سی لگ رہی ہے اور پھر یہ سارا سلسلہ... یہ بھی تو کم وحشت ناک نہیں۔'' میں نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

''خوامخواہ، اصل میں تم کچھ زیادہ ہی وہمی ہوتے جا رہے ہو۔ ارے، یہ لوگوں کو خون عطیہ کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ خون عطیہ کرنا ایک اچھی بات ہے۔ اس کا فائدہ ضرورت مندوں کو پہنچتا ہے اور دوسروں کے کام آنا ہی انسانیت ہے۔'' وہ جتانے والے انداز میں بولا۔

''جی... جی... انسانیت کی خدمت ہی تو زندگی کی اصل معراج ہے اور خصوصاً جب اس میں ہزار ڈالرز جیتنے کی امید بھی شامل ہو جائے... ہے نا؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''خدمت یہ تب ہوتی جب لوگ بغیر کسی لالچ اور صلے کی تمنا کے بغیر خون دیتے جیسے کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔''

''ہونا تو یہی چاہیے مگر لوگ ایسا کرتے نہیں ہیں، اسی وجہ سے تو انہیں یہ نیا قانون بنانا پڑا۔ یہ بتاؤ کہ خود تم نے آخری بار خون کا عطیہ کب دیا تھا؟''

''کافی دن ہو گئے، دراصل میں مصروف رہا ہوں اور ٹریفک حادثے کے بعد سے صحت بھی اتنی اچھی نہیں رہی۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''تب تو آرنی... تمہارے پاس بھی سنہری موقع ہے۔'' وہ میری ساری تقریر نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں بھی میرے ساتھ کھیلنا چاہیے۔ کیا کہتے ہو تم؟''

''نہیں مارک! تمہیں معلوم ہے کہ نہ مجھے یہ کھیل پسند ہیں اور نہ ہی سمجھ میں آتے ہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''یہ ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ تم فوراً ہی سیکھ جاؤ گے اور اس میں کچھ خاص کرنا بھی نہیں ہے۔ تھوڑا سا خون دو اور اچھا خاصا پیسا جیت لو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں ہار ہے ہی نہیں... یوں سمجھو کہ ایک بار ہار اور 50 دفعہ جیت... یہ تناسب بنتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ کھیل کسی بھی لاٹری سے بہترین ہے۔''

''مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اسے کیسے چلا رہے ہیں؟ کیسے کر لیتے ہیں یہ سب؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے کبھی سوچا ہے آخر ان کا فائدہ کیا ہے؟ انہیں اتنا پیسا دینے کے بعد کیا بچتا ہے؟ اتنی بڑی عمارت، اخراجات، تنخواہیں سب کیسے پوری ہوتی ہیں؟ اور اگر کچھ بچتا نہیں تو وہ یہ کیوں کر رہے ہیں؟''

''یار! ہمیں ان سوالوں میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''ہمیں تو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔ درخت گننے کا کام دوسروں کے لیے چھوڑ دو۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ کیوں کرتے ہیں؟ اور کیسے کرتے ہیں؟ مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ پچھلی بار جب میں یہاں سے باہر نکلا تو میری جیب میں ہزار ڈالرز کے گرما گرم نوٹ تھے جو میں نے کھیلتے ہوئے کمائے تھے۔ اس بار میں کم از کم تین ہزار کمانا چاہتا ہوں۔'' وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ''اب چلو جلدی۔''

''پاگل پن ہے یہ...'' میں گاڑی لاک کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ اتنی دیر میں وہ کئی قدم آگے نکل گیا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

چند لمحوں میں ہم ایک سجے سجائے استقبالیہ کمرے میں کھڑے تھے۔ یہ عمارت خاصی وسیع و عریض، انتہائی جدید اور ضرورت سے زیادہ صاف ستھری تھی۔ اس میں کہیں کوئی درخت تک نہیں تھا۔ اندر اس استقبالیہ کمرے میں البتہ سجاوٹ کا کچھ سامان موجود تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر کمپیوٹر اور دیگر مشینوں کے ساتھ نقلی پھولوں کا بڑا سا گلدستہ سجایا گیا تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے موجود خاتون بھی قدرے مسکرا رہی تھی۔ اگرچہ کہ اس کی عمر تیس سال کے اوپر ہی تھی مگر اس کے سنہری بال، دلکش آنکھیں اور نازک اندام سراپا ماحول کو دلچسپ بنا رہا تھا مگر مارک کو میرے اندازے کے عین مطابق اس وقت گیم کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے دوبارہ تمہارے

سارے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے اور پھر کانٹریکٹ بنے گا؟'' مارک اس کے پہلے سوال پر ہی جھلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ فوراً گیم کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ اس خوب صورت خاتون کو قدرے غصے سے دیکھ رہا تھا۔

''بالکل نہیں جناب... بالکل نہیں۔'' وہ دوبارہ مسکرائی۔ ''آپ کی تمام تر تفصیلات ہمارے پاس محفوظ ہیں۔'' اس کے جواب پر مارک نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور میری طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبا کر مسکرایا جیسے اس کے غصے کی وجہ سے ہی سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہو۔

''مگر سر! مجھے آپ سے صرف ایک سوال کرنا ہے امید ہے۔ آپ برا نہیں مانیں گے؟'' خاتون نے پوچھا۔

''نہیں... پوچھیے۔''

''کیا آپ نے کانٹریکٹ کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے اور کیا آپ نے اس کی شرائط سمجھ لی ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو آپ دوبارہ بھی معاہدے کو پڑھ سکتے ہیں۔''

''نہیں نہیں، میں نے سب پڑھ لیا ہے۔'' مارک نے جلدی سے کہا۔

''تو پھر سر؟ مجھے اب صرف آپ کے دستخط درکار ہیں۔''

''ضرور۔'' مارک مسکرایا اور اس نے سامنے رکھے کاغذوں پر دستخط کر دیے۔ اس کے دستخط کے بعد اس عورت نے قلم میری طرف بڑھا دیا۔ ''آپ اور میں گواہوں کی جگہ دستخط کریں گے۔'' وہ نرمی سے بولی۔ ''ان کی طرف سے آپ اور کمپنی کی طرف سے میں... کیا آپ اسے پڑھنا چاہیں گے؟''

''ارے، میں نے پڑھ لیا ہے، یہ صرف دستخط کریں گے۔''

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی مارک بیچ میں کود پڑا۔ اس کی جلد بازی کی وجہ سے مجھے فوراً دستخط کرنے پڑے۔ میرے بعد اس خاتون نے بھی کاغذ پر اپنے دستخط ثبت کر دیے اور مسکرا دی۔

''ٹونی۔'' اس بار وہ قدرے بلند آواز میں پکاری۔ ''یہ صاحب تیار ہیں۔ انہیں گیم روم میں لے جاؤ۔''

اس کے آواز دیتے ہی اچانک ایک طویل القامت اور مضبوط جسم والا نیگرو نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گیا۔ شاید وہ کمرے سے ملحق کسی جگہ پر پہلے سے موجود تھا۔ وہ شکل ہی سے ڈبلیو ڈبلیو ای کے خطرناک باکسرز کی طرح لگ رہا تھا مگر اس کا انداز اس کے ظاہری سراپا کے بالکل برعکس تھا۔

''یہاں تشریف لائیے سر۔'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا اور ہمیں ایک دس بائی دس فٹ کے کمرے میں لے آیا۔ کمرے کا دروازہ اس نے ایک خاص کارڈ کی مدد سے کھولا تھا۔ اس دروازے کی موٹائی دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ کسی تجوری کے دروازے کی طرح تھا۔ شاید یہ کمرے کو ساؤنڈ پروف بنانے کے لیے کیا گیا ہو۔ میں نے سوچا۔

اندر ایک دیوار پر بڑی سی اسکرین لگی ہوئی تھی جس کے سامنے دو آٹومیٹک قسم کی خاص کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کرسیاں تاروں کے ذریعے کمپیوٹرائزڈ نظام سے جڑی ہوئی تھیں جبکہ اس کے ساتھ ہی کچھ عام کرسیاں بھی موجود تھیں جو غالباً تماشائیوں کے لیے مخصوص تھیں۔

مارک فوراً ہی ایک بڑی کرسی پر جا بیٹھا اور میں نے اس کے ساتھ رکھی عام کرسی سنبھالی۔ ٹونی اس دوران میں گیم مشین سے نکلنے والے تاروں اور اس کے ساتھ موجود مشین کو سیٹ کر رہا تھا۔ مارک نے بیٹھتے ہی اپنی کرسی کے ہتھے پر موجود ریموٹ کا ''گو'' بٹن دبا دیا تھا مگر اس سے کچھ نہیں ہوا تھا۔ اسکرین اسی طرح خالی رہی۔

''یہ کام نہیں کر رہا۔'' وہ یک دم چلایا۔

''سر! چند لمحے رکیے۔'' ٹونی ملائمت سے بولا۔ ''ہمیں پہلے آپ کو اس کے اور ''بلیڈ'' کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔''

''اچھا اچھا۔'' مارک نے سر ہلایا۔

چند لمحوں میں ٹونی نے مارک کے بائیں بازو کی رگ میں ایک خاص سوئی لگائی اور اسے ٹیپ سے محفوظ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے گیم کمپیوٹر سے منسلک ایک بڑی، لمبی اور بھاری بھرکم نظر آنے والی عجیب و غریب مشین کو آن کیا۔ اس پر بڑے حروف میں B.L.E.E.D بلڈ لیٹنڈ ایکسٹریکشن الیکٹرونک ڈیوائس (خون نکالنے کا برقی آلہ) تحریر تھا۔ اس نے اس سے جڑے پائپ کو مارک کے ہاتھ میں لگی سوئی کے ساتھ فٹ کر دیا پھر کئی بٹن دبائے۔

''لیجیے سر! اب آپ کھیل سکتے ہیں۔ ہر بار جب آپ ''گو'' کا بٹن دبائیں گے، آپ کو جیتنے کا ایک نیا موقع ملے گا اور ہر بار آپ ایک اونس خون کا عطیہ دے رہے ہوں گے۔ ہر جیت پر آپ ڈالر جیتیں گے اور ہر ہار پر بھی ایک اونس خون عطیہ میں دیں گے۔ کیا آپ اس بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں سر؟''

''نہیں، مجھے یہ معلوم ہے۔ میں یہاں پہلے بھی آ چکا ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' مارک بولا۔ ٹونی کے کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہ ''گو'' کا بٹن دبا چکا

تھا۔

وہ ایک عام سا ویڈیو گیم لگ رہا تھا جس میں دودھ بھری بال کو بلی تک پہنچانا تھا۔ اگر بال بلی کے بجائے کتے کے ہاتھ لگ جاتی تو اسکور کم ہوجاتا اور اگر بال بلی تک پہنچ جاتی تو اسکور بڑھ جاتا۔ مارک پہلی بار میں دو دفعہ دودھ کی گیند بلی تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ تیسری بار کتا گیند چھین کر لے گیا۔

''اوہ۔'' وہ زور سے بولا۔ کتے کے گیند جھپٹتے ہی خون نکالنے والی اس بڑی سی مشین B.L.E.E.D نے ہلکا سا بزر بجایا۔ اس پر ایک عبارت لکھی نظر آرہی تھی جس کے مطابق مارک کا ایک اونس خون نکال لیا گیا تھا۔

''مجھے جیتنا ہے، اب اس بے وقوف کتے کو ایک قطرہ دودھ بھی نہیں ملنے والا... اسے معلوم نہیں کہ اس کا پالا کس سے پڑا ہے۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا اور اس نے ''گو'' کا بٹن دبا دیا۔

اگلے چکر میں اسے دو بار ہارنا پڑا۔ اسے کھیلتے دیکھنا دلچسپ تجربہ تھا۔ اب مجھے بھی اس میں تھوڑا لطف آنے لگا تھا۔ پھر بہرحال یہ سب ایک اچھے مقصد کے لیے ہورہا تھا اور مارک کو بھی اچھے ڈالرز ملنے کی امید تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اب اس کے ساتھ یہاں جب تک وہ کھیلتا، بیٹھنا ہی تھا تو پھر بیزار ہونے، گھبرانے یا چڑنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ میں سوچ کر کرسی پر آرام سے نیم دراز ہوکر اس کا کھیل دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔

☆☆☆

''مارک! اب بس کرو اور کھڑے ہوجاؤ۔'' میں مارک کو آواز دے کر بولا۔ اسے کھیلتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔

''نہیں یار... آرنی! تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔ میں اپنے ہزار ڈالرز کے ٹارگٹ سے اب تھوڑا ہی سا دور ہوں۔ تم دیکھنا صرف چند منٹ اور لگیں گے، جیت میرے سامنے ہی ہے۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

''نہیں، بس اب بہت ہوچکا۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''آرنی! جیت میری مٹھی میں ہے۔ میں اسے اپنی رگوں میں بہتا محسوس کررہا ہوں۔'' وہ جذباتی انداز میں بولا۔

''وہ جیت نہیں تمہارا خون ہے... جو تمہاری رگوں سے نکلا جارہا ہے پاگل آدمی۔'' میں ڈپٹ کر بولا۔

''مارک! یہ دیکھو... اسے پڑھو۔'' میں نے اس کی توجہ B.L.E.E.D کی طرف دلائی جس پر لکھی عبارت بتارہی تھی کہ وہ اب تک 50 اونس خون دے چکا ہے۔ ''ذرا دیکھو... 50 اونس خون کم نہیں ہوتا، اب بس کرو۔''

''مگر مجھے تو ذرہ بھر کمزوری محسوس نہیں ہورہی۔ میں خود کو بالکل ٹھیک محسوس کررہا ہوں... ایک دم فٹ۔'' وہ مسکرایا۔

''مگر تم بہتر نظر نہیں آرہے ہو احمق۔'' میں کراہا۔ ''اب بس کرو مارک... میں بہت پریشان ہورہا ہوں۔''

''آرنی! جذباتی مت بنو۔ میں پہلے بھی یہاں سے ہزار ڈالرز اسی طرح جیت کر گیا تھا۔ بس تھوڑی دیر رک جاؤ۔''

''پتا نہیں... ہوسکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر مجھے یہ سب صحیح نہیں لگ رہا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ان سات سو ڈالرز پر قناعت کرنی چاہیے مارک۔'' میں نے کہا مگر میرے سمجھانے کے باوجود اس نے ایک بار پھر ''گو'' کا بٹن دبا دیا اور چلایا۔ ''واہ واہ، دیکھا... میں نے کیسا درست نشانہ لیا۔''

میں اسے وہاں سے اٹھنے، کھیل بند کرنے اور گھر چلنے کے لیے کئی بار کہہ کر مایوس ہوکر کرسی پر جا بیٹھا اور تشویش سے اسے دیکھنے لگا۔

اس کی حالت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی پیلاہٹ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ پلکیں گویا گری سی جارہی تھیں۔ مگر وہ کسی پیشہ ور جواری کی طرح اگلے داؤ کے چاؤ میں مرا جارہا تھا۔ وہ میرا غصہ اور تناؤ محسوس کررہا تھا اس لیے مسلسل گنتی بھی کررہا تھا اور چند لمحوں بعد چلنے کا وعدہ بھی...

پھر اس وقت جب میں نے طے کرلیا کہ اب مجھے خود ہی ٹونی کو اندر بلا کر زبردستی کھیل بند کروا دینا چاہیے۔ وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔

میں نے B.L.E.E.D کی طرف دیکھا۔ اس کے مطابق اب تک اس کے جسم سے 68 اونس خون نکالا جاچکا تھا۔ یعنی چار پونٹ یا چار بوتل خون۔

''اوہ میرے خدا... ان لوگوں نے تو اسے نچوڑ ڈالا ہے۔'' میں تیزی سے اس کی طرف مڑا۔

''مارک... اٹھو مارک۔'' میں نے اسے ہلایا مگر وہ خاموش ہی رہا۔

''مارک۔'' اس بار میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا مگر اس

کی حالت وہی رہی۔ کوئی جواب نہ پاکر میں گھبرا کر دروازے کی جانب دوڑا۔ مارک کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے دروازے کو ہلانے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ باہر سے بند تھا۔

''ہیلو... کوئی ہے... دروازہ کھولو... ہمیں مدد کی ضرورت ہے... دروازہ کھولو۔'' میں چلایا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے اسے باہر سے کیوں بند کر رکھا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازہ کھل گیا اور ٹونی اندر داخل ہوا۔

''تم نے دروازہ باہر سے بند کیوں کیا تھا؟'' میں اسے دیکھ کر غرایا مگر اس نے مجھے یوں نظرانداز کردیا جیسے اس کے کانوں تک میری آواز پہنچ ہی نہ رہی ہو یا پھر میں کوئی غیر مرئی مخلوق ہوں جو اسے نظر ہی نہ آرہی ہو۔ وہ مارک کا معائنہ کرنے لگا۔

''تم جواب کیوں نہیں دے رہے؟ مارک کو کیا ہوا ہے؟ تمہیں مجھے جواب دینا ہوگا۔ اسے فوراً ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' میں جارحانہ انداز میں بولا۔

''میں ڈاکٹر ہی ہوں۔'' اس نے مڑ کر جواب دیا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' میں نے بے یقینی کے عالم میں اسے گھورا۔

''یہ زندہ ہے۔'' وہ مختصر سا جواب دے کر دیوار کی جانب بڑھا۔ وہاں اس نے کوئی بٹن دبایا اور بولا۔

''مجھے کمرا نمبر 12 میں ایک اسٹریچر درکار ہے۔'' اس نے کسی کو آرڈر دیا اور بٹن بند کردیا۔

پھر اس نے مارک کو سیدھا کیا۔ پہلے اس نے B.L.E.E.D کے پائپ کو الگ کیا۔ سوئی کو خاص ڈھکن سے بند کیا پھر کمپیوٹر کے تار ہٹائے۔ وہ اس طرح سکون سے سب کچھ کررہا تھا جیسے یہ سب اس کے معمولات میں شامل ہو۔ میں اسے گھورے جارہا تھا۔ غصہ، پریشانی اور خطرے کا شدید احساس... میرا دماغ الٹتا جارہا تھا۔ چند لمحے بعد ہی دو افراد ایک اسٹریچر لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔

''تم اسے کہاں لے جارہے ہو؟'' میں نے ٹونی سے پوچھا۔

اس دوران میں ان دونوں نے مارک کو اسٹریچر پر ڈال دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتے، میں تیزی سے اسٹریچر کے سامنے آگیا اور دونوں ہاتھوں سے اسٹریچر کو روک کر اپنا سوال دہرایا۔

''تم لوگ مارک کو کہاں لے جارہے ہو اور کیوں؟''

''مہربانی کرکے سامنے سے ہٹ جایئے سر... ہم صرف اپنا کام کررہے ہیں۔'' ٹونی اپنے مخصوص مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ''ہم جو کچھ کررہے ہیں، وہ کانٹریکٹ کے عین مطابق ہے۔ کانٹریکٹ کی شرائط کے مطابق۔''

''کانٹریکٹ کی شرائط... کیسی شرائط؟'' میں چلایا۔ ''جو بھی ہو، میں تمہیں اپنے دوست کو اس طرح لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہورہا ہے؟''

''یہ لیجیے...'' ٹونی نے اسٹریچر کے ساتھ لٹکے پلاسٹک کے تھیلے میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کانٹریکٹ کی شرائط اور معاہدہ موجود ہے۔ آپ اسے پڑھ لیجیے سر! اور اب ہمارے راستے سے ہٹ جایئے... میرا اندازہ ہے کہ ہمارے پاس بہت کم وقت بچا ہے۔'' وہ مارک کی طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی وقت کی کمی والی بات نے مجھے مارک کی تشویش ناک حالت کا احساس دلا دیا تھا۔ اس وقت اس کا ڈاکٹر کے پاس پہنچنا ضروری تھا۔ سوال و جواب تو بعد میں بھی ہوسکتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اسے اسٹریچر پر ڈال کر ڈاکٹر کے پاس ہی لے جارہے ہوں گے۔ یہی سوچ کر میں راستے سے ہٹ گیا۔ میرے ہٹتے ہی وہ مارک کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے نکلتے ہی میں نے لفافے کو کھولا۔ اس کے اندر اسی معاہدے کی کاپی موجود تھی جس پر میں نے بھی گواہ کے طور پر دستخط کیے تھے۔ مگر وہ کاپی عجیب سے کاغذ پر تھی۔ میں نے معاہدے پر نظر ڈالی۔ پہلے ہی صفحے پر موٹے حروف میں تحریر تھا کہ اگر ڈونر کھیل کے دوران بے ہوش ہوجائے تو اس معاہدے کی شق نمبر III خود بخود اور فوراً ''لاگو'' ہوجائے گی۔ میں درمیان کی تمام شقیں چھوڑتا ہوا شق نمبر III تک پہنچا۔

''میں یعنی ڈونر بہ قائمی ہوش و حواس اور اپنی مرضی سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ میں اپنے مکمل جسم کو کمپنی کو عطیہ کرتا ہوں۔ کمپنی کو اس حوالے سے ڈونر کے جسم پر مکمل اختیار ہوگا۔ عام طور پر ایسی صورتِ حال میں ڈونر کے جسم کے تمام اہم اعضا کو نکال کر محفوظ اور پھر مارکیٹ میں فروخت کردیا جاتا ہے جبکہ خاص کیسز میں ان میں سے کچھ کو یونیورسٹیز اور تحقیقی اداروں کو بھی عطیہ کیا جاسکتا ہے۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کاغذ پر لکھی سطروں کو گھورے جا رہا تھا۔ میرا دماغ گویا اڑ سا گیا تھا۔ مجھے یہ سب کسی بھیانک خواب کا حصہ لگ رہا تھا۔ لفافے کو ہاتھ میں دبائے میں بمشکل گرتا پڑتا باہر نکلا۔

استقبالیہ پر وہی خاتون اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ مگر اب وہ مجھے کسی ویمپائر سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

”سر! آپ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ میں ڈاکٹر کو بلوا دوں؟“

”نہیں۔“ میں چیخ پڑا۔ ”مجھے تمہارا ڈاکٹر درکار نہیں۔ مارک... مارک کہاں ہے؟ وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہیں؟“

”مارک... ہاں سر! اس نام کے ہمارے ایک کلائنٹ ہوا کرتے تھے۔“ وہ پھر مسکرائی۔ ”شاید آپ کے ہاتھ میں ان ہی کا معاہدہ ہے۔ کیا میں یہ کاپی واپس لے سکتی ہوں؟“ اس نے میرے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کی جانب اشارہ کیا۔ ”معاہدے کی رو سے آپ اسے یہاں سے باہر نہیں لے جا سکتے۔“

”ہرگز نہیں... یہ میں تمہیں نہیں دوں گا۔ تم یہ سب جو بھی کر رہے ہو، سب غلط ہے۔“ میں چلایا اور بھاگتا ہوا عمارت سے باہر جانے والے دروازے کی جانب لپکا۔ وہ چڑیل وہیں کھڑی مجھے باہر جاتا دیکھ رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے ذرا بھی پریشانی یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں اس کے ردِعمل پر زیادہ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ مجھے بار بار شدید قے محسوس ہو رہی تھی۔ مارک کے ساتھ نہ جانے کیا ہو رہا ہوگا۔ اب تک تو انہوں نے نہ جانے اسے کہاں پہنچا دیا ہوگا۔ ان کی جلدی کی وجہ اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ مارک کے اعضا... اس کا دل، جگر، گردے، آنکھیں مارکیٹ میں فروخت ہو رہے ہوں گے، یہ تصور ہی میرا دل الٹانے کے لیے کافی تھا۔

میں کسی بھی طرح اسے بچانا چاہتا تھا۔ شاید یہاں سے نکل کر کسی کو اس معاہدے کی کاپی دکھا کر یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ میں یہی سوچتا ہوا تیزی سے پارکنگ کی جانب دوڑ رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں داخل ہوتے ہی مجھے دو افراد اپنی جانب بڑھتے نظر آئے۔ میں جس قدر تیزی سے ممکن تھا، بھاگ کر کار میں جا بیٹھا۔ میری آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ ہاتھ پیر بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے بمشکل گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ دونوں میرے پیچھے ہی آ رہے تھے۔ یقیناً وہ مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ میں یہ معاہدہ کسی کو دکھا سکوں۔ وہ ان کے خلاف زبردست ثبوت ثابت ہو سکتا تھا اور اس چڑیل نے انہیں میرے پیچھے لگایا ہوگا مگر اب وہ مجھے چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

میں نے دیوانوں کی طرح گاڑی موڑی اور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ میرا سیٹ بیلٹ میرے کندھے پر جھول رہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اسے باندھ پاتا۔ گاڑی پستول سے نکلی ہوئی گولی کی طرح عمارت سے باہر نکلی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ مجھے فوراً مارک کے لیے مدد حاصل کرنی تھی۔ ویسے تو شاید کوئی میری بات نہ مانتا یا میں اسے ثابت نہ کر پاتا مگر میرا ہتھیار میرے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ معلوم نہیں ان سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی نے انہیں ڈبو دیا تھا، میں نے سوچا۔ اس معاہدے کی وجہ سے انہوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کا خون کیا ہوگا اور اب یہی ان کی تباہی کی وجہ بننے والا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے ایک ہاتھ سے گاڑی سنبھالتے ہوئے معاہدے کے کاغذ کو لفافے سے نکالا۔ اس پر نظر پڑتے ہی دنیا میری آنکھوں میں گھوم گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں، یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

مگر ایسا ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود کاغذ بالکل سادہ تھا۔ اس پر موجود معاہدہ اپنے سیکڑوں الفاظ کے ہمراہ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ شاید اسے کسی خاص روشنائی سے اسکین کیا گیا تھا جو مخصوص وقت کے بعد غائب ہو جاتی ہوگی۔ یہی ان کے اطمینان کی وجہ تھی۔

اب کیا ہوگا؟ میں مارک کو کیسے بچاؤں گا؟ میں کیسے ثابت کروں گا کہ ڈونز لوٹو ان کارپوریشن میں کیا ہو رہا ہے... مارک...

مگر میں اس سے زیادہ نہیں سوچ پایا۔ اس معاہدے کو دیکھنے اور پھر حیرت وصدمے کے شدید جھٹکے کے دوران دو باتیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ غیر ارادی طور پر میری ٹانگ نے سارا وزن ایکسلریٹر پر ڈال دیا تھا اور سامنے سے ایک بڑا بھاری بھرکم ٹرک اچانک نمودار ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے صرف ایک زوردار دھماکا اور ایک شدید جھٹکا یاد رہا تھا جس نے مجھے ونڈ شیلڈ پر دے مارا تھا۔

میری آخری سوچ یہی تھی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے اور میں جلد ہی مارک سے ملنے والا ہوں بلکہ زیادہ امکانات اس بات کے نظر آ رہے تھے کہ میں پہلے پہنچ کر عالمِ بالا میں اس کا استقبال کرنے والا ہوں۔

نے مجھے کافی بہتر محسوس کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو میں ایک اسپتال میں تھا۔ میرے جسم پر جہاں تک میری نظر جا رہی تھی، پٹیاں اور پلاسٹر بندھے ہوئے تھے۔

''اوہ، بہت خوب... تو تم جاگ گئے... زندگی کی طرف خوش آمدید...'' ایک صحت مند اور مسکراتے چہرے والی نرس میرے قریب آ کر بولی۔ ''پریشان مت ہو۔ تم بچ گئے ہو اور جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مگر تم اتنی تیز گاڑی کیوں چلا رہے تھے؟ بہت جلدی میں تھے کیا؟ یاد رکھو ہم زندہ رہیں گے تو کچھ بھی کر پائیں گے اس لیے کبھی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ خاص طور پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے... سمجھے؟'' وہ مسکرائی۔

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا بلکہ پورا جملہ کہا بھی مگر یہ دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا تھا کہ میرے ہونٹوں سے آواز نہیں نکل پائی۔ اس صورتِ حال نے مجھے لرزا دیا۔

''اوہوں، بولنے کی کوشش مت کرو حادثے میں تمہارا لیرنکس متاثر ہو گیا تھا۔ لیرنکس یعنی تمہارا وائس باکس... ڈاکٹر جوزف بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے تمہاری سرجری کی ہے اور اسے ٹھیک کر دیا ہے۔ تم ایک ہفتے میں بولنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ بس اس ایک ہفتے میں اپنے گلے کو تکلیف مت دینا۔''

بولتے بولتے وہ گھومی اور سامنے رکھی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی جس پر ایک خاصا بڑا اور خوب صورت گلدستہ موجود تھا۔

''اچھے لگ رہے ہیں نا پھول... پھولوں کی بھی کیا بات ہے۔ انہیں جب بھی دیکھو تازگی کا احساس ہوتا ہے۔''

میں نے جواب میں گردن ہلائی مگر صرف ابرو اچکا کر رہ گیا۔ اس حادثے نے مجھے پورا ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت میں سوائے ایک ہاتھ اور پیر کے جسم کو ہلکی سے جنبش بھی دینے کے قابل نہیں تھا۔

''تم نے حماقت یہ کی تھی کہ سیٹ بیلٹ تک نہیں لگایا تھا۔ اگر تم نے حفاظتی بیلٹ لگایا ہوتا تو خاصی چوٹوں سے بچ جاتے۔'' نرس مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چلو اب جو ہوا سو ہوا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہاری جان بچا لی اور اب تمہاری صورتِ حال قابو میں ہے۔ لہٰذا ان چوٹوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ دیکھتے ہیں کہ تمہارے لیے یہ پھول کس نے بھیجے ہیں۔'' واقعی بہت اچھی نرس ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس کی گفتگو اور توجہ

''تمہیں یہاں آئے دو دن ہوئے ہیں۔ ہم تو ابھی کسی کو اطلاع بھی نہیں دے پائے۔ پھر یہ پھول تمہیں کس نے بھیجے ہیں؟''

اس کی بات نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ شاید میرے دوستوں میں سے کسی کو میرے حادثے کی اطلاع مل گئی ہو۔

''زبردست... یہاں ایک کارڈ لگا ہوا ہے مگر کریڈٹ کارڈ کی طرح کا کمپیوٹرائزڈ کارڈ ہے۔ کسی بڑے گیمنگ ایلی کی جانب سے۔ اسے دو ہفتے کے اندر استعمال کر لینے کی صورت میں ابتدائی دس گیمز بالکل مفت ملیں گے اور یہ کارڈ دو افراد استعمال کر سکتے ہیں... تم تو اب اسپتال میں ہو، اسے استعمال نہیں کر پاؤ گے۔ اگر تم اجازت دو تو یہ میں لے لوں؟ مجھے گیمز کھیلنے کا بہت شوق ہے۔'' وہ بڑی امید سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔ شاید میرے اس عمل کو اس نے میری ہاں سمجھا۔

''بہت بہت شکریہ، تم بہت اچھے ہو۔ کل میرا آف ڈے ہے۔ میں کل ہی اپنے شوہر کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔ اس جگہ کا نام نہ جانے کیوں سنا سنا سا لگ رہا ہے۔ ڈونرلوٹوان کارپوریشن...

''کیا تم اس کے ممبر ہو؟''

اس کے الفاظ گویا بجلی بن کر مجھ پر گرے۔ میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ میرا دماغ گویا اڑ سا گیا تھا۔

''ارے تمہیں کیا ہو رہا ہے؟'' نرس یکلخت میری طرف لپکی۔ ''تم اتنی بری طرح کیوں کانپ رہے ہو؟ ڈاکٹر... ڈاکٹر اسے دیکھیے پلیز۔''

نرس کے پکارنے پر ایک ڈاکٹر تیزی سے وہاں آ پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انجکشن کی سرنج تھی۔

ڈونرلوٹوان کارپوریشن...

ٹکر... ٹرک... وہ دونوں افراد جو میرا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ عمارت، وہ کمرا، ٹونی... خون... B.L.E.E.D مشین، اسٹریچر اور میرا دوست مارک... سب کچھ کسی سائنس فکشن فلم کے فاسٹ ریوائنڈ ہونے والے مناظر کی طرح میرے اردگرد گھوم رہا تھا۔ بازو میں لگنے والے انجکشن کے بعد میرا بے سدھ ہوتا ذہن اس ہنستی مسکراتی نرس کو خون کی بڑی سی تھیلی میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

مغرب کے نرالے رسم و فرائض میں گندھی... دلچسپ اعصاب شکن کہانی

زندگی کا کوئی نعم البدل نہیں... یہ انمول خزانہ ہے... کوئی تھا جو اس کے اس خزانے کے تعاقب میں تھا... وہ جیتا جاگتا انسان تھا... مگر ہر شخص اسے مردہ سمجھنے پر بضد تھا...

لبِ گور

ماہ نور

ونسی نے جوتے اتار کر ابھی کرسی پر کمر سیدھی کی ہی تھی کہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ جوتوں کے بغیر ہی وہ دروازے تک پہنچا۔

''رڈولف ونسی کا گھر یہی ہے؟'' سوال پوچھنے والا دراز قامت، سیدھا سادہ اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''ہاں۔'' ونسی نے جواب دیا۔

''برائے مہربانی آپ مجھے دکھائیں گے کہ وہ کہاں پر ہیں؟''

''کون؟'' ونسی نے حیرت سے اجنبی کو دیکھا۔

''ونسی، جناب۔'' اجنبی نے قدم اندر رکھا۔ ''میں تجہیز و تکفین سے تعلق رکھنے والی کمپنی کا ملازم ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں ''انڈر ٹیکر'' ہوں اور ونسی کی لاش کو زیادہ دیر تک کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے... اس کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

ونسی نے غیر یقینی انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ گنگ رہ گیا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' اس نے ''انڈر ٹیکر'' کی پیش قدمی روکی۔ ''میں رڈولف ونسی ہوں۔ کیا تم مجھے کیمیکل لگاؤ گے؟''

انڈر ٹیکر کا نام جان اسٹین تھا اور وہ اسٹین فنرل ہوم کی جانب سے آیا تھا۔ جان نے وضاحت کی وہ ادارے کو کال موصول ہوئی تھی رڈولف ونسی وفات پا گئے ہیں۔ اور یہ ان کا

پتا ہے۔ اسی پتے پر انڈر ٹیکر کی ضرورت ہے۔ میں دل سے معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز آپ کو بہ خیریت پا کر مجھے نہایت خوشی ہوئی ہے۔"

"کیا میں اپنا کارڈ چھوڑ جاؤں؟" جان اسٹین نے جاتے جاتے سوال کیا۔

"کیا مطلب؟" ونسی بھڑک اٹھا۔

"م...... میرا مطلب تھا کہ......"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو اس کارڈ کے ذریعے تمہاری خدمات طلب کرلوں۔" ونسی غرایا اور لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔ "عجیب پاگل آدمی ہے۔" ونسی بڑبڑاتا ہوا پلٹا۔

کرسی پر نیم دراز ہو کے اس عجیب غلطی کے بارے میں سوچنے لگا جس کی ایک وضاحت یہ سمجھ میں آتی تھی کہ اس کا کوئی ہم نام مر گیا ہے اور انڈر ٹیکر نے بھول چوک میں غلط پتا نوٹ کرلیا ہوگا۔ ونسی اس واقعے کو ذہن سے جھٹکنے ہی والا تھا کہ اطلاعی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔

اپنی شام غارت کرنے والوں کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر دروازے کی جانب بڑھا۔

باہر ایک ڈلیوری بوائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا عمودی ڈبا موجود تھا۔ ڈبا اس نے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ٹکا کر رسید بک ونسی کی جانب بڑھادی۔

"جناب! یہاں دستخط کر دیجیے۔"

"کس خوشی میں؟" ونسی نے ناگواری سے پوچھا۔

"یہ مرحوم ونسی کی تدفین کے پھول ہیں۔" ڈلیوری بوائے نے جواب دیا۔

اس مرتبہ ونسی کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ جیسے پھر خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے ڈبے کا کاغذ پھاڑا اور لڑکے کی بات کی تصدیق کی۔ ونسی نے دیکھا کہ اودے رنگ کے دائرے میں سنہری الفاظ میں اس کا نام لکھا تھا۔

ونسی نے کینہ توز نظروں سے لڑکے کو دیکھا اور لات مار کر ڈبا ایک طرف پھینک دیا۔ "میرا نام ونسی ہے۔" وہ دہاڑا اور دھکا دے کر لڑکے کو نکال باہر کیا۔

ونسی دروازہ بند کر کے واپس کرسی پر آ گیا۔ دوسری مرتبہ غلطی یا اتفاق نہیں ہوسکتا۔ کچھ غلط ہو رہا ہے... اس نے سوچنا شروع کیا۔

نہ یہ یکم اپریل تھی کہ کوئی اس کے ساتھ عملی مذاق کی مشق کر رہا ہو۔ بہت ہو گیا۔ اسے کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ ورنہ اگلی بار کوئی گورکن گاڑی لے کر آجائے گا۔

ونسی نے قریب ترین پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈیسک سارجنٹ کو اس نے اپنی کہانی سنائی۔ سارجنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ کسی اہلکار کو روانہ کرتا ہے۔

کچھ دیر بعد اطلاعی گھنٹی پھر بجی، ونسی نے دیدے گھمائے اور کرسی پر بیٹھا رہا۔ گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ وہ مشکوک انداز میں اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

وہ پولیس کا آدمی تھا، ونسی نے اپنی کہانی دہرائی۔

"پولیس اس سلسلے میں میری کیا مدد کرسکتی ہے؟" اس نے بعد از وضاحت سوال کیا۔

"ہونہہ۔ اب ایسا ہے کہ۔" پولیس مین نے کان کھجایا۔ "ہم کچھ نہ کچھ تو ضرور کر......" گھنٹی کی آواز میں اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

ونسی نے معنی خیز نظروں سے پولیس مین کو دیکھا۔ پولیس اہلکار ذرا سا ہچکچایا پھر دروازہ کھول دیا۔

"آفیسر! کیا یہ رڈولف ونسی کا گھر ہے؟" باہر کھڑے آدمی نے سوال کیا۔

"ہاں، یہی ہے۔"

"باڈی کہاں رکھی ہے؟" اجنبی نے دوسرا سوال کیا اور ونسی نے لڑکھڑا کر کرسی کا سہارا لیا۔ اس مرتبہ ونسی نے بدن میں سرد لہر دوڑتی محسوس کی۔ "کیا وہ واقعی مر گیا ہے؟" اس نے بازو پر چٹکی لی اور واضح تکلیف محسوس کی۔

پولیس مین نے فیونرل ہوم کے آدمی کو تفتیش کے لیے اندر بلا لیا۔

"انڈر ٹیکر" نے وہی کہانی دہرائی جو پہلے والے "انڈر ٹیکر" نے سنائی تھی کہ ونسی کے کسی عزیز نے ونسی کے انتقال کی اطلاع دے کر ادارے کی خدمات طلب کی تھیں۔ پتا بالکل ٹھیک لکھا گیا تھا۔

پولیس مین نے دوسرے انڈر ٹیکر سے کچھ سوالات کیے پھر زندہ بیٹھے ونسی کی جانب اشارہ کر کے بتایا کہ مسٹر ونسی بہ خیریت ہیں۔ وہ بھی اظہارِ افسوس اور معذرت کر کے چلتا بنا۔

اس کے جانے کے بعد پولیس مین میک گوائر نے اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی دل جلا ہے جو عملی مذاق کر رہا ہے۔"

"مذاق؟" ونسی پھٹ پڑا۔ "مذاق مذاق ہوتا ہے...... یہ "مذاق" متواتر بڑھتا جا رہا ہے۔ تم دیکھنا کہ ابھی پھر کوئی نہ کوئی آن ٹپکے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں آس پاس ہی رہوں گا۔ ڈونٹ وری۔" میک گوائر نے تسلی دی۔

ونسی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجی۔ دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔

میک گوائر نے دروازہ کھولا۔ وہ کوئی پادری نما شخص تھا۔ جس کے پاس پھولوں کا مخصوص عمودی ڈبا تھا۔ ڈبے پر پرنٹ تھا۔ "REST IN PEACE"

"آپ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں یہاں کوئی موت نہیں ہوئی ہے۔" میک گوائر کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ "آپ کے ادارے سے اگر کوئی اور یہاں نظر آیا تو پولیس اپنی کارروائی کرے گی۔"

میک گوائر نے جواب سنے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

ونسی نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔

اگلے دو گھنٹے تک پھر گھنٹی نہیں بجی۔ وہ دونوں اس دوران میں شراب سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

رات کے بارہ بج گئے۔ "میں سمجھتا ہوں کی ان کی تفریح اختتام پذیر ہو چکی ہے۔ میں ڈیوٹی آف کر رہا ہوں۔ کوئی پریشانی محسوس کرو تو سارجنٹ کو کال کر دینا۔ وہ ضرور مدد کرے گا۔"

یہ کہتے ہی میک گوائر کھڑا ہو گیا۔

"شکریہ، دوست۔" ونسی نے ہاتھ ملایا۔

☆☆☆

پولیس مین میک گوائر کے جانے کے پانچ منٹ بعد گھنٹی پھر بجی۔

ونسی نے ارادہ باندھ لیا تھا کہ اب اگر تدفینی ادارے کی جانب سے کوئی وارد ہوا تو وہ اس کی گردن توڑنے میں دیر نہیں کرے گا۔ نتائج کچھ بھی برآمد ہوں۔

وہ دانت پیستا ہوا دروازے کی جانب گیا۔

"مجھے کچھ تاخیر ہو گئی ہے۔" اجنبی نے کہا۔ "مجھے نو بجے آنا چاہیے تھا لیکن کچھ مجبوری آن پڑی تھی۔ میرا تعلق تمہارے پرانے گینگ "نسپلو" سے ہے۔ تم نے ڈبل کراس کیا اور یہاں دبک کر مطمئن ہو گئے؟ تم کیا سمجھ رہے تھے..."

ونسی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے اجنبی کی پوری بات نہیں سنی اور پھرتی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ ایک ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ دونوں گولیاں اس کے سینے میں داخل ہو گئی تھیں۔

وہ فرش پر گرا تو بے جان تھا۔

آئندہ گھنٹی بجے گی تو آنے والے "انڈر ٹیکر" کو وہ تیار اور مطلوبہ حالت میں دستیاب ہوگا۔

قسط :2

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا

ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

میری سانس بُری طرح پھولی ہوئی تھی، خشک نالے کی بھُر بھُری مٹی کا غبار ناک اور منہ کے راستے داخل ہو کر شدید گھٹن کا باعث بن رہا تھا۔ ہماری جیپ ایک طرف الٹی پڑی تھی، اس کے چاروں پہیے گھوم رہے تھے۔ میرے حواس قدرے بحال ہوئے۔ آٹھ دس پولیس والے میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے، دو نے مجھے بے دردی سے دبوچ کر کھڑا کر دیا تھا۔

اطفال گھر میں اپنا بچپن اور جوانی گزارنے کے دوران میں کبھی بھی ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا، جس صورتِ حال سے اس وقت میں دوچار تھا۔ اطفال گھر میں ہر ہفتے دکھائی جانے والی سبق آموز فلموں میں، میں نے پولیس کا مثبت اور منفی دونوں کردار دیکھے تھے۔ کسی مجرم کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے تھے، قانون کی گرفت میں آنے کے بعد مجرم کو عمر قید اور پھانسی تک کی سزا بھی ہوتے دیکھی تھی، بے گناہ بھی پکڑے جاتے تھے۔ جیل کا ماحول بھی
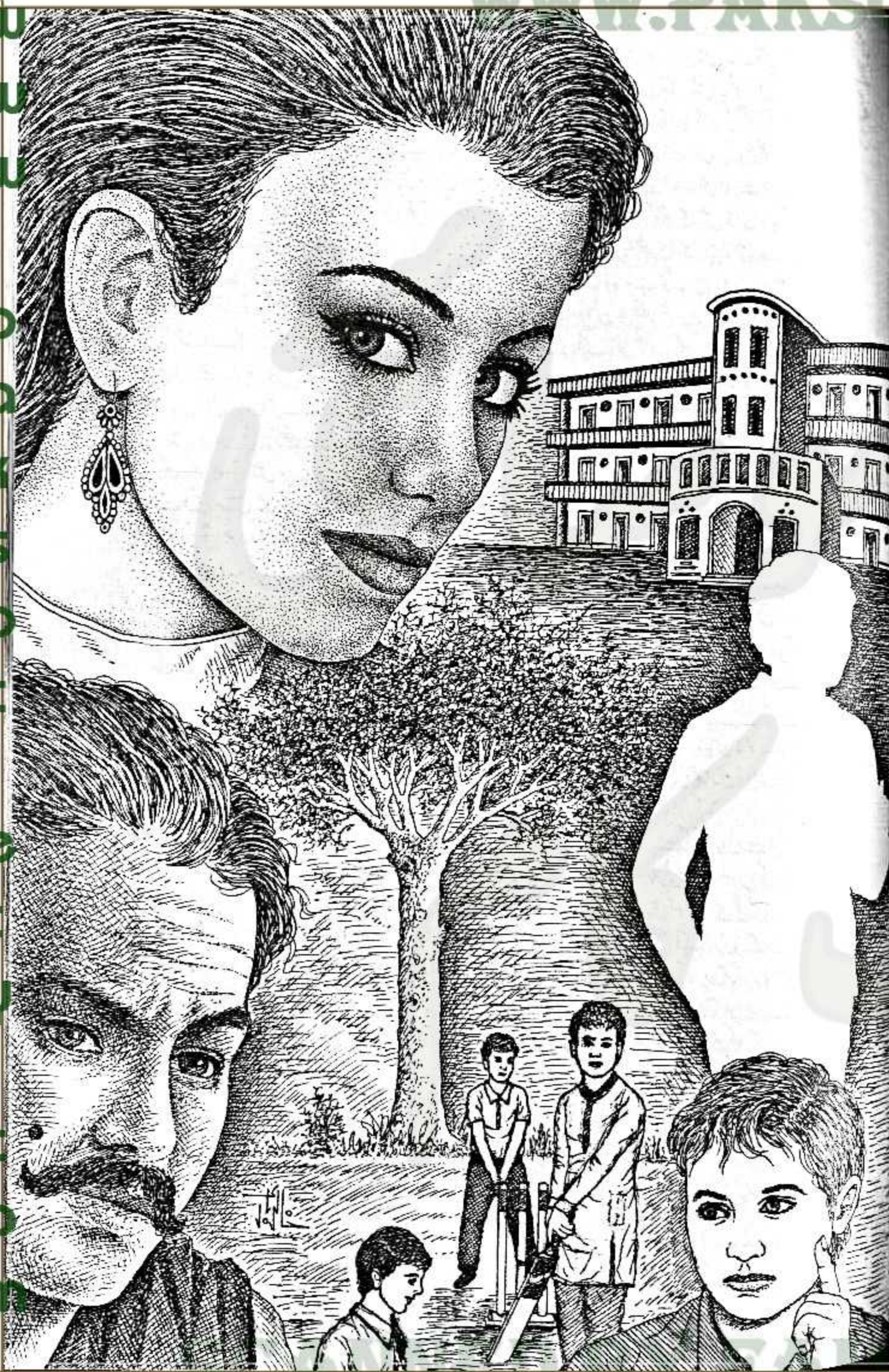
دکھایا جاتا تھا، یہی وہ سارے عوامل تھے، جنہوں نے میرے اندر پولیس کا ایک خوفناک تاثر قائم کررکھا تھا اور اب یہی خوف میرے دل ودماغ پر بھی مسلط تھا۔ کیونکہ میرا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے نالے سے باہر لے آئے۔ موبائل کے قریب ایک خرانٹ پولیس والا اپنی وردی اور دبدبے کے باعث... مجھے خصہ ور انسپکٹر ہی نظر آرہا تھا۔ عام پولیس والوں کی وردی کے مقابلے میں اس کی وردی پر کچھ اضافی قسم کے ستارے نظر آرہے تھے، ہولسٹر میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ توند بھی کچھ باہر کو ابھری ہوئی تھی۔

''بٹھاؤ اسے گاڑی میں۔'' ایک خونخوار سی نظر میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ پھر مجھے ہتھکڑیاں ڈال کر موبائل کے پچھلے حصے میں سوار کرا دیا۔ موبائل اسٹارٹ ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں ان پولیس والوں سے اپنی صفائی میں کیا بات کروں؟ ساتھ ہی مجھے اول خیر کا خیال آیا جو نہ جانے کب جیپ سے فرار ہو گیا تھا۔

شاید اس کے تجربے نے اسے بچالیا تھا جبکہ میں ناتجربہ کاری کے باعث مار کھا گیا۔ پولیس کے چھاپے کے حوالے سے میرا دھیان سرمد بابا کی طرف بھی گیا۔

حالات کی ''جھپکا جھپکی'' کے بعد میرے حواس مرحلہ وار سنبھل رہے تھے، یہ خیال میرے لیے طمانیت بخش تھا کہ ضرور پولیس نے سرمد بابا کے ایما پر یہ کارروائی کی ہوگی اور اب وہی میری گلوخلاصی کا موجب بن کر پولیس والوں کی غلط فہمی کا ازالہ بھی کرتے کہ میں بے گناہ تھا۔ نہ ہی ان مجرموں کا ساتھی تھا جنہوں نے حاجی اسحاق کے مرنے کے بعد پورے اطفال گھر کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ کچھ میری عقل نے بھی کام کرنا شروع کیا تو فوراً ہی ایک تشویش ناک خدشہ ابھرا کہ پولیس کے ہوتے ہوئے فرار کی کوشش بے گناہ کو بھی مجرم بنا ڈالتی ہے، شاید یہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ تو پھر اس کا مطلب تھا کہ اول خیر کا پولیس کے ہتھے نہ چڑھنا میرے لیے تقدیر کی ایک خوش کن مصلحت تھی اس لیے میں نے اول خیر کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے کا اٹل فیصلہ کرلیا۔

میں اب ایک جہنم سے باہر تھا مگر پلٹ ری قسمت... باہر آکر بھی میرے نصیب میں قید ہی لکھی تھی۔

پولیس موبائل شہر کی بھری پُری اور شور مچاتی ٹریفک سے لبریز سڑکوں سے گزرتی ہوئی بالآخر ایک مقام پر رک گئی۔ مجھے نیچے اتارا گیا۔ یہ ایک تھانے کا وسیع وعریض احاطہ تھا۔ وہاں مجھے دو تین اور گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں اور ان میں سے بھی کچھ ہتھکڑی لگے آدمیوں کو اتارا جارہا تھا۔ میں بہ غور ان کے چہرے دیکھ کر ان چہروں کو تلاشتا رہا جن کی گرفتاری کی مجھے توقع تھی۔ یعنی گگل خان اور اس کے خونخوار ساتھی۔ مگر یہ چہرے میرے لیے غیر شناسا ہی ثابت ہوئے۔

مجھے سلاخ دار کوٹھری میں ڈال دیا گیا جس کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ اس کوٹھری میں پہلے ہی سے چار پانچ قیدی موجود تھے۔ وہ سب لوگ چہروں سے خرانٹ اور مچھے ہوئے بدمعاش ہی نظر آرہے تھے۔ جن کی آنکھوں سے وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ مجھے ان کے درمیان نجانے کیوں ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کوٹھری کے باہر راہداری میں آتے جاتے پولیس والوں کے زور زور سے بولنے کی آواز گونج رہی تھیں۔ مجھے اس سارے ماحول سے وحشت ہو رہی تھی، ہول سا آرہا تھا۔

''اوئے لمڈے؟ تو کون ہے؟ اور کہاں سے پولیس کے ہتھے چڑھا ہے؟'' دفعتاً ایک پاٹ دار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی، میں ایک کونے میں دُبکا کھڑا تھا۔ چار، پانچ چہروں میں بولنے والے کا چہرہ تلاشنے کے لیے ہونق سا بن گیا۔

''کچا دانا لگتا ہے۔ کہیں یہ سالا وہ لمڈے باز تو نہیں۔'' ایک اور نے میری جانب تکتے ہوئے گھٹیا قسم کا تبصرہ کیا۔

''ابے بولتا کیوں نہیں، زبان تالو سے چپکی ہوئی ہے کیا؟'' تیسرے نے بھی اپنی بھاری آواز کے زور پر جیسے مجھے جھنجوڑا۔

''مجھے اطفال گھر سے پکڑ کر لائی ہے پولیس۔'' بالآخر میں نے بتایا۔ دل ودماغ اور حواسوں کی عجیب کیفیات ہونے کے باعث مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔

''اطفال گھر سے؟'' ایک آدمی کے منہ سے نکلا اور سب کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پھر پہلی آواز والا مخاطب ہوا۔ چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آگیا اور اپنی وحشت ناک نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔

''کیا تو... گگل خان کا ساتھی ہے؟''

''نن... نہیں۔ ساتھی تو نہیں ہوں... مگر اس کی قید میں ضرور تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ خود کو میں نے سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرا مخاطب بھی میرے قریب آکر بولا۔ ''کاکا۔ تجھے پولیس نے کیوں پکڑا؟'' اس کے لہجے میں چوٹ عیاں تھی۔

''میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، پولیس نے مجھے مجرموں کا ساتھی سمجھ کر دھر لیا۔'' میں نے بتایا۔

''اس لمڈے سے اپنے چھوٹے استاد کا پوچھ۔'' تیسرے نے لقمہ دیا۔ اور ''چھوٹے استاد'' کے ذکر پر میں چونک گیا۔ کیونکہ معرکے کے دوران، اول خیر کے ایک ساتھی نے اسے چھوٹے استاد کہہ کر ہی پکارا تھا۔ تو کیا یہ لوگ اول خیر کے ساتھی تھے؟

''اوئے، ایک بات بتا۔'' پہلے والے نے اس بار دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''تجھے معلوم ہوگا، گگل خان نے اپنے اڈے (اطفال گھر) میں کسی آدمی کو قید کیا ہوا تھا؟'' اس کے سوال پر میرے ذہن نے جھٹکا کھایا۔ بلاشبہ اس کا سوال اول خیر کے حوالے سے تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اس سے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''کیا تم اول خیر کے ساتھی ہو؟''

میرے اس سوال پر جیسے بارہ بائی بارہ کی اس کوٹھری میں سماعت شکن بم پھٹ پڑا۔ وہ سب میرے منہ سے اول خیر کا نام سن کر چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے اور میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔

''ہاں! ہم اسی کی بات کر رہے ہیں۔ وہ ہمارا چھوٹا استاد ہے بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

اول خیر کے حوالے سے خطرناک صورت نظر آنے والوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر میری ہمت سوا ہونے لگی اور میں بولا۔ ''مجھے اول خیر کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔''

''تیری یہ جرأت۔'' ان میں سے ایک آدمی بپھر پڑا اور خونخوار غراہٹ کے ساتھ میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ میرے قد کے برابر لمبا تھا۔ میں گھبرا سا گیا مگر پہلے والے نے فوراً اپنے ساتھی کے ہاتھ سے میرا گریبان چھڑوا دیا اور بولا۔

''آنکھوں کے اندھوں کچھ تو عقل سے کام لو۔ اس گگل خان نے سب لڑکوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔''

یہ تسلی ہوتے ہی کہ یہ لوگ اول خیر کے آدمی تھے، میں نے انہیں دھیمے لہجے میں ساری تفصیل سنا ڈالی۔

آخر یہ جملہ میرے منہ سے ادا ہونے کے بعد کہ گرفتاری کے عین وقت اول خیر نجانے کدھر غائب ہو گیا... جس کا شاید پولیس والوں کو بھی علم نہ ہو سکا... اور وہ مجھے گرفتار کر کے یہاں لے آئی تو پہلے والے آدمی نے یکدم میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور مرتعش آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''خبردار! یہ بات انسپکٹر روشن خان کو نہیں پتا چلنی چاہیے۔''

میں نے ہولے سے اثبات میں... سر ہلا دیا۔ جس شخص نے مجھے گریبان سے پکڑا تھا، عقیدت سے اس نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ میرے لیے اب ان کی آنکھوں میں بڑی عقیدت اور احترام والے تاثرات امڈ آئے تھے۔ ایک بے حیثیت اور کمزور سے نظر آنے والے لڑکے نے چار پانچ منجھے ہوئے خرانٹ صورت جرائم پیشہ افراد کے سامنے میری ایک دم ہی کایا پلٹ دی تھی۔ پتا نہیں اس بات پر مجھے فخر یا خوشی محسوس کرنی چاہیے تھی یا نہیں، تاہم میں خاموش رہا۔ پہلے والے آدمی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھیمی آواز میں کچھ کھسر پھسر کی اس کے بعد وہ سب اِدھر اُدھر ہو کر زمین پر دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بشروں سے میرے لیے بھی ایک مرعوبیت جھلکنے لگی تھی۔ میری بات پر یقین کرنے کا ان کے پاس ٹھوس جواز تھا، ورنہ یہ اتنی آسانی سے یقین کرنے والے کہاں تھے۔ پہلا والا ساتھی، شاید اب اس گروپ کو لیڈ کر رہا تھا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے ایک کونے میں لے گیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

''سن! ذرا غور سے میری بات سننا۔'' وہ عجیب دھیمے اور اسرار بھرے لہجے میں بولا۔

''پہلے اپنا نام تو بتا؟''

''شہزاد احمد خان۔ عرف شہزی۔'' میں نے اپنا نام مع عرفیت کے اسے بتایا... اس نے کہنا شروع کیا۔

''تو اتنی بڑی بات جھوٹ کبھی نہیں کہہ سکتا... چھوٹا استاد فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے تو وہ جلد ہم سے یا بڑے استاد سے رابطہ کرے گا اور تو نہیں جانتا اپنے چھوٹے استاد کو وہ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن ہے۔ لیکن جو آڑے اور مشکل وقت میں اس کے کام آکر اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے... تو سمجھ اس نے چھوٹے استاد کو خرید لیا۔ اور یہی کام تو نے کیا ہے۔ اب تیری مدد اور خاطری ہمارے ذمے واجب ہو چکی ہے۔ اس کے لیے چھوٹے استاد کے سامنے باقاعدہ جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس معاملے میں استاد اپنے ساتھی کی بھی کوتاہی برداشت نہیں کرتا۔''

وہ ذرا رکا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ اب مجھ سے کوئی اہم بات کرنے والا ہو۔ میں بھی کچھ بولے بغیر ہمہ تن گوش رہا۔ وہ آگے بولا۔

''دیکھ یہ... جو ہے نا... انسپکٹر روشن خان (ایک

گندی گالی)... اسے ہم جانتے ہیں... تو نہیں... یہ نسلِ خنزیر... گگل خان سے ملا ہوا ہے۔ وہ بہت جلد اس خنزیر انسپکٹر کو اس بات سے آگاہ کر دے گا کہ چھوٹا استاد (اول خیر) تیرے ساتھ تھا اور تیرے ساتھ ہی فرار...‘‘

’’مگر ایسا نہیں ہے۔‘‘ میں نے فوراً اس کی تصحیح کی۔ البتہ میں اس کی اس بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا کہ انسپکٹر، گگل خان والوں سے ملا ہوا ہے۔

’’کیا مطلب ہے تیرا اس بات سے؟‘‘ اس نے بھویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں بولا۔

’’جب تم لوگوں نے حملہ کیا تھا تو... گگل خان پسپا ہو کر پولیس کے آنے سے پہلے ہی باٹا پورہ والی روڈ کی طرف کار لے کر فرار ہو چکا تھا۔ یہ بات تمہارے ہی ایک ساتھی نے اول خیر کو بتائی تھی۔‘‘

’’اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن گگل خان سمیت اس کے آدمی کو تو یہ حقیقت معلوم ہی ہے ناں کہ چھوٹا استاد قیدی مدد سے فرار ہوا ہے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسپکٹر روشن خان کو مطلع کیا جائے گا اس سلسلے میں اور پھر وہ کمینہ تیرے دوالے پیچھے پڑ جائے گا۔ وہ تجھ پر تشدد بھی کر سکتا ہے... ہمیں تو یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں وہ نسل خنزیر... تجھے... پکڑ کر دوبارہ گگل خان والوں کے حوالے نہ کر دے۔‘‘

اس کی آخری خدشہ دلانے والی بات پر میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ کیونکہ اس ساری صورتِ حالات کے بعد میرا ایک بار پھر گگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں کے ہتھے چڑھنا جان لیوا حد تک خطرناک ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں ان کی بربریت کو ایک بار سہہ چکا تھا۔ میں پھر سے اندیشوں اور خدشات میں گھر گیا کہ شاید میرا مشن ناکامی سے دوچار ہوا تھا... وہاں سے کوئی بھی قیدی آزاد نہیں ہو سکا تھا، شوکی اور ثریا وغیرہ کی حسرت آمیز صورتیں میرے چشمِ تصور میں گھوم گئیں اور میں بے چین سا ہو گیا۔

’’... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے... میں تو سمجھا تھا کہ پولیس نے یقیناً سرمد بابا کی نشاندہی پر چھاپا مارا تھا اور وہ ہماری مدد کرنے آئی تھی؟‘‘

’’تمہارے سرمد بابا نے اس سلسلے میں کچھ کیا ہو... یا نہیں... مگر حقیقت یہی ہے کہ... پولیس تمہاری نہیں بلکہ گگل خان والوں کی مدد کی غرض سے آئی تھی۔ تم دیکھ نہیں رہے۔ یہاں ہم لوگوں کے سوا گگل خان کا کوئی ساتھی... قید میں نظر نہیں آ رہا۔‘‘

اس کے اس انکشاف پر میں اندر سے ہل گیا... اس آدمی کی یہ ساری باتیں جو کہ قیاسات پر مبنی تھیں، اگر درست تھیں۔ تو اس کا مطلب تھا کہ میں آسمان سے گر کر کھجور میں آن اٹکا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر سرمد بابا نے اس سلسلے میں کیا کیا تھا۔

کیا انہوں نے ابھی تک میرا وہ خفیہ ایس ایم ایس پڑھا نہیں تھا، یا پھر وہ کسی وجہ سے پڑھے بغیر ان کے سیل فون سے زائل ہو گیا تھا یا پھر... اس سلسلے میں میرا دماغ گھن چکر سا ہو گیا۔

’’تو ادھر ہی بیٹھا رہ... میں اپنے ساتھیوں سے بات کر کے آتا ہوں...‘‘ معاً اس آدمی نے کہا تو فوراً ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے پیشِ نظر میں نے کہا۔ ’’ٹھہرو... تمہارا نام کیا ہے؟‘‘

’’ارشد...‘‘

’’اگر تمہاری یہ بات درست بھی ہو کہ پولیس درحقیقت، گگل خان کے آدمیوں کو سپورٹ کرنے آئی تھی تو پھر گگل خان کو فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اور سرمد بابا کو میرا کیا ہوا خفیہ میسیج ضائع چلا گیا؟ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ...‘‘

’’ارے کاکا ابھی یہ سب باتیں چھوڑ۔ وقت کے ساتھ تجھے سمجھ میں آ جائیں گی، پہلے ابھی کی فکر کر...‘‘ ارشد نے میری بات کاٹی۔ ’’تو نہیں جانتا... ہم سے زیادہ تو تو خطرے میں ہے اس وقت۔ ہمیں تو اب خود سے زیادہ تیری فکر ستانے لگی ہے۔ ٹھہر، میں آتا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جو ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، ارشد مجھے ایک بار پھر تشویش میں ڈال گیا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ سلاخ دار دروازے پر ایک سنتری نے ڈنڈا بجایا۔ مخاطب میں ہی تھا۔

’’اوے... لڑکے، چل باہر نکل...‘‘ میں اٹھ کھڑا ہوا تو میرے ساتھ ارشد کے ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سنتری سے پوچھا۔ ’’اس لڑکے کو کدھر لے جانا چاہتے ہو؟‘‘

’’تم اپنے کام سے مطلب رکھو... ہٹو آگے سے... آنے دو لڑکے کو۔‘‘ اس کے ساتھ کھڑے دوسرے سنتری نے درشت آواز میں کہا۔ تو فوراً ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرا۔ میں نے حالات کو تجزیہ کرتے ہوئے فوراً کہا۔

’’میرے ساتھ اپنا کوئی تعلق ظاہر مت کرنا۔ ایسا

خطرناک ثابت ہو سکتا ہے جو انسپکٹر کو شک میں مبتلا کر دے گا۔‘‘

یہ کہتا ہوا میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ارشد کو شاید میری بات سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بھی تحمل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا اور بات بدلنے کی غرض سے معنی خیز انداز میں سنتری سے بولا۔

’’سنتری بادشاؤ! یہ لڑکا بڑی اچھی چپی کرتا ہے۔ خدمت شدمت کے لیے یہ اچھا تھا کہ ہمارے پاس ہی رہتا۔ کہیں دوسری بیرک میں تو اس کو نہیں رکھنے کا ارادہ ہے؟‘‘

سنتری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ مجھے تسلی تھی کہ ارشد نے میرے بروقت ہوشیار کرنے پر عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ سنتری مجھے لے کر سیدھا انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا۔

انسپکٹر روشن خان اپنی گھومنے والی کرسی میں دھنسا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی تیز نظریں جیسے میرے چہرے میں کچھ کھوج رہی تھیں۔ اس نے دونوں سنتریوں کو جانے کا اشارہ کرنے کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ بغیر اجازت کوئی اندر داخل نہ ہو۔

ان کے جانے کے بعد اس نے اپنی بڑی سی میز پر ایک سیاہ موٹے رول کو اٹھایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اس کی میز کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ وہ چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ انسپکٹر کا ایک جملہ بڑی آسانی سے ارشد کے انکشافات کی تائید و تردید کرنے والا تھا۔

’’اول خیر کو جانتا ہے؟‘‘ سانپ کی پھنکار سے مشابہ سنسنی پھیلاتی آواز میری سماعتوں میں اُتری۔

’’جی... انسپکٹر صاحب! جانتا ہوں۔‘‘ بہ سرعت کام کرتے ذہن نے مجھے یہی جواب اگلنے پر مجبور کیا تھا۔

’’کب سے جانتا ہے؟‘‘ دوسری بار پھنکار سے مشابہ آواز ابھری۔

’’یہی کوئی دس بارہ دنوں سے۔‘‘

’’دس بارہ دنوں سے یا دس بارہ مہینوں سے؟‘‘

’’میں سمجھا نہیں... انسپکٹر صاحب؟‘‘ میں نے الجھ کر کہا۔

’’پھٹاک‘‘ کی زوردار آواز سے اس نے میز پر اپنا موٹا سیاہ رول مارا اور میں لمحے بھر کو کپکپا گیا۔ یہ میرا فطری ردِ عمل تھا۔

’’میں نے فارسی نہیں بولی۔ جو تیری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’صاحب جی! میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ جو سچ تھا وہ میں نے بتا دیا۔ ورنہ میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ میں اول خیر کو نہیں جانتا۔‘‘

بظاہر سیدھے سادے انداز میں میرے جواب میں چھپی ہوشیاری کو انسپکٹر روشن خان نہیں سمجھ پایا تھا، لہٰذا اس نے اگلا سوال کیا۔

’’وہ تیرے ساتھ فرار ہوا تھا؟‘‘

’’فرار...‘‘ میں نے الجھنے کی اداکاری کی۔ ’’میں تو لڑائی جھگڑے سے گھبرا کر بھاگا تھا۔ بڑی زبردست مارا ماری ہو رہی تھی صاحب جی۔ شاید اول خیر کے ساتھیوں کے گروپ نے اطفال گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ گگل خان کے آدمی اسے اغوا کر کے جو لائے تھے۔ اس کی نگرانی میرے سپرد کی گئی تھی مجھے اپنی جان کا خوف کھائے جا رہا تھا، کیا کرتا۔‘‘

’’ہوں...‘‘

’’مجھے اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔‘‘ وہ خوں ناک انداز میں بولا۔ اور میں اندر سے کھٹک گیا۔ شاید اس بدبخت نے میری کوئی غلطی پکڑ لی تھی۔

’’تیرے ساتھ جیپ میں اول خیر بھی تھا؟‘‘

’’صاحب جی! یہ میں نے آپ سے کب کہا کہ فرار ہوتے وقت اول خیر میرے ساتھ نہیں تھا۔‘‘ جو غلطی انسپکٹر نے میری پکڑی تھی اس کا فوری طور پر مجھے بھی احساس ہو گیا تھا کیونکہ مجھے گاڑی چلانا نہیں آتی تھی... اگر میں اسے یہ بتانے سے انکار کر دیتا تو پھر انسپکٹر کا اگلا سوال یہ ہوتا کہ کیا مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔ صورتِ حال گمبھیر تھی جو مجھے ازخود سچ اگلنے پر مجبور کر رہی تھی اور ارشد کی ساری نصیحتیں محتاط رہنے کی تدبیریں الٹی ہو رہی تھیں۔

’’اس کا مطلب ہے تیرے ساتھ اس وقت جیپ میں اول خیر بھی تھا۔‘‘

’’جی صاحب! بھلا مجھے جیپ چلانی کب آتی ہے۔ ڈرائیونگ وہی کر رہا تھا۔ کیا وہ بھی پکڑا گیا ہے؟‘‘ میں نے ہونق ہو کر پوچھا۔

’’یا تو تو بہت سیدھا سادہ بن رہا ہے یا پھر تو بہت زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے۔‘‘ بالآخر انسپکٹر روشن نے غصیلے انداز میں ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ شاید میرے سیدھے سادے لہجے نے اسے اندر سے واقعی چکرا کر رکھ دیا تھا۔

’’تو نے اس وقت کیوں نہیں بتایا ہمیں کہ اول خیر بھی تیرے ساتھ تھا؟‘‘ انسپکٹر نے اگلا سوال داغا۔

ارشد کی باتوں کی روشنی میں اور انسپکٹر کے سوالوں

نے مجھ پر یہ آشکارا کر دیا تھا کہ پولیس کی وردی میں بظاہر یہ قانون کا رکھوالا گُگل خان والوں کا "راتب خور" تھا۔ اور یقیناً اس سلسلے میں اسے کسی نے بعد میں "بریف" کیا ہوگا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

"صص... صاحب جی میں تو سمجھا تھا اول خیر بھی گرفتار ہو گیا ہوگا۔ مجھے تو خود اس وقت اپنا ہوش ہی کہاں تھا۔ جب ہماری جیپ خشک نالے میں الٹی تھی اس کے ساتھ میرا دماغ بھی الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ پھر قانون کے ہتھے چڑھنے پر تو میں مزید خوف زدہ ہو گیا تھا۔ لیکن صاحب جی! اگر اول خیر بھی مجرم تھا۔ تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو لڑائی کے دوران جیپ لے کر فرار ہو رہا تھا تو میں چھلانگ لگا کر اس میں سوار ہو گیا۔ وہاں اطفال گھر کے دیگر لڑکے اور بچے بھی خوف زدہ ہو کر جن کا جہاں منہ اٹھا بھاگ رہا تھا۔ بڑی خطرناک جنگ چھڑی تھی۔ صاحب جی مجھے تو ابھی تک ہول آ رہا ہے۔ مجھے آپ نے یقیناً آزاد کرنے کے لیے ہی بلایا ہے نا؟" میں نے آخر میں بڑی لجاجت کے ساتھ اس سے کہا۔ میں نے دیکھا میری باتیں سن کر انسپکٹر روشن خان کے چہرے پر الجھن کے آثار تیرنے لگے تھے۔ ورنہ تھوڑی دیر پہلے اس کے خرانٹ چہرے پر جس قسم کے خونخوار تاثرات نظر آ رہے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے کسی بھی وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اب بھی بلا سر سے ٹلی نہیں تھی۔

"ہوں... ں... ں"۔

چند لمحوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اس نے ایک گہری ہنکار بھری... نجانے کیوں اس کے بعد مجھے اپنے وجود میں ایک سنسنی کا احساس ہوا۔ وہ ابھی مجھ سے مزید کچھ کہنے والا ہی تھا کہ اچانک اس کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی بیل گنگنائی۔ اس نے کھڑے کھڑے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دوسری جانب سے غالباً شناسا سا آواز سنتے ہی اس کے چہرے کا سارا رعب کافور ہونے لگا۔ شاید دوسری جانب اس سے زیادہ بھاری شخصیت موجود تھی۔

"جی... جی... سر... نن... نہیں... پانچ ... ہی بندے پکڑے گئے ہیں۔" اس کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا۔ میرے اندر دھکڑ پکڑ سی شروع ہو گئی۔

"بالکل نہیں... سر بالکل نہیں... اس نام کا تو کوئی نوجوان ہماری پکڑ میں نہیں آ سکا... ایک نوجوان کو غلطی سے مجرموں کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیا تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ تو بے چارہ خود اطفال گھر سے تعلق رکھتا تھا... پھر کیا! ظاہر ہے اسے چھوڑنا پڑا۔ جی جی بالکل اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔" اس نے بتایا اور اس دوران ریسیور کان سے لگائے ہوئے دزدیدہ نظروں سے میری جانب بھی دیکھا۔ میرے اندر جیسے کوئی پٹاخا چھوٹا۔ یہ کس نوجوان کی بات کر رہا تھا؟ جسے اس نے چھوڑ دیا تھا؟ میرا دھیان اپنی طرف ہو گیا۔ ذہن میں اٹھنے والے اچانک ایک خوشگوار احساس سے میں نے اندازہ لگایا۔ شاید اس کے افسر کو پتا چل گیا تھا کہ مجرموں کے ٹولے کے ساتھ ایک بے گناہ نوجوان کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ نوجوان میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ گویا اب یہ مجھے اس فون کے بعد فوری طور پر رہا کرنے والا تھا۔

"نہیں نہیں جی آپ زحمت نہ کریں آنے کی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ میں بھی تھوڑی سی کاغذی کارروائی نمٹانے کے بعد ان پانچوں کو رہا کر دوں گا۔ آپ فکر نہ کرو جی۔"

انسپکٹر نے کہا اس کے بعد شاید دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کے بعد انسپکٹر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر رول ہاتھ میں پکڑے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ وہ مجھ سے اس طرح غافل ہو گیا کہ جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ پھر رول میز پر رکھا اور اپنی بھاری چیئر پر گر گیا۔ ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا مگر پھر خود ہی نمبر کاٹ دیا۔ ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد اس نے میز کی دراز سے سیل فون نکالا اور نمبر پنچ کرنے لگا، رابطہ ہوتے ہی بولا۔

"او چوہدری صاحب وہی ہوا جس کا آپ کو پہلے سے اندازہ تھا مگر آپ فکر نہ کریں یہ پانچوں ویسے بھی کام کے نہیں ہیں۔ ایک دانہ کام کا ہاتھ لگا ہے۔ اس کے بارے میں، میں نے صاحب کو ابھی کچھ نہیں بتایا... نہیں چوہدری صاحب آپ بے فکر رہو۔ معاملہ ابھی میرے ہاتھ ہی تک رہے تو اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ آپ کیوں خود کو قانون کی نظروں میں لاتے ہو۔ دیکھ ہی رہے ہو آپ معاملہ دونوں طرف سے ٹکر کا ہے۔ ان کی بھی پہنچ اوپر تک ہے اور کہا ناں جی ابھی میں زیادہ تفصیل بیان کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مگر آ... کر نہ کریں۔"

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ سیل میز پر رکھنے کے بعد اس نے ٹیبل بیل بجائی، وہی دونوں پولیس والے اندر آ گئے۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ بولا۔ "اس کو لاک اپ نمبر تین میں لے جا کر بند کر دو۔"

"چلو اوئے آگے لگ۔" انہوں نے مجھے دھکیلا۔

مجھے اس بار جس سلاخ دار کوٹھڑی میں رکھا تھا وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

اس امر پر مجھے تشویش آمیز حیرت ہونے لگی۔ پتا نہیں یہ کمبخت انسپکٹر روشن خان میرے ساتھ اب کیا کرنے والا تھا؟ نجانے وہ کس چوہدری کو کون سے کام کی تسلیاں دے رہا تھا؟ جہاں تک میرا ذہن کام کر رہا تھا، اس کے مطابق اول خیر کے ان پانچوں آدمیوں کی رہائی کے سلسلے میں کوئی تگڑی سفارش یا ضمانت دی جا چکی تھی — اب وہ سب چھوٹنے والے تھے مگر اس بات کی اطلاع سے انسپکٹر روشن خان اپنے سیل فون پر نجانے کس چوہدری کو باخبر کرتے ہوئے اسے تسلی بھی دے رہا تھا کہ جن پانچ آدمیوں کو وہ (شاید مجبوراً) رہا کرنے والا تھا، وہ کام کے نہیں تھے مگر جو کام کا تھا، اس انسپکٹر نے گول کر دیا تھا۔ جبکہ کسی چوہدری کو بتاتے وقت اس نے تسلی دی تھی کہ وہ اس کے قبضے میں تھا۔ اور وہی کام کا آدمی ہے، وہ کام کا آدمی کون تھا؟ میں؟ شاید اس کا جواب میرے پاس اثبات میں ہوتا، جس کے سبب مجھے اب علیحدہ کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر معاملہ میرے لیے میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر تھا۔ میں موجودہ حالات کے تناظر میں گہرائی تک سوچنے لگا۔

مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ میں تو اپنی رہائی کے لیے پُرامید تھا، وہ اب کھٹائی میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور کس قسم کا کام لیا جانے والا تھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں تن بہ تقدیر ہو کے اپنے حالاتِ زندگی کے آئندہ آنے والے ان دنوں کا شمار کرتا... جو کتنے سہانے اور کتنے کڑے ہو سکتے تھے۔

دفعتاً ایک تشویش آمیز... سنسنی خیز لہر میرے وجود میں دوڑ گئی، ایک متوحش سا وسوسہ میرے ذہن میں اچانک ہی اُبھرا تھا کہ کہیں میری چال الٹا میرے گلے کا پھندا تو نہیں بن گئی تھی؟ یعنی اگر میں انسپکٹر کے سامنے ان پانچوں قیدیوں کے بارے میں بتا دیتا تو شاید میں بھی چھوٹ جاتا۔

☆☆☆

ابھی مجھے اس نئی کوٹھڑی میں تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ اچانک مجھے شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔ میں فرش سے اٹھ کر سلاخ دار دروازے سے آن چپکا۔ میرے سامنے راہداری تھی۔ دائیں جانب اِکادُکا اسٹور نما مختصر سے کمرے تھے۔ جن کے دروازے بند تھے۔ بائیں جانب کھلی راہداری تھی اور ایک حد تک ہی میں آگے تک دیکھ سکتا تھا۔ کچھ سادہ اور وردی پوش آدمی نظر آ رہے تھے۔ شور کچھ آدمیوں کا تھا۔ وردی پوش پولیس والے انہیں سنبھالنے اور دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے، شاید کچھ قیدیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ اور چند گالی گلوچ کے الفاظ بھی سنائی دیے۔ قریباً دس بارہ منٹوں تک یہ شور تھم گیا۔ میں پلٹ کر دوبارہ ایک کونے میں فرش پر دیوار کے ساتھ پشت لگائے بیٹھا رہا۔ چند منٹ مزید بیت گئے تو میں نے راہداری میں اپنی کوٹھڑی کے قریب قدموں کی چاپ سنی یوں بھی میں خالی خالی نظروں سے اس طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر روشن اور اس کے ہمراہ ایک سپاہی کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"ادھر آ اوئے۔" اس کے ہمراہ سپاہی نے مجھے اٹھ کر آنے کا اشارہ کیا۔ میں قریب پہنچا۔ انسپکٹر روشن... خار کھائی نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ پھر دفعتاً اس نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر میرا گریبان دبوچ لیا۔ اور مجھے اس زور سے جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا کہ درمیان میں حائل آہنی سلاخوں سے میری پیشانی ٹکرا گئی۔ میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ سی خارج ہو گئی ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجنا گیا۔ اور آنکھوں کے سامنے کرمرے سے ناچنے لگے۔ اس حالت کے دوران میں ایک غراتی ہوئی بھیڑیے سے مشابہ آواز گالی کے ساتھ ابھری تھی۔

"اوئے۔ تو تو کہہ رہا تھا اول خیر اور اس کے گروپ سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تو سب تیرے باپ نکلے۔" انسپکٹر نے تندخو انداز میں کہا۔

دوبارہ حواس بحال ہونے تک میں نے یہ کریہہ الفاظ سنے اور اس تضحیک کے باعث میرا وجود انگارہ سا بننے لگا۔ آہنی سلاخوں سے پیشانی ٹکرانے کے باعث وہاں اینٹھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم چوٹ قابلِ برداشت تھی۔

"میں نے صحیح کہا تھا انسپکٹر..." میرے حلق سے جو آواز برآمد ہوئی، وہ مجھے اجنبی سی لگی تھی، نجانے کیوں باپ والی بات نے مجھے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہی تو میری زندگی کا وہ ایک لفظ تھا جس نے ایک عرصے سے میرے اندر کسی بڑے طوفان کی آمد سے پہلے ایک اضطراری اور بے چین خاموشی کا سا تاثر پیدا کر رکھا تھا۔

انسپکٹر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید کچھ کرنے کے موڈ

میں آیا تھا۔ کیونکہ اس وقت مزید دو پولیس والے وہاں آن دھمکے۔ ان کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور کپڑے کا ایک بڑا سا تھیلا تھا۔ پہلے والے سنتری نے لمبی سی چابی آہنی چوکھٹے کے اندر ڈال کے دروازہ کھولا، تینوں سنتری جارحانہ انداز میں اندر داخل ہوئے، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے قابو کر کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیے۔ اس کے بعد ہتھکڑی لگائی گئی۔ اور دوسرے سنتری نے تھیلا میرے سر پہ ڈال دیا۔ اب میں دیکھنے سے قاصر تھا۔ بولتا بھی تو آواز گھٹی گھٹی سی برآمد ہوتی، مجھے باہر نکالا گیا۔۔۔ اور مختلف راستوں سے گزارنے کے بعد کسی گاڑی میں سوار کرادیا گیا۔

کئی مخدوش خیالات میرے دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگے، نجانے یہ لوگ مجھے کہاں لے جارہے تھے۔ اور کیوں؟

''اطفال گھر'' میں دکھائی جانے والی سبق آموز فلموں میں پولیس کا مثبت کردار دکھایا جاتا تھا تو کچھ منفی پہلو بھی دکھائے جاتے تھے۔

ایک فلم میں، میں نے پولیس کا منفی و مثبت دونوں کردار دیکھے تھے، منفی کردار کے مطابق اس فلم میں ایک بے گناہ قیدی کو کس طرح پھنسایا جاتا ہے اور وقت پڑنے پر بے گناہ کو جعلی پولیس مقابلے میں قتل بھی کردیا جاتا ہے۔ یا تھانے میں ہی زہر دے کر ہلاک کردیا جاتا۔

میرے دل و دماغ پر یہاں بھی کچھ ایسے ہی خیالات کی یلغار تھی۔ نجانے یہ مجھے کہاں لے جارہے تھے؟ مجھے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔ تھانے سے روانہ ہوتے ہوئے ایک بات اور میں نے محسوس کی تھی، پولیس موبائل کی سواری اور طرح کی تھی، اس بار مجھے ایک کار میں سوار کرایا گیا تھا۔ یہ یقیناً چونکا دینے والی بات تھی۔ اب پتا نہیں یہ پولیس کار تھی یا پرائیویٹ۔ بہرحال نصف گھنٹے کی درمیانی رفتار کے ہموار سفر کے بعد کار اب نسبتاً ناہموار راستے پر گامزن تھی۔ جھٹکوں اور ہچکولوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا، مگر آگے جا کر یہ راستہ بھی قدرے ہموار ہوگیا تھا۔ تاہم پائدان پر میرے جمے ہوئے پیروں کی ترتراہٹ سے۔۔۔۔ اندازہ ہوا کہ یہ پختہ سڑک نہ تھی بلکہ کوئی کچا راستہ تھا۔ جسے سڑک کے طور پر ہموار کیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد کار کسی مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ دروازے کھلے مجھے نیچے اتارا گیا۔ ایک سنتری کے سہارے چند قدم چلا پھر کھڑا کردیا گیا۔ کسی بھاری دروازے کے کھلنے کی جھٹکے دار آواز سنائی دی، مجھے آگے دھکیلا گیا۔ اندر سناٹا محسوس ہوا۔ پھر شاید کسی کمرے میں مجھے لایا گیا تو یکدم میرے اوپر سے کپڑا ہٹادیا گیا۔ سب سے پہلے میرے نتھنوں سے ایک تیز اور ناگواری بو ٹکرائی، جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر ہی رہا کہ یہ کس کی ہوسکتی تھی۔

اب کھلی آنکھوں سے میں اپنے اردگرد جو ماحول دیکھ رہا تھا وہ مجھے لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔

یہ ایک۔۔۔ بلند چھت والا ہال نما کمرا کوئی عقوبت خانہ ہی نظر آرہا تھا۔ مجھے کمرے کے وسط میں کھڑا کردیا گیا۔ در و دیوار سالخوردہ اور پرانی طرز کے تھے، دیواروں ہی نہیں فرش کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ دل و دماغ پر ہیبت طاری کرنے والی عجیب سی کیفیت طاری تھی، پورے کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ ہی روشن دان۔ کمرے میں ہر طرح کے آلات نظر آرہے تھے۔ جو یقیناً تشدد اور ایذارسانی کے لیے تھے۔

غرضیکہ۔۔۔ سب چیزیں دیکھنے کے بعد مجھے اپنے جسم سے روح کا ناتا ٹوٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ میرے ہراساں ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ ''کیا یہ اس جنونی ایس ایچ او روشن خان کا نجی ٹارچل سیل تھا؟ میرے اس لرزہ خیز خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔

انسپکٹر روشن اپنے ساتھ صرف تین سنتریوں کو لایا تھا۔ روشن خان تو ایک طرف رکھی چھوٹی میز کرسی پر براجمان ہوگیا باقی تینوں سپاہی کھڑے رہے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہنوز ہتھکڑی تھی۔ میرے سامنے کی کرسی پر روشن خان موجود تھا اور میری طرف کچھ ایسی سنسناتی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے وہ میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ میں اس جگہ سے کتنا خوف زدہ ہوں پھر اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ حرکت میں آیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اس کی میز کے قریب کھڑا کردیا۔ سپاہی نے میری ہتھکڑیاں کھول دی تھیں۔ پھر ایک اسٹول کھسکا کر میرے قریب کردیا۔ جس کا اشارہ پاکر میں اس پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد انسپکٹر نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور قلم بھی۔ کاغذ اس نے میرے سامنے میز پر پھیلا کر اس پر قلم رکھ دیا۔ وہ اردو میں ٹائپ کیا ہوا اسٹامپ پیپر تھا جس پر چند سطروں میں بہت مختصر عبارت درج تھی۔ انسپکٹر نے مجھے اسے پڑھنے کو کہا۔ میں پڑھنے لگا۔

''میں شہزاد احمد خان عرف شہزی، ولدیت نامعلوم، میرا تعلق کبیل دادا، مختاری بیگم کے گینگ گروپ سے ہے،

مختاری بیگم نے مجھے چوہدری ممتاز کو ٹارگٹ کلنگ پر مامور کیا تھا۔ اور میری مدد اس گینگ گروپ کا نائب اول خیر کررہا تھا۔ جس کی مدد سے ہم نے پہلے نیو ملتان میں چوہدری ممتاز کی رہائش گاہ پر حملہ کیا، ناکامی کی صورت میں کچھ روز بعد ہمیں پتا چلا کہ ممتاز خان اپنے فلاحی ادارے اطفال گھر کے دورے پر آیا ہوا ہے تو ہم نے وہاں ہلا بول دیا۔ وہاں بھی ناکامی کی صورت میں فرار ہوتے وقت اول خیر تو نکل جانے میں کامیاب ہوگیا مگر میں پکڑا گیا۔ یہ میرا بیان باقاعدہ ہوش و حواس حلفیہ بیان ہے، جسے ایک طرح سے مختاری بیگم کے گینگ گروپ سے ''بیزاری نامہ'' بھی سمجھا اور پڑھا جائے اس رعایت سے وعدہ معاف گواہ کے طور پر انسانی ہمدردی کے ناتے مجھ پر رحم کیا جائے اور کڑی سزا سے بچایا جائے۔''

نیچے میرا نام تھا۔

یہ سب پڑھ کر میں ششدر رہ گیا۔ یہ کیا تھا؟ میرا اپنا حلفیہ بیان۔۔۔؟ یا پھر کسی اور کے لیے تھا؟

میں نے ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر سے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے کریہہ صورت انسپکٹر روشن کی طرف دیکھا تو اس کے بدہیت ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

''اس پر اپنے دستخط کردو یا اپنا نام لکھ دو۔ ساتھ ہی دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بھی لگادو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میز کی دراز میں سے اسٹیمپ پیڈ بھی نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

''لل۔۔۔ لل۔۔۔ لیکن۔۔۔ انسپکٹر۔۔۔۔۔۔۔ صاحب! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا ہے۔۔۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میرا تو ان ناموں کے افراد سے تعلق تو ایک طرف رہا، میں تو انہیں جانتا تک نہیں ہوں۔'' سوکھے پڑتے میرے حلق سے یہ الفاظ اٹک اٹک کر برآمد ہوئے۔

''یہ کمرا دیکھ رہے ہو تم۔'' انسپکٹر روشن کی سرسراتی آواز ابھری۔ ''یہ کمرا نہیں ہے، ایک اذیت گاہ ہے جہاں پر پتھر بھی بولنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں، تم پتھر ہو نہ، عادی مجرم۔۔۔ جو یہ تشدد سہہ سکو۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ۔۔۔ خاموشی کے ساتھ اس پر اپنا نام اور انگوٹھا لگادو۔''

''اس کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟'' میں نے اپنے اندر کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں رہا کردیا جائے گا۔۔۔'' وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''آپ مجھے رہا کردو گے انسپکٹر صاحب! پھر کیا یہ لوگ مجھے زندہ چھوڑیں گے، جن کے خلاف میں یہ جھوٹا بیان دے رہا ہوں؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

''تمہیں مکمل تحفظ دیا جائے گا۔'' وہ لالچ دیتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے اس بیان کے بعد اس گینگ گروپ کا وجود ہی ختم ہوکر رہ جائے گا۔ میں ویسے بھی تمہاری ہسٹری سے واقف ہوں۔ تمہارا اس دنیا میں اور کوئی نہیں، چوہدری ممتاز صاحب تمہیں مالا مال کردیں گے۔ تم اگر چاہو تو ان کی مستقل ملازمت بھی اختیار کرسکتے ہو۔ ساری زندگی عیش کروگے۔ تمہارے جیسے چٹے ماضی والے نوجوانوں کی وہ بہت قدر کرتے ہیں۔ اب بولو کیا کہتے ہو؟''

''کیا مجھے صرف اس بیان پر دستخط کرنے ہوں گے یا اور بھی کچھ کرنا پڑے گا؟''

''خاصے سمجھدار ہو، فوراً ہی معاملے کی تہ تک جا پہنچے۔ ہاں۔۔۔ اس پر دستخط کرنے کے بعد تمہیں عدالت میں بھی جج کے سامنے یہ بیان زبانی کلامی دینا پڑے گا۔''

''کیا مجھے کچھ سوچنے کا موقع دے سکتے ہیں۔'' بالآخر میں نے کہا۔ وہ کچھ سوچتا بن گیا، پھر اپنی کالی موٹی بالوں سے ڈھکی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صرف پندرہ منٹ۔''

''ٹھیک ہے مگر میں یہ پندرہ منٹ تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک اور شرط رکھی، وہ بھی منظور کرلی گئی، انسپکٹر روشن نے کھڑے ہوکے سپاہی کو کوئی اشارہ کیا۔ اس نے وہی ہتھکڑی دوبارہ میرے ہاتھوں میں لگادی۔ میں اسٹول پر بیٹھا رہا۔ وہ چاروں باہر نکل گئے۔

ایسے ہی وقت میں سرمد بابا کی نصیحت مجھے یاد آنے لگی۔ ''شہزی بیٹا! مدِمقابل جب زبردست اور طاقت ور ہو تو اسے دماغی جنگ سے زیر کیا جاسکتا ہے۔ بچپن میں نصابی کتابوں میں ایک شیر بکری کی کہانی بہت مشہور ہوئی جو خود کو شیر کا نوالہ بننے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اسے بڑی چالاکی سے ایک کنویں کے قریب لا کر اسے اندر چھلانگ لگانے پر مجبور کردیتی ہے۔ کہانی یا سبق۔۔۔ کسی کی زندگی کا تجربہ ہوتا ہے۔''

استاد سکھانے کے بعد امتحان لیتا ہے اور وقت و حالات امتحان لینے کے بعد سکھاتے ہیں۔ میں ایسے ہی امتحان سے گزر رہا تھا۔ یک عقل وہ ہوتی ہے جو حالات کی بھٹی میں پک کر کندن بنتی ہے، اور ایک عقل وہ ہوتی ہے جو گویا وراثت کے طور پر اللہ کی طرف سے ودیعت ہوتی

ہے۔ اسے عقلِ سلیم یعنی کامن سینس کہا جاتا ہے، اس وقت وہ عقل میرے کام آرہی تھی۔ بے شک میں بے گناہ تھا، مظلوم بھی اور زبردست کے آگے زیردست تھا۔ اس پر بھی میرا ایمان پختہ تھا کہ اللہ مظلوم اور بے گناہ انسان کی مدد ضرور کرتا ہے۔ مگر صرف ایمان رکھنے سے سب کچھ حاصل نہیں ہوجاتا۔ اس کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا پڑتے ہیں، دماغ کو کھنگالنا پڑتا ہے شاید اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔

یہ عیار انسپکٹر جس ناپاک عزائم کے ساتھ مجھے اپنے نجی ٹارچ سیل میں لایا تھا یقیناً اس کی پشت پر کوئی بڑا ہاتھ تھا، قانون کی وردی میں بظاہر نظر آنے والا قانون کا یہ رکھوالا اپنے فرائضِ منصبی کی پاسداری میں کتنا سچا تھا، اس کا پوری طرح سے مجھے اب اندازہ ہوا ہے۔ لیکن شاید قانون کا یہ کالا رکھوالا خود کو زیادہ عیار و چالاک سمجھتا تھا یا پھر میرے سوچنے کی غلطی تھی۔ کہ قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے والے کالے کوٹ میں ملبوس وکیل اور ان وکیلوں کے پرمغز دماغوں کا نچوڑا ایک جج ایسے بیان پر کتنا یقین کرسکتا تھا؟ جو ان کی غیر موجودی میں تحریری طور پر ان کے سامنے رکھا جائے؟ میری عقل سلیم میں کیا سمایا تھا، میں یہ سب کچھ اس تناظر میں بھی سوچ رہا تھا، اور میں نے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد جب وہ جلاد صفت انسپکٹر اپنے تین ہمنواسنتریوں کے ساتھ اندر داخل ہوا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرکے کہا۔ ”میں اس جھوٹے بیان پر دستخط نہیں کرسکتا۔“

اس کے بھاری ہاتھ کا ایک زبردست گھونسا میرے چہرے پر پڑا... میں اسٹول سمیت پیچھے الٹ گیا۔ میرا نچلا ہونٹ دانتوں میں آکر پھٹ گیا اور اب بھل بھل خون بہنے لگا... جلاد صفت انسپکٹر خونخوار بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں آستینیں چڑھالی تھیں اور مجھے ٹھوکریں لاتیں اور گھونسیں مارنے لگا۔ میں گُگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے اس طرح کی ماریں کھاتا رہا تھا شاید اس لیے میرے اندر اس کی مار سہنے کی مدافعت موجود تھی، میں سہتا رہا، چلاتا چنختا رہا، اس کے بعد میری شرٹ پھاڑ دی گئی۔ سانپ جیسے چوڑے پھن والے لتر میری ننگی پیٹھ پر برسائے گئے۔ پھر میرا سر لوہے کی بونگ میں پھنسا دیا گیا۔ مجھے اپنی کھوپڑی پھنسی ہوئی محسوس ہونے لگی، اس انسانیت سوز تشدد کو سہنا میری مجبوری تھی، وہ اذیت جس نے میری روح تک کو بچپن سے لے کر اب تک زخمی اور چھیر چھیر کر ڈالا تھا۔ اور جس زخم کے سامنے مجھے دنیا کی ایذا ہیچ لگتی... وہ تھی میرے اپنے سگے باپ کا مجھے دھتکار دینا۔ اپنی شناخت جس کا میں حقدار تھا۔ اس سے جدا کرکے ایک نئی نویلی عورت کی خاطر اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے اکھاڑ پھینکنا۔ یہی وہ اذیت تھی جسے جب بھی یاد کرتا، میں دکھ و کرب کی ایک لہر عذاب میرے پورے وجود کو ابلتے آتش فشاں کے دہکتے لاوے میں بدلنے لگتی۔ اس نے میرے اندر انسپکٹر کے اس تشدد کو سہنے کی ایسی قوتِ مدافعت پیدا کردی تھی کہ میں یہ تشدد سہتا چلا گیا۔ کسی موذی وبائی بیماری کے بچاؤ کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر ویکسین استعمال ہوتی ہے۔ یہ ویکسین اسی بیماری کے وائرس یا جراثیم سے ہی بنتی ہے، جسے انجکشن کے ذریعے خون میں منتقل کیا جاتا ہے، تاکہ ہمارے جسم کے قدرتی مدافعتی نظام اس جراثیم سے جنگ کرنے اسے ختم کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ یہ جراثیم ویکسین کے ذریعے بہت کمزور کرکے خون میں شامل کیا جاتا ہے، اور قدرتی مدافعتی نظام اسے آن واحد میں ختم کردیتا ہے۔ پھر اس کے اندر اصل جراثیم کو مارنے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ ”ویکسین“ کا خاص طبی اصول ہے، میں نے بھی اپنے ازلی دکھ کو ویکسین کے طور پر ہی استعمال کیا تھا اور پولیس کا یہ ناروا تشدد سہنے میں کامیاب رہا تھا۔

روشن خان پر جنون سوار ہوگیا تھا۔ اس کی بیل جیسی ابھری آنکھوں سے خونخواری اور درندگی دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی بے گناہ اور نہتے آدمی پر تشدد کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہوگا۔

اس کے بعد ایک دیوار گیر آہنی اسٹینڈ کے قریب مجھے گھسیٹ کر لے جایا گیا۔ وہاں زنگ آلود فولادی زنجیریں اور آہنی کڑوں سے مجھے جکڑ کر جالی دار شکنجے میں جکڑ دیا گیا اور تب تک شکنجے کو تنگ کیا جاتا رہا کہ میری ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ جب ہڈیاں چٹخنے کے بالکل قریب محسوس ہونے لگیں تو میں نے ہانپتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

”بب... بس... کرو... ختم... خدا کا واسطہ... انسپکٹر! بس کرو... میں اب مزید تکلیف نہیں سہہ سکتا۔“

میری داد فریاد پر تشدد کا یہ غیر انسانی اور بہیمانہ عمل روک دیا گیا۔ بدبختوں نے .... میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی نہیں کھولی تھیں۔ جو میری جسمانی اذیتوں میں اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔

تھوڑی دیر تک میں ننگی اینٹوں کے سیلن زدہ فرش پر عضوِ معطل کی طرح پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اس کے بعد مجھ پر پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی گئی، جلتے سلگتے زخموں کی اینٹھن میں برائے نام ہی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد کہیں جاکر میرے دونوں ہاتھ آزاد کردیے گئے اور مجھے دوبارہ بازوؤں سے پکڑ کر اسٹول پر بٹھا دیا گیا۔

”اب اگر تو نے انکار کیا تو میرے ہاتھوں بڑی اذیت ناک موت مرے گا۔“

میری زخم زخم سماعتوں سے اس جلاد صفت انسپکٹر روشن خان کی غراتی ہوئی آواز ٹکرائی تو... میں نے ہانپتے اور کراہتے ہوئے اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔

اسٹیمپ پیپر میرے سامنے تھا۔ میں نے اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے قلم اٹھایا اور اپنا نام لکھا اور دستخط کرنے کے بعد انگوٹھا بھی لگا دیا۔

یہ سب کرنے کے بعد انسپکٹر روشن کا چہرہ غرور اور فاتحانہ مسرت سے مزید مکروہ اور شیطانی محسوس ہونے لگا...

گھنٹے ڈیڑھ کے بعد مجھے نجی ٹارچ سیل سے نکال کر دوبارہ ناڑ پورہ کے لاک اپ میں پھینک دیا گیا۔ مجھے اب کورٹ میں اپنی پیشی کا شدت سے انتظار تھا۔

شاید چند دنوں میں مجھے کورٹ میں پیش کیا جانے والا تھا، اس دوران میرے زخموں کی مرہم پٹی وغیرہ بھی باقاعدگی سے کی جاتی رہی مگر میں نے یہ زخم مرہم پٹی کرنے کے لیے نہیں سہے یا کھائے تھے۔ لہٰذا مرہم پٹی کرکے جانے والے سپاہی کے بعد خود کو اپنے ہاتھوں گزند پہنچاتا، خود گزیدگی کا یہ عمل کس قدر امتحان طلب اور کٹھن ہوتا ہے، یہ میں ہی جانتا تھا۔ میں اپنے کچھ گہرے مخفی زخموں کو بھرنا نہیں چاہتا تھا۔ چھٹے روز بالآخر مجھے عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ انسپکٹر نے کچھ مزید مجھے سمجھا دیا کہ مجھے اپنے تحریری بیان کے بعد اور کیا کہنا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ میں غلطی پر تھا یا... یہ راتب انسپکٹر... بے وقوف تھا... یا پھر... وہ لوگ گھاس کھا گئے تھے، جنہوں نے اس جلاد صفت جنونی انسپکٹر کے ذریعے مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف بارودی کارتوس کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔ کیا ان کی عقل میں یہ بات نہیں سما رہی تھی کہ میں کورٹ میں نہ صرف اپنے تحریری بیان سے مکر سکتا تھا بلکہ روشن خان کا کچا چٹھا بھی بیان کرسکتا تھا۔ ان کے اس اطمینان اور تسلی سے اب مجھے بھی نامعلوم بے چینی اور تشویش سی ہونے لگی۔ انہیں کیونکہ اس بات پر پورا یقین تھا کہ میں وہاں الٹا ان کے خلاف پھٹ پڑنے کے بجائے وہی بیان دوں گا جو یہ چاہتے ہیں یا پھر یہ مجھے اب تک ”اطفال گھر“ سے بھاگا ہوا ایک کمزور اور خوف زدہ سا ”بچہ“ سمجھتے تھے؟ پولیس موبائل میں مجھے کورٹ لے جایا گیا۔ دوسری پیشی پر میری حاضری ہونا تھی۔ جب اس کا اعلان ہوا تو یکدم اس جنونی جلاد صفت انسپکٹر نے میرے کانوں میں ایک ایسی سنسناتی ہوئی سرگوشی کی جس نے مجھے میرے بدترین خدشات اور نامعلوم سی تجسس آمیز بے چینی کو گویا سرنگوں کرڈالا۔

”دیکھ اوئے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ تیرے دل و دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اب بھی تیرے دماغ میں کوئی ٹیڑھ‘ چالاکی ہے تو اسے نکال پھینک۔ تو ابھی بچہ ہے ہمارے سامنے۔ اطفال گھر سے نکلا ہوا نہیں بلکہ انڈے سے نکلا ہوا۔ مجھ سے بھی زیادہ خطرناک لوگوں کی تجھ پر شکرے جیسی نظریں ہیں کورٹ میں وہی کچھ کہنا ہوگا تو نے جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے.... اب کورٹ میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا منظر بھی دیکھ لے۔“

جب مجھے وسیع احاطے سے گزار کر کورٹ کے برآمدے کی طرف لے جایا جارہا تھا تو انسپکٹر نے پھر سنسناتی ہوئی سرگوشی میرے کان میں انڈیلی۔

”اس طرف دیکھ... غور سے ذرا...“

میں نے دم بہ خود نظروں سے اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک کلیجی رنگ کی بیش قیمت نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی تھی، اس کے شیشے بلائنڈڈ تھے پھر عقبی نشست کی کھڑکی کا شیشہ خودکار انداز میں نیچے کو سرک گیا۔

پھر میری کھلی آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا، وہ منظر نہیں، میرے بچپن کی معصوم اور دھتکاری ہوئی زندگی کا خراج تھا۔ میری وہ واحد خوشی اور مسرت تھی، میرے جینے کا باعث تھی... عابدہ دو خطرناک گھنی مونچھوں والے بھیڑیا صفت مردوں کے درمیان بیٹھی مجبور نگاہوں سے میری جانب تک رہی تھی۔ دونوں گن بردار تھے، ایک نے اپنی گن کی جھلک مجھے کھڑکی کے راستے دکھا دی تھی۔ دوسرے شخص کو میں پہچانتا تھا۔ وہ اشرف تھا، اس کے چہرے پر بڑی زہر آلود مسکراہٹ تھی۔

عابدہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف تکے جارہا تھا۔ گویا ہم دونوں کو ایک دوسرے کی قابلِ رحم حالت دکھا کر دیدۂ عبرتِ نگاہ بنایا جارہا تھا کہ زبردست کے

آگے زبردست کی نہیں چلتی... تم کو وہی کرنا ہے، جو ہم چاہیں گے۔

عابدہ کو دیکھ کر تو میں جیسے اپنے اردگرد سے ہی بےخبر ہوگیا تھا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب کھڑکی کا شیشہ دوبارہ بند ہوگیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے ریورس ہوکر ایک طرف غائب ہوگئی۔ کوئی بٹن دبا تھا کہ اسکرین سے وہ منظر غائب کردیا گیا۔ اشرف کو دیکھ کر میرے وجود میں نفرت کی تندو زہریلی لہر ابھری تھی۔ میرے اور عابدہ کے درمیان تعلقِ خاطر کو اس کمینے اور خبیث انسان کے علاوہ اور کون جان سکتا تھا؟

"تم ہمارا اشارہ سمجھ چکے ہوگے۔" روشن خان نے مجھے آگے دھکیلتے ہوئے پھر سرگوشی کی۔ "وہ لڑکی تمہارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے، یہ مجھ سے زیادہ وہ لوگ جانتے ہیں جن کے قبضے میں اس وقت اس کی عزت اور جان ہے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ تمہارے بیان بدلنے سے ہمارا اتنا بڑا نقصان نہ ہوگا جتنا کہ تمہارا ناقابلِ تلافی نقصان ہوجائے گا۔ چلو آگے۔"

میرے پورے وجود میں سائیں سائیں ہورہی تھی۔ دل کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا تھا۔ چلنے کی سکت ختم ہونے لگی تھی۔ ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ شاید مجھ سے زندگی کی بھیانک غلطی ہوگئی تھی، میں خود کو چالاک و ذہین سمجھتا تھا مگر میرے دشمن تو میری سوچ سے بڑھ کر مکار اور عیار ثابت ہورہے تھے، کسی طرح عین وقت پر مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کیا گیا تھا۔ اب میں کیا کروں؟

کورٹ کا داخلی دروازہ اب صرف چند قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا، یہ منحوس دروازہ مجھ سے دور ہی رہے اس تک پہنچنے کا فاصلہ کبھی ختم نہ ہو، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پولیس نہیں، جہنم کے فرشتے مجھے جہنم کے دروازے کی جانب گھسیٹ رہے ہوں۔

بالآخر لرزیدہ قدموں سے عدالت کا دروازہ پار کرنا ہی پڑا۔ آگے ایک پل صراط منتظر تھا۔ اب وہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا، جو میں چاہتا تھا۔ اب میں جج صاحب کے سامنے چلّا چلّا کر اپنی دادفریاد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اپنی سکت اور قوتِ برداشت سے زیادہ جو تشدد سہا تھا، وہ سب مجھے رائگاں جاتا محسوس ہورہا تھا۔ کاش! میں گونگا ہوجاؤں۔ کاش... میری قوتِ گویائی سلب ہوجائے اور میں وہ جھوٹا بیان نہ دے سکوں... جو کسی بےگناہ کے گلے کا پھندا یا کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بننے والا تھا۔

کاش... کاش... مایوسیوں اور نا امیدوں کے اندھیارے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مجھے کٹہرے میں لاکر کھڑا کردیا گیا۔ کمرائے عدالت میں خاموشی تھی کچھ وکیل ایک طرف مستطیل میز پر موجود نظر آئے، جج صاحب بارعب نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ کسی وکیل نے میرے بارے میں نجانے کس کس جرم کی ایک طویل فہرست سے جج کو آگاہ کیا۔ ایسے خطرناک جرائم جن کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے جھوٹے بیان میں بار بار کبھی مختاری بیگم، کمیل دادا اور اول خیر کا نام آرہا تھا، ان کے ساتھ میرے دیرینہ تعلقات کو جوڑا جارہا تھا، اور اب رہی سہی کسر خود میں اپنی زبان سے پوری کرنے والا تھا۔ پھر کیا باقی رہتا، سب کچھ شاید ختم ہوجاتا۔

"مایوسیوں کے اندھیروں کی انتہا میں ایک امید کی ٹمٹماتی جوت ضرور نظر آتی ہے کاکے! جسے صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جو اللہ پر یقین کامل رکھتے ہیں، کہ مایوسی کفر ہے، اس ذات پاک کے ہوتے ہوئے اللہ کو ایک بار پکار کے دیکھو... بےآسرا کم مایہ اور مظلوموں کی تو وہ سب سے پہلے سنتا ہے۔ اللہ سے مدد مانگو۔"

سرمد بابا کے یہ الفاظ میری سماعتوں میں گونجنے لگے۔ اسی وقت میں نے دل کی عمیق گہرائیوں سے مدد کے لیے اللہ کو پکارا۔

"یااللہ! میری مدد فرما۔ میں کتنا مظلوم ہوں، تو بھی جانتا ہے، مگر عابدہ... وہ تو مظلومیت کی تصویر ہے، تو ہی اس کی حفاظت فرمانا... مگر میں تیرے آسرے تجھ سے امید کے واسطے ظالموں کے آگے سینہ سپر ہوجاؤں گا۔"

دعا مانگنے کے بعد میں نے عابدہ کو اللہ کے حوالے چھوڑ دیا۔ اور جب جج نے مجھ سے گمبھیر لہجے میں یہ کہا۔

"تم اپنی صفائی اور بیان میں کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس کے سامنے میرے بیان کا کاغذ موجود تھا۔

"جج صاحب! میری قمیص اتاری جائے۔" بالآخر میں نے کہا۔ کمرائے عدالت میں کچھ ہلچل سی مچی۔ میں نے ترچھی مگر سنسناتی نظروں سے قریب موجود انسپکٹر روشن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جو تھوڑی دیر قبل اپنی متوقع فتح کے باعث کھلا ہوا تھا، یک دم مسخ ہونے لگا۔ عدالت میں لوگوں کی بھنبھناہٹ کا شور بڑھنے لگا تو جج صاحب نے ہتھوڑا مار کر "آرڈر... آرڈر" کہا۔ پھر انہوں نے ایک اہلکار کو حکم دیا جس نے فوراً تعمیل کرتے ہوئے میری شرٹ اتار دی۔ میرے جسم پر تشدد کے نیل اور زخم سب کو نظر آگئے۔ میں

نے اپنی شلوار بھی اتارنے کی اجازت چاہی تو ایک کالے کوٹ والے وکیل نے اعتراض کرنا چاہا۔ مگر جج صاحب "آبجیکشن اوور رول" کہہ کر اعتراض مسترد کردیا۔ تاہم میں نے جج صاحب سے کہہ دیا تھا کہ میں نے زیرجامہ (جانگیہ) پہن رکھا ہے۔ جج صاحب سمجھدار انسان تھے، میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سمجھ چکے تھے۔

میری شلوار اتاری گئی تو وہاں بھی گھٹنوں اور پنڈلیوں پر نیل اور چوٹوں کے نشان تھے۔

"جج صاحب! اس وقت میں ہی اپنا وکیل ہوں، میں قانون کو نہیں جانتا لیکن اپنے عام شہری حقوق سے واقف ضرور ہوں۔" میری آواز میں رفتہ رفتہ جذباتی رقت اتر رہی تھی۔ "جج صاحب آپ سمیت سب کو یہ نشان نظر آگئے ہیں تو میں اب اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔"

جج صاحب نے سر کے خفیف اشارے سے مجھے بولنے کی اجازت دی۔ اور پھر میں رکا نہیں چلتا چلا گیا۔ اطفال گھر سے لے کر اب تک کی ساری روداد سچ سچ بیان کرڈالی اور عابدہ کے متعلق بھی سب کچھ سچ بتادیا۔ سرمد بابا موجودہ سیٹھ منظور وڑائچ کا بھی ذکر کرڈالا۔ جو اب ایک معروف کاروباری معتبر شخصیت بن چکے تھے، انسپکٹر روشن خان کی نجی ٹارچر سیل کے بارے میں بھی بتادیا۔

"جج صاحب میں نے جو کہا ہے سچ کہا ہے مگر اس سچ کی سزا مجھے ایک بےگناہ اور معصوم لڑکی عابدہ کی عزت اور جان کو خطرے میں ڈالنے کے بعد... ملنے والی ہے۔ اب میں آپ کے قانون کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرتا ہے۔ جج صاحب آپ سمیت اس کمرائے عدالت میں موجود لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر میری التماس ہے کہ وہ میری معصوم اور بےگناہ عابدہ کی عزت اور جان کی خیر کے لیے دعائیہ کلمات ضرور ادا کردیں کہ مجھے ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنے اللہ کی طاقت اور سچ کی فتح پر پورا یقین ہے۔ بس! جج صاحب! مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا گیا۔ میرا وجود شدید جذباتیت سے کانپ رہا تھا، آنکھیں آنسوؤں سے تربتر تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب عدالت سے میں نے دو افراد کو تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر نکلتے دیکھا۔ چند اور لوگوں نے بھی سرسری نگاہ ان پر ڈالی تھی تاہم پورے ہال کمرے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جلاد صفت انسپکٹر روشن کا چہرہ دھواں دھواں ہورہا تھا۔ روشن خان اور اس کے سرکردہ ساتھیوں کے... سان وگمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ جو چال انہوں نے عین وقت پر چلی تھی، وہ بُری طرح پٹ جائے گی۔

وہاں شہر کے معززین کے علاوہ انسانی حقوق کی تنظیم سے وابستہ افراد بھی موجود تھے، صحافی برادری سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے جو سب کے سب میرے حامی بن چکے تھے۔

جج صاحب نے اس وقت انسپکٹر روشن خان کی گرفتاری کے احکامات جاری کرتے ہوئے ایک نئے تفتیشی افسر کو کیس پر تعینات کرنے کے بعد اطفال گھر پر چھاپے اور چوہدری ممتاز سمیت گگل خان کی بھی گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیے۔

کمرائے عدالت میں زبردست کھلبلی مچ گئی تھی، انسپکٹر روشن مجھے بڑی خونخوار اور کھا جانے والی نظروں سے گھورے جارہا تھا، جج صاحب اٹھ کر اپنے چیمبر میں جاچکے تھے۔ مجھے نئے تفتیشی افسر کے حوالے کردیا گیا۔ برآمدے تک آنے پر صحافیوں کی فوج نے مجھے گھیرلیا۔ میں کھل کر جو انہیں بتاسکتا تھا بتاتا رہا پھر اس کے بعد مجھے ایک بڑی سی سرکاری جیپ میں سوار کرادیا گیا۔ میں اب قانون کا قیدی نہ تھا بلکہ اس کی کسٹوڈی میں تھا اور بہت جلد مجھے سرمد بابا یعنی سیٹھ منظور وڑائچ کے حوالے کیا جانے والا تھا۔

☆☆☆

میں اب آزاد تھا مگر میرا دل و دماغ ایک نامعلوم سی قید میں جم کر رہ گیا تھا۔ میں اندر سے ٹوٹ ٹوٹ سا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میرا سب کچھ ختم ہوگیا ہو۔ جیسے میں نے اپنی آزادی کے بدلے میں کسی معصوم اور بےگناہ زندگی کی عزت وجاں کا سودا کرلیا ہو۔ دماغ قلابازیاں کھا رہا تھا، ضمیر تسلیاں دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی آزادی کے لیے نہیں بلکہ سچ کی خاطر کیا ہے۔ اللہ کی ذات پر بھروسا کرکے اس کی رحمانیت کی ایک پُرامید آس کے بل بوتے پر کہ اب وہی عابدہ کی عزت وجاں کا حافظ و ناصر ہے۔

میرے نصیب کی بھی کیسی ستم کاری تھی، بچپن میں ایک عورت کی خاطر باپ نے مجھے خود سے دور کردیا، اطفال گھر میں پلا بڑھا پھر جب اطفال گھر کو ایک جہنم گھر میں بدلا گیا تو بڑی مشکل سے وہاں سے رہائی ملی تو تقدیر کی ظرفہ کاری نے مجھے ایک دوسرے جہنم میں دھکیل دیا۔ وہاں کی صعوبتیں سہتا ہوا آزاد ہوا تو اپنی ذات کا قیدی بن گیا۔ نیتوں کے حال اللہ جانتا ہے۔ میں عابدہ کی خاطر ہر طرح کی صعوبت والام سہہ جانے کی سکت رکھتا تھا۔ مگر یہ معاملہ

سچ کے جھوٹ پر ختم کا تھا، یہ میری آزادی کی جنگ نہیں تھی، حق و باطل کی جنگ تھی۔ اب میری چشمِ تصور میں عابدہ کا چہرہ تھا کہ اب وہ جانے کس حال میں ہوگی۔

وقت گزرنے کا مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ ایک مقام پر گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ نئے تفتیشی افسر کے ہمراہ دو اہلکار اور ڈرائیور تھے، تفتیشی افسر گورا چٹا پکی عمر کا دراز قامت شخص تھا۔ شکل و صورت سے اچھا ہی دکھائی دیتا تھا، اس کا نام مجھے انسپکٹر ریاض باجوہ معلوم ہوا تھا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ نرم اور دوستانہ تھا۔ شاید وہ میری دلی کیفیات سے واقف تھا، یہی سبب تھا کہ ایک گہری پُرسوچ تفکر کی پرچھائیں اس کے چہرے کو گہری متانت بخش رہی تھیں ایک بالکل نئی طرز کی عمارت کے احاطے میں جیپ رکی تھی اور ہم نیچے اتر آئے۔

یہ مجھے پولیس سے ملتا جلتا ہی کوئی محکمہ معلوم ہوتا تھا، ان کی وردیاں بھی تھوڑی مختلف تھیں۔ یہاں اور بھی وردی پوش افراد نظر آرہے تھے، کچھ مسلح کچھ غیر مسلح۔ مجھے ایک صاف ستھرے کوریڈور سے گزار کر ایک بڑے آفس روم میں لایا گیا۔ ایک بڑی سی میز پوش والی میز کے عقب میں بھاری بھرکم چیئر تھی، مجھے اشارے سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر ریاض باجوہ اپنی چیئر پر براجمان ہوگیا۔ اس نے پہلے میرے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں منگوائیں، ان کا مجھے اب کہاں ہوش رہا تھا، مگر ریاض صاحب کے اصرار پر میں نے کچھ بسکٹ اور ایک کیک کا ٹکڑا کھایا۔ چائے پی پھر ریاض باجوہ نے مجھ سے ساری تفصیل دوبارہ پوچھنے کے بعد قلم بند کرڈالی، اس نے سرمد بابا کا سیل نمبر مجھ سے لیا... اور ان سے رابطہ کیا۔ سچی بات تھی مجھے اب سرمد بابا سے بھی کوئی امید نہ رہی تھی۔ بلکہ مجھے کسی سے کوئی امید نہ رہی تھی۔ میری حالت ہارے ہوئے جواری کی سی تھی، جو اپنی ساری پونجی ایک جوئے میں ہار چکا ہو۔ سرمد بابا سے مجھے شکایت نہ تھی کہ انہوں نے میرے ایس ایم ایس پر ابھی تک کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ممکن تھا وہ مس ہوگیا ہو۔ مگر اب کیا فائدہ، پلوں کے نیچے سے تو بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

''نوجوان! تمہارے سچے جذبے کی میں قدر کرتا ہوں مگر تم بہت زیادہ مایوس اور افسردہ نظر آرہے ہو؟''

باجوہ نے میرے چہرے کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

شاید سرمد بابا سے اس کا رابطہ نہ ہوسکا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔

''کیا سیٹھ صاحب سے بات نہیں ہوسکی؟''

''تھوڑی دیر بعد بات کرتا ہوں۔ ان کا نمبر مصروف جارہا ہے۔'' باجوہ نے جواب دیا۔

''کیا سیٹھ صاحب (سرمد بابا) سے رابطہ ضروری ہے؟''

''یقیناً۔'' وہ بولا۔ ''کورٹ میں تم نے خود ہی ان کا حوالہ دیا تھا اور یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔ مجھے رپورٹ میں اس کا ذکر کرنا ہے۔ وہ ایک طرح سے تمہاری ضمانت ہوگی۔'' میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوبارہ رابطہ کیا۔ اس بار رابطہ ہوتے ہی باجوہ صاحب نے مختصراً الفاظ میں انہیں میرے متعلق دیگر معلومات فراہم کیں پھر سیل فون میری طرف بڑھادیا۔ میں نے فون لے کر کان سے لگایا اور سلام کیا۔

''شہزی! میرے بچے۔ تم... تم... ٹھیک تو ہونا...؟ یہ... یہ سب کیا ہے؟ تم اطفال گھر سے کیوں نکال دیے گئے...؟'' سرمد بابا نے انتہائی شفقت سے پوچھا۔

ان کا مجھے اس طرح پکارنا... نہ جانے کیوں میرے اندر کی ازلی کسک کو بیدار کرنے کا باعث بننے لگا۔ میں نے حلق میں تیرتی رقت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جی بابا! میں ٹھیک ہوں...''

''تمہارا لہجہ بتارہا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو، وہیں رکے رہو۔ میں ابھی پہنچتا ہوں، ذرا اس آفیسر کو فون دو۔'' وہ فوراً بولے۔ میں نے سیل فون باجوہ صاحب کی طرف بڑھادیا۔ تھوڑی دیر تک وہ انہیں کچھ بتاتے رہے۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

''وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔'' سیل فون میز پر رکھنے کے بعد باجوہ صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ میں نے آہستگی سے سر کو جنبش دی۔ نصف گھنٹے بعد بیش قیمت سوٹ میں ملبوس سرمد بابا اندر داخل ہوئے، میں انہیں دیکھ کر کھڑا ہوا۔ انہوں نے بے اختیار مجھے خود سے لپٹالیا۔ میرے جیسے باپ کے پیار اور شفقت کو ترسے ہوئے انسان کے لیے ان کی یہ قربت مجھے انتہائی جذباتی کرگئی اور میں بے اختیار رو دیا۔

بہت آہستگی سے انہوں نے مجھے خود سے علیحدہ کرکے دوبارہ کرسی پر بٹھایا پھر باجوہ صاحب سے ہاتھ ملایا۔ میں ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، وہ میرے لیے اس قدر پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے، جیسے میرا ان سے خونی رشتہ ہو۔ میرا اپنا حقیقی سگا باپ جو میری ساری زندگی کا ایک

سوالیہ نشان تھا، وہ کہاں تھا؟ میں اسے تلاش کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ وقت اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر کئی ایسے سوالات سر ابھارا کرتے تھے، جن کے جوابات میں اپنے باپ سے سننا اور پوچھنا چاہتا تھا۔ اولاد، ماں باپ کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے، مجھے اس کا اندازہ تھا، میں اپنے سگے باپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں اس پر بار کیوں تھا؟

ایک یہ سرمد بابا تھے جو مجھ سے باپ جیسی محبت کرتے تھے، باجوہ صاحب نے انہیں اب تک کی ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ میں دیکھ رہا تھا، سرمد بابا ازحد فکرمند اور تشویش زدہ نظر آرہے تھے، یہ سب سننے کے بعد انہوں نے اپنا سر تھام لیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''بیٹا! تم بالکل فکر نہ کرو۔ ضرورت پڑنے پر میں اعلیٰ سے اعلیٰ وکیل کروں گا تمہارے لیے۔'' پھر وہ باجوہ صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''مجھے ایک بات کا ڈر ہے باجوہ صاحب! شہزاد کو جس خطرناک چکروں میں پھانسا گیا ہے۔ کیا وہ اتنی آسانی سے نکل پائے گا؟ اور اس معصوم بچی عابدہ کا کیا ہوگا؟''

''آپ بے فکر رہیں۔ وہ لوگ اب عابدہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتے، شہزاد کے عدالت میں اس بیان کے بعد سب پہاڑ کے نیچے آجائے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' سرمد بابا دعائیہ لہجے میں بولے مگر میں عابدہ کی طرف سے جانے کیوں مایوسی کا شکار تھا۔ شاید مجھے خدشہ تھا کہ وہ جن لوگوں کے قبضے میں تھی، وہ کم خطرناک لوگ نہ تھے، اور عدالت میں ان کے خلاف بیان نے جلتی پر تیل نے کام کیا ہوگا۔

''کیا میں اسے لے جاسکتا ہوں؟'' تھوڑی دیر بعد ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے بعد سرمد بابا نے رخصت ہونا چاہا تو باجوہ صاحب نے خوش اخلاقی سے مسکرا کر مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شیور۔۔ آپ شہزاد کو لے جاسکتے ہیں مگر بہ وقتِ ضرورت ہمیں اس کی اور آپ کے تعاون کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''

سرمد بابا نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر باجوہ صاحب کو تھمادیا جو انہوں نے سنبھال لیا۔

ہم دونوں رخصت ہوگئے۔ باہر ایک لمبی سی نئے ماڈل کی چمچماتی کار کھڑی تھی، باوردی ڈرائیور موجود تھا، اس نے جلدی سے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں ہی پچھلی نشست پر براجمان ہوگئے تو ڈرائیور نے کار آگے بڑھادی۔

سارے راستے خاموشی رہی، شاید وہ ڈرائیور کی موجودی میں مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے، مجھے تو ویسے ہی چپ سی لگی ہوئی تھی، میرا دل و دماغ عابدہ کی طرف تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی اسے ظلم سے بچاسکتا ہے۔ جبکہ میں اپنے تئیں بھی عابدہ کی تلاش اور بازیابی کے سلسلے میں عملی طور پر کچھ کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اب آزادی ملی تو اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس تمام تر کشیدہ صورتِ حال کی وجہ سے میرے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں سرمد بابا سے پوچھتا ان کی کایا پلٹ کیسے ہوئی تھی؟ وہ کون خاتون تھیں جو انہیں اطفال گھر کے ''اولڈ ونگ'' سے ایک دن اچانک اپنے ساتھ لے گئی تھیں، پھر اس کے بعد سرمد بابا کو میرا بھی یارا نہ رہا۔ نہ آئے، نہ میری خیریت پوچھی؟ پھر ایک طویل عرصے بعد سیٹھ منظور وڑائچ کے نام سے اطفل گھر کے دورے پہ آئے تو مجھے پہچان بھی لیا۔ مجھے سرمد بابا کا معاملہ کچھ پُراسرار اور گمبھیر محسوس ہورہا تھا، لیکن مجھے تو اس وقت اپنا ہی ہوش نہ تھا، میرا سارا دھیان عابدہ کی طرف تھا، دل و دماغ شدید بے چینی اور اضطراری کیفیات میں بار بار کروٹیں بدل رہا تھا، جج صاحب نے اگرچہ عابدہ کی بازیابی کے سلسلے میں احکامات جاری کر تو دیے تھے، اور باجوہ صاحب اس سلسلے میں کیا کرنے والے تھے، یہ آگے وقت بتاتا، جبکہ میں اس معاملے میں سرِدست خود کو بے بس محسوس کررہا تھا۔

کار ایک پوش علاقے میں داخل ہوگئی۔ سڑک کے دورویہ انسانوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت وہ عالیشان بنگلے اور کوٹھیاں نظر آرہی تھیں جنہیں میں بظاہر خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چند منٹ بعد کار ایک پُرشکوہ رہائشی عمارت کے خودکار گیٹ سے اندر داخل ہوئی جہاں ایک گن مین موجود تھا۔ جس نے ''صاحب'' کی کار دیکھتے ہی فوراً گیٹ کھول کردیا تھا۔

کوٹھی بڑی شاندار تھی، باغ، باغیچہ، خوش نما گل بوٹوں کی باڑیں انواع واقسام کے درخت۔ جن کا نظارہ آنکھوں اور دماغ کو تازگی بخش رہا تھا، پورچ میں ایک اور چھوٹی گاڑی بھی موجود تھی، ایک ملازم اندر سے بھاگا ہوا آیا۔ میں اور سرمد بابا کار سے اتر آئے۔ سہ پہر کا وقت

ہو چلا تھا۔ ایک خوبصورت اور بیش قیمت لکڑی کے فینسی محرابی داخلی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے تھے، یہ وسیع لاؤنج تھا، بیش قیمت صوفے دھرے تھے، سامنے دیوار پر بڑی ایل سی ڈی نصب تھی۔ وہیں ٹین ایجز لڑکا لڑکی ریموٹ ہاتھ میں لیے بیٹھے کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی خوب صورت تھے، اور صورتوں کی مماثلت بھائی بہن ہی ظاہر کرتی تھی، ہم پر نظر پڑی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے، فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

''سلام دادا جان!'' دونوں نے سرمد بابا کو دادا کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ پھر میری طرف کچھ الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا اور لڑکے نے بابا سے میرے بارے میں پوچھا۔ ''دادا جان! یہ کون ہے؟''

''دانی بیٹا یہ تمہارا دوست... شہزاد۔ یہ اب ادھر ہی رہے گا۔'' وہ بولے۔ دونوں نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد لڑکی نے سرمد بابا سے کہا۔

''دادا، مما، گھر پہ نہیں ہیں۔''

''گھر پہ نہیں ہیں؟ کہاں گئی ہیں؟'' سرمد بابا کچھ چونکے۔

''انکل جمال کا فون آیا تھا، آفس کا کوئی کام تھا۔''

''میرے لیے کوئی پیغام؟''

''نہیں دادا! کہہ رہی تھیں کوئی بات ہوگی تو وہ خود آپ سے رابطہ کرلیں گی۔''

''تمہاری مما کی طبیعت تو ٹھیک تھی ناں؟ انہیں کیا ضرورت تھی جانے کی۔ مجھے فون کر دیتیں میں چلا جاتا۔'' سرمد بابا کچھ فکرمند سے نظر آئے۔

لڑکے نے کہا۔ ''دادا! انکل جمال نے پہلے آپ ہی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر آپ کا سیل فون...''

''اچھا... اچھا... ٹھیک ہے۔ میں عارفہ بیٹی سے بات کرلیتا ہوں...'' وہ یکدم بولے۔ ''آؤ بیٹا۔'' آخر میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور مجھے لے کر ایک مختصر راہداری کی طرف بڑھے۔ دونوں لڑکا لڑکی میری طرف تکتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد سرمد بابا مجھے ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ بڑی شاہانہ طرز کا اور جدید اشیا سے مزین یہ کمرا بہت آرام دہ اور پُرسکون نظر آیا۔

''شہزی بیٹا! تم بیٹھو، میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں۔'' وہ مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے، ملازم ساتھ ساتھ تھا، پھر وہ اس کے ہمراہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے، میں ابھی سرمد بابا کے سلسلے میں سوچ بچار ہی کر رہا تھا کہ وہی ملازم دوبارہ وارد ہوا اور مجھ سے بولا۔

''آئیے جناب! آپ کو کمرا دکھا دوں۔ آپ غسل وغیرہ کر کے فریش ہو جائیں، پھر کھانا لگاتا ہوں۔''

میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی شاہانہ اور آرام دہ زندگی کا روپ دیکھا تھا۔ دل و دماغ میں کچھ مرعوبیت سی طاری تھی، میں خاموشی سے اٹھ کر ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک اندرونی دروازے سے گزار کر جس کمرے میں داخل ہوا، وہ بھی کشادہ اور آرام دہ تھا، ایک بیڈ اور سائڈ میں صوفہ تھا۔ ایک وارڈروب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازم نے مجھ سے کہا۔ ''یہاں آپ کے سائز کے کپڑے موجود ہیں، غسل کے بعد وہ پہن لیجیے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیڈ سائڈ پر بیل لگی ہوئی ہے، میں حاضر ہو جاؤں گا، ویسے میرا نام اطہر ہے۔ چلتا ہوں۔''

وہ دبلا پتلا چھریرے جسم کا ملازم یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور باتھ روم میں گھس گیا۔

غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہوا، باتھ ٹاول لپیٹ کر باہر نکلا، وارڈ روب کھولی، اپنی پسند کی جینز اور ایک ٹی شرٹ نکال کر پہن لی۔ ٹی شرٹ کچھ ٹائٹ کچھ ڈھیلی تھی، بہرحال مجھے آگئی۔ میں نے سرسری نظروں سے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہاں سرمد بابا پہلے سے موجود اپنے سیل فون پر کسی سے بات کر رہے تھے، میں خاموشی سے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اطہر نامی وہی ملازم آن وارد ہوا اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا سرو کرنے لگا۔ جب تک اس نے کھانا لگایا' سرمد بابا بھی فون سے فارغ ہوگئے۔

''بیٹا! میں تو کھانا کھا چکا ہوں۔ آؤ تم کھالو، میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے نہایت شفیق لہجے میں بولے۔ وہ اس وقت ہلکے پھلکے لباس میں تھے، میں چپ چاپ سا اٹھا اور کھانے کی ٹیبل پر آگیا۔ کھانا پُرتکلف تھا مگر مجھے کھانے پینے کا کہاں ہوش تھا، سرمد بابا نے ایک چھوٹی سی پیالی میں اپنے لیے تھوڑی سوئٹ ڈش نکال لی تھی، میں بے دلی سے کھانا کھانے لگا' اس دوران میں اطہر ہاتھ میں کارڈلیس پکڑے سرمد بابا کے قریب آیا۔ ''سر! آپ کا فون ہے۔'' کہہ کر فون تھمایا اور چلا گیا۔

''ہیلو۔'' کھانا کھاتے ہوئے میری نظریں یونہی ان

کے چہرے پر جم گئیں۔

''ہاں! میں سیٹھ منظور ہی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟'' وہ بولے پھر دفعتاً دوسری جانب سے کچھ ایسی بات سن کر ان کے چہرے پہ الجھن کے آثار نمودار ہوئے اور پھر وہ ریسیور کان سے لگائے ہوئے میرے چہرے کی طرف عجیب سی نظروں سے تکتے ہوئے بولے۔

''ہاں! شہزاد، اس وقت میرے پاس ہی موجود ہے مگر آپ کون ہیں اور شہزاد سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

''کون ہے؟ انکل!'' میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

''پتا نہیں کون آدمی ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے، لو بیٹا! کرو بات۔'' میں نے دھڑکتے دل سے فون لیا اور اپنے کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔

''او خیر...! کا کا...! تو اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں تیرے ہاتھ اور پاؤں تک چوم لیتا۔''

یہ اول خیر تھا۔ وہ اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا اور مجھ سے متاثر بھی ہو رہا تھا۔ ''کا کا تو نے ہماری خاطر اتنی بڑی مصیبت جھیلی اور قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تو تو استادوں کا استاد نکلا کا کے۔ پھر ہم نے بھی تیری قربانی رائگاں نہیں جانے دی۔''

اس کی آخری بات پر میں پورے وجود کے ساتھ چونک پڑا۔ ''کا کا تیرا ہم پر یہ بہت بڑا احسان ہے، جو ساری عمر ہم نہیں بھولیں گے۔''

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر... جو سچ تھا وہی کہا مگر اس سچ میں ایک دکھ بھی شامل ہے، ایک معصوم زندگی داؤ پر لگ چکی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی، میں سرمد بابا کے سامنے دانستہ اس کا نام لینے سے احتراز کر رہا تھا۔

''او خیر... کا کا تو کیا سمجھتا ہے ہم تجھ سے اتنے دن غافل رہے۔ جب تو عدالت میں ساری کہانی بیان کر رہا تھا، اس وقت تک میرے آدمی کمرائے عدالت میں موجود تھے۔'' وہ بتانے لگا۔ ''پھر جیسے ہی تو نے عابدہ کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں یکدم باہر نکل آئے تھے۔''

''پھ... پھر...؟'' میں کسی خیال سے فوراً دھڑکتی آواز میں بولا۔ مجھے یاد آیا تھا عابدہ کے ذکر کے فوراً ہی بعد اس کمرائے عدالت میں غیر ارادی طور پر ان دو افراد پر نگاہ پڑی تھی جو یکدم کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گئے تھے، یقیناً وہ دونوں اول خیر گینگ گروپ کے آدمی ہی تھے۔

''کا کا! بے غم ہو جا۔ عابدہ بہن ہمارے پاس ہے اور بالکل بھلی چنگی ہے۔'' دوسری جانب اول خیر نے جیسے مجھے کائنات کی ایک بہت بڑی اور غیر یقینی خوش خبری سنائی، جس نے گویا مجھے سرتاپا سماعت بنا دیا۔ مجھے یقین ہی نہ آیا۔ بولا تو زبان لڑکھڑانے لگی۔

''تت... تم... سس... سچ کہہ رہے ہو۔ تت... کیسی ہے وہ۔ ٹھ... ٹھیک تو ہے نا...؟'' میرا ریسیور والا ہاتھ بھی زبان کی طرح کپکپانے لگا۔ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھے سرمد بابا بھویں سکیڑے بہ غور میرے چہرے کی طرف تکے جا رہے تھے۔

''او خیر... کا کا سب ٹھیک ہے ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔ اور تیرے جیسے بہادر نوجوان تو ہمارے جگر کے بھی قریب ہوتے ہیں۔ لے... خود بات کرلے۔'' دوسری جانب سے اول خیر کی مخصوص آواز ابھری... میں عابدہ سے بات کرنے والا تھا، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اپنی سانس تک روک لی، دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی۔ وقت رک گیا۔ سب کچھ تھم گیا۔

''ہیلو، شہزی! یہ میں ہوں، عابدہ...''

وہ آواز نہیں تھی، وہ تو امرت تھا، شہد تھا، گویا اپنی جانِ جاناں دل آرا ہستی کا نرم و نازک لبوں سے پھونکا گیا صور تھا جس نے میرے تنِ مردہ میں، نس نس میں زندگی کو آبشار بنا کر دوڑا دیا تھا۔

''عابدہ... عابدہ...'' میں فون پر ہی اسے دیوانوں کی طرح پکارنے لگا۔ ''... یہ... یہ... تم ہو... واقعی تم ہو... کیسی ہو...؟ ٹھیک تو ہو ناں... تم... تم...؟''

وفورِ جذبات سے مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ عابدہ کے ذکر پر سرمد بابا کے چہرے کے تاثرات کچھ بدلے، وہاں ہلکی معنی خیز مسکراہٹ نے لے لی۔ وہ تو بہت پہلے سے میرے اس تعلق کو جانتے تھے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں... تم کیسے ہو... یہ لوگ کون ہیں... تمہارے دوست ہیں...؟ مجھے انہی لوگوں نے، ان بھیڑیا صفت لوگوں کے شیطانی چنگل سے بچایا ہے۔''

وہ بولے جا رہی تھی، میں نے اپنی کیفیات پر قابو پایا۔ بولا۔ ''ہاں! ہاں! تم ان کے پاس بالکل محفوظ ہو، گھبرانا نہیں، یہ میرے دوست ہی ہیں۔ میں خود ابھی تمہیں لینے کے لیے آتا ہوں۔ ذرا اس آدمی کو فون دو۔''

تھوڑی دیر بعد میں اول خیر سے بات کر رہا تھا۔
”میں... میں... ابھی عابدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“
”او خیر... کاکا! تیرے دل کی حالت کا مجھے اندازہ ہے۔“ وہ مخصوص انداز میں بولا۔
”عابدہ تیری امانت اور ہمارے لیے محترم ہے اور بالکل محفوظ بھی، جب چاہے مل لے، سیٹھ صاحب سے کہو اپنے گھر کا پتا ذرا تفصیل سے مجھے سمجھا دے۔ میں خود تمھیں لینے آ رہا ہوں مگر بتا دینا یہ بھی کہ میری آمد کا اور کسی سے ذکر نہ کرے۔“

سرمد بابا کو ابھی تک میں نے اول خیر کے بارے میں تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کارڈلیس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے مختصراً اور کچھ ڈھکے چھپے الفاظ میں اول خیر کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا۔ انہوں نے گومگو سی پُرسوچ خاموشی کے ساتھ اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی، پھر کارڈلیس میرے ہاتھ سے لے کر بولے۔ ”میں بات کرتا ہوں۔“
پہلے تو انہوں نے اپنی رہائش گاہ کا پتا اول خیر کو سمجھا دیا پھر گہری متانت سے بولے۔
”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم عابدہ بیٹی کو یہاں میرے پاس لے آؤ، شہزی اب میری سرپرستی میں ہے، میں عابدہ کو بھی اپنی سرپرستی میں لینا چاہتا ہوں۔“
سرمد بابا کی اس بات پر میں چونک کر ان کا چہرہ تکنے لگا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سرمد بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا۔
دوسری جانب سے نجانے اول خیر نے کیا کہا ہوگا، تاہم سرمد بابا بولے۔ ”آپ بالکل بے فکر رہیں۔ دونوں میرے پاس محفوظ رہیں گے۔ میں انہیں آج سے نہیں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ لو... شہزاد بیٹے سے بات کرلو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور دھیمی آواز میں بولے۔
”شہزی بیٹا! جو میں نے کہا ہے وہی ٹھیک رہے گا۔ اسے کہو عابدہ کو ادھر ہی لے آئے۔“ میں الجھ سا گیا، میں خود عابدہ کے پاس جانے اور اسے دیکھنے کے لیے اس قدر بے تاب ہو رہا تھا کہ کاش! میرے پر لگ جاتے اور میں اڑ کر جا پہنچتا۔ ویسے سرمد بابا کی بات بھی مجھے درست ہی لگی تھی، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارڈلیس ان کے ہاتھ سے لے کر اول خیر سے بولا۔
”اول خیر! سیٹھ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“
”جیسے تمہاری مرضی، ہم آپس میں مشورہ کر کے تمھیں تھوڑی دیر بعد بتاتے ہیں۔“ اول خیر نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
میری بے چینی فزوں تر ہوگئی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ رابطہ منقطع نہ ہو، عابدہ سے میں اس وقت تک فون پر باتیں کرتا رہوں، اس وقت تک اس کی خیریت سے آگاہ رہوں جب تک وہ یہاں نہیں پہنچ جاتی۔
سرمد بابا کا یہ لینڈ لائن نمبر تھا۔ وہ خود بھی معروف کاروباری شخصیت تھے، ان کا نمبر حاصل کرنا، اول خیر والوں کے لیے چنداں مشکل نہ تھا، اول خیر میری وجہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ جبکہ میں بدقسمتی سے پھنس گیا تھا۔ مگر آفرین ہے اول خیر پر اس کے بعد بھی وہ مجھ سے غافل نہ رہا، سائے کی طرح اس نے اپنے آدمی میرے پیچھے لگا رکھے تھے، حتیٰ کہ کورٹ تک وہ مجھے اپنے ساتھیوں کے ذریعے نظروں میں لیے ہوئے تھا۔ میرے بیان کے فوراً بعد اول خیر کے آدمی حرکت میں آ گئے تھے، بعد میں انہوں نے شاید اس گاڑی کو ٹریس کر کے اس پر ہلا بول دیا ہوگا، اور عابدہ کو چھڑا کر اول خیر کے محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہوگا۔

اب جب تک میں عابدہ کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیتا، مجھے قرار نہیں آتا تھا، میں کھانے کی ٹیبل سے بھی قبل از وقت اٹھ گیا۔
میں اور سرمد بابا، دوبارہ صوفے پر آن بیٹھے تھے، میں شدید اضطراری کیفیات سے دوچار تھا، عابدہ کی بازیابی اور خیریت کی خوشی اپنی جگہ تھی، پھر بھی دل عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید یہ خوشی کی زیادتی تھی، جو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ سرمد بابا میری ایک ایک کیفیات کو نوٹ کر رہے تھے۔
”ٹیک اٹ ایزی، بیٹا! میرے پاس تم دونوں بالکل خیریت سے اور محفوظ رہو گے۔“ انہوں نے تشفی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا۔ وہ بولتے رہے۔ ”مجھے تم سے کئی باتوں پر معافی مانگنا ہے، کیا تم میری بات سن رہے ہو شہزی بیٹا؟“
”جی“ جج... جی جی... ہاں میں سن رہا ہوں۔“ میں خیالات کے بھنور سے ابھر کر بولا۔ ”مگر... معافی کی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔“
”اطفال گھر میں جب میں سخت بیمار پڑ گیا تھا تو تم نے میری تیمارداری کی تھی، بالکل سگی اولاد کی طرح... شاید

اس سے بھی بڑھ کر۔ جب مجھے عارفہ بیٹی ایک دن اچانک لینے کے لیے وہاں آن پہنچی تو بعد میں اصولاً مجھے تمہاری خبر گیری لینا چاہیے تھی مگر میں ایسا نہ کرسکا۔“ اتنا کہہ کر وہ ذرا رکے، میں اب ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہ دستور اپنی جانب متوجہ پاکر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔
”عارفہ، میری بہو ہے۔ میرے بیٹے محمود کی بیوی۔“ انہوں نے انکشاف کیا، میں چونک پڑا۔ وہ آگے کہتے رہے۔
”ایک جانکاہ حادثے میں میرے بیٹے محمود کا انتقال ہوگیا تھا۔“ ان کی آواز بے اختیار بھرا گئی، میں بھی گم صم سا ہوگیا۔
”وہ چاہے کتنا ہی ناخلف اور سنگ دل سہی... مگر تھا تو میرا بیٹا... میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اللہ سے بھی نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی تھی اس کی مغفرت اور بخشش کے لیے۔ میری بہو عارفہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ شوہر کی ناوقت موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بیک وقت گھر اور وسیع و عریض کاروبار کی ذمے داری اس کے نازک کندھوں پر آن پڑی تھی۔ ایسے میں اسے میری ضرورت پڑی تو مجھے لینے کے لیے اطفال گھر آن پہنچی۔ اور رو کر اس نے سارا حال سنایا۔ مجھ سے معافیاں مانگیں، میں تڑپ گیا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔“ وہ سانس لینے کو ذرا تھمے... میں دم بہ خود سا ان پر بیتی کہانی سن رہا تھا۔
”عارفہ کی بدنصیبی نے تب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔“ سرمد بابا، اپنی بوڑھی آنکھوں کے گوشے رومال سے پونچھنے لگے، مجھے ان پر بے حد ترس آنے لگا، وہ بولے۔
”عارفہ کو جگر کی ایک موذی بیماری لگ گئی تھی... لاپروائی اور شوہر کی موت کے باعث اپنے علاج پر دھیان نہ دے سکی اور اسے جگر کا کینسر ہوگیا۔ جس کا صرف ایک ہی حل تھا، اور وہ تھا جگر کی پیوندکاری۔ ڈاکٹرز نے اسے ٹرانس پلانٹ لیور کا مشورہ دیا تھا، جو امریکا میں ہی بہ احسن و خوبی ممکن ہو سکتا تھا۔ وقت کم تھا کچھ اور پریشانیاں بھی تھیں، اس طرح میں تمھیں نہیں بھولا تھا مگر مجھے تسلی تھی کہ تم ”اطفال گھر“ جیسے ایک ذمے دار اور اچھے ادارے میں ہو۔ خدا جانتا ہے، میں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ جیسے ہی میرے حالات ٹھیک ہوں گے پہلی فرصت میں تمھیں، یہاں اپنے پاس لے آؤں گا، مگر شہزی بیٹا! زندگی کبھی کبھی ایسی الجھی ہوئی ڈور بن کر رہ جاتی ہے کہ انسان اسے سلجھاتا ہی رہتا ہے اور وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا پھر ہوش آتا ہے تو سر پکڑ لیتا ہے اپنا... یہ کیسی بے خبری سی بے خبری ہے کہ کچھ سوچنے، کچھ کرنے کا یارا ہی نہیں رہا۔ اس دوران مجھے حاجی صاحب کے جانکاہ انتقال کی خبر بھی ملی، میں نے اطفال گھر کو اپنی ذمے داری میں لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ ”نئے پنڈ“ کے چوہدری ممتاز نامی آدمی نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ تب میں نے ایک خطیر رقم بہ طور چندے کی صورت میں اطفال گھر کو دینے کے لیے وہاں کا دورہ کیا، اور تم سے ملاقات کی تم تب تک ماشاء اللہ جوان ہو چکے تھے، تاہم میں تمھیں اور تم مجھے پہچان چکے تھے۔ مگر میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اطفال گھر جیسے اتنے اچھے اور پاکیزہ ادارے کی آڑ میں اب وہاں کیا انسانیت سوز گل کھلائے جا رہے تھے۔ تمہاری زبان سے اس ادارے کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات سن کر تو میں بالکل دنگ ہو کر رہ گیا۔“ وہ اتنا کہہ کر کے پھر مسکرا کر بولے۔
”شہزی بیٹا! میرے دونوں پوتے پوتی سے تو تم مل چکے ہو ناں... پوتے کا نام خرم ہے، اور پوتی نعیمہ ہے۔ دونوں مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ بس اب تو یہی میرا کل سرمایہ ہیں میرے مرحوم بیٹے کی نشانی ہیں۔“
میں نے ان کے مرحوم بیٹے محمود کے بارے میں ان سے دعائیہ کلمات کہے۔ اور ان کی بیمار بہو سے متعلق بھی زیرِلب دعا کرتے ہوئے سرمد بابا سے پوچھا۔
”باجی عارفہ کی طبیعت اگر اس قدر خراب ہے تو آپ کو انہیں فوراً لے کر امریکا روانہ ہو جانا چاہیے۔“
”ساری کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں شہزی بیٹا۔ چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ میں بھی عارفہ بیٹی کے ساتھ چلا جاؤں مگر عارفہ بیٹی کے پُرزور انکار پر کہ دونوں بچوں کی تعلیم کا حرج ہوگا نجانے کتنا عرصہ عارفہ بیٹی کو وہاں لگے۔ پھر یہاں کچھ کاروباری مجبوریاں بھی ہیں۔ بہرحال تین روز بعد عارفہ بیٹی کی فلائٹ کنفرم ہو چکی ہے۔“
”تو کیا وہ اکیلی جا رہی ہیں، امریکا؟“ میرے لہجے میں موہوم سی حیرت تھی۔
”ہاں بیٹا! حالات اور مجبوری نے عارفہ بیٹی کو بہت سخت اور نڈر بنا دیا ہے۔ یہ فیصلہ اس کا ہے کہ وہ اکیلی ہی بہ غرضِ علاج امریکا جائے گی۔ آگے جو نصیب...“ سرمد بابا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے اب سرمد بابا کے دکھوں کا اندازہ ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بابا کیا میں عارفہ باجی سے مل سکتا ہوں؟ عیادت کرنا چاہتا ہوں ان کی۔“

''ضرور'' وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولے۔ ''وہ اب گھر پر ہی آرام کرتی ہے۔ اور امریکا روانگی کی منتظر ہے اب میں نے بات کی تھی۔ آفس میں ہمارے بزنس منیجر جمال مرزا نے ایک انتہائی ضروری کام سے انہیں بلایا تھا۔ وہ خود عارفہ بیٹی کو لینے آیا تھا۔ آتی ہوگی۔''

اس طرح باتیں کرتے ہوئے کچھ ساعتیں اور بیت گئیں کہ انٹر کام ..... پر چوکیدار نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔

''آ گئے وہ لوگ۔'' سرمد بابا نے کچھ پوچھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' سرمد بابا میری بے چینی بھانپ کر بولے۔ ''باہر ہی ان کا استقبال کرتے ہیں۔''

ہم دونوں اس محرابی دروازے سے باہر آ گئے۔ ایک سنگل ڈور منی پیجرو جیپ اندر داخل ہو رہی تھی، میری دھڑکتی نظریں جیپ پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں جیسے عابدہ کے جیپ سے نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے اس کی راہ میں استقبال کے لیے آنکھیں بچھا دیں ہوں۔

دروازے کھلے۔ تین افراد کے ساتھ عابدہ اتری، دو آدمی مسلح تھے، ایک غیر مسلح، یہی اول خیر تھا۔ عابدہ مجھے اور میں اسے دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دوڑے اور قریب پہنچ کر میں نے اس کے نرم و نازک پھول سے وجود کو تھامنا چاہا مگر وہ فورِ جذبات کی شدت سے مجھ سے لپٹ گئی اور میں بھی اس سے پیوست ہو گیا۔ اس کے وجود کی مخصوص شناسا خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور خودی کے عالم میں بے خودی طاری ہونے لگی... وہ میرے کشادہ سینے پر اپنا سر رکھے گلنار چہرہ دھیرے دھیرے رگڑ رہی تھی اور مجھے پیار کا امرت اپنے وجود میں اترتا محسوس ہونے لگا۔ وہ ہولے ہولے سسک کر رونے لگی۔ اس کے ریشمی بالوں کی خوشبو کو میں ہونٹوں سے چوم رہا تھا۔

''عابدہ! تت... تم ٹھیک تو ہو نا...؟'' بالآخر میں نے آہستگی کے ساتھ اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ آنسوؤں سے لبریز چہرے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں ٹھیک... تمہیں چشم سلامت دیکھ کر خوشی کی انتہا سے میرے آنسو نہیں تھم رہے ہیں شہزاد۔'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ساتھ ان خبیثوں نے کوئی زیادتی تو نہیں کی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ''ایسا وقت آنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں گی۔''

سرمد بابا نے ہولے سے کھنکار کر ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ اب تک وہ سب خاموش کھڑے تھے، میں جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ اول خیر کی جانب متوجہ ہوا۔

''او خیر...'' وہ اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے مخصوص لہجے میں مسکرا کر بولا اور پھر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اس نے دو بار میرا منہ بھی چوم لیا۔ میں نے اس کے دونوں ساتھیوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ ان کے انداز میں میرے لیے احترام تھا۔ وہ سرمد بابا سے بھی ملے۔ انہوں نے انہیں اندر آنے اور بیٹھنے کا کہا لیکن اول خیر نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ وہ اس وقت واپس لوٹنا چاہتا تھا۔ میں کسی سوچ میں الجھا رہا۔

''کاکا! تیری امانت ہم نے تجھ تک پہنچا دی۔ اب ہمیں اجازت دے۔'' اول خیر مجھ سے بولا تو میں نے خیالات سے چونک کر کہا۔

''اول خیر! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' میری بات پر اس کے چہرے پہ بے پناہ مسرت ابھر آئی۔

''بھلے کاکا! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ابھی چل وہاں بھی تم سے ملنے کے لیے کچھ لوگ بے چین ہیں۔''

سرمد بابا میری بات پر الجھن کا شکار تھے۔ عابدہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ میں نے پہلے عابدہ کی طرف دیکھا پھر سرمد بابا سے مخاطب ہوا۔

''بابا! میں عابدہ کو آپ کی ذمے داری میں سونپنا چاہتا ہوں۔ آپ سمجھدار ہیں، عابدہ کی موجودگی میں یوں بھی میرا یہاں رہنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر میں آپ سے رابطے میں رہوں گا، آتا جاتا بھی رہوں گا۔ عابدہ آپ پر بوجھ تو نہیں بنے گی؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہو تم، شہزی بیٹا!'' وہ یکدم تڑپ کر بولے۔ تاہم وہ اشارہ سمجھ چکے تھے۔ ''تم اور عابدہ میرے لیے اولاد ہی کی طرح ہو، عابدہ میرے پاس رہے گی تو اس سے بڑھ کر مجھ بدنصیب بڈھے کے لیے خوشی کی اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔ اللہ نے مجھے صرف بیٹا دیا تھا، وہ بھی اس نے اپنی رضا سے واپس لے لیا۔ عابدہ کو تو میں اپنی بیٹی ہی سمجھوں گا۔'' وہ آبدیدہ ہو گئے، اور عابدہ کے سر پہ دستِ شفقت بھی رکھ دیا۔ مجھے تسلی ہوئی، پھر میں نے عابدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''عابدہ! میرے سامنے کچھ اہم مقاصد ہیں، جنہیں میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم سمجھداری کا ثبوت دو گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں کچھ باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔''

''لل... لیکن... شہزی...؟'' اس نے اضطراری انداز میں کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکی مگر میں اس کی پریشان کن بے چینی کو بھانپ کر محبت ریز مسکراہٹ سے بولا۔

''عابدہ! میری فکر نہ کرو۔ اپنا خیال رکھنا۔ میں تم سے دور نہیں ہو رہا۔ آتا جاتا اور تم سے ملتا جلتا رہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' میرے جانے کے دکھ سے اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔ مگر میں نے سمجھایا کہ انسان کی زندگی کا مقصد صرف اپنے لیے نہیں ہوتا، تقدیر آپوں آپ کچھ ذمے داریاں انسان کے کندھے پر ڈال دیتی ہے۔ مجھے کچھ مجبور اور بے کس آنکھیں اپنی جانب تکتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ جو مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے ہیں۔ میں کل یا پرسوں آ کر تم سے ملوں گا اور کچھ باتیں پوچھوں گا۔ ابھی تم آرام کرو۔''

اس کے بعد میں سرمد بابا اور عابدہ کو خدا حافظ کہہ کر اول خیر کے ساتھ اس کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہم سرمد بابا کی رہائش گاہ سے روانہ ہو چکے تھے۔

جیپ اول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ اس کے دونوں مسلح ساتھی، عقبی نشستوں پر چوکس بیٹھے تھے۔ اول خیر میرے ساتھ جانے کے فیصلے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''او خیر... کاکا! تو نے میرے ساتھ آ کر بہت اچھا کیا۔'' ایک مصروف شاہرہ کی جانب موڑ کاٹنے کے بعد وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''بیگم صاحبہ اور استاد کیبل دادا تجھے دیکھنے اور ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ سچ پوچھ تو ان کی دلی خواہش تھی کہ میں تجھے ساتھ لے آؤں، میں ابھی سب سے پہلے بیگم صاحبہ کو یہ خوش خبری سناتا...'' کہتے ہوئے اس نے اپنے سیل فون پر ایک نمبر پنچ کرنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' میں نے قدرے مسکرا کر پوچھا۔

''بس ایسے ہی، اس کی ضرورت نہیں۔'' سنجیدگی سے یہ کہتے ہوئے اس نے سیل فون واپس رکھ لیا۔ میں اول خیر سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا، غالباً اس سے زیادہ عابدہ سے کہ اسے ان پانچ لڑکیوں کے ساتھ کہاں لے جایا گیا تھا؟ باقی لڑکیوں کا کیا ہوا؟ ممکن تھا، اول خیر بھی اس کی تفصیل سے آگاہ ہو۔ عابدہ کے بعد اب وہ لاپتا بدنصیب لڑکیوں کی تعداد چار ہو گئی تھی، ان میں شکیلہ بھی شامل تھی، اطفال گھر کی اب موجودہ پوزیشن کیا تھی؟ اور شوکی سمیت دیگر لڑکے بچے بچیاں لڑکیاں کہاں تھیں؟ ان سب سوالوں کے جواب مجھے اول خیر سے معلوم کرنے تھے۔

ابھی میں نے اول خیر سے بات چھیڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دفعتاً ہمارے عقب سے ایک..... ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ آگے موڑ تھا۔ شاید اول خیر نے اپنی جیپ اس سمت موڑنا تھی۔ اس لیے جیپ کی رفتار اس نے آہستہ کر دی تھی، جبکہ ہمارے پیچھے سے نمودار ہونے والا..... ٹرک (درمیانے سائز کا ٹرک) بہ دستور تیز رفتاری سے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اول خیر نے دائیں جانب مڑنے کا انڈیکیٹر دے رکھا تھا، اصولاً ٹرک کو بھی اپنی رفتار آہستہ کر دینی چاہیے تھی، جبکہ اول خیر کو بھی تسلی تھی کہ ٹرک والا بائیں جانب سے انہیں اوورٹیک کر کے نکل جائے گا یا پھر رفتار دھیمی کر دے گا۔ مگر جانے کیوں میری نظریں عقب نما مرر پر جم سی گئی تھیں۔ طوفانی رفتار سے آنے والے ٹرک کی اسپیڈ میں مجھے بجائے کمی کے بتدریج اضافہ ہی ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جیپ قدرے رک کر دائیں جانب موڑ کاٹ ہی رہی تھی کہ اچانک ایک دھماکے سے جیسے زلزلہ آ گیا۔ موڑ کاٹتی جیپ کے عقبی حصے سے وہ..... ٹرک ٹکرایا۔ جیپ کو ایک طوفانی جھٹکا لگا، شکر تھا کہ وہ الٹی نہیں تھی، البتہ ٹکر کے باعث جیپ دوسری سڑک پر آ کر پھرکی کی طرح گھومتی ہوئی دوسری جانب سڑک پر آ گئی۔ یہ دو سڑکوں کے درمیان بنا کٹ تھا دوسری جانب کی سڑک سے آتی ہوئی ٹریفک رواں تھی، نتیجتاً گاڑیوں کے ٹائروں کی سمع خراش آوازیں ابھریں۔ اور ہماری جیپ سے ایک گزرتی ہوئی تیز رفتار کار ٹکرائی، یہ دوسرا دھماکا تھا۔ میرے حواس مختل ہونے لگے، شیشوں کی کرچیاں اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرا گئیں، جن سے چہرے پہ خراشیں پڑ گئیں، مگر اس وقت ان باتوں کا کہاں ہوش تھا۔ بدبخت ٹرک تو تیزی سے نکل گیا تھا۔ ہمیں چوٹیں تو آئی تھیں مگر اول خیر اور اس کے ساتھیوں نے دوبارہ سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ سڑک پر ان گنت گاڑیوں کے ہارن نے شور بپا کر رکھا تھا۔

''ہوشیار! چھوٹے استاد! دشمن...!''

دفعتاً مجھے اول خیر کے ایک آدمی کی خبردار کرنے کی

www.paksociety.com

آواز سنائی دی۔ میں سیٹ پر جھکا ہوا تھا، سر ابھار کر دیکھا۔ اس سمت سے جدھر ہماری جیپ نے آتے ہوئے موڑ کاٹا تھا، ایک کار نمودار ہوئی اور چار پانچ مسلح افراد نمودار ہوئے تو خبردار کرنے والے آدمی نے جیپ کے اندر سے ان پر فائر کھولنا چاہا لیکن ان میں سے دو افراد نے خودکار رائفلوں سے اسے بھون کر رکھ دیا۔ اس کی کرب ناک چیخیں ہمیں سنائی دی تھیں۔ ساتھ ہی گولیوں کی جھپک مجھے اپنے چہرے پہ بھی محسوس ہوئی۔

''دُبکا رے، کاکا! سیدھا مت ہونا۔'' مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی۔ اس دوران اول خیر کے دوسرے آدمی نے جوابی فائرنگ کی جبکہ اول خیر بجلی کی پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال کر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے رینگ گیا۔ میں خود اگلی سیٹ کے پائیدان میں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ باہر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ جاری تھی، یہ شہر کا وسطی علاقہ تھا اس لیے وہاں خاصی جگہ بچ گئی، کئی لوگوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ باہر آگ اور خون کا کھیل جاری تھا، تابڑتوڑ گولیاں برسنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر یکدم سناٹا چھا گیا اور کھٹکا ہوا، جس دروازے سے اول خیر باہر گیا تھا، وہیں سے وہ دوبارہ نمودار ہوا، اب اس کے ہاتھ میں جدید قسم کی گن نظر آرہی تھی۔

''کاکا! جلدی نیچے اتر میرے پیچھے آ... جلدی... جلدی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور جیپ سے باہر آگیا۔ دائیں بائیں گاڑیاں رکی ہوئی تھیں لوگ اِدھر اُدھر بھاگ کر جاچکے تھے۔ چند لاشیں بھی سڑک پر پڑی نظر آئیں۔ یہ انہی لوگوں کی تھیں، جنہوں نے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ ہم پر حملہ کیا تھا، مگر شاید اول خیر کے ہاتھوں خود ہی مار کھا گئے تھے، ان کی کار سڑک کے ''کٹ'' پر ترچھی کھڑی تھی، اس کا رنگ ڈارک بلیو تھا۔ اول خیر کو میں نے اس کار کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میں بھی اس کے عقب میں ہولیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے قریب پہنچ کر اول خیر نے قدرے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

''کاکا۔ پیچھے بیٹھ... جلدی...'' یہ کہتے ہی اس نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گن برابر کی سیٹ پر پھینکی۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اور چونک پڑا۔ سیٹ پر کسی کا آڑا ترچھا زخمی وجود بے سدھ پڑا تھا۔ تاہم میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ اول خیر نے پھرتی سے کار اسٹارٹ کرکے ایک طرف موڑ کاٹ کے آگے بڑھادی۔

''یہ لے کاکے سب سنبھال۔'' سامنے نظریں مرکوز کرتے ہوئے، اول خیر نے میری طرف ایک پستول بڑھایا۔ جو میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ خاصا وزنی پستول تھا۔

''چلانا آتا ہے؟''

''نن... نہیں... شاید ہاں...''

''سیکھ جائے گا۔''

''یہ... کس کی لاش ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نہیں پہچانا اس سور کی اولاد کو؟''

''میں نے ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی ... دائیں ٹانگ کی ران پر گولی لگی تھی، یہی حال بائیں بازو کا تھا، اس کا سر سینے کی طرف مڑا ہوا تھا۔ میں ابھی اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی۔

''یہ گگل خان ہے۔'' اس نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا۔ ''یہ مرا نہیں ہے، زخمی ہے... اس پر نظر رکھ، ہمیں شکار کرنا چاہتا تھا، خود شکار ہوگیا۔ میرا خیال ہے یہ تجھے اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا...''

''یہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔'' میں نے فوراً کسی خیال کے تحت اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اسے ہر صورت زندہ رکھنا ہوگا اول خیر...''

مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی، پھر میں نے بات بدل ڈالی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارے باقی دو ساتھیوں کا کیا ہوا؟''

''دونوں خرچ ہوگئے۔''

''اوہ...''

''ہماری زندگی ایسے ہی ہے کاکا۔ پانی کا بلبلہ...''

اسے اپنے دونوں ساتھیوں کے مرنے کا افسوس تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں آنسوؤں کی چمک محسوس کی۔ تاہم دوسرے ہی لمحے اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے رکھتے ہوئے دانت بھینچ کر کہا۔ ''بدلے میں ان کے چار آدمی بھی گئے۔ گگل خان ہاتھ لگا ہے، یہ ان کا اہم آدمی ہے۔''

''اول خیر۔ اس مردود کو ابھی نہیں مرنا چاہیے۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''نہیں مرے گا اور حکم کر کاکے؟'' وہ عجیب سے

لہجے میں بولا۔

"میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا..."

"پوچھنا نہیں بول کاکا! اگلوانا بول۔ اتنا سیدھا نہیں کہ ہمارے سوالوں کے سیدھے طریقے سے جواب دے گا۔"

"کیا تم اس کے منہ سے کچھ نہیں اگلوا سکتے؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کار مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی، سوچنے لگا کیا ان کا ٹھکانا شہر سے کہیں باہر تھا؟

"اوخیر... کاکا۔" وہ ہنسا۔ "ہم تو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، مجھے اس سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔"

"تو پھر یہ شکار تیرے نام ہوا۔" اول خیر نے قہقہہ لگایا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی خوں ریزی نے میری طرح اس کے اعصاب شل نہیں کیے تھے جبکہ میرے دل کی دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب سی تھیں۔

"تم ابھی جا کہاں رہے ہو؟"

"شکار کو ٹھکانے پر چھوڑنے۔"

"کیا تم اپنے اصل ٹھکانے پر نہیں جا رہے ہو؟ میرا مطلب ہے، جہاں مجھے لے کر جانا اور اپنے دوسرے ساتھیوں وغیرہ سے ملانا چاہتے تھے؟"

"تو نے ٹھیک اندازہ لگایا کاکا۔" وہ بولا۔ "بیگم صاحبہ کا یہی حکم ہوتا ہے۔ کوئی اہم شکار ہاتھ لگے تو سیدھا پرانی باؤلی والے ٹھکانے کی طرف پہنچایا جائے۔" میں نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی، دفعتاً میں نے اول خیر کے چہرے سے ایک عجیب سی پُرسوچ اور گہری سنجیدگی کے تاثرات نوٹ کیے۔ اس کی نظریں کار کی ونڈ اسکرین کے پار ویران سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک اسے بھی احساس ہو گیا کہ میں سر گھمائے اس کے چہرے ہی کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ فوراً میری طرف دیکھ کر بولا۔

"کیا ہوا کاکا؟ کوئی بات ذہن میں آ رہی ہے؟"

"میرے تو نہیں، البتہ تمہارے چہرے سے ایسا مجھے ضرور لگا ہے اچانک ہی۔" میں نے کہہ دیا تو وہ فوراً مسکرا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"اوخیر... کاکا! لگتا ہے تیرے ہاتھوں پیروں سے زیادہ تیرا دماغ چلتا ہے۔ تو نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ میں اس وقت واقعی کوئی اہم بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟" بے اختیار میں نے بھی پوچھ لیا۔

"ٹھہر ذرا..." کہتے ہوئے، اس نے ایک بار پھر اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر پنچ کرنے کے بعد رابطہ ہوتے ہی بولا۔

"استاد! سیٹھ منظور کی رہائش گاہ سے واپسی پر دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ کاکا شہزاد بھی ہمارے ساتھ تھا، شیدا اور جالا مارے گیا۔ ہاں... ہاں... میں اور کاکا شہزاد بالکل ٹھیک ہیں۔ اور بالکل محفوظ ہیں۔ فکرمند نہ ہونا، تھوڑی دیر لگ جائے گی پہنچنے میں۔"

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے حیرت ہوئی اس نے اپنے استاد سے گُگل خان کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا، ابھی میں اس سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے کار کی رفتار بتدریج کم کر دی اور تیزی کے ساتھ ایک یوٹرن لیا۔ اب کار دوبارہ شہر کے رخ پر تھی۔

"کاکا! ہم حکم کے غلام ہوتے ہیں۔" یوٹرن لینے کے بعد وہ مجھ سے بڑے عجیب لہجے میں بولا۔

"تیرا میرا معاملہ ایک وکھرا تعلق بن چکا ہے۔ کاکے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے لوگوں کو گُگل خان کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ کیونکہ تو نے اس سے نجانے کون سی اہم باتیں اگلوانی ہیں۔ ممکن ہے یہ کام وہاں بھی ہو جاتا مگر اس میں رسک تھا، میرے اوپر کے لوگ گُگل خان کو دیکھتے ہی اس کی موت کا پروانہ جاری کر دیتے۔ یا پھر انتقام کی آگ میں اسے تشدد کے دوران میں ہی ختم کر دیتے۔ اس سلسلے میں ان کے اصول سخت ہیں۔"

میں اس کی بات سے متاثر ہوا تھا، گویا وہ میری خاطر اپنے گروہ کے کڑے اصولوں سے انحراف کر رہا تھا، میں نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا، وہ بلاشبہ یار باش اور دوستوں کے لیے جاں باز تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اول خیر! میں تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں میرا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ میں اس مردود گُگل خان سے ان چار معصوم لڑکیوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا... جنہیں یہ کچھ عرصہ پہلے غائب کر چکا تھا، عابدہ بھی ان میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ میں اطفال گھر کی نئی صورت حالات کے بارے میں جاننا چاہتا اور اب وہاں کے کیا حالات ہیں وغیرہ..."

"اگر عابدہ ان چار بدنصیب لڑکیوں میں شامل تھی تو، پھر تمہیں عابدہ سے بھی اس سلسلے میں دریافت کرنا چاہیے تھا۔" وہ بولا۔

"یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ظاہر ہے وہ ان لڑکیوں کے بارے میں مکمل تفصیل نہیں بتا سکتی تھی۔ پھر وہ کچھ ایسے حالات کا شکار رہی تھی۔ ابھی میں اس سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ تاہم میں اس سے فون پر بھی پوچھ سکتا ہوں... جتنا وہ جانتی تھی۔"

"اتنا میں بھی اس سے پوچھ چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "وہ کچھ نہیں جانتی، صرف اس قدر ہی بتا سکی تھی کہ ان لڑکیوں کو نیم بے ہوشی کے عالم میں کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا تھا مگر کچھ دنوں بعد عابدہ کو ان لڑکیوں سے الگ کر کے کسی دوسرے مقام پر رکھا گیا۔ وہ بہت خوف زدہ تھی، اس نے اشرف نامی ایک نوجوان سے رحم کی بھیک مانگی تھی، جسے وہ پہچانتی تھی، تمہاری دوست کی حیثیت سے۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خبیث بھی گُگل خان کا ساتھی بن چکا ہے۔ اور اس مردود اشرف نے ہی گُگل خان وغیرہ کو تمہاری اس کمزوری سے آگاہ بھی کیا تھا، جس کے نتیجے میں انہوں نے بعد میں تم پر جذباتی دباؤ ڈال کر عدالت میں جھوٹے بیان کی تم سے تصدیق کروانی چاہی تھی۔" اول خیر نے اپنی بات ختم کی۔ اشرف کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت کی لہر سی ابھری تھی۔ "یہ اشرف کون تھا کاکا؟" اول خیر نے پوچھا تو میں نے مختصراً اس خبیث کے بارے میں بتا دیا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے کہا۔ اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور اسے مختصراً موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے اور اپنی آمد وغیرہ کے بارے میں مطلع کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم اپنے جن ساتھیوں کے پاس جا رہے ہو، کیا وہ تمہارے لوگوں سے اس کی شکایت نہیں کر دیں گے؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"وہاں میرا کوئی ساتھی نہیں، بس! تیرے جیسا ہی ایک یار ہے اپنا... چھتا... نام ہے اس کا۔ یہ بھی کبھی ہمارا ساتھی ہوا کرتا تھا، ہمارے گروہ میں کسی غلطی پر معاف کر دینے کا اصول سرے سے موجود نہیں ہے۔ چھتے سے بھی ایک فاش غلطی ہو گئی تھی، اسے ٹھکانے لگانے کے لیے مجھے مقرر کیا گیا تھا مگر چھتے کا مجھ پر ایک بڑا احسان تھا۔ میرے لیے یہ کڑا فیصلہ تھا۔ ایک طرف تنظیم کا حکم دوسری جانب دوستی، میں نے خود کو خطرے میں ڈال کر اس سالے چھتے کو بچا لیا اور اپنے لوگوں سے یہی کہا کہ میں نے اس کا کام تمام کر ڈالا ہے۔ چھتا ایک بیوہ عورت کی محبت میں گرفتار تھا۔ دو بچے پہلے شوہر سے تھے اس کے۔ اب وہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔"

"کیا اس میں خطرہ نہیں؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ تمہاری تنظیم کے کسی آدمی کی نظروں میں آ گیا تو سب سے پہلے تم اپنے لوگوں کے زیرِ عتاب آؤ گے۔"

"اوخیر..." وہ ہنسا۔ "کاکا! اپنا کچھ مزاج ہی ایسا ہے۔ دوستوں کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، میری موت بھی ایک دن اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں ہو گی۔ خیر... چھتے کو بھی اس خطرے کا احساس ہے۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ مگر اب وہ چند روز میں یہ شہر چھوڑ کر کسی اور شہر منتقل ہونے والا ہے۔"

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ یہ دشمنوں کی کار تھی، اول خیر اس سے بھی جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ کار شہر میں داخل ہو چکی تھی، چوک کے قریب ایک کچی آبادی خاصے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی مگر اول خیر نے وہیں ایک طرف کار روک لی۔ اور چھتے سے سیل فون پر بات کر کے اسے ہدایت دینے لگا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ پھر کار ایک کچے راستے پر اتار لی۔ غریب آبادی کے ننگ دھڑنگ بچے ہماری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے، ٹیڑھی میڑھی گندی گلیوں سے گزرنے کے بعد کار ایک گلی کے سرے پہ واقع گھر کے دروازے پر جا رکی۔ ایک دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ چھتے نے شاید کچھ عرصہ خود کو روپوش رکھنے کے لیے دانستہ ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہوگا۔ ایک چھریرے جسم، لمبوترے چہرے کا گورا چٹا آدمی دروازے پر پہلے ہی سے کھڑا نظر آیا۔ اس کے بال بہت چھوٹے اور کسی جیل کی مدد سے کڑک اور کھڑے کیے ہوئے تھے۔ وہ کلین شیو تھا۔ قد لمبا تھا۔ کار رکتے ہی وہ ہماری طرف بڑھا۔

"پیچھے شکار موجود ہے۔ جلدی سے بتا کہاں اتارنا ہے؟ اول خیر نے کار کے اندر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ شاید یہی چھتا تھا۔

"اندر ہی لے آؤ، پروین بچوں کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔"

اول خیر نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی اتر آیا۔ زخمی گُگل خان نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگا تھا۔ اس کا بہت سا خون بہہ گیا تھا۔ حالت نازک ہو رہی تھی، مجھے تشویش ہونے لگی، کم بخت مر جاتا تو مشکل پڑ جاتی۔

گردو پیش کا جائزہ لینے کے بعد چھتے اور اول خیر نے پچھلی سیٹ سے زخمی گگل خان کو کھینچ کر باہر نکالا اور کھلے ٹاٹ جھولتے دروازے سے اندر لے گئے۔ میں بھی اندر آ گیا۔ مختصر سا نیم پختہ صحن تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ زخمی کو دوسرے کمرے میں لا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

''چھتے!'' اول خیر نے قدرے ہانپتے ہوئے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔ ''پہلے اس کی مرہم پٹی کا کچھ بندوبست کر۔ میں تب تک کار سے جان چھڑا کر آتا ہوں۔''

گگل خان کی حالت کے پیشِ نظر اس نے... متفکر لہجے میں کہا۔ ''اول خیر مجھے اس کی حالت بہت خراب لگ رہی ہے۔ یہ کیسے بچے گا؟'' میری بات پر وہ مسکرا کر بولا۔

''فکر نہ کر کاکے۔ یہ اپنا چھتا آدھا ڈاکٹر ہے۔ سب سنبھال لے گا۔'' پھر وہ چھتے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیوں چھتے سنبھال لے گا نا...؟ اسے مرنے نہیں دینا ہے، اس سے ہمیں کچھ ضروری باتیں اگلوانی ہیں۔''

''تم فکر نہ کرو استاد۔ میرے پاس سب سامان موجود ہے۔'' وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں بس کاکے کی تسلی کی خاطر کہہ رہا تھا۔'' اول خیر نے مسکرا کر چھتے کا کاندھا تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔

اول خیر کے نکلتے ہی چھتا چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ پھرتی کے ساتھ ہاتھ بھی چلنے لگے اور زبان بھی۔ میں بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ ایک بکس نکال لایا تھا وہ جس کے اندر مرہم پٹی کا سامان تھا۔ ساتھ ساتھ بتاتا جا رہا تھا مجھے مثلاً جب وہ مختاری بیگم کے گروپ میں تھا تو کسی مقابلے وغیرہ میں زخمی ہونے والے ساتھیوں کی مرہم پٹی اس کے ذمے ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ چیرا لگا کر گولی بھی نکال لیا کرتا تھا۔ یہ سب اس نے ایک ڈاکٹر کے کلینک میں کام کرتے ہوئے سیکھا تھا۔ گگل خان کی مرہم پٹی تو کر دی آخر میں اس کی ٹانگ اور بازو سے گولی نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ گگل خان کے منہ سے کراہتی ہوئی آوازیں جب چیخوں میں بدلنے لگیں تو چھتے کی ہدایت پر میں نے اس کے منہ کے اندر ایک کپڑے کا ٹکڑے کا گولا بنا کر ٹھونس دیا۔

بازو کی گولی چھتے نے سرجیکل نائف سے نکال دی تھی مگر ٹانگ کی گولی نہ نکال سکا، وہ ران کے اندر تک گہرائی میں دھنسی ہوئی تھی، بہ قول اس کے اگر وہ گہرائی تک ''چیر پھاڑ'' کرتا تو بڑی نس کے پھٹنے کا خطرہ تھا، جس کے باعث خون روکنا اس کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا۔

بہرحال پھر بھی اس نے کافی سارا کام بہ احسن خوبی نمٹا دیا۔ اس کے فرسٹ ایڈ باکس کے اندر ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔

''تو... ادھر ہی ٹھہر میں جب تک زمین پر گرے خون وغیرہ کی صفائی کر دیتا ہوں۔'' چھتے نے مجھ سے کہا۔ میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

اس نے گگل خان کے ایک دو انجکشن بھی لگا دیے تھے۔ وہ اب نیم بے ہوش تھا۔

چھتے نے جلدی جلدی جب تک دوسرے کام نمٹائے اتنے میں اول خیر بھی آ گیا۔

گگل خان کی سنبھلتی ہوئی حالت سے مطمئن ہونے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔ ''کیوں کاکا دیکھا چھتے کا کام؟''

''بہت خوب، یہ تو واقعی سرجن ہے۔'' میں نے بھی چھتے کی توصیف کی تو چھتا بولا۔

''ایک گولی میں نہیں نکال سکا مگر میں نے زخم کے اندر ''پیکنگ'' کر دی ہے۔ تاکہ خون بہنا بند ہو جائے، ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''ایک بات بتا چھتے!'' اول خیر نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''بھابی اور بچے کتنی دیر میں آئیں گے؟''

''آتے ہی ہوں گے، ادھر پاس کے میدان میں منگل بازار لگتا ہے، پروین وہاں کچھ خریداری کے لیے گئی ہے۔''

''تو چند گھنٹوں کے لیے انہیں کسی دوسری جگہ نہیں لے جا سکتا؟''

''اگر میری مزید ضرورت نہیں ہے تو میں پروین اور بچوں کو ان کی خالہ کے ہاں لے جاتا ہوں۔''

''مگر یہ کام رازداری سے ہونا چاہیے۔ ان کو ہمارا پتا نہ چلے۔'' اول خیر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

''نہیں پتا چلے گا، میں باہر سے ہی انہیں لے جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بس! اب تو جا...'' اول خیر نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ جاتے ہوئے چھتے نے اول خیر کو تاکید کر دی کہ گھر کا تالا لگا جانا باہر سے۔

چھتے کے جانے کے بعد اول خیر نے ایک گہری سانس خارج کر کے مجھ سے کہا۔ ''چل بھئی کاکا بس ہمارے پاس دو تین گھنٹے ہی ہیں جو پوچھنا ہے اس سے پوچھ لے۔''

''مگر یہ تو ہوش میں ہی نہیں ہے۔ کچھ بتائے گا کیسے؟'' میں نے چارپائی پر بے سدھ پڑے گگل خان پر

نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ابھی ہوش میں لے آتے ہیں اسے۔'' یہ کہہ کر اول خیر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پانی کا ایک پلاسٹک کا جگ تلاش کیا اور گگل خان کے چہرے پر چھینٹے مارے، تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے ہمیں پہچان لیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش چاہی مگر میں نے اسے گریبان سے دبوچ لیا۔ اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے خوفناک لہجے میں بولا۔

''تم کوئی حرکت نہیں کرو گے، گگل خان! تم سے مجھے بہت سی باتوں کا حساب لینا ہے۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ بھی مجھے غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ایک نظر اس نے میرے ساتھ کھڑے اول خیر پر بھی ڈالی، مجھے حیرت تھی کہ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ تھا اس کا مطلب تھا وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔

میں نے اس کا گریبان ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ دوبارہ چارپائی پر چت ہو گیا۔

''وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟''

''کون سی لڑکیاں؟'' وہ جیسے انجان بن گیا۔

''وہی جنہیں تم نے اس روز کسی کے حوالے کیا تھا، جب میں بھی تمہاری قید میں تھا اور اس میں عابدہ اور شکیلہ بھی تھیں۔''

''عابدہ کو تو یہ کتا لے اڑا۔'' گگل خان نے زہر خند لہجے میں اول خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں نے طیش میں آ کر ایک گھونسا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ اس کی پیشانی کا زخم نہ کھلنے پائے۔

''زبان کو لگام دے کتے کی اولاد۔ عورتوں کے بیوپاری، اپنی ماں بہن کو بھی تو نے ضرور اس طرح ہی کسی کے حوالے کیا ہوگا۔ سیدھی طرح میرے سوالوں کے جواب دے۔ وہ چار بدنصیب معصوم لڑکیاں کہاں ہیں؟''

گھونسا کھانے کے بعد وہ کھا جانے والی نفرت انگیز نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔ ''توکل کا لمڈا گگل خان کا منہ کھلوائے گا، ان لوگوں کی شہ پر تو جو کچھ کر رہا ہے نا بہت جلد ان کا حشر بھی تو اپنے ساتھ خراب ہوتا دیکھ لے گا۔''

اس کی دھمکی آمیز بات پر میرا دماغ ایک بار پھر الٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے زدوکوب کرتا، اول خیر نے مجھے روک دیا اور بولا۔

''کاکا! میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا... یہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولے گا... لیکن ٹھہر... ذرا...'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا ڈبا تھا۔ اس کے اندر پسی ہوئی سرخ مرچیں تھیں۔ اول خیر نے بڑی بے رحمی سے گگل خان کی پیشانی کے زخم پر سے پٹی کھینچ لی۔ اس کا زخم پھر کھل گیا.... کپڑے کا گولا اس کے منہ میں ٹھونسا اور ڈبے سے مرچیں نکال کر اس کے کھلے رستے زخم پر یوں چھڑکنے لگا جیسے ہانڈی میں ڈال رہا ہو۔

زخم جو پہلے ہی جلن کا شکار تھا، سرخ مرچیں پڑنے سے اس کی جلن بڑھ گئی۔ گگل خان تکلیف کے باعث اپنا سر ادھر ادھر مارنے لگا۔ اول خیر نے اس پر بس نہ کیا۔ وہ ایک اور ڈبا کچن سے اٹھا لایا۔ اس کے اندر نمک تھا، اب وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً گگل خان کے زخم پر نمک چھڑکنے لگا۔ گگل خان کا وجود اینٹھن کا شکار نظر آنے لگا۔ اس نے کئی بار چارپائی سے اٹھنے کی بھی کوشش چاہی مگر میں اسے فوراً دبوچ لیتا۔ کپڑے کا گولہ منہ میں ٹھونسے ہونے کے باعث وہ چیخنے سے بھی قاصر تھا، اس کی جگہ اس کے حلق سے غر غراہٹیں ابھرنے لگیں۔

''کھولتا ہے، منہ اپنا یا تیری آنکھوں کی باری آئے اب...؟'' اول خیر نے غراتے ہوئے کہا مگر گگل خان نے اپنے سر کو اثبات میں نہ ہلایا۔

''کاکا! اس کا سر دبوچ ذرا۔'' اول خیر نے دانت پیستے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے فوراً گگل خان کا دائیں بائیں حرکت کرتا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اول خیر نے اس کی ایک آنکھ کے پپوٹے کو اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے اوپر کر دیا۔ اور سرخ مرچ آنکھ میں انڈیل دی۔ اس پر بس نہ کرتے ہوئے اول خیر نے اس کی نتھنوں کے اندر بھی سرخ مرچ اور نمک گھسیڑ دیا۔ گگل خان کی حالت دیدنی حد تک ابتر ہونے لگی۔

وہ چارپائی پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اول خیر نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

''اگر اب بھی تو نے زبان نہ کھولی تو تیری شلوار اتار کر مرچیں بھر دوں گا... بول...؟''

گگل خان نے تب بھی اپنے سر کو اثبات میں نہیں ہلایا تو اول خیر نے غصے سے ہونٹ بھینچ کر اس کی قمیص اوپر اٹھائی اور ابھی اس کے ازاربند کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ گگل خان کا سر تیزی سے اثبات میں ہلنا شروع ہو گیا۔

اول خیر نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اشارہ

کیا۔ میں نے فوراً گنگل خان کے منہ میں ٹھونسا ہوا گولا نکال دیا۔

’’پپ... پپ... پانی... لگاؤ میری آنکھ اور زخم پر...‘‘ اور ہانپتا ہوا فریاد کرنے لگا۔

’’ہرگز نہیں، پہلے ہمارے سوالوں کا جواب دے۔ اس کے بعد...‘‘ اول خیر گرجا۔

’’میری... میری زندگی کی ضمانت کیا ہے؟‘‘ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش میں کراہتے ہوئے بولا۔

’’تیری تسلی کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس وقت ہم تجھے قتل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمارے سوالوں کے جواب دے اور نکل جا یہاں سے۔‘‘

اول خیر نے کہا۔ ’’مگر تجھے سچ بولنا ہے جب تک ہم اس کی تصدیق نہیں کرلیں لیتے تجھے نہیں چھوڑیں گے، یہ بھی یاد رکھنا۔‘‘

’’وہ چاروں لڑکیاں فروخت کردی گئی ہیں۔‘‘

’’کہاں...؟ اور کس آدمی کو...؟‘‘

’’جمعہ خان کو۔‘‘

’’وہ کہاں رہتا ہے؟‘‘

’’اوکاڑہ میں چنی بائی کے کوٹھے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ان چاروں لڑکیوں کو ادھر ہی لے گیا ہے۔‘‘

’’تو نے کس کے کہنے پر... ان چار بدنصیب لڑکیوں کو ان کے حوالے کیا تھا؟‘‘

’’چوہدری ممتاز کے۔ چنی بائی کے کوٹھے کی پشت پناہی چوہدری ممتاز ہی کرتا ہے۔‘‘

’’یہ کمینہ نسلِ خنزیر! جھوٹ بول رہا ہے، اول خیر!‘‘ میں پھٹ پڑا۔ ’’اگر ان لڑکیوں کو جمعہ خان اوکاڑہ لے گیا تھا تو یقیناً عابدہ بھی ان کے ساتھ ہوتی... مگر عابدہ تو ان کے قبضے میں تھی۔‘‘

’’ہاں! یہ صحیح ہے۔‘‘ گنگل خان کی زبان تکلیف سے بچنے کی خاطر فرفر چل رہی تھی۔ وہ اب مجھ سے مخاطب تھا۔ ’’تم سے جھوٹا بیان دلوانے کے لیے عابدہ کے ذریعے دباؤ ڈالنے کا حربہ اشرف نے ہمیں دیا تھا۔ جس کے باعث عابدہ کو چوہدری ممتاز نے فوراً اکاڑہ سے واپس بلوالیا تھا۔‘‘

اشرف کے اس حربے کی کارستانی کا مجھے پہلے ہی شبہ تھا، جب میں نے اس روز کورٹ کے احاطے میں اشرف کو عابدہ کے ساتھ گاڑی میں اس کی مجھے جھلک دکھانے کے دوران مسلح آدمیوں کے ہمراہ بیٹھے دیکھا تھا۔ اب اس کی تصدیق ہوتے ہی اشرف کے لیے میرے پورے وجود میں نفرت اور غیظ وغضب کی سنسناتی ہوئی لہر دوڑ گئی۔ یہی وہ کمینہ شخص تھا، جسے میری اس کمزوری کا علم تھا۔

’’چنی بائی کے کوٹھے کا پتا بتاؤ۔‘‘ اول خیر نے پوچھا۔ اور گنگل خان نے اسے اس کا پتا بتادیا۔

’’اب تو خدا کے لیے مجھے عذاب سے نجات دلادو۔ مرا جارہا ہوں میں تکلیف سے۔‘‘ وہ کراہا تو اول خیر نے میری طرف دیکھا۔

’’میرے آخری سوال کا جواب دو۔‘‘ میں نے گنگل خان سے کہا۔ وہ کراہتا رہا۔ میں نے پوچھا۔

’’اب اطفال گھر کی تازہ صورتِ حال کیا ہے وہ ابھی تک تمہارے یعنی چوہدری ممتاز کے تصرف میں ہے یا...‘‘ میں نے مستفسرانہ انداز میں دانستہ اپنا سوال ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

’’ہاں، ہاں سب کچھ ویسا ہی ہے کچھ نہیں بدلا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں بری طرح چونکا۔ ’’کیا پولیس نے اطفل گھر کا بھانڈا نہیں پھوڑا ابھی تک؟ اور وہ بچے لڑکے لڑکیاں...؟‘‘

’’سب کچھ ویسا ہی .... چل رہا ہے۔‘‘ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کی مرچ بھری آنکھ سے آنسوؤں کی آبشار جاری تھی اور نتھنوں میں مرچ اور نمک کی پھونک، نے اس کی ناک سے رطوبت جاری کردی تھی، چھینکیں مار مار کر اس کا برا حال ہوا جارہا تھا۔

’’ہاں! سب کچھ ویسا ہی ہے۔ چوہدری ممتاز بڑے اثرورسوخ کا آدمی ہے۔ اب بس کرو۔ خدا کے لیے۔‘‘ اس نے فریاد کی۔

اول خیر حرکت میں آیا۔ اور اسے بازو سے تھام کر غسل خانے لے گیا۔ میں کمرے میں ہی کھڑا سوچتا رہا۔ اس نے جو باتیں بتائی تھیں، اس نے میری بے چینی کو بڑھا دیا تھا۔ مجھے شکیلہ سمیت ان چاروں معصوم لڑکیوں کے بارے میں تفکر آمیز تشویش ہونے لگی، جو اوکاڑہ... کسی چنی بائی کے کوٹھے پر پہنچادی گئی تھیں۔ ان میں شکیلہ بھی تھی جو شوکی کی اور عابدہ کی دوست تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ شوکی ایک غلط فہمی کے باعث مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا مگر اطفال گھر میں میرے گنگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے ٹکرا جانے کے بعد یقیناً اس کی غلط فہمی دور ہوجانی چاہیے تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ میں ان چاروں بدنصیب لڑکیوں کی رہائی کے سلسلے میں کیا کرسکتا تھا؟

اول خیر نے جس طرح اپنے لوگوں یعنی مختاری بیگم اور کبیل دادا وغیرہ کے سخت اور کڑے اصولوں کے مطابق مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس کے پیشِ نظر اب میرا ارادہ اول خیر کے ساتھ زیادہ دیر تک نتھی رہنے کا ہونے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری خاطر میری دوستی کی خاطر بار بار ایک کڑے امتحان سے دوچار ہو۔ اور اپنے ہی گروہ کے زیرِ عتاب آجائے، دیکھا جائے تو یہ والا معاملہ بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر بڑا رسک لیا تھا۔ پتا نہیں اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا؟ اطفال گھر کے سلسلے میں مجھے تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی کہ بقول گنگل خان کے وہاں کے معاملات ومعمولات جوں کے توں تھے، وہاں خونی معرکے کے بعد بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ یعنی وہاں کے کالے دھندوں کو پولیس کی سرپرستی حاصل تھی جن میں وہ راتب خور انسپکٹر روشن خان پیش پیش تھا۔

اپنے باپ کی تلاش بھی میرے لیے ایک ازلی سوالیہ نشان تھا۔ کیا میں اکیلا اور اول خان جیسے کسی تجربے کار آدمی کے بغیر یہ پہاڑ جیسی ذمے داری پوری کرلوں گا۔ اس پر مستزاد، میری چوہدری ممتاز جیسے بااثر اور خطرناک آدمی سے دشمنی کی ابتدا بھی ہوچکی تھی۔ میں کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا، میری تقدیر میں کیا تھا۔ قنوطیت اور مایوسی ایک بار پھر میرے دل ودماغ کو گھیرے میں لینے لگی۔

دفعتاً ایک آواز پر میں بری طرح چونک پڑا۔ بڑی عجیب آواز تھی، وہ خرخراتی ہوئی۔ آواز غسل خانے سے آتی محسوس ہوئی تھی مجھے۔ جدھر اول خیر زخمی گنگل خان کو پانی کے چھینٹے لگانے کے لیے لے کر گیا تھا۔ ایک سنسناتا ہوا خیال میری رگوں میں دوڑ گیا۔ اور پھر جیسے میرے وجود میں بجلی سی بھر گئی، میں گولی کی سی رفتار سے دروازے کی طرف لپکا۔ اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ یہ اول خیر تھا۔ مجھے سامنے غسل خانے کے قریب گنگل خان کا بےسدھ وجود نظر آیا، اس طرح کہ اس کے دونوں ہات پاؤں پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مرچوں بھری آنکھ سرخ انگارہ بنی بہت دہشت ناک منظر پیش کررہی تھی۔ اس کی گردن میں عجیب انداز میں مڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔

’’کک... کیا ہوا... اسے؟‘‘ میں نے متفکر سے کھڑے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ’’گزر گیا جہان سے یہ کاکے!‘‘

’’کیا؟ کیسے مرا؟‘‘ میں ہونق سا ہوگیا۔

’’سالا مردود! اس حالت میں بھی چالاکی کرنے سے باز نہ آیا۔ آنکھیں اور ناک دھونے کے بعد اس نے مجھ پر اچانک حملہ کردیا... جس کی مجھے کم ہی توقع تھی مگر پستول میں نے بھی اس پر تان رکھا تھا، وہ اس نے مجھ سے جھپٹنے کی کوشش کی تھی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا مگر ٹانگ زخمی ہونے کے باعث وہ لڑکھڑا گیا اور اس کی گردن میرے ایک بازو کے شکنجے میں آگئی، اگر میں جھٹکا لگا کر اس کی گردن کا منکا نہ توڑ ڈالتا تو یہ میرے سینے یا کھوپڑی میں گولی اتار چکا تھا۔‘‘

’’اوہ...‘‘ بے اختیار میرے ہونٹ تشویش زدہ انداز میں وا ہوئے۔ مجھے گنگل خان یا اس جیسے بے رحم اور مردود آدمیوں کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ تاہم تفکر آمیز لہجے میں اول خیر سے بولا۔ ’’اب کیا ہوگا؟ اس کی لاش کیسے ٹھکانے لگائیں؟‘‘

’’یہی میں سوچ رہا ہوں...‘‘ اول خیر گومگو لہجے میں بولا۔

’’وہ کار کہاں چھوڑ کر آئے تھے تم؟‘‘ میں نے ایک خیال کے تحت فوراً پوچھا جس کا مطلب سمجھتے ہوئے وہ بولا۔

’’اس کار کو دوبارہ حاصل کرنا اب ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہوگا۔ ہم ایسی جگہ پر ہیں جہاں میں فون کرکے اپنے کسی ساتھی کو بھی نہیں بلاسکتا مدد کے لیے۔ ایک چھتا ہی بچتا ہے۔ اسے پہلے ہی ایک کام پر لگا رکھا ہے۔‘‘

’’ہم دونوں یہ کام نہیں کرسکتے؟‘‘ میں نے اس کے متفکر اور پُرسوچ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’یہی میں سوچ رہا تھا۔ کرنا تو ہمیں پڑے گا یہ کام مگر...‘‘ وہ کہتے کہتے رکا... ہم کھلے صحن میں کھڑے تھے اس نے آسمان کی طرف دیکھا پھر ریسٹ واچ پہ نظر ڈالی۔ اس کے بعد سیل فون اٹھا کر چھتے سے رابطہ کیا۔

’’چھتے... ہمیں دو تین گھنٹے اور دے سکتا ہے یار! ہاں بعد میں بتاؤں گا، جو تو سمجھ رہا ہے کچھ ایسی ہی بات ہوئی ہے۔ بس رات گہری ہونے کا انتظار ہے۔ او خیر! میرے یار سب تیرا یہ احسان ہے مجھ پر... اچھا... اللہ حافظ...‘‘ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

’’کاکا! ایک مسئلہ تو حل ہوا ذرا رات گہری ہونے دے۔ اس کی لاش کو اٹھا کر کسی طرح باہر لے جانا ہوگا، قریب ہی ایک گندہ نالا بہہ رہا ہے۔ اس مردود کی لاش پھینک دیں گے قصہ ختم۔‘‘ میں نے اس کی بات سن کر اپنے

سر کو پُرسوچ انداز میں اثباتی جنبش دی تھی۔
اب تک ہم نے دوبارہ گرنے والے خون وغیرہ کو صاف کر دیا۔ اس کے بعد اول خیر نے کسی کونے کھدرے سے ایک بوری ڈھونڈ نکالی۔ گگل خان کی لاش اندر گھسیڑ کر لپیٹ دی گئی۔
''چل کاکا! اتنا کام تو نمٹ گیا۔ بس اب ذرا رات کا اندھیرا پھیلنے کی دیر ہے۔'' اول خیر بوری کا منہ رسی سے بند کرتے ہوئے بولا تو میں نے ہلکے سے پوچھا۔
''گگل خان، چوہدری ممتاز کا اہم آدمی تھا، اب تم لوگوں کو اس کے سخت ردِعمل کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ کیا تم اس کی اطلاع اپنے لوگوں کو دو گے؟''
میری بات پر وہ مسکرا کر بولا۔ ''او خیر... کاکا! ہم تو دشمنوں کی طرف سے ہر وقت اور ہر قسم کے ردِعمل کے لیے تیار ہی رہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کی اطلاع مجھے اپنے لوگوں کو دینا پڑے گی۔''
''کیا بتاؤ گے انہیں کہ...''
''بہت جواب ہیں میرے پاس۔ کچھ بھی بتا دوں گا۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ وقت کو نہ دیکھو تو وہ تیزی سے اپنا احساس کراتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اور اگر توجہ دو تو گزارے نہیں گزرتا... ہم دونوں رات کی تاریکی پھیلنے کا انتظار کرتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ اول خیر سے مختاری بیگم اور کپیل دادا کے بارے میں پوچھوں۔ آخر وہ کون تھے؟ اور ان کی چوہدری ممتاز سے کیا دشمنی تھی؟ مگر میں پہلے ہی ان سے دور رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ میں شاید نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔ کورٹ میں میرے بیان کے بعد اب دیکھنا یہ تھا کہ قانون انسپکٹر روشن جیسے زرخرید آدمی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اور چوہدری ممتاز کس حد تک بچتا ہے؟ میرے اس اقدام سے اول خیر کے گروہ کے لوگ خوش تھے، بقول اول خیر کے۔ مختاری بیگم اور کپیل دادا بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے گومگو سے لہجے میں بالآخر اول خیر سے یہ بات گوش گزار کر ڈالی تھی کہ ان لوگوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔
میری اس بات پر وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ میں سمجھا شاید اسے میری بات بُری لگی ہے۔ میں نے اس کا اظہار بھی کر ڈالا تو وہ ہنس کر بولا۔
''اوہ نہیں کاکا۔ خیر ہے۔ ایسی بات نہیں، بھلا میں تجھ سے ناراض ہو سکتا ہوں بلکہ یقین کر تو خود میں تجھ سے پہلے ہی اس پہلو پر غور کر چکا ہوں اور مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ تجھے یہ بتاتا۔ لیکن جیسے حالات تیرے پر بیت رہے ہیں وہ تجھے خود ہماری طرف دھکیل رہے ہیں۔ تیرا مقدمہ بھی اب ایک نیا رخ اختیار کر چکا ہے تو بیگم صاحبہ اور استاد کپیل دادا کی ضرورت بن چکا ہے مگر دیکھ کاکا!''
وہ سانس لینے کو رکا پھر گہری متانت سے بولا۔
''بات تیرے تحفظ کی بھی ہے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ تیرا ہمارے ساتھ رہنا ضرورت بن گیا ہے۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے اس مقدمے کے بعد شاید چوہدری ممتاز کی کہانی ختم ہو جائے۔ کیونکہ اس مقدمے کی چینل کے ذریعے کوریج کی جارہی ہے۔ بالخصوص اطفال گھر اور انسپکٹر روشن خان کا نجی ٹارچر سیل کا جس طرح تو نے ذکر کیا تھا کورٹ میں وہ معمولی بات نہیں ہے۔''
''اول خیر ایک بات بتاؤ۔'' بالآخر میں نے کہا۔ وہ میری طرف تکنے لگا۔ ''یہ تمہاری بیگم صاحبہ کا چوہدری ممتاز سے آخر جھگڑا کس بات کا ہے؟'' میرے استفسار پر اول خیر نے ایک گہری سانس لی۔ پھر بولا۔
''بس.... مگر ہم بھی اب یہی چاہتے ہیں کہ یہ کھیڈ چھیتی نال مک جائے تو ہم بھی سکون کی سانس لیں مگر ہماری وفاداری بیگم صاحبہ کے ساتھ ہے۔ ہم مرتے دم تک ان کے ساتھ ہیں۔ ویسے تیری وجہ سے کچھ امید تو ہو چلی ہے کاکا کہ اب کھیل ختم ہونے والا ہے۔''
''کاش ایسا ہی ہو، مجھے بھی اس بات کی خوشی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اول خیر! مجھے اپنے بھی کچھ ذاتی معاملات نمٹانے ہیں بہت گہرے معاملات۔'' یہ کہتے ہوئے میری نظریں غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔
وقت گزرا اور رات کی تاریکی پھیل گئی۔ پہلے اول خیر نے باہر نکل کر جائزہ لیا۔ کچی بستی تھی مزدور طبقہ تھا دن بھر کی مشقت طلب اور جان توڑ سخت کوشی کے بعد سب سوئے پڑے تھے۔ پوری بستی پر سناٹا اور تاریکی مسلط تھی۔
''چل کاکا میں بوری اپنے کاندھے پر لاد لیتا ہوں تو گھر کو تالا لگا دے۔'' اول خیر بولا۔
میں نے بوری اٹھوا کر اول خیر کے کاندھے پر رکھوائی، تالا سنبھالا اور باہر تاریک سیلن زدہ سی گلی میں آ گئے۔
میں نے گھر کو باہر سے تالا لگایا۔ بستی واقعی تاریک تھی کہیں کہیں دور قریب کے کسی گھر سے روشنی پھوٹتی نظر آتی تھی، کھلے آسمان پر بھی چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا۔ ٹمٹماتے تاروں کی مقدور بھر روشنی میں ہم دونوں آگے پیچھے دم بہ خود ہیولوں کی طرح کھڑے نظر آرہے تھے، پھر ہم نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔
اس کچی آبادی کی زمین ناہموار تھی، گھر سے نکلتے وقت اول خیر نے فون پر چھتے کو اپنے نکلنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس نے بتایا وہ اپنی بیوی کے کسی رشتے دار کے ہاں ہے اور شاید اب کل صبح ہی گھر لوٹے گا۔
نالا خاصا دور تھا۔ آگے چل کر بوری میں نے اپنے کاندھوں پر اٹھالی، اگرچہ اول خیر نے اعتراض کیا مگر میں نہ مانا۔ حرام خور گگل خان کی لاش کا وزن بھی سوا لاکھ کے مرے ہوئے ہاتھی سے کم نہ تھا۔ گندے نالے تک پہنچتے پہنچتے میں ہانپ گیا۔ نالے کے کنارے پر کچرا اور سخت تعفن پھیلا ہوا تھا۔ ہم کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پلیا پر آ گئے۔ ہم نے تاک کر گگل خان کی لاش بوری سمیت نیچے پھینک دی۔ چھپاکا سا ہوا۔ اور بوری گندے کالے پانی پر تھوڑی دیر نظر آتی رہی۔ پھر قدرے نیچے ڈوب کر پانی کی سطح پر پہلے سے تیرتے ہوئے گندے کباڑ میں مدغم ہو گئی۔
''خس کم جہاں پاک۔ چل کاکا! اب نکل لے۔ اسی راستے۔'' اول خیر نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ہم دونوں کچی بستی سے نکل کر پختہ سڑک پر آ گئے۔ یہاں خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی، رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کچھ ٹریفک رواں تھا، ٹیکسی تو نظر نہیں آئی، مگر ایک چائے خانہ ٹائپ ہوٹل کے قریب ایک رکشا کھڑا نظر آ گیا۔ اس کے اندر ایک من موجی سا آدمی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ رکشے میں ٹیپ ریکارڈر لگا ہوا تھا، وہ موسیقی کے مزے بھی لے رہا تھا۔
''ہاں چھڑا بازار چلنا ہے۔'' اول خیر نے اس سے کہا۔
''بالکل چلے گا۔'' رکشے والے نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے کہا اور چھوکرے کو آواز دی۔ اسے دس کا نوٹ اور خالی کپ پکڑا دیا۔
ہم دونوں تب تک رکشے میں بیٹھ چکے تھے۔
رکشا آگے بڑھ گیا۔ چھڑا بازار سنسان تھا۔ وہاں اتر کر اول خیر نے رکشے والے کو فارغ کر دیا پھر سیل فون پر کسی سے بات کی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لمبی سی جیپ ہمیں لینے آن پہنچی۔ ڈرائیور کے علاوہ اس میں دو آدمی موجود تھے۔ ان میں ایک کو میں فوراً پہچان گیا۔ وہ ارشد

تھا۔ وہی ارشد جو مجھے ناڑ پورہ کے تھانے کے لاک اپ میں اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ ملا تھا۔ وہ بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملا۔

ہم سب جیپ میں سوار ہوگئے اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ ارشد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں اور اول خیر عقبی سیٹ پر تھے۔ اول خیر مختصراً موجودہ صورتِ حال کے بارے میں انہیں بتاتا رہا۔ جس کا آخری حصہ ظاہر ہے جھوٹ پر مبنی تھا۔ مثلاً کنگل خان کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ حملہ کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر زخمی ہو کے فرار ہوگیا تھا وغیرہ۔ ارشد نے فون پر ہی کیبل دادا کو تو ساری صورتِ حال بتادی تھی۔

سفر جاری تھا، پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی ایک پوش علاقے میں داخل ہوگئی۔ جس کے دورویہ بنگلے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میرے تصور میں ان کا ٹھکانہ کسی الگ تھلگ مقام پر... اڈے کی صورت میں ہونا چاہیے تھا لیکن جب کار ایک عظیم الشان کوٹھی کی پُرشکوہ عمارت میں داخل ہوئی تو مجھے اپنا خیال غلط محسوس ہوا۔ کوٹھی کی پیشانی پر ''بیگم ولا'' درج تھا۔

ان کے بیچ مجھے نجانے کیوں عجیب سا احساس ہونے لگا۔ پختہ روش کے دائیں بائیں خوش رنگ بوٹوں کی مہک بکھری ہوئی تھی، وسیع باغ بھی نظر آیا۔ پورچ میں ایک شاندار نئے ماڈل کی کار موجود تھی۔ ایک ڈبل ڈور بجیرو تھی۔

ہم نیچے اترے اور ایک وسیع و عریض پُرتعیش ہال کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ ارشد مجھے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اول خیر کے علم میں ہماری شناسائی آچکی تھی۔ کچھ کھانے پینے کی چیزوں کا بندوبست کیا گیا۔ پھر ارشد نے بڑے استاد کے آنے کی اطلاع دی۔

میرے قد کے برابر ایک لمبا تڑنگا مگر بھاری بھرکم جسم والا ایک سانولے رنگ کا شخص اندر داخل ہوا تو مجھے پہلی ہی نظر میں اس پر بن مانس کا گمان ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور بھاری کاندھے جھکے جھکے سے تھے۔ اس کے بال چھوٹے تھے، اس نے ٹائٹ جینز اور اسی طرح کی چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس سے اس کا کسرتی جسم واضح ہو رہا تھا۔ اس کے بازو اور سینہ گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے، چہرہ کلین شیو تھا، چہرے مہرے سے کرخت رو انسان نظر آتا تھا۔ بھویں بھی چوڑی اور گھنی تھیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے میں صرف اب میں، اول خیر اور ارشد تھے جو اسے دیکھتے ہی مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی بڑا استاد یعنی کیبل دادا ہے۔ وہ میری طرف بھویں سکیڑ کر دیکھ رہا تھا، پھر میری جانب اپنے دونوں بن مانس جیسے بازو پھیلا کر بڑھا۔ اور پُرتپاک انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

''تیرا پورا نام کیا ہے نوجوان؟'' وہ بولا۔ اس کا لہجہ کھردرا اور آواز بھاری تھی۔ اس کے پوچھنے کے انداز میں میرے لیے فخر بھرا ہوا تھا۔

''شہزاد احمد خان عرف شہزی۔'' میں نے اسے اپنا پورا نام بتایا۔

''بیٹھ جا۔'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔ مگر اس کے بولنے کا انداز ہی ایسا تھا۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ وہ سامنے والے ایک بڑے اور آرام دہ صوفے میں دھنس گیا اور اول خیر کی جانب دیکھ کر تحکمانہ انداز سے بولا۔

''ہاں چھوٹے! ہوا کیا تھا؟'' جواباً اول خیر نے وہی تفصیل مختصراً صراحت کے ساتھ اسے بتادی، جو تھوڑی دیر پہلے جیپ میں وہ ارشد کو بتا چکا تھا۔ ''جیپ کی رجسٹریشن کس کے نام تھی، جس پر تم لوگ سوار تھے؟'' کیبل دادا نے اول خیر سے دوسرا سوال پوچھا۔ تو اس نے مؤدبانہ سے لہجے میں بتایا۔

''بے فکر رہو استاد! جیپ کسی اور کے نام رجسٹرڈ تھی۔ جو اس دنیا میں نہیں ہے پولیس کو ہمارا سراغ نہیں مل سکتا۔''

''بہتر!'' کیبل دادا نے اثبات میں سر کو ہولے سے جنبش دی۔ وہ گاہے بہ گاہے میری طرف بھی بہ غور دیکھ رہا تھا۔ بالآخر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''شہزاد۔ تو نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ تو نے ہماری خاطر ایک بڑی قربانی دی ہے۔ ہم نے بھی تیری عظیم قربانی کو ضائع نہیں جانے دیا۔ اس کا سہرا اول خیر کے سر جاتا ہے۔ اس نے عابدہ کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہ کی تھی۔ ادھر سے یہ عابدہ کو چھڑانے کی قسم کھا کر نکلا تھا۔''

''میں اس کے لیے آپ سب کا اور اول خیر کا خاص طور پر مشکور ہوں۔'' میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ ''ویسے میں نے کورٹ میں وہی کچھ کہا تھا جو سچ تھا۔'' میرا لہجہ محتاط تھا۔

''استاد! بیگم صاحبہ جاگ رہی ہیں؟'' اول خیر نے

کیبل دادا سے پوچھا۔ ''میرا تو یہی خیال تھا کہ انہیں نہیں جگایا جائے لیکن ان کا اصرار تھا کہ شہزی کی آمد پر انہیں جگا دیا جائے۔'' کیبل دادا بولا۔

''میرا مطلب تھا شہزی کا کا بھی بہت تھکا ہوا ہے یہ بھی ذرا آرام کر لیتا۔ صبح بیگم صاحبہ کی اس سے ملاقات کروادی جاتی۔'' اول خیر بولا۔ اسی وقت ایک کارندہ اندر داخل ہوا اور بیگم صاحبہ کی آمد کی اطلاع دی۔

اپنے لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم وجود کے ساتھ صوفے پر آرام سے بیٹھا کیبل دادا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اول خیر اور ارشد کو بھی کھڑے ہوتے دیکھ کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اندرونی دروازے سے ایک جوان عورت شاہانہ اور بارعب چال چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ گورا تھا، چہرہ حسین اور دلکش تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹوں کی بناوٹ بڑی رمزیہ، جسم صحت مند تھا، وہ پنجاب کے کسی دیہاتی کھلی ڈلی آزاد فضا کی الھڑ مٹیارن نظر آتی تھی اور بیک وقت ایک مردم مزاج اور دبدبے والی خاتون بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے گھنے ریشمی بال مہندی رنگ کے تھے، جو بڑے سلیقے سے پشت پر کھلے ہوئے تھے۔ اس کا عام لباس بھی اس کے پُروقار و پُرشباب وجود پر عجب بہار دکھا رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں... مدِمقابل کو از خود ہی اس کے احترام میں جھک جانے کا تاثر پایا جاتا تھا۔ ورنہ تو میں سمجھا تھا کہ ان کی بیگم صاحبہ کوئی عمر رسیدہ اور چڑچڑی بوڑھی عورت ہوگی، تاہم مجھے اس کے خوب صورت چہرے پہ ایک نامعلوم سی سخت گیری اور اس سے زیادہ سرد مہری جھلکتی محسوس ہوئی۔ اس کی آمد پر کیبل دادا سمیت اول خیر اور ارشد مؤدبانہ انداز میں سر اور آنکھیں جھکائے کھڑے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب بیگم صاحبہ کی نگاہ مجھ پر پڑی اور میری آنکھیں چار ہوئی تھیں کہ اچانک میں نے بیگم صاحبہ کے تنے ہوئے وجود کو واضح انداز میں ایک جھٹکا لیتے ہوئے محسوس کیا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ شاید فرش پر بچھے بیش قیمت دبیز قالین پر ان کا پاؤں رپٹا ہو۔ مگر وہ تو یک ٹک میرے چہرے کو دیکھتی چلی گئی۔ اس کی کشادہ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جس میں حیرت اور ناقابلِ یقین جیسے چونکتے ہوئے ایسے تاثرات تھے جن میں شناسائی ناشناسائی کے درمیان جنگ کی سی کیفیات ہو۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس خاتون کا ایک ہاتھ اپنی پیشانی کو

''کیا تمہیں بے وقوف عورتیں پسند ہیں؟''
''نہیں۔''
''کیا تمہیں سگریٹ نوش خواتین پسند ہیں؟''
''بالکل نہیں۔''
''اور ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو کھانا تک نہیں پکا سکتیں؟''
''یار تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟''
''تو پھر تم میری بیوی میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

☆☆☆

لمبے سفر سے واپسی پر ایک آدمی کتا خانے سے اپنا کتا لینے کے لیے رکا۔
گھر پہنچنے پر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''میرے خیال میں جارج نے سفر کافی انجوائے کیا ہے۔ یہ راستے بھر اس طرح بھونکتا رہا جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔''
اس کی بیوی نے کہا۔ ''وہ تم سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم غلط کتا گھر لے آئے ہو۔''

(ج۔احمد۔پشاور)

تھامنے کے لیے حرکت میں آیا تو اس کے حلق سے آہ جیسی آواز بھی برآمد ہوئی، مؤدبانہ کھڑے کیبل دادا وغیرہ نے چونک کر سر اٹھایا اور اس کی جانب دیکھا۔ تب تک وہ خاتون چکرا کر گرنے لگی تو کیبل دادا نے بہ سرعت بڑے احترام سے اس خاتون کو سنبھالا اور آرام سے صوفے پر بٹھادیا۔ ہم سب پریشان ہوگئے۔ کیبل دادا ''بیگم صاحبہ... بیگم صاحبہ... کیا ہوا؟'' کہہ کر اسے پکارتا رہا مگر ''بیگم صاحبہ'' پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری رہی۔

اول خیر اور ارشد حرکت میں آئے ارشد پانی کا گلاس بھر لایا اور کیبل دادا کو تھمایا۔ کیبل دادا نے تھوڑا پانی لے کر بیگم صاحبہ کے چہرے پر چھینٹے مارے اور بیگم صاحبہ نے آنکھیں کھول دیں۔ کیبل دادا نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے فون کرنا چاہا مگر بیگم صاحبہ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا اور پھر مجھ پر نگاہیں جمادیں۔ اور یک ٹک دیکھتی چلی گئی۔ اس بار ان کے چہرے کے تاثرات کیبل دادا سمیت اول خیر اور ارشد سے بھی چھپے نہ رہے، پھر یوں ہوا وہ دم بہ

خود سے کبھی میری طرف اور کبھی بیگم صاحبہ کی طرف دیکھنے لگتے۔ جبکہ خود میری اپنی حالت بھی عجیب سی تھی، آخر اس اچھی بھلی رعب داب والی خاتون کو ہوا کیا تھا جو مجھے دیکھتے ہی بے ہوش سی ہونے لگی تھی، میں خود شدید قسم کی حیرت سے دوچار تھا۔

"یہ... یہ کون ہے؟" معاً خاتون نے ایک ہاتھ کا اشارہ میری جانب کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آواز بھی اس کی دورخی شخصیت کی طرح مترنم بھی تھی اور بارعب بھی۔

"یہ وہی نوجوان ہے بیگم صاحبہ! شہزی... شہزاد احمد خان... جس نے کورٹ میں چوہدری ممتاز وغیرہ کے خلاف بیان دیا تھا۔" کبیل دادا نے بتایا۔ تو اول خیر نے بھی آگے بڑھ کر نہایت مؤدبانہ انداز میں میرے سلسلے میں تھوڑی بہت تفصیل سے اسے آگاہ کر دیا جو میرے یقینی خیال کے مطابق پہلے ہی سے بیگم صاحبہ کو آگاہ کی جا چکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کل بات کریں گے، ابھی اسے آرام کرنے دو۔" کہتے ہوئے بیگم صاحبہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اسی اثنا میں کبیل دادا نے کسی روبی نامی جواں سال لڑکی کو آواز دے کر بلا لیا تھا، اب وہ بیگم صاحبہ کو سہارا دے کر اس دروازے کی طرف بڑھ گئی جس دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

میں گومگو سے چہرے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کبیل دادا اور اول خیر وغیرہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے مگر بولے کچھ نہیں، تاہم اول خیر نے کبیل دادا سے مجھے لے جانے کی اجازت مانگی۔ اس نے ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

اول خیر مجھے لے کر ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا تو مجھ سے بولا۔ "کاکا یہ کیا چکر تھا؟"

"پتا نہیں۔ میں تو خود حیران ہوں۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ تو مجھے دیکھتے ہی چکرا کر گر پڑیں میں خود گھبرا گیا تھا کیا معاملہ ہے یار؟"

"او خیر... کاکا میں تو خود تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔ میری تو اپنی مت (عقل) ماری گئی ہے۔" وہ بولا پھر بڑے عجیب اور پُراسرار بھرے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ "کاکا! تیرے میرے درمیان تو کوئی راز نہیں ہے ناں ایک بات بتا۔ کیا تو اس سے پہلے بھی بیگم صاحبہ کو جانتا تھا؟" میں اس کے اس عجیب وغریب سوال پر چونکا اور ہنس پڑا۔

"اول خیر! ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تو زندگی میں پہلی بار آج تمہاری اس خوب صورت بیگم صاحبہ کو دیکھا ہے۔ میں نے تو اپنی آدھی عمر اطفال گھر کی چار دیواری میں گزار دی ہے۔ اب بھی میری تقدیر میں شاید ناساعد حالات کی قید ہی لکھی ہوئی ہے مگر تم نے مجھ سے یہ عجیب سوال کیوں کر ڈالا؟" میری بات پر اول خیر نے ایک گہری اور اسرار بھری ہوں خارج کی اور بولا۔

"چل کوئی بات نہیں مگر ہمیں ایسا لگا تھا جیسے بیگم صاحبہ مجھے کسی خاص حیثیت سے پہچان رہی ہیں، ممکن ہے انہیں کوئی غلط فہمی ہوا و خیر... کاکا تو آرام کر پریشان نہ ہو کل بات کریں گے۔" کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے اسے روکا۔ میں نے گہری متانت سے کہا۔

"اول خیر! میں کل اوکاڑہ روانہ ہونا چاہتا ہوں۔" میرا لہجہ دوٹوک تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے کل بات کریں گے۔" کہتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں چند ثانیے گومگو کے سے انداز میں کھڑا رہا پھر کمرے کا جائزہ لیا جو خاصا کشادہ اور آرام دہ نظر آ رہا تھا۔ میں غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہو گیا اور بیڈ پر لیٹا تو شدید تھکاوٹ کے باعث نیند نے جلد ہی آن لیا۔ میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

مجھے صبح آٹھ بجے جگا دیا گیا۔ ایک کارندے نے مجھے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے باہر ناشتے کی میز پر آنے کا کہا اور چلا گیا۔

میں نہا دھو کر کمرے سے نکلا اور اس ڈرائنگ روم نما ہال میں آ گیا۔ ایک کونے میں لمبی چوڑی میز تھی، رات کا کھانا بھی ہم نے اسی میز پر کھایا تھا۔ اب ناشتے پر اول خیر اور ارشد میرے منتظر تھے، کبیل دادا نظر نہیں آ رہا تھا۔

"او خیر کاکا سب تندر (نیند) کر لی اچھی طرح؟" اول خیر مخصوص لہجے میں مسکرا کر بولا۔

"ہاں..." میں نے مختصر کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناشتا پُرتکلف تھا۔ آملیٹ، دہی، میٹھی چٹنی، مکھن، ڈبل روٹی روغنی پراٹھے، چائے، جوس دودھ میں نے ڈبل روٹی کے دو سلائس اور تھوڑا سا آملیٹ لیا اور چائے کے ساتھ مختصر سا ناشتا کر کے میز چھوڑ دی اور صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

میرا چہرہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ مجھے ان چار بدنصیب لڑکیوں کی فکر ہو رہی تھی جن میں شکیلہ بھی تھی۔ اول خیر میرے چہرے

کی سنجیدگی بھانپ کر ناشتے کی میز سے اٹھ آیا۔

"اول خیر! مجھے جانا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کاکے تیرے دل و دماغ میں کیا پک رہا ہے۔" وہ بولا۔ "تھوڑا صبر کر میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا بلکہ بڑے استاد کبیل دادا سے مدد مانگ کر اوکاڑہ روانہ ہو جائیں گے۔ تنہا تو کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"میرے اکیلے ہونے کی بات چھوڑ دو اول خیر!" میں نے اسی قدر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر دو۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کبیل دادا بھاری انداز میں کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا، اس کے چہرے پر سوچ کے گہرے تاثرات تھے، وہ آ کر ہمارے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ارشد بھی تب تک ناشتے سے فارغ ہو کر ہمارے ساتھ آن بیٹھا تھا۔

اول خیر نے بلاتمہید میری بے چینی اور پریشانی سے کبیل دادا کو آگاہ کیا تو وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اس کا فیصلہ بیگم صاحبہ خود کریں گی!"

"تو پھر آپ بیگم صاحبہ کو جگا کر بتا دیں۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔" اس بار میں نے خود براہِ راست کبیل دادا سے لب کشائی کی تو وہ میری جانب گھورنے کے انداز سے تکتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بولا۔

"ہولا رہ شہزادے۔ ہولا رہ۔ ان لڑکیوں کا سراغ تو معلوم ہو ہی چکا ہے ناں تمہیں، یہ کام پولیس کے ذریعے بھی ہم کروا سکتے ہیں، یہ اتنا ضروری نہیں ہے۔" مجھے اس کی یہ بات سخت ناگوار گزری، اول خیر نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ ان چار بدنصیب لڑکیوں کا سراغ مجھے کسی اور ذریعے سے معلوم ہو چکا ہے گل خان کا ذکر سرے سے گول کرنا پڑا تھا۔

"یہ کام کتنا ضروری اور غیر ضروری ہے، یہ صرف میں جانتا ہوں۔" میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور پولیس یہ کام نہیں کر پائے گی۔ بلکہ الٹا کام بگڑ جائے گا۔" میری بات پر کبیل دادا نے ایک لمحے کو بڑی کرخت نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تو کسی بدمزگی یا بحث سے بچنے کی خاطر اول خیر نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کبیل دادا سے کہا۔

"استاد شہزی کاکا کو دراصل پولیس پر بھروسا نہیں رہا

بدتمیز

ڈنکن اسکاٹ لینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن آیا تو اسے ہاسٹل میں قیام کرنا پڑا۔ کرسمس کی چھٹیوں میں وہ گھر گیا تو اس کی ماں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "بیٹا! وہاں تم انگریز لڑکوں سے بھی ملتے جلتے ہو گے۔ وہ مزاج میں کیسے ہوتے ہیں؟"

"بدترین!" ڈنکن نے حقارت سے کہا۔ "اسکاٹ لینڈ ان سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ شور اور چیخ و پکار ان کا شیوہ ہے۔ میرے داہنے طرف والے کمرے میں لڑکی رات بھر ہذیانی انداز میں چیختی رہتی ہے۔ بائیں طرف بھی ایک انگریز لڑکی ہے۔ وہ پوری رات دیوار میں نہ جانے کیا ٹھونکتی رہتی ہے!"

"ہائے میرا بچہ!" ماں نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔ "ایسے بے ہودہ پڑوسیوں کے ساتھ تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہو گا؟"

"بس ہو ہی جاتا ہے، موم!" وہ بولا۔ "میں انہیں نظرانداز کر دیتا ہوں اور رات بھر یکسوئی سے اپنا ڈرم بجانے کی مشق کرتا رہتا ہوں۔"

کراچی سے اورنگزیب کا جواب

ہے۔ ان چاروں لڑکیوں کی عزت اور جان خطرے میں ہے؟"

"مگر ہم نے اس کی عابدہ کو ان کے چنگل سے چھڑا لیا ہے۔ اب اسے کس بات کی فکر ہے؟" کبیل دادا نے اول خیر کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ جواباً بولا۔

"استاد، اس نے لوگوں کے ساتھ ایک عرصہ ساتھ گزارا ہے اس لیے اسے جلدی ہے... ان کو بچانے کی ذمے داری اس نے اپنے سر خود لی ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے... بیگم صاحبہ سے بات کر لیتے ہیں۔" کبیل دادا نے مجھے تسلی دی۔ "ویسے میرا نہیں خیال کہ بیگم صاحبہ تمہیں ابھی یہاں سے جانے کی اجازت دیں۔ تم ہمارے دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتے ہو، جو ہمارے مفادات کے خلاف ہے۔"

"میں نے کسی کے مفادات کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے کبیل دادا۔" میں یہ کہتے ہوئے غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اس سخت ردِعمل پر کبیل دادا کی آنکھوں میں غصے کی لہر ابھری تھی۔ اول خیر اور ارشد پریشان سے نظر آنے لگے۔ ایسے ہی وقت میں کبیل دادا کی غراہٹ سے مشابہ

آواز ابھری۔

"تیرا ہم پر اگر احسان نہ ہوتا تو بیگم صاحبہ کی چھت کے نیچے ایسا بولنے والے کی کھوپڑی میں گولی اتار دیتا۔"

"کبیل دادا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے میں اسے سمجھاتا ہوں۔" اول خیر نے ذرا تیز لہجے میں مداخلت کی، اسی اثنا میں وہی خاتون کمرے میں داخل ہوئی جسے یہ لوگ بیگم صاحبہ کہہ کر پکارتے تھے۔

"کیا شور ہے یہ؟" اس کی ترنم میں لپٹی رعب دار آواز گونجی تو کبیل دادا وغیرہ سب احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیگم صاحبہ شہزی یہاں سے جانا چاہتا ہے۔" کبیل دادا نے...... بتایا تو خاتون نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے شفاف اور دلکش چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر جب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی تو اس کے لہجے میں وہ تحکمانہ پن یا سرد مہری نہ تھی جو اپنے کارندوں سے مخاطب ہوتے وقت اس کے لہجے سے ظاہر ہوتی تھی۔

"کیوں شہزاد صاحب! آپ کو یہاں کوئی تکلیف پہنچی ہے۔ ہمیں بتاؤ؟" میں نے دیکھا۔ اول خیر اور ارشد جبکہ بالخصوص کبیل دادا کے بشروں سے چونکتی ہوئی حیرت کی جھلک ابھری۔

"جی نہیں بیگم صاحبہ! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے مگر..."

"تو پھر آپ یہاں سے جانا کیوں چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارے دشمنوں کی نظروں میں آپ کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے ہیں اور وہ آپ کی جان کے دشمن ہیں۔"

بیگم صاحبہ کا اس طرح مجھے آپ سے مخاطب کرنا یقینی طور پر میرے لیے تو اتنا نہیں لیکن کبیل دادا وغیرہ کے لیے ضرور اچنبھے کا باعث بن رہا تھا، یہ بات ان کے تاثرات سے بالکل عیاں تھی۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا وہ میری نظروں کا مطلب بھانپ کر بیگم صاحبہ سے انتہائی احترام سے بولا۔

"بیگم صاحبہ آپ آرام سے تشریف رکھیں۔ میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔"

وہ خاتون نہایت شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی صوفے کے قریب آئی اور اس پر براجمان ہوگئی۔

میں بہ دستور محسوس کر رہا تھا کہ یہ پُروقار خوب صورت خاتون میرے لیے نرم رویہ رکھتی ہو۔

اول خیر نے اسے وہ سب بتا دیا جسے سن کر خاتون کے چہرے پہ ایک رنگ سا جھلکا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر توصیفانہ لہجے میں بولی۔

"شہزاد صاحب۔ آپ واقعی ایک بہادر نوجوان ہیں، اور باعزم غیور بھی، آج کی دنیا میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ ہم ذاتی طور پر اور دل سے آپ کے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں اور آپ کا یہی مشن ہے تو ہم بھی نہیں روکیں گے، لیکن کیا آپ کو اس بات کا اندازہ ہے کہ آپ اس وقت ایک خطرے سے بھی دوچار ہیں۔ آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ عدالت میں دھواں دھار بیان کے بعد بڑے بڑے اونٹ پہاڑ تلے آنے والے ہیں، آپ ہمارے لیے بھی اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں مگر ہم آپ کے نیک مقصد کے بیچ بھی حائل نہیں ہونا چاہتے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اکیلے یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ ہمارے جن ساتھیوں کا انتخاب کریں، وہ آپ کے ساتھ کر دیے جائیں گے۔"

خاتون، یعنی بیگم صاحبہ کی اس بات پر میں آج پہلی بار اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا، اول خیر بھی خوشی سے مطمئن نظر آنے لگا۔ مگر کبیل دادا کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئیں، اس نے اعتراض اٹھایا۔

"بیگم صاحبہ! اس وقت حالات ہمارے لیے بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم بھی حالاتِ جنگ کی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ سب جانتے ہیں کہ یہ نوجوان شہزاد احمد خان ہمارے لیے کس قدر اہم ہے، ہمارے دشمنوں کو بھی اس کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے، دشمنوں پر وار کرنے کا ہمارے ہاتھ ایک موقع آیا ہے۔ جسے ہم اس طرح خود اپنے ہاتھ سے ضائع کر رہے ہیں۔"

"تو کیا ہم اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس نوجوان کے اپنے نیک اور اہم مقصد کو فراموش کر دیں؟" بیگم صاحبہ نے میری حمایت میں کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ اس نوجوان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔"

"بیگم صاحبہ! ہم اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس کی مدد کریں گے، ٹھیک ہے، اگر اسے ان چاروں مغوی لڑکیوں کا سراغ مل چکا ہے تو یہ ہمیں بتا دے۔ ہمارے ساتھی بہ آسانی یہ کام نمٹا آئیں گے۔"

"میرے آگے صرف یہی ایک مقصد نہیں ہے۔" میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ "کچھ اور معاملات بھی ہیں جو ذاتی نوعیت کے اور فوری حل طلب

ہیں۔ اور ویسے بھی میں ہرگز یہ بات پسند نہیں کروں گا کہ میں یہاں نظر بند یا قیدی کی حیثیت سے موجود رہوں... جب کسی کو میری ضرورت پڑے وہ میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے آگے ہانک دے۔ ہر انسان اپنے برے بھلے کا خود ذمے دار ہوتا ہے۔"

بیگم صاحبہ میری باتوں کو بڑے دھیان اور توجہ سے سن رہی تھی، اور اس سے کہیں زیادہ غور اور عمیق نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف تکے جا رہی تھی۔ اول خیر نے بھی میری حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"کاکا شہزی کی ان باتوں کا خیال رکھنا ہمارا اخلاقی فرض بنتا ہے بیگم صاحبہ! کہ ہم اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ رہی بات ہم سے مدد مانگنے کی شہزی کے مجھ پر بھی بہت احسانات ہیں۔ اگر مجھے ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اپنے مشن میں رکھنا چاہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے ہم یہ معاملہ اس پر چھوڑتے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور میں نے ازراہ احترام قدرے خم ہو کر بیگم صاحبہ کا ہولے سے شکریہ ادا کیا۔ کبیل دادا خاموش کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ خوش نہیں۔

"تم نے ناشتا ٹھیک طرح سے کر لیا۔" بیگم صاحبہ نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کے لہجے سے مجھے ایک عجیب طرح کی مٹھاس محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اسے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ اب دھیرے دھیرے آپ سے تم پر آگئی تھی۔

"جی ہاں! بیگم صاحبہ میں نے ناشتا کر لیا۔ بہت پُرتکلف ناشتا تھا۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کبیل دادا سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوئی۔

"کبیل"

"جی بیگم صاحبہ۔" کبیل دادا فوراً قدرے خم ہو کر مؤدبانہ بولا۔

"آج سے شہزی کے معاملات اول خیر ڈیل کرے گا۔ انہیں ہر قسم کی سپورٹ فراہم کرنا تمہارے ذمے ہے، سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا، بیگم صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔" وہ فوراً بولا پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر جاتے جاتے بولی۔

"تم کو جو تیاری کرنا ہے وہ کر لو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔" یہ کہہ کر وہ شاہانہ چال کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر میں، اول خیر اور ارشد اوکاڑہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہم اس گاڑی میں سوار تھے جس پر رات چڑا بازار کے چوک سے ارشد نے مجھے اور اول خیر کو پک کیا تھا۔ یہ اگرچہ پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر تھی مگر اس کی کنڈیشن اچھی تھی اور انجن بھی طاقت ور تھا۔

کبیل دادا نے ہمارے روانہ ہوتے وقت ہمیں دس پندرہ آدمی... ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا تھا مگر میں نے اس کا مشورہ رد کر دیا۔ اول خیر بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ کا قائل نہ تھا۔ ویسے بھی ہم کسی جنگی محاذ پر نہیں جا رہے تھے، اول خیر نے صرف ارشد کو ساتھ لے لیا تھا۔ بعد میں اول خیر نے مجھے بتایا تھا کہ میری طرح ارشد بھی اس کا رازدار دوست اور جاں نثار ساتھی ہے۔

ملتان سے اوکاڑہ دو سو پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت ہم ملتان روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ ارشد ڈرائیونگ میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ ملتان سے خانیوال کا سفر اس نے نصف گھنٹے میں طے کر لیا تھا۔ یہاں سے میاں چنوں، پیرو وال، کھڈہ سے خیرآباد آتے ہوئے بالآخر ہم محسن وال کے ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں رکے۔

ارشد نے جیپ کا بونٹ اٹھا دیا تھا۔ اور ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے میں مصروف ہو گیا جبکہ میں اور اول خیر ہوٹل کے احاطے میں بچھی چارپائی پر پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ پیش گار لڑکے کو چائے وغیرہ کا آرڈر دینے کے بعد اول خیر مجھ سے بولا۔

"کاکا! بیگم صاحبہ والا یہ معاملہ کچھ پُراسرار سا لگتا نہیں ہے؟"

میں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ یہ ایسا ہی چائے خانہ نما چھپر ہوٹل تھا، جہاں باربردار ٹرک لگژری مسافر کوچیں تھوڑی دیر کے لیے رکتی تھیں۔ اس وقت دو تین باربردار اور دس وہیلر ٹرک کھڑے تھے، دو مسافر کوچیں دو ایک لمبی لوکل بس کھڑی تھی، اس کی بات پر میں قدرے چونکا اور بولا۔

"کون سا معاملہ؟ میرے لیے تو بیگم صاحبہ پوری کی پوری ہی پُراسرار شخصیت ہیں۔"

میری بات پر اول خیر بے اختیار ہنس پڑا پھر بولا۔ "او خیر... کاکا یہ بھی تو نے خوب کہی، ویسے میں کل رات کی بات کر رہا ہوں۔ تو نے بھی تو محسوس کی ہوگی یہ بات بیگم صاحبہ تجھے دیکھتے ہی عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوگئی تھی مگر کاکے... بات اتنی بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ

ہمارے لیے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلے دن یعنی آج صبح بیگم صاحبہ کا رویہ بھی تیرے ساتھ خاصا نرم اور میٹھا میٹھا سا تھا۔ یار کاکا سمجھ نہیں آرہا آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ ورنہ تو کبیل دادا نے جو بحث چھیڑ دی تھی، مجھے ڈر تھا معاملہ بڑھ نہ جائے کیونکہ بیگم صاحبہ کبیل دادا کے مشوروں پر آنکھ بند کر کے عمل کرتی ہے۔ اسے اتنا یقین ہے اس پر مگر آج تو بیگم صاحبہ نے اپنے روایتی مزاج کے بالکل خلاف رویہ رکھا تھا تیرے ساتھ آخر چکر کیا ہے کاکا؟"

میں ہنس دیا بولا۔ "مجھے کیا معلوم، میں تو خود پہلی بار تیرے سامنے ہی بیگم صاحبہ سے ملا ہوں۔"

اس اثنا میں چائے وغیرہ آگئی، اور ارشد بھی آگیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔

"مجھے بھی سگریٹ دے۔" اول خیر نے ارشد کے بیٹھتے ہی کہا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے جیب سے گولڈ لیو کا پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ اول خیر نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لی تو ارشد نے فوراً اس کے سرے کو لائٹر دکھا دیا۔

ارشد نے میری طرف بھی پیکٹ بڑھایا مگر میں نے مسکرا کر انکار میں سر ہلا دیا۔

"میں بھی نہیں پیتا، بس کبھی کبھار موڈ سے سوٹے لگا لیتا ہوں۔" اول خیر ہنسا۔

وہاں ہم زیادہ دیر نہیں رکے اور آگے بڑھ گئے۔

اسلحے کے نام پر ہمارے پاس صرف پستولیں تھیں۔ ارشد اور میرے پاس پسٹل تھے، جبکہ اول خیر کی شلوار کے نیفے میں جرمن ساختہ میگا رو اڑسا ہوا تھا۔ تینوں ہتھیار لائسنس شدہ یافتہ تھے، ملک کے خراب حالات کے پیش نظر آتی جاتی گاڑیوں کی چیکنگ اور تلاشی لی جاتی تھی۔

میاں چنوں سے ساہیوال 84 کلومیٹر یعنی 52 میل تھا۔ چی چاں وطنی اور پھر ہڑپہ کے پانچ ہزار سالہ دفن شدہ شہر کی جھلک دیکھتے ہوئے جب ساہیوال کے قریب قدرے مضافات میں تھے تو ایک مقام پر ہمیں جیپ روکنا پڑی۔

سہ پہر کا وقت ہو چلا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے کھا لیا تھا۔ جیپ روکنے کی وجہ مین شاہراہ پہ واقع ایک بڑا سیاسی جلوس تھا۔ جلوس کے شرکا، ہیوی موٹر سائیکلوں پہ سوار تھے۔ کسی بڑی سیاسی شخصیت کا اجتماع نظر آتا تھا۔

جلوس پوری مین سڑک کو گھیرے آگے بڑھ رہا تھا مسافر کوچیں اور لاریوں سمیت دیگر آنے جانے والی گاڑیوں کو راستہ کھلنے تک سڑک کے کنارے کچے میں روک دیا گیا تھا۔ مجھے اس شعبدے بازی پر حیرت کے ساتھ غصہ آنے لگا۔ میں نے جل کر اول خیر سے کہا۔

"یار خدانخواستہ کسی کو گزرنے کی جلدی یا ایمرجنسی ہو، وہ بے چارہ کیا کرے گا؟"

میرے استفسار پر اول خیر ایک تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ "تو اس کی کیا بات کرتا ہے کاکا یہ بے حس سر پھرے لوگ تو کسی ایمبولینس کو گزرنے کا راستہ بھی نہیں دیتے۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک عقب سے ایک بلیو کلٹس ہمیں عقب سے ہارن پہ ہارن دینے لگی۔

"کیا یہ اندھا ہے یا اس کا دماغ خراب ہے؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ارشد نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا۔ پھر ساتھ ہی ایک ہاتھ سے باہر سامنے کی طرف اشارہ بھی کر دیا عقب سے ہارن دینے کی آواز معدوم ہو گئی مگر دوسرے ہی لمحے اس کار سے ایک خوبرو سا نوجوان اتر کر ارشد کے قریب آیا اور ملتجی لہجے میں بولا۔

"یار! پلیز بس تھوڑا سا گاڑی کو سائڈ میں کر لو، میں آگے نکل جاؤں کار میں میری والدہ کی طبیعت سخت خراب ہے، میں اسے ساہیوال کے ایک بڑے اسپتال لے جا رہا ہوں۔"

ارشد کے جواب دینے سے قبل ہی اول خیر نے اس سے کہا۔

"کاکا! ہم اپنی گاڑی ایک طرف کر لیتے ہیں مگر سامنے دیکھ رہے ہو کتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے یہ لوگ تمہیں نکلنے دیں گے؟"

"ضرور میں ان سے درخواست کروں گا، مجھے امید ہے کہ وہ میری مجبوری کو دیکھتے ہوئے انسانیت کے ناتے میری گاڑی نکلنے کا بندوبست کر دیں گے۔"

"چل اوئے... ارشد کاکا! گڈی کو ذرا ہو تھلے لادے، (اور نیچے اتار دے)"

اول خیر نے فوراً ارشد کو ہدایت کی، ہماری گاڑی پہلے ہی پختہ سڑک کی سائڈ میں کچے پر ایک طرف جھکی کھڑی تھی، تاہم ارشد نے کلٹس کو راستہ دینے کے لیے تھوڑی اور نیچے نشیب میں اتار دی۔ اس سے نیچے ایک ندی بہہ رہی تھی، نوجوان نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور تیزی سے اپنی کار کی طرف دوڑا۔ مجھے اس نوجوان پر بڑا ترس آیا۔ میں اس کی بیمار ماں کے لیے دعا ہی کر سکتا تھا۔ کار آگے نکل گئی تو ارشد نے گاڑی تھوڑا آگے بڑھا کر اسے نشیب کے جھکاؤ سے تھوڑا اوپر کر لیا۔ اب وہ بھی چیونٹی کی رفتار سے کلٹس کے

پیچھے پیچھے گاڑی بڑھا رہا تھا۔

"اوکاکا! جگاڑ مار رہا ہے۔ یہ سر پھرے سیاسی جیالے متوالے کارکن ہمیں آگے پھر بھی نہیں نکلنے دیں گے۔"

اول خیر شاید ارشد کی چالاکی بھانپ گیا تھا، جو کلٹس کے پیچھے رہ کر اپنی گاڑی بھی آگے نکالنے کے چکروں میں تھا۔

مگر کلٹس کا راستہ چند سیاسی کارکنوں نے روک لیا۔ لڑکا ان سے گزارش کرنے لگا مگر وہ لڑکے آگے نکل گئے ان کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ لڑکے کو کار نکالنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کی پریشانی فزوں تر ہو رہی تھی، معاً ایک نئے ماڈل کی سیاہ ہنڈا سٹی دکھائی دی، اس کار نے کلٹس کا راستہ روک رکھا تھا۔ اس کار پر کارکن پھول پھینک رہے تھے، وہ نوجوان جلدی سے اپنی کار سے اترا... اور دوڑا دوڑا ہنڈا سوک کے نزدیک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا۔ ہماری جیپ بھی قریب ہی تھی، ہم اندر بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے خاموشی سے۔

ہمیں وہ لڑکا ہنڈا سوک کار کی کھڑکی پر جھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کار پر سیاسی جماعت کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ ایک گولڈن پلیٹ پر ایم پی اے لکھا ہوا تھا۔ وہ کسی صوبائی اسمبلی کے ممبر کی کار تھی۔

اچانک میں چونک پڑا۔ کھڑکی پر جھکے ہوئے اس مجبور لڑکے کو اچانک کسی نے گریبان سے پکڑا، یہ ہاتھ اندر سے نمودار ہوا تھا۔ لڑکا ہاتھ جوڑنے لگا۔ وہ اب باقاعدہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ شاید اس کی فریاد پر کان دھرنے کے بجائے اس سیاسی شخصیت نے اس کے ساتھ تضحیک آمیز رویہ اپنا رکھا تھا۔ کار کے اندر براجمان اس شخصیت کی جانب اٹھا ہوا تھا اور انگلی کے اشارے سے وہ چیخ چیخ کر اسے شاید برا بھلا کہہ رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیاسی شخصیت کار کے اندر سے برآمد ہوئی، وہ کوئی نوجوان تھا، کارکنوں نے جو بینرز وغیرہ اٹھا رکھے تھے، اس میں ایک پکی عمر کے ساتھ نوجوان کی تصویریں بنی تھیں، شاید دونوں باپ بیٹا تھے، اور نجانے کتنے عرصے سے موروثی سیاست کا مزہ چکھ رہے تھے۔

باپ ایم این اے تھا، اور بیٹا ایم پی اے۔ وہ اس طاقت کے زعم میں باہر نکلا اور اس مجبور نوجوان کے چہرے پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ میں جو یہ منظر دیکھ کر اندر ہی اندر جل اور سلگ رہا تھا، اس ناانصافی اور بے حسی پر بیٹھا نہ رہ سکا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کے گاڑی سے اترا۔

"کیا کر رہا ہے۔ کاکا! ٹھہر..." مجھے عقب سے اول خیر کی آواز سنائی دی۔ مگر مجھے یہ آواز کب سنائی دی تھی میں جوشِ غیظ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس سیاسی نوسرباز زادے کے ہاتھ کو زور سے جھٹک دیا اور غصے سے بولا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی ہے۔ ایک مجبور انسان کو اس طرح اپنی طاقت کے زعم میں زدوکوب کرتے ہوئے۔ اس کی ماں کار میں جاں بہ لب ہے اور یہ تم سے راستہ مانگنے کی بھیک مانگ رہا ہے۔ تم کیسے عوامی نمائندے ہو؟ تمہارے بینروں پہ عوام کا خادم لکھا ہوا ہے، اور تم عوام کے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہو؟" میری اس دھواں دھار تقریر اور اس کا ہاتھ نوجوان کے گریبان سے جھٹکنے پر وہ سیاسی نوسرباز زادہ ایک لمحے کو دم بہ خود رہ گیا۔ شاید اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کے متوالوں اور سر پھرے کارکنوں کے جھرمٹ کے بیچ اس کے ساتھ اس سلوک کی جرأت کر سکتا ہوں۔ یہ اس کی طاقت کا اور غرور پر میری شدید ضرب تھی۔

کچھ میں بھی اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ کسی بے کس اور بے گناہ معصوم انسان پر کسی طاقت ور کو ظلم کرتے دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور گویا پھر میں دیوانہ وار آتشیں غرور میں کود جایا کرتا تھا، یہاں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

احساسِ تذلیل سے ان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کے جوشیلے کارکنوں کا ایک جتھا میری طرف مشتعل ہو کر بڑھا۔ تو فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا، مشتعل کارکن جہاں کے تہاں رک گئے۔ یہ اول خیر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ فضا میں بلند تھا، ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا، ارشد کے ہاتھ میں بھی پستول تھا، مگر ہم خطرے میں گھرے ہوئے تھے کہیں سے کوئی کارکن اپنی چمچہ گیری کا جوہر دکھانے کے لئے یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا ہوگا، اس خدشے کے پیش نظر میں نے بھی بجلی کی سی پھرتی دکھائی، اور اپنا پسٹل نکال لیا اور شفقت راجا پر جھپٹا۔

اس کی گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں اور میرے پسٹل کی مہیب نال اس کی کنپٹی سے لگی تھی۔

"خبردار! کسی نے کوئی ذرا سی بھی حرکت کی تو... اسے گولی مار دوں گا۔" میں دھاڑا۔ نجانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ میری فطرت کا خاصہ تھا کہ ظلم و مظلومیت کا ایسا منظر مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میری اس حرکت پر گویا دور قریب، سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

"اس کار کو راستہ دو فوراً اندر اس کی بیمار ماں موجود ہے، جلدی... جلدی..."

میں پھر چیخا۔ سیاسی نوسرباز... شفقت راجا چند

تا نے تو مجھے خوں ناک نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے کارکنوں کو وہی حکم دیا جو میں چاہتا تھا... گلٹس کار کو نکلنے کا راستہ دے دیا گیا۔ نوجوان بہت خوش نظر آرہا تھا مگر متفکر بھی تھا شاید اسے میری بھی فکر تھی۔ مگر اس کے پاس مجھ سے بات کرنے کا وقت نہ تھا، وہ نکل گیا۔

مجھے اپنی اس خطرناک حرکت کا اچھی طرح احساس تھا کہ میں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا ہے۔ ایک ذرا موقع کی ہی منتظر ہوں گے یہ لوگ اور پھر شاید ہماری تکا بوٹی کر ڈالتے یہی سبب تھا کہ اول خیر اور ارشد کے چہرے پہ بھی فکرمندی کے آثار تھے۔

''اب ہمیں نکلنے دیا جائے۔ ہٹو آگے سے۔'' کہتے ہوئے میں نے شفقت راجا سمیت دھیرے دھیرے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ مشتعل کارکنوں کی آنکھوں میں اترا ہوا خون میں صاف محسوس کرسکتا تھا۔ گویا وہ ایک ذرا موقع کی تاک میں تھے اور پھر ہم تینوں پر ہی پل پڑتے۔

''راجا صاحب کو تم کہیں نہیں لے جاسکتے۔'' معاً چار پانچ جوشیلے کارکنوں نے میرا راستہ روک لیا۔

''تمہارے راجا صاحب سے کوئی دشمنی نہیں ہے میری۔ اب مجمع سے نکلنے کے بعد ہم تھوڑی دور جاکر انہیں چھوڑ دیں گے۔''

میں نے کہا تو اس بار شفقت راجا خار کھائے لہجے میں بولا۔ ''تم اب نہیں بچ سکتے، تمہیں یہ مہم جوئی بہت مہنگی پڑے گی۔ میرے ساتھی کسی بھی صورت میں مجھے تمہارے ساتھ جانے نہیں دیں گے۔'' اس کے لہجے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ میں نے جو جوا کھیلا تھا وہ مجھے کس قدر مہنگا پڑنے والا تھا مگر میں اس کے جھانسے یا دھمکی میں نہ آیا۔ اور ہاتھ بلند کرکے ایک ہوائی فائر کردیا۔ میرے قریب بڑھنے کی کوشش کرنے والے مذکورہ چار پانچ جوشیلے کارکن پیچھے ہٹ گئے۔

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے راجا صاحب۔'' میں شفقت راجا کی طرف دیکھ کر نفرت خیز لہجے میں دھاڑا۔

''کسی بھول اور کسی نشے میں مت رہنا۔'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اول خیر نے بلند آواز میں شفقت راجا کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ ''راجا صاحب یہ کاکا تمہارے کارکنوں سے زیادہ سرپھرا اور جنونی ہے۔ آپ کو ہم خبردار کرتے ہیں آپ کسی زعم یا طاقت کے نشے میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ یہ پاگل آپ کو بھی گولی مار دے اور خود کو بھی۔ یہ واقعی ایک پاگل نوجوان ہے اور اسے ہم روحانی علاج کے لیے ساہیوال کے چک جھمرہ کے ایک بابا جی کے پاس لے جارہے ہیں۔ ہم آپ کو چھوڑ دیں گے، میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ ہمیں بس خیر خیریت کے ساتھ یہاں سے نکلنے دیا جائے۔''

اول خیر کی چالاکی پر میرا مسکرانے کو جی چاہا۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے پاگل کہہ کر شفقت راجا کو ہی نہیں بلکہ اس کے کارکنوں کو بھی ایک لمحے کے لیے ڈرا سا دیا تھا۔ اول خیر کا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اپنی ساری اکڑفوں بھول کر شفقت راجا نے اپنے مشتعل کارکنوں سے وہی کہا جس کی میں اسے ہدایت دے چکا تھا۔

ہمیں اپنی گاڑی میں سوار ہونے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے سوار ہوتے ہی ارشد نے جیپ آگے بڑھادی۔ ذرا دور جاکر شفقت راجا کو سڑک پر اتار کر ہم فوراً آگے بڑھ گئے۔

''او خیر... کاکا! تیرے ان اچانک دھاکڑ پروگراموں سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ بڑے بُرے پھنس گئے تھے۔''

اول خیر نے ایک گہری سانس لے کر ہنستے ہوئے کہا تو ارشد بھی مسکرا کر بولا۔ ''چھوٹے استاد تیری چالاکی نے بروقت ہمیں بچالیا۔ ورنہ یہ بات وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ شہزی، کسی بھی صورت میں شفقت راجا پر گولی چلانے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''حد ہوگئی ہے بے حسی کی یار! یہ کیسے خود کو عوامی نمائندے کہتے ہیں۔ اس غریب کی ماں کار میں جاں بہ لب پڑی تھی اور بجائے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنے کے وہ راجا مہاراجا صاحب جو خود کو ''آپ کا خادم'' ہونے کے دعوےٰ کرتے ہیں۔ الٹا اس نوجوان کے ساتھ تضحیک آمیز برتاؤ کرتا ہے۔ لعنت ہے ایسے جھوٹے دوغلے سیاست دانوں پر۔''

ہمارا سفر اس ناخوشگوار واقعے کے بعد ایک بار دوبارہ خیر خیریت کے ساتھ جاری تھا۔

جب ہم ساہیوال سے آگے نکل گئے اور چک کے قریب سے گزرنے لگے تو اچانک گاڑی چلاتے ہوئے ارشد نے ایک سنسنی خیز اعلان کیا۔

''شاید ہمارا تعاقب کیا جارہا ہے۔'' اس اطلاع پر میں نے اور اول خیر نے چونک کر عقب میں مڑ کر دیکھا۔ دو

گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھیں۔

''اوئے ارشد! گاڑی دوڑا۔'' اول خیر نے اسے ہدایت کی۔ ارشد نے فوراً گاڑی کو ڈبل ٹاپ گیئر میں ڈالا اور اس کی رفتار طوفانی حد تک بڑھادی۔ اول خیر نے اپنا پستول نکال لیا اور ہاتھ میں پکڑ کر گاڑی کے بالکل پچھلے حصے میں چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، عقبی اسکرین سے میں نے پیچھے کو تیزی سے بھاگتی سڑک کے سامنے نظریں جمادیں۔ ایک پجیرو طوفانی رفتار سے ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آرہی تھی۔ مجھے دونوں گاڑیوں میں خاصی تعداد میں آدمی بیٹھے نظر آرہے تھے۔ یقیناً یہ مسلح بھی تھے۔

مضافاتی سڑک تھی، اور خاصی حد تک ویران بھی وہ ہماری گاڑی کے قریب پہنچتے ہی ہم پر اندھادھند فائرنگ بھی کرسکتے تھے، ہم ایک اہم مشن پر تھے، اس نئی مصیبت میں پڑنے کے بالکل متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

''اوئے ارشد! گڈی دوڑا۔ ذرا دھیان سے، کوئی گشتی پولیس کی گاڑی نہ پیچھے پڑجائے۔''

''بے فکر رہو استاد! میں ایک طرف موڑ کاٹنے والا ہوں ان کو جل دینے کے لیے۔''

''او خیر کاکا! جلدی کر پھر۔'' اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

دفعتاً گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے اپنا توازن سنبھالنے کے لیے میں نے اور اول خیر نے خود کو سنبھالا، گاڑی نے ایک تنگ موڑ کاٹا تھا پھر نشیب میں اتر گئی۔ تھوڑی دیر تک زبردست ہچکولے کھاتی رہی۔ اس کے بعد شاید کسی نیم پختہ سے کچے راستے پر آگئی تھی۔ اب گاڑی کم ہچکولے کھا رہی تھی، مگر ایک بدقسمتی آڑے آگئی۔ دھماکے کی آواز سے ٹائر برسٹ ہوگیا۔ یہ خطرناک صورت حال تھی، راجا کے کارکن ہمارے تعاقب میں تھے، اب پتا نہیں ارشد نے گاڑی کو موڑتے وقت کس قدر پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کیا ہوگا کہ ہم ان کی نظروں کے تعاقب سے بچے تھے یا نہیں، تاہم ٹائر برسٹ ہوتے ہی ارشد نے فوراً گاڑی کو بریک لگادیے تھے، کچے راستے پر ہونے کے باعث گاڑی جلدی جام ہوگئی۔

گردوغبار کے بگولے نے ہمیں تھوڑی دیر تک گھیرے میں لیے رکھا، پھر ہم گاڑی سے اتر آئے، ہمارے عقب میں تقریباً چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ملتان روڈ نظر آرہا تھا۔

''شاید وہ آگے نکل گئے ہیں۔'' اول خیر نے کہا۔ پھر ہم نے گاڑی کا جائزہ لیا۔ پچھلا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ فاضل ٹائر گاڑی میں موجود تھا۔ ارشد فوراً ٹائر بدلنے کے لیے حرکت میں آگیا۔ میں اور اول خیر گردوپیش کا جائزہ لینے لگے، یہ بنجر علاقہ تھا۔ اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ جس کچے اور قدرے نشیبی راستے پر ہم اس وقت موجود تھے، یہ آگے کھیتوں کے درمیان جاکر گم ہورہا تھا۔ آگے کوئی گاؤں تھا۔

شام اترنے لگی تھی، دور پرے کچھ دیہاتی لوگ نظر آئے تھے، جو پیدل بھی تھے اور بیل گاڑیوں پر بھی۔ ہمارے عقب میں کنڈیارو کی قدِآدم جھاڑیوں کے بڑے بڑے ڈھینگر پھیلے ہوئے تھے، بائیں جانب ایک کچا کنواں بھی نظر آتا تھا۔

ارشد تیزی سے اپنا کام نمٹانے میں مگن تھا، وقت بچانے کی خاطر اول خیر بھی اس کی مدد میں شامل تھا۔ جبکہ مجھے اول خیر نے گردوپیش پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی تھی اور میں اس وقت وہی کام کررہا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد جیسے ہی ارشد نے اپنا کام نمٹایا... اچانک گھنے ڈھینگرو کے عقب سے آتی ایک آواز پر میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ کسی گاڑی کی آواز تھی، جو ہاتھ جھاڑتے ہوئے اول خیر اور ارشد نے بھی سن لی تھی۔ ہم تینوں نے فوراً پستول نکال لیے، پھر وہ سب کچھ آناً فاناً ہی ہوا تھا، جس کی ہمیں بعید ترین توقع تھی۔ وہی دو گاڑیاں ڈھینگرو کے عقب سے نمودار ہوکر ہمارے بالکل قریب آکر ایک جھٹکے سے رک گئیں، سب سے پہلے پجیرو سے پانچ چھ مسلح افراد اترے۔

ہمیں گھیر لیا گیا اور ناچار ہمیں اپنے محدود اسلحے سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شکر تھا ابھی انہوں نے ہم پر سیدھے فائر نہیں کیے تھے جس کا مطلب تھا سردست یہ ہمیں ہلاک کرنے کے موڈ میں نہ تھے۔

یہ بات شک وشبے سے بالاتر تھی کہ یہ لوگ شفقت راجا کے ہی کارندے ہوسکتے تھے جو ہمارے تعاقب میں تھے اور کافی ہوشیار اور بیدار دماغ ثابت ہوئے تھے۔

''خبردار! کوئی غلطی نہ کرنا، ورنہ تم تینوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔'' ان میں سے ایک لمبا تڑنگا آدمی گرجا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اول خیر نے پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو اور ہماری تم سے کیا دشمنی ہے؟''

''بکواس بند کرو۔ چلو گاڑی میں بیٹھو اپنی۔'' وہ آدمی اول خیر کو گھورتے ہوئے گرجا۔ پھر اس کے چار پانچ مسلح

آدمیوں نے ہمیں گنوں کی نال سے ٹھونکتے ہوئے گاڑی میں سوار کرادیا۔ ہماری گاڑی اب ان کے قبضے میں تھی مگر یہ واقعی شفقت راجا کے آدمی تھے...... مجھ سمیت ہم تینوں کا شبہ بڑا قوی تھا یقینی طور پر صورتِ حال گمبھیر ہونے کا ہم تصور کر سکتے تھے۔

ہمیں اپنی ہی گاڑی میں لاد کر یہ لوگ مخالف سمت روانہ ہوگئے اور ملتان روڈ پر آگئے۔ میرے اندر دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی، اول خیر اور ارشد بھی اس نئی خراب صورتِ حال پر پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے۔ اپنے مقصد کی منزل کے قریب پہنچ کر بلا وجہ کی قلم ہمارے گلے پڑگئی تھی۔ تینوں گاڑیاں یکساں رفتار کے ساتھ آگے پیچھے دوڑتی ہوئیں ٹھیک اس مقام سے بائیں جانب کچے میں اتر گئیں جہاں ہمارا.... ..... شفقت راجا کے سیاسی اجتماع سے واسطہ پڑا تھا۔

یقین تو پہلے ہی تھا، اب تصدیق بھی ہوگئی تھی کہ یہ لوگ اسی کے ہی آدمی تھے۔ کینہ پرور شفقت راجا اپنی تضحیک نہیں بھولا تھا اور ہمارے نکلتے ہی اس نے اپنے آدمی ہمارے تعاقب میں دوڑا دیے تھے۔ باقی مجمع یا اس سیاسی اجتماع کے شرکاء وغیرہ تھوڑی دور سامنے ایک کچے کے ایک میدان میں نظر آرہے تھے، مگر تینوں گاڑیاں ملتان روڈ سے بائیں جانب ایک نسبتاً چھوٹی ذیلی سڑک پر موڑلی گئیں یہ چک نواں کا علاقہ تھا اور قدرے مضافاتی بھی۔ یہ لوگ وہیں ہمیں لے جارہے تھے۔ ہمارا خیال درست نکلا۔ تینوں گاڑیاں اس ذیلی سڑک پر تیز رفتاری سے فاصلے پاٹتی ہوئیں قریب کوئی چار پانچ کلومیٹر کے بعد دائیں جانب مڑگئیں یہاں جابجا پختہ نیم پختہ مکانات اور گھر نظر آرہے تھے۔ ڈیرا نما وہ پُرشکوہ عمارت یہاں سے ایک چھوٹے دریا کی شاخ پر سے گزرنے کے بعد دکھائی دے گئی۔ جہاں یہ تینوں گاڑیاں روک دی گئیں۔ یہ قرمزی پتھروں سے بنی مستطیل نما عمارت تھی۔ حویلی نما مکان کا رقبہ وسیع عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مکان کے برابر میں چھپر نما سائبان نظر آرہے تھے کچھ لوگ نقشین پایوں والی چارپائیوں پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے نظر آئے، بھینسیں بندھی ہوئی تھیں، دو تین شکاری کتے بھی بندھے نظر آرہے تھے۔ گاڑیاں رکتے ہی گڑگڑی جائے... چند افراد تیزی کے ساتھ ہماری طرف بڑھے۔

ہمیں گاڑی سے اتارا گیا اور ایک بیٹھک قسم کے بلند چھت والے کمرے میں لے آئے۔ یہاں سرکنڈوں کے بنے مونڈھے پڑے تھے دو چار..... موٹ نقشین پایوں والی خالی چارپائیاں بھی بچھی نظر آئیں، ہم تینوں کو ایک چارپائی پر محدود کرکے بٹھادیا گیا۔ اول خیر نے ان سے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''او بادشاؤ! گل ختم کرو ہمیں جانے دو ہم ایک ضروری کام سے جارہے ہیں۔ اس کاکے کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔'' اول خیر کی بات پر ان دس بارہ مسلح افراد کو لیڈ کرنے والا شخص غصیلی نظروں سے اول خیر کی طرف گھورنے لگا پھر تند لہجے میں بولا۔

''اپنے اس کاکے کو تمہیں پٹا ڈال کر رکھنا چاہیے تھا۔ کیوں کھلا چھوڑا ہے اسے تمہارا فیصلہ اب راجا صاحب ہی کریں گے۔''

''راجا صاحب'' کو ان لوگوں نے راستے میں ہی سیل فون پر مطلع کردیا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکے تھے وہ بھی شاید وہاں پہنچنے والا تھا۔ شاید اپنا خطاب اور عوامی خدمت کا، بڑے بڑے جھوٹے دعوے کرنے کے بعد... اسے یہیں آنا تھا۔

تھوڑی دیر گزری اور باہر گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ بیٹھک کا کھلا دروازہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، اور باہر کا مقدور بھر منظر بھی۔ وہیں ہم نے دو سیاہ رنگ کی ہنڈا اسٹی کو رکتے دیکھا تھا۔ پھر فوراً شفقت راجا کو بھی جس کا چہرہ غصے سے ہنوز مسخ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہمراہ دو تین مسلح محافظ بھی تھے۔ وہ طیش کے مارے پھونکتا ہوا اندر داخل ہوا اور آتے ہی سیدھا میری جانب بڑھا اور خونخوار سی نظروں سے گھورتا ہوا اس نے مجھے تھپڑ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اول خیر نے جو دانستہ میرے قریب ہوکر بیٹھا تھا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا تھپڑ میرے چہرے تک پہنچنے سے پہلے روک لیا اور خوں ناک غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''ہتھ ہولا رکھ۔ نوجوان! جو بات کرنی ہے زبان سے کر۔ ہم غلطی پر نہیں ہیں مگر پھر بھی قصہ مکانے کے لیے معافی مانگنے کو تیار ہیں۔ باقی میدان کھلا ہے ہم آپ کے قبضے میں ہیں، ہاتھ کی ریت رکھو یا زبان کی۔'' کہتے ہوئے اول خیر نے شفقت راجا کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

اس کے ایک مسلح کارندے نے اول خیر کی اس جرأت پر جارحانہ پیش قدمی کرنا چاہی... مگر راجا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

اول خیر کے لہجے یا اس کی بات نے راجا کو شاید کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کر وہ اب اس سے مخاطب ہوکے بولا۔

''تم کس کے آدمی ہو؟ اور کون ہو؟''

بات شاید دوسرے رخ پہ جارہی تھی، میں بغور یہ سب سن رہا تھا۔ اول خیر نے جواباً مسکرا کر یار باش سے لہجے میں کہا۔

''او شہزادو! آرام نال بے جاؤ۔ ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، بس یہ کاکا ذرا پاگل سا ہے۔ اس کے بارے میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔''

''معافی کس بات کی... اول خیر؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔ نہ ہی میں اس نوجوان کو جانتا تھا۔ بس مجھے اس پر ترس آیا اس کی ماں بیمار تھی ان کا فرض بنتا تھا انسانیت کے ناتے یہ لوگ اسے جانے کے لیے نہ صرف راستہ دیتے بلکہ اس کی مدد کی بھی کوشش کرتے۔ یہ تو خود کو عوام کا خادم ان کا نمائندہ کہتے ہیں۔''

میں نے آخر میں شفقت راجا کی طرف دیکھ کر یہ کہا تھا۔ اول خیر میری تقریر سے پھر پریشان آنے لگا۔ کیونکہ اس کے بعد شفقت کے تیور پھر بگڑنے لگے تھے، میری طرف غصے سے گھورتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''اوئے۔ اس کا دماغ تو ابھی تک آسمان سے نہیں اترا اس کو ابھی اور اسی وقت سبق سکھاؤ اس کے سر کے بال مونچھیں حتیٰ کہ بھنویں بھی منڈھ دو۔ جوتوں کا ہار گلے میں پہنا کر اسی وقت گدھے پر سوار کروا کر اسے مجمع میں لے کر آؤ تاکہ لوگ دیکھ کر عبرت پکڑیں کہ شفقت راجا کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے اور اس پر پستول تاننے والے آدمی کا ہم کیا حشر کرتے ہیں۔''

اس کی یاوہ گوئی پر میں ہی نہیں اول خیر بھی بری طرح بھڑک گیا۔

''راجا صاحب! اس طرح کے جھگڑے ہمارے گھر کی بھی لونڈی ہوتے ہیں آج آپ کی باری ہے کل ہماری ہوگی۔ ٹھیک ہے پھر ہم ہتھیار ڈالتے ہیں۔ اور خود کو آپ کے حوالے کردیتے ہیں آپ کو اجازت ہے کہ آپ جو چاہے ہمارے ساتھ سلوک کرو کیوں کہ اس وقت آپ اپنے ڈیرے پر موجود ہو۔ اپنے آدمیوں کی فوج سمیت۔ اب ایک نہیں تین گدھے لانا اس کاکا کے ساتھ ہم دونوں بھی اپنی مونچھیں اور بھویں منڈوانے کے لیے تیار ہیں۔'' اول خیر نے ارشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شفقت راجا سے نہایت جوشیلے لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ اول خیر جب بھی کچھ بولتا بہت جچے تلے لب و لہجے میں بولتا تھا۔ جس کا اثر شفقت راجا پر ہوتا تھا۔ یہ بات بھی اس کی جو ایک خوفناک تہدید میں چھپی ہوئی تھی، شفقت راجا کے غم و غصے سے غرورِ طاقت کو متزلزل کرتی نظر آئی تھی۔

''ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ ویسے سے بھی ہم ایسی دشمنی کی نوبت ہی نہیں آنے دیں گے۔ اس وقت تم تینوں کو جان سے مار کر تمہاری لاشیں ویران کھڈ میں پھینک دیں گے۔''

''او خیرا!'' اول خیر اس کی طرف دیکھ کر بڑے...... اطمینان سے مسکرا کر بولا۔ ''ہم تمہارے قبضے میں ہیں جو چاہے سلوک کرو۔''

''تم دونوں کو جانے کی اجازت ہے۔ مگر اس نوجوان کو یہاں چھوڑنا ہوگا۔'' اس بار شفقت راجا نے جو بہ غور میری طرف خاصی دیر سے پُرسوچ نظروں کے ساتھ گھورے جارہا تھا، بولا۔

''مگر کیوں؟'' اول خیر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میں اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔'' شفقت دانت پیس کر بولا۔

''آپ کیا کرو گے اس کے ساتھ؟'' اول خیر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی کریں گے جو تمہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا گیا ہے۔'' کہتے ہوئے شفقت راجا نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو پکار کے تحکمانہ کہا۔

''اوئے، فوراً پھتو نائی کو لے کر آؤ۔ اور ایک گدھے اور جوتوں کے ہار کا بندوبست کرو۔''

میرے دل و دماغ میں خوناک زلزلے نے سر ابھارا، سرخ غبار سا میری آنکھوں کے آگے چھانے لگا۔ تذلیل سے قبل ہی احساس تذلیل نے میری یہ حالت کردی تھی تو بعد میں کیا ہوتا، آنے والے طوفان کا تو اول خیر کو بھی اندازہ ہوتا۔

شفقت راجا کے حکم پر دو آدمی فوراً حرکت میں آئے اور پیچھے کو پلٹ گئے۔

اچانک ایک کارندے نے آکر شفقت راجا کے کان میں کچھ کہا۔ میری سلگتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میرا وجود جوار بھاٹے کی زد میں تھا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے؟ اس مردود کو انہیں یہاں لانے کا کس نے کہا تھا؟'' اپنے کارندے کی بات پر شفقت راجا غصیلے پن سے بولا۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک ٹھگنے قد کا سیاہ رو شخص اندر داخل ہوا وہ پکی عمر کا تھا۔ کڑھائی دار کرتہ اور شلوار پہن رکھی تھی، بائیں کان کی لو

سے چاندی کی بالی چمک رہی تھی، آنکھیں گاڑھی تھیں اور ان میں مخصوص چمک مترشح تھی۔ اسے دیکھتے ہی انتہائی کمینے انسان کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ اس کے کاندھے پر بڑا سا رومال نما کپڑا تھا۔ الٹے ہاتھ کی انگلیوں میں دو تین موٹے موٹے نگوں والی چاندی آنگوٹھیاں تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا جس کی مٹھی بنا کر اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش بھی لیا اور شفقت راجا کی طرف دیکھ کر بڑی خباثت سے مسکرایا۔

''راجا صاحب چنی بائی کا سلام قبول ہو... دام لینے آیا تھا۔''

''چنی بائی'' کا نام سے یکدم میری آتش فشانی کیفیت بدلنے لگی، پورا یقین تھا مجھے کہ اس نام پر ضرور اول خیر اور ارشد بھی اندر سے چونکے ہوں گے۔ یہ چنی بائی ہی تو تھی جس کے اڈے پر شب خون مارنے کے لیے ہم ملتان سے یہاں خاک چھانتے ہوئے آئے تھے۔

میں نے دیکھا شفقت راجا کو اس آدمی کی آمد اس وقت انتہائی ناگوار گزری تھی۔

''تم سے کتنی بار کہا ہے فون پر رابطہ کر کے آیا کرو ہم سے ملنے کے لیے۔'' شفقت راجا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور کر کہا تو اس مخصوص حلیے والے آدمی کے چہرے کی ...... کمینی مسکراہٹ یکلخت سرد مہری میں بدل گئی۔ وہ اسی لہجے میں جواباً بولا۔

''یہ بھی خوب کہی راجا صاحب آپ نے... آپ سے رابطہ کرو تو آپ سیل فون اپنا آف کر دیتے ہیں خود ملنے آؤ تو...''

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' شفقت راجا نے اس کی بات کاٹ کر برہمی سے کہا۔ تو وہ شخص بھی غالباً اپنی اوقات پر اتر آیا۔

''راجا صاحب۔ اس طرح نہیں چلے گا۔ آج میں اپنی پے منٹ لے کر ہی جاؤں گا چنی بائی نے مجھے سختی سے یہ حکم دے کر بھیجا ہے۔ دام دو یا ''دانے'' واپس لے کر آؤ۔''

ان کی بحث نے ہمارے اندر دھکڑ پکڑ مچا رکھی تھی۔ راجا نے انتہائی خونخوار نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھا اور الٹے ہاتھ کا زور دار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ بلند چھت والے کمرے تلے دم بہ خود ماحول میں ''چٹاخ'' کی آواز ابھری تھی، تھپڑ زوردار ثابت ہوتا تھا۔ جس کے باعث وہ آدمی چند تمام پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت شفقت راجا کے موجود مسلح کارندوں نے اس آدمی پر اپنی گنیں تن لیں اور خوں ناک نظروں سے گھورنے لگے، میں نے اس مضروب آدمی کے چہرے اور اس کی چندی چندی آنکھوں سے مترشح ہوتی اس چمک کو نمایاں طور پر محسوس کیا تھا، جن میں نفرت و بغض کا طوفان بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے راجا شفقت سے صرف اس قدر بولا۔

''مجھے جانے کی اجازت ہے راجا صاحب؟'' ان نے زہریلے لہجے میں صرف اتنا پوچھا۔

پھر نجانے کیا ہوا۔ اس چھت تلے ایک ہولناک اور خونی ڈراما محض ایک اشارے پہ ہی کھیلا گیا۔ ایک کارندہ لپک کر مضروب آدمی کے سامنے اچھل کر نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں گراری دار چاقو تھا، جسے کھولنے میں اس نے صرف ایک پل ہی ضائع کیا ہوگا، اور دوسرے ہی لمحے اس نے چاقو کا مہیب پھل نہایت بے رحمی سے اس آدمی کے قدرے نکلے ہوئے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ''اوخ'' کی کرب ناک آواز اس آدمی کے حلق سے نمودار ہوئی تھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگے کو جھکا... ناقابلِ برداشت اذیت کے آثار اس کے چہرے کو مزید مکروہ بنا گئے... اور منہ سے خون اگلتا ہوا وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر کے ٹھنڈا ہو گیا۔

''نمٹاؤ اس حرام زادے کو اب اچھی طرح سے۔'' شفقت راجا نے سنگ دلی سے حکم دیا۔

''راجا صاحب! اب ان تینوں کو بھی نمٹانا پڑے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہی ہیں۔'' ایک کارندے نے ہماری طرف جلاد صفت نظروں سے تکتے ہوئے شفقت راجا کو مشورہ دیا۔

''ختم کر دو ان تینوں کو بھی...'' شفقت راجا شدتِ جنوں سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ شاید کوئی خطرناک نفسیاتی مریض ہی معلوم ہوتا تھا۔

یکلخت کئی مہیب گنوں کا رخ ہم تینوں کی طرف اٹھا... اور فضا گولیوں کی خوں رنگ بوچھاڑ سے لرز اٹھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ٹونی گبریل نے بس سے باہر قدم رکھا... طویل سفر کے باعث اس کے جوڑ اکڑ گئے تھے... اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ بس کے ماحول کے برعکس فلوریڈا کی کھلی فضا فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ لگیج کمپارٹمنٹ سے اس نے اپنا سفری بیگ وصول کیا اور دو سو میل کی سفری تھکان دور کرنے کے لیے ہوٹل کا رخ کیا۔ رات جوان ہو رہی تھی۔ اس کے پاس ''ملی'' کو تلاش کرنے کے لیے دو گھنٹے تھے۔

☆☆☆

ٹونی کو جو کمرا ملا، وہ پُرتعیش تو نہ تھا تاہم صاف ستھرا تھا۔ اس نے کمرے کا موازنہ پچھلے ہوٹل کے کمرے سے کیا۔ اس کے مقابلے میں یہ کمرا اسے کافی بہتر لگا۔

سب سے پہلے اس نے گرم پانی سے غسل کیا تو تھکے ہوئے بدن کو راحت کا احساس ہوا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے کبھی مکمل آرام نصیب نہیں ہوگا۔

اسے اب تک مکمل آگاہی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ خود اپنا ''باس'' ہے۔ وہ کسی کا پابند نہیں تھا۔ اپنے فیصلے خود کرتا تھا۔ وہ ایسی راہ پر چل پڑا تھا جہاں موت اور لاقانونیت کا راج تھا۔ جب کوئی گولی اس کے کان کے پاس سے گزر کر کسی بدقسمت کو چاٹ جاتی تو ٹونی اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک تھا وہی کرتا جو اس کا دل کہتا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی ٹارگٹ تھا۔ گزرتے ہوئے بدتر دنوں میں اس ٹارگٹ نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا۔

ٹونی نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تو وہ کسی بھوت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے کام سے گہری وابستگی رکھتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل نہیں کر پاتے تھے... موت اتنی طاقتور نہیں تھی کہ ٹونی کے اندر کی ناقابلِ فہم آگ کو بجھا سکتی۔ اس نے اپنی پکچر خود ہی پینٹ کی تھی... جو ایسے بھوت کی طرح تھی جو اپنی دھن کا پکا تھا۔

ایک عجیب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی... شاید وہ کچھ بھول گیا تھا لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیا بھول چکا ہے۔

☆☆☆

علاقے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ماحول بدل جاتا ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ زندگی کے اہم ساتھی جو وفادار ہوتے

ذہن میں چبھن کا باعث بننے والی ایک انوکھے ذائقے کی منفرد کہانی...

مزاج کی آوارگی اور بے یقینی ہمیشہ خسارے کے سودے میں الجھائے رکھتی ہے... ایک ایسے ہی ضدی اور سرکش کی بے اعتدالیاں... جسے ہر پل ایک نئے جسم و جاں کی تلاش سرگرداں و بے قرار رکھتی تھی...

تلاشِ پیہم

بابر نعیم

ہیں... انہیں نہیں بدلنا چاہیے اور ملی بدل گئی تھی... کیوں؟

ٹونی کو پتا چل گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ملی کے خطوط آنا بند ہو گئے تھے۔ بالآخر ایک خط آیا بھی تو وہ ملی کے بجائے اس کے وکیل کا تھا۔

طلاق کے کاغذات کی سیاہی خشک ہونے سے قبل ملی نے دوسری شادی رچالی۔ ٹونی سب جانتا تھا، تاہم اسے پتا نہیں تھا کہ ملی نے کس سے شادی کی ہے؟ لیکن وہ یہ شرط لگانے کے لیے تیار تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا ایک دولت مند شخص تھا...

ٹونی کی شادی ملی سے ہوئی تھی تو اس وقت دونوں کے پاس محض پچاس ڈالرز تھے۔ ملی نے سمجھا کہ یہ وقتی بحران ہے۔ تاہم جلد ہی رومانی جذبات ٹھنڈے ہونے لگے۔ ملی کی ٹائپ اور طرح کی تھی۔ ملی کے والدین نے ایک پُرآسائش زندگی گزاری تھی۔ فطرتاً وہ بھی ایک پُرآسائش زندگی کی خواہاں تھی۔

شادی کی پہلی سالگرہ پر ٹونی کو یقین کرنا پڑا کہ ملی والدین کے پاس واپس جانا چاہتی ہے۔ اسے جنگ میں حصہ نہ لینا پڑتا تب بھی وہ جانتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی خطرے سے دوچار ہو چکی ہے۔

☆☆☆

جنگ کے بعد ٹونی نے ایک حسین اور سبک اندام لڑکی کو ڈھونڈ ہی لیا اس لڑکی کا شوہر واقعی ایک متمول شخص تھا اور ٹونی کی دانست میں وہ لڑکی ملی ہی تھی۔

وقت ضائع کرنا بے معنی تھا۔ ٹونی اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ وہ "ملی" کے نئے گھر تک پہنچ گیا۔ یہ ایک عالیشان عمارت تھی۔ تاہم اپنا مخصوص مشن مکمل کرنے کے لیے اسے حالات سازگار نظر نہیں آئے۔ چنانچہ وہ واپس ہوٹل آ گیا۔ بات اگلے روز پر چلی گئی۔ اگلی رات سازگار تھی... ملی کا نیا گھر کئی لاکھ ڈالر مالیت کا تھا۔ ٹونی گھر کے بہت قریب تھا جب اس نے ملی کو دیکھا۔ ملی اسے نہیں دیکھ سکی تھی اور وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ ہوشیار ہو جائے۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ ٹونی عجلت میں کام خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلے بھی اس نے کبھی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

ٹونی سات روز تک متواتر اس کی نگرانی کرتا رہا...

ملی روز اسے بیش قیمت لباس میں دکھائی دیتی۔ ٹونی سے شادی کے وقت اسے ایسا لباس میسر نہیں تھا۔ اس کا حسن اور جسمانی خدوخال میں بھی نئی شادابی دکھائی دیتی تھی۔

وہ اس کی تھی... وہی ملی اب پہلے سے بہت بدل چکی تھی۔ ایک ہفتے کے دوران میں اسے کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔ یہ اچھی بات تھی۔

ٹونی حیران تھا کہ ملاقات ہونے پر ملی کا ردِعمل کیا ہوگا؟ وہ چلانا شروع کر دے گی؟ یا کچھ اور...

وہ صبر و سکون سے مناسب موقع کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس کے پاس بہت وقت تھا اور وہ کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار ٹونی نے ملی کو تیراکی کرتے دیکھا۔

پھر ایک شام وہ سنیما میں ملی کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ فلم دیکھ رہی تھی اور ٹونی ملی کو دیکھ رہا تھا۔ ملی کا شوہر علاقے سے دور تھا۔

ٹونی نے اس کے شوہر کو رخصت ہوتے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا۔ ملی نے اسے گلے لگ کر رخصت کیا تھا۔ ٹونی نے دیکھا کہ اس کا شوہر موٹا اور تقریباً پچاس برس کا تھا۔ ٹونی کو احساس ہوا کہ یقیناً دولت ہی ملی کی ترجیح تھی۔

☆☆☆

دوسرا ہفتہ ختم ہونے والا تھا۔ ٹونی ایکشن میں آ گیا۔ بھیگی بھیگی شب میں چاند پورا روشن تھا۔ ملی نے سنہری رنگ کی بکنی پہنی ہوئی تھی اور اندرونی رہائش سے نکل کر سوئمنگ پول کی جانب جا رہی تھی۔

ٹونی بہ آسانی نظروں میں آئے بغیر عمارت میں داخل ہو چکا تھا۔ ملی عریاں ٹانگیں پانی میں ڈال کر ہلا رہی تھی۔ اس کی نگاہ پول کی تہ کو کھنگال رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ عقب میں فرش پر ٹکے ہوئے تھے۔

ٹونی بلی کی طرح اس کے عقب میں آ گیا۔

"ہیلو ملی۔" اس نے دھیمے اور سرد لہجے میں کہا اور اس کو شانوں سے پکڑ لیا۔ ملی کے سر پر جیسے بم پھٹ پڑا۔ پیشتر اس کے کہ ملی کوئی ردِعمل پیش کرتی... ٹونی اسے لیے ہوئے پانی میں جا گرا۔

وہ دیوانگی کے عالم میں جدوجہد کر رہی تھی لیکن ٹونی کے تجربے کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ ٹونی اپنے کام میں ماہر تھا۔ وہ پول سے باہر نکلا تو ملی کا سنہرا بے جان لاشہ پانی میں اوندھا تیر رہا تھا۔

☆☆☆

ٹونی گبریل نے بس سے باہر قدم رکھا۔ طویل سفر کے باعث اس کے جوڑ اکڑ گئے تھے... اگست کی گرم رات تھی، نو بج رہے تھے۔ بس کے ماحول کے برعکس ٹیکساس کی کھلی فضا فرحت بخش تھی۔ لگیج کمپارٹمنٹ سے اس نے اپنا سفری بیگ وصول کیا اور سفر کی تھکان دور کرنے کے لیے ہوٹل کا رخ کیا... رات جوان ہو رہی تھی۔ اس کے پاس ایک نئی ملی کو تلاش کرنے کے لیے ایک دو گھنٹے تھے۔

بڑی اور مہذب کہلانے والی اقوام کے نظریات اور حقیقت کے گمبھیر تضادات عیاں کر دیتے ہیں کہ اس معاشرے میں امیر اور غریب کے درمیان کیا رقابت چل رہی ہے... انقلابات اور جنگوں کا خراج ہمیشہ عورتوں کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے... احساسات و خواہشات کے بھنور میں حائل شکست و فتح کے فاصلوں اور فیصلوں کی گھڑیوں کا حساب دیتی کہانی...

سلگاتے... بھڑکاتے اور دلوں کو کچل دینے والے اعمال کی دردسری...

انتظام

جمال دستی
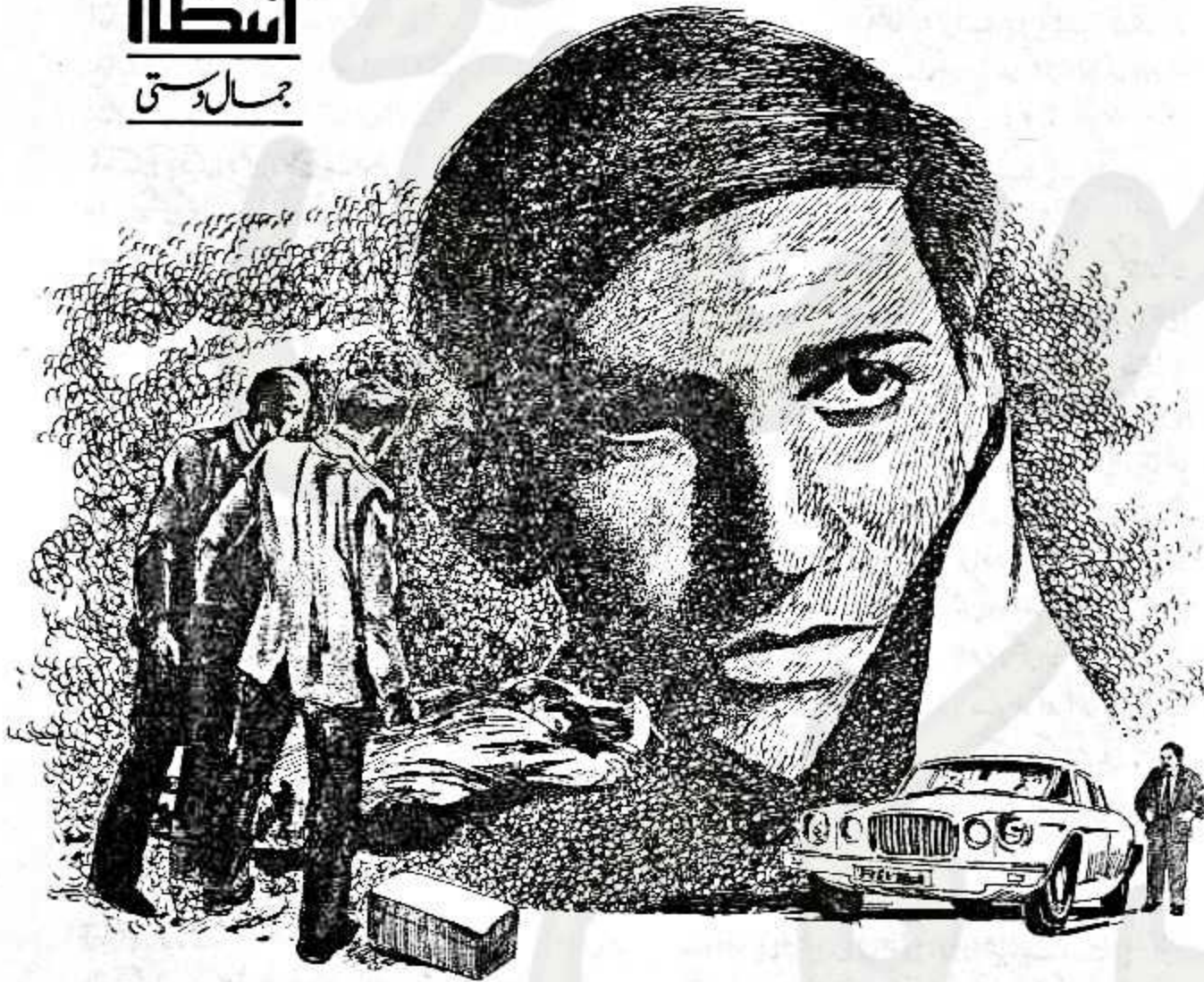
وہ گاؤں ایک ایسے پرانے ڈھانچے کی طرح لگ رہا تھا جسے نئے کپڑے پہنا دیے گئے ہوں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ عمارتوں کے بیرونی حصے کو پلاستر کر کے اس پر رنگ برنگے نیون سائن لگا دیے گئے ہیں جن پر بدیسی زبان میں خوشنما الفاظ لکھ کر گاہکوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر فیشن ایبل اور نوجوان مرد چہل قدمی کر رہے تھے اور انہیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں وہ اپنی شام گزار سکیں۔ ان میں سے شاید

کوئی بھی اس گاؤں کے ماضی سے واقف نہیں تھا۔ اس گاؤں کا نام یونگ جوگول تھا اور یہ دارالحکومت سیئول سے بیس میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔

سیاہ سیڈان کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے رویانگ یوک نے کھڑکی کے شیشے سے باہر نگاہ ڈالی۔ سڑک کے کنارے دور تک دکانوں، چائے خانوں اور شراب خانوں کی قطار نظر آرہی تھی لیکن وہ ان کی ظاہری چمک دمک اور آرائش سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے عقب میں وہی پرانے طرز کی بوسیدہ عمارتیں ہیں جنہیں وہ اپنی جوانی کے دنوں میں دیکھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ان عمارتوں پر آویزاں سائن بورڈز پر وہی پرانے طرز کے نام لکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ڈریگون نائٹ کلب، بٹرفلائی بار اور ماماسین ہاؤس وغیرہ وغیرہ۔ فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرنے والے بھی کوریائی باشندے نہیں تھے۔ ان میں اکثریت امریکی سپاہیوں کی تھی جو قرب وجوار کے فوجی کیمپوں سے خریداری کا بہانہ بنا کر آئے تھے۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کم کرلی تھی اور رویانگ کی نظریں کسی ایسے سنگِ میل کو ڈھونڈ رہی تھیں جس کے ذریعے وہ منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ چند لمحوں بعد وہ ایک چوک پر پہنچے جہاں سے ایک راستہ دائیں جانب جاتا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”یہاں سے موڑلو۔“

اسے وہ چوک اچھی طرح یاد تھا۔ یہاں ہمیشہ ٹریفک پولیس کا سپاہی ایک اونچے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر ٹریفک کنٹرول کیا کرتا تھا۔ دھوپ، بارش اور آندھی طوفان میں بھی وہ اپنے فرائض انجام دیا کرتا۔ اس زمانے میں یہاں سے گزرنے والا ٹریفک تین پہیوں والے ٹریکٹر، ٹیکسی یا فوجی ٹرکوں پر مشتمل ہوتا تھا لیکن اب سپاہی کی جگہ ٹریفک سگنل نے لے لی تھی۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد اس نے ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا اور خود گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ اس نے اپنے قیمتی اوورکوٹ کے بٹن بند کرلیے اور اندھیرے میں قرب وجوار کا جائزہ لینے لگا۔ اسی دوران میں ایک دبلا پتلا لیکن مضبوط شخص اس کے قریب آگیا۔ یہ تاج تھا جو ڈرائیور کے علاوہ اس کے محافظ کے طور پر بھی فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اس نے تاج کو اپنی بنگلہ دیش کی فیکٹریوں کے ہزاروں ورکرز میں سے منتخب کیا تھا۔ تاج نے کہا۔

”کیا تم اکیلے ہی وہاں جاؤ گے؟“

”ہاں۔“ رویانگ نے جواب دیا۔ ”وہ میرا انتظار کررہے ہوں گے۔“

”کیا تم ان لوگوں پر بھروسا کرسکتے ہو؟“

رویانگ نے مڑ کر اپنے باڈی گارڈ کو دیکھا۔ وہ وفادار ہونے کے ساتھ اپنے کام میں بھی ماہر تھا لیکن اس کی سوچ محدود تھی۔ ”انہیں پیسے چاہئیں اور ایسے معاملات میں ایک دوسرے پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔“

رویانگ نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کیے اور گلی کی جانب چل دیا۔ دس گز جانے کے بعد اسے روشنی نظر آئی۔ وہ اس جانب مڑ گیا۔ وہاں ایک شخص گیٹ کے ساتھ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے رویانگ کے قدموں کی آواز سنی تو سگریٹ پھینک کر سیدھا کھڑا ہوگیا اور احتراماً بولا۔ ”مسٹر رویانگ یوک؟“

”ہاں۔“ رویانگ نے جواب دیا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“

رویانگ نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے گیٹ عبور کیا اور لکڑی کی سیڑھیاں اترنے لگا جن کے برابر میں ہی ایک اور قدیم طرز کی عمارت تھی۔ رویانگ کو اس ماحول میں اپنائیت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے غربت کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کا پورا خاندان ایک کمرے میں رہتا تھا اور بڑی مشکل سے زندگی بسر ہورہی تھی۔ بعض اوقات تو فاقہ کشی تک نوبت آجاتی۔ ناقص غذا کی وجہ سے اس کی نشوونما بھی متاثر ہوئی اور اس کے قد کاٹھ میں وہ اضافہ نہیں ہوسکا جو ہونا چاہیے تھا۔ کوریا کی جنگ کے بعد وہ بھی لاکھوں مہاجرین کی طرح اپنی ماں اور بڑی بہن کے ساتھ جنوب کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہوگیا جہاں انہیں ایک فوجی کیمپ کے قریب پناہ ملی۔ پورے ملک میں یہ واحد جگہ تھی جہاں انہیں کچھ عرصے کے لیے خوراک اور رہائش مل سکتی تھی۔ اس نے کوڑا چننے کا کام شروع کردیا۔ وہ روزانہ کچرے کے ڈھیر سے امریکی فوجیوں کی پھینکی ہوئی اشیا ایک لوہے کی ٹرالی میں اکٹھی کرتا اور پھر ایک چھکڑے میں ڈال کر شہر لے جاتا۔ جب اس کے پاس کچھ پیسے جمع ہوجاتے تو اس کی ماں ہڈیوں کا سوپ بناتی جس میں برائے نام بھی بوٹی نہ ہوتی لیکن یہ انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ جس دن کچرے کے ڈھیر میں سے مکئی کے دلیا کا ٹن مل جاتا تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے۔ اب وہ جنوبی فرانس سے شیمپین، سائبیریا سے مچھلی کا اچار اور الاسکا سے کیکڑے منگواسکتا ہے لیکن مکئی کی تازہ روٹی کا تصور کرکے ہی منہ میں پانی آجاتا ہے۔

گلی میں بالکل تاریکی تھی اور رویانگ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نے تاج کو ساتھ نہ لاکر غلطی تو نہیں کی۔ اچانک ہی ایک دروازہ کھلا اور رویانگ کے ساتھ آنے والا شخص ایک نیم تاریک گودام میں داخل ہوگیا۔ رویانگ نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ دوبارہ بند ہوگیا۔ وہ دونوں مختلف پیٹیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گودام کے عقبی حصے میں واقع ایک چھوٹے سے دفتر میں پہنچے جہاں ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ رویانگ کی نظر وہاں بیٹھی ہوئی ایک درمیانی عمر کی عورت پر گئی جس کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور دو آدمی اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ رویانگ کے ساتھ آنے والے آدمی نے قدرے جھک کر اس عورت کو تعظیم دی اور اس سے پہلے کہ وہ عورت کچھ کہتی، رویانگ نے ان آدمیوں سے کہا۔

”ہمیں تنہا چھوڑدو۔“

وہ تینوں عورت کے اشارہ کرنے پر باہر چلے گئے اور انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ اب وہ تینوں کمرے سے باہر تاریک گودام میں کھڑے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے سگریٹ سلگا لیے تھے اور وقفے وقفے سے کمرے میں جھانک رہے تھے۔

”تمہارے پاس کوئی تصویر ہے؟“ رویانگ نے اس عورت سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سرہلادیا۔ حالانکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس عورت کے پاس کوئی پرس یا بیگ نما چیز نہیں ہے۔ وہ تھوڑا سا مسکرائی پھر گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک براؤن لفافہ نکال لیا۔

”کتنے پیسے دوگے؟“ اس نے کہا۔

رویانگ نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”میں تمہیں پہلے ہی بتاچکا ہوں۔“

”لیکن مجھے زیادہ پیسے چاہئیں۔“ اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”میں بوڑھی ہوچکی ہوں اور اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس وقت میں اپنا خیال خود رکھ سکتی تھی اور بہت سے مرد میری مدد کے لیے تیار رہتے تھے لیکن اب وہ بات نہیں ہے، مجھے زندہ رہنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔“

رویانگ پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے مزید کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا۔ عورت لمحہ بھر کے لیے ہچکچائی پھر اس نے وہ لفافہ رویانگ کے حوالے کردیا۔ اس نے گہری سانس لی اور لفافے میں سے ایک تصویر نکال لی۔ اس نے آٹھ ضرب دس کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ سات عورتیں تھیں۔ ان میں سے تین کرسیوں پر بیٹھی تھیں جبکہ چار کھڑی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے اوپر ایک بینر پر ایشین اسٹار نائٹ کلب لکھا ہوا تھا لیکن اس کا کوریائی زبان میں ترجمہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں کسی کورین باشندے کو امریکی فوجی کلبوں اور بار میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ماسوائے ان لوگوں کے جو وہاں کام کرتے ہوں۔ ان ساتوں عورتوں نے گہرا میک اپ کررکھا تھا اور ان کے جسم پر چست لباس تھے۔ وہ سب بے حد پُرکشش اور جوان تھیں۔ ان میں سے کچھ شرمیلی اور کچھ شوخ تھیں لیکن سب بڑی بہادری سے حالات کا مقابلہ کررہی تھیں۔

”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ عورت نے پوچھا۔

رویانگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”میں تمہاری بہن کی بات کررہی ہوں۔“ عورت بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ ان میں سے تمہاری بہن کون ہے؟“

رویانگ جانتا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ تصویر میں انتہائی بائیں جانب دوسری لڑکیوں سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ گوکہ اس نے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح چہرے پر غازہ تھوپ رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے پہلی نظر میں اسے پہچاننا ممکن نہیں تھا لیکن اس کی پُرسکون آنکھیں اور جانی پہچانی مسکراہٹ اسے دوسری لڑکیوں سے الگ کررہی تھی۔

رویانگ نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ عورت اس کے جذبات کی گہرائی سے واقف ہو۔ اس نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی اور تند لہجے میں بولا۔ ”یہ تم ہو۔ ان کے درمیان؟“

”ہاں۔“ وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، میں ملکہ تھی۔“

”یونگ جوگول کی ملکہ۔“ رویانگ نے طنزاً کہا۔ ”میری بہن کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“

”میں سننا چاہوں گا۔“

اس عورت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اپنے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”ایک آدمی اسے پسند کرنے لگا تھا۔“

”کون تھا وہ؟“ رویانگ نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ایک امریکی فوجی۔ تم جانتے ہو وہ سب فطرتاً ایک جیسے ہوتے ہیں۔“

”مجھے پوری بات بتاؤ۔“ رویانگ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

روبا ئنگ کی بہن سولہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر... چلی گئی تھی۔ اس وقت اسے مڈل اسکول پاس کیے ایک سال ہی ہوا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک خط چھوڑا جس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بیوہ ماں پر بوجھ سمجھتی ہے۔ جب اسے کوئی کام مل جائے گا تو وہ چھوٹے بھائی کی تعلیم کے لیے پیسے بھیجے گی۔ اس نے اپنی بات پر عمل کیا اور چند ماہ بعد ہی پیسے آنے شروع ہو گئے۔ ابتدا میں چھوٹی رقوم آئیں پھر ان میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اس کے بھیجے ہوئے پیسوں سے روبا ئنگ کی ماں اس قابل ہوگئی کہ وہ بیٹے کی فیس، کتابوں اور یونیفارم کے اخراجات برداشت کر سکے۔ روبا ئنگ نے ہائی اسکول پاس کیا تو پیسے آنا بند ہو گئے۔ روبا ئنگ نے ایک الیکٹرانک کمپنی میں ملازمت کرلی۔ ایک دن اس نے ماں کو ایک معقول رقم تھمائی اور خود بہن کی تلاش میں شمال کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کی بہن نے پیسوں کے ساتھ جو خط بھیجے، وہ سب یونگ جوگول سے پوسٹ کیے گئے تھے۔

اس نے تمام دکانوں، ہوٹلز، کلبس اور شراب خانوں میں جا کر لوگوں سے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا لیکن کسی سے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ وہ اپنے ساتھ زادِ راہ کے طور پر جو چیزیں لایا تھا، وہ بھی ختم ہو رہی تھیں۔ پھر بھی اس نے مزید دو دن قیام کا فیصلہ کیا تا کہ بہن کی تلاش جاری رکھ سکے لیکن جب بھوک ستانے لگی تو واپس گھر لوٹ آیا۔ ماں اس کے اچانک چلے جانے سے بہت پریشان تھی۔ اس نے روبا ئنگ سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ کبھی اس طرح اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

اس نے بہن کو بھلانے کی بہت کوشش کی اور تمام ذہانت و توانائی الیکٹرانک کے کاروبار کے لیے وقف کر دی پھر اس نے ملازمت چھوڑ کر چھوٹے موٹے ٹھیکے لینے شروع کر دیے اور بیس سال کی جدوجہد کے بعد وہ ایک کارپوریشن کا مالک بن گیا جو اپنی مصنوعات امریکا برآمد کرتی تھی۔ اس کے دس سال بعد اس کا شمار کوریا کے امیر ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ اس کی ماں طویل عمر پانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئی تاہم وہ مطمئن تھا کہ آخری سالوں میں وہ اسے ایک آرام دہ زندگی دینے کے قابل ہو سکا۔ مرنے سے پہلے ماں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ بہن کی تلاش جاری رکھے گا اور اگر وہ مرگئی ہے تو اسے اس کے پہلو میں دفن کرے گا۔ روبا ئنگ نے ماں سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی وصیت پر ضرور عمل کرے گا۔

☆☆☆

اب وہ اس ٹھنڈے گودام میں بیٹھا یونگ جوگول کی سابق ملکہ کو دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ کسی زمانے میں بہت حسین رہی ہوگی لیکن اس وقت اسے اس کے سراپا سے غرض نہیں تھی بلکہ وہ صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کہیں وہ جھوٹ تو نہیں بول رہی۔

"تمہاری بہن بہت شرمیلی تھی۔" اس عورت نے کہا۔ "جب اسے امریکن فوجی کے ساتھ رات گزارنے کے لیے کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ماماسین (نائیکا) نے اسے بید کی چھڑی سے خوب مارا۔ مجبوراً وہ امریکی سپاہی کے ساتھ چلی گئی لیکن رات بھر روتی رہی۔ جس پر وہ سپاہی غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے ماماسین سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ ماماسین نے انکار کر دیا جس پر دونوں میں خوب جھگڑا ہوا۔ جب دوسرے دن وہ سپاہی چلا گیا تو ماماسین نے ایک بار پھر تمہاری بہن کی پٹائی کی۔"

روبا ئنگ نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کے لیے یہ سب سننا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس عورت کے منہ پر تھپڑ مار دے جو اس کی بہن پر ہونے والے ظلم کو مزے لے کر بیان کر رہی تھی جیسے اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا کیونکہ اسے ابھی اس عورت سے اپنی بہن کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔

"تم اسے کس نام سے بلاتی تھیں؟" وہ جانتا تھا کہ اس زمانے میں یونگ جوگول کی سبھی عورتیں فرضی نام استعمال کرتی تھیں۔

"می سوک۔"

روبا ئنگ نے اس کا مطلب جاننے کی کوشش نہیں کی بلکہ دانت بھینچتے ہوئے بولا۔ "اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے امریکی فوجی اسے پسند کرنے لگے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بہت شرمیلی اور کم گو تھی۔ حالانکہ وہ بہت سے فوجیوں کا دل بہلا چکی تھی لیکن ہمیشہ یہی ظاہر کرتی کہ وہ نئی نئی آئی ہے۔" اس عورت نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور بولی۔ "کچھ فوجی اسے پسند کرتے تھے اور کچھ نہیں۔"

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" روبا ئنگ نے جل کر پوچھا۔ "وہ تمہیں تو پسند کرتے ہوں گے؟"

"ہاں، مجھے ناچنا اور لوگوں کو ہنسانا آتا ہے اس لیے سب مجھے پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کیمپ کا انچارج بھی مجھے چاہتا تھا۔" اس نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا اور یوں دیکھنے لگی جیسے ماضی کا کوئی منظر اس کے سامنے ہو۔

"وہ مجھ پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا پھر اس نے می سوک کو دیکھ لیا۔ اسے شرمیلی اور کم گو لڑکیاں پسند تھیں۔ اس نے مجھ سے نظریں پھیر لیں اور ہر رات می سوک کے ساتھ گزارنے لگا۔"

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر اپنے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس کی پروا نہیں تھی کیونکہ میرے چاہنے والے بہت تھے پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ ماماسین کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ سارے پیسے می سوک کو نہ دے دے اور اس کے حصے میں کچھ نہ آئے لیکن اس نے انچارج کو اس پر راضی کر لیا کہ پہلے وہ اسے ادائیگی کرے گا، اس کے بعد ہی می سوک کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے حالانکہ اس زمانے میں کوئی عورت بیرکوں میں نہیں جا سکتی تھی لیکن وہ کیمپ انچارج تھا۔ اسے کون روکتا۔"

"کیا وہ اسے اپنے کمرے میں لے گیا تھا؟"

"ہاں، میرا یہی خیال ہے۔ دوسرے دن وہ واپس آئی تو بہت خاموش تھی۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ ماماسین نے اس کی تلاشی لی لیکن اس کے پاس سے مزید رقم برآمد نہیں ہوئی۔ اس پر ماماسین نے اسے بہت مارا اور کہا کہ اسے کیمپ کمانڈر سے مزید پیسے لینے چاہیے تھے۔ دوسرے دن انچارج آیا اور اس نے می سوک کے کندھے اور کمر پر زخموں کے نشان دیکھے تو غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے یونگ جوگول کے میڈ سے ماماسین کی شکایت کر دی۔ اس نے فوراً ہی پولیس بھیج دی جو ماماسین کو پکڑ کر لے گئی۔ اس نے میڈ اور پولیس والوں کو بھاری رشوت دے کر اپنی جان چھڑائی۔ اگلے روز انچارج آیا تو اس نے می سوک کو اس کے ساتھ مستقل رہنے کی اجازت دے دی۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

وہ عورت کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "ہمیں نہیں معلوم۔ ہم نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔"

روبا ئنگ نے اس سے کئی سوالات کیے تا کہ می سوک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات مل سکیں لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ اس کے جانے کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سننے میں آیا۔

"اس کیمپ انچارج کا نام کیا تھا؟" روبا ئنگ نے پوچھا۔

"ہنری شیفرڈ۔"

"یہی نام تھا... تمہیں اچھی طرح یاد ہے نا؟"

"ہاں، ممکن ہے اس سے بھی لمبا ہو لیکن اس کی وردی پر یہی لکھا ہوا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تصویر میں رکھ لوں؟" روبا ئنگ نے پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، روبا ئنگ نے اپنے پرس سے ڈھیر سارے نوٹ نکالے اور اس کے سامنے ڈال دیے۔

"ہاں۔" وہ نوٹ دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم یہ تصویر رکھ سکتے ہو۔"

روبا ئنگ نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کمپنی کی خدمات حاصل کیں۔ یہ ایک پرانی کمپنی تھی جو کوریا کی جنگ کے بعد سے ہی کام کر رہی تھی اور اس کا دفتر سیئول میں تھا۔ اس نے فرم کے ذمے اپنی بہن کی تلاش کا کام نہیں لگایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ البتہ اس نے انہیں ایک امریکی سپاہی ہنری شیفرڈ کو ڈھونڈنے کی ذمے داری سونپی۔ اس کمپنی نے روبا ئنگ کا تعارف ایک ریٹائرڈ کورین وائی ین یا ئنگ سے کروایا جو کسی زمانے میں سیئول میں آٹھویں امریکی فوجی دفتر میں کام کر چکا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات روبا ئنگ کی اسٹڈی میں ہوئی۔

"میرے ابھی تک آٹھویں آرمی میں دوست ہیں۔" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ "انہوں نے ہی مجھے یہ فہرست دی ہے۔" اس نے کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ کا پلندا لہراتے ہوئے کہا۔ "اس میں ان تمام افسروں کے نام ہیں جو اس زمانے میں سیکنڈ انفنٹری ڈویژن سے وابستہ تھے۔"

روبا ئنگ نے کہا۔ "میں صرف ہنری شیفرڈ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

یا ئنگ نے فہرست پر نظر دوڑائی اور بولا۔ "لیفٹیننٹ کرنل ہنری شیفرڈ۔ اس کا تبادلہ مقررہ وقت سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

"کوئی ایسی وجہ ہوگی اسی لیے اسے وقت سے پہلے ہٹا دیا گیا۔" اس نے تفصیل بتانا شروع کی۔ روبا ئنگ غور سے سنتا رہا اور ساتھ ساتھ نوٹس بھی لیتا رہا پھر غصے سے بولا۔ "اس کرنل کو غیر فرقے دارانہ رویے کی وجہ سے ہٹایا گیا تھا۔"

"ہاں کیونکہ وہ اپنے لوگوں کے لیے ایک بری مثال قائم کر رہا تھا۔"

"لیکن اس رپورٹ میں یہ واضح نہیں کہ اس نے

ایسی کیا حرکت کی تھی؟"

"اس طرح کی حرکتوں پر عموماً پردہ ڈال دیا جاتا ہے تاکہ افسروں کی نیک نامی پر حرف نہ آنے پائے اور میزبان ملک سے بھی تعلقات خراب نہ ہوں۔"

"وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس واقعے کی شہرت ہو؟" رویا تنگ نے پوچھا۔

"ہاں اور اسی لیے اسے خاموشی سے کمانڈ سے فارغ کر کے امریکا بھیج دیا گیا۔ اس کے ٹھیک چھ ماہ بعد اس نے ریٹائرمنٹ لے لی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" رویا تنگ نے جاننا چاہا۔

"وہ مر چکا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں، اس کی موت فلوریڈا کے گالف کورس میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی۔"

رویا تنگ نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ دیوار پر لگے شیلف میں چینی، کورین اور انگریزی زبان میں کتابیں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ "گویا وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔"

"ہاں، بظاہر تو یہی لگتا ہے لیکن میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔"

"وہ کیا؟"

"سیونتھ کیولری کے ریٹائرڈ فوجیوں نے اپنی ایک تنظیم بنا رکھی ہے۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنا نیوز لیٹر بھی شائع کرتے ہیں۔ ہم اس میں ایک اشتہار دے سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس زمانے میں کیمپ گیری اوون پر تعینات تھا اور اس کیس کے بارے میں کچھ جانتا ہے تو ہم سے رابطہ کرے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی سے؟"

"ہاں۔"

رویا تنگ نے ایک لمحے سوچا پھر کہنے لگا۔ "مجھے تو یہ بعید از قیاس لگتا ہے کہ جو شخص اس معاملے میں شامل رہا ہو، وہ رضاکارانہ طور پر ایک پرائیویٹ سراغ رساں کمپنی سے رابطہ کرے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اگر اشتہار میں میرا نام اور پتا دیا جائے تو شاید ایسا ممکن ہو سکے۔" رویا تنگ نے کہا۔

"ہاں، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟" ین یا تنگ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

چھ ماہ گزر گئے لیکن اشتہار کے جواب میں کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ رویا تنگ کی امیدیں دم توڑتی جا رہی تھیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے کبھی اپنی بہن کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکے گا۔ پھر ایک دن اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میڈ نے جا کر دیکھا اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے دفتر میں آئی۔

"دروازے پر ایک آدمی آیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

رویا تنگ اپنی میز سے اٹھا اور اس شخص کا استقبال کرنے بیرونی دروازے تک گیا۔ دو منٹ بعد وہ اسے اپنے پارلر میں لے آیا۔ وہ ایک قوی الجثہ شخص تھا اور اس کا وزن لگ بھگ تین سو پاؤنڈ ہوگا۔ اس نے بگی ٹائپ سوٹ پہن رکھا تھا اور سفید قمیص کے ساتھ سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔

"میرا نام انطونی ہے لیکن فوج میں سب مجھے اینڈی کہا کرتے تھے۔ جب آرمی میں تھا تو اس وقت میری یہ حالت نہیں تھی۔" اس نے اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی کام نہیں رہا، سوائے آرام کرنے کے۔" وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ "میں نے سیونتھ کیولری کے نیوز لیٹر میں تمہارا اشتہار دیکھا تھا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے رابطہ کرنے کی زحمت کی۔" رویا تنگ نے رسماً کہا۔

"اصولاً مجھے پہلے خط لکھنا چاہیے تھا۔" انطونی نے کہا۔ "یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ میں جہاز پر سوار ہوا اور یہاں چلا آیا لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ریٹائرڈ لوگوں کو بھی فوجی جہازوں سے مفت سفر کی سہولت حاصل ہے۔ بس تھوڑا بہت سامان کا کرایہ دینا پڑتا ہے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ میں بہت زیادہ سامان لے کر نہیں آیا۔" اس نے ایک چمڑے کے بیگ کی طرف اشارہ کیا جو سامان سے پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ "لہٰذا میں نے سوچا کہ جو کچھ جانتا ہوں، وہ تمہیں بھی بتا دوں۔"

"تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟"

"نہیں، فی الحال مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم مجھے ایک ٹھنڈی بیئر اور تھوڑی سی مونگ پھلی منگوا دو۔"

رویا تنگ نے گھنٹی بجا کر خادمہ کو بلایا اور اسے دونوں چیزیں لانے کے لیے کہا۔ انطونی نے بیئر کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ "اچھی ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہیں پسند آئی۔"

انطونی نے کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں چیزوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ جب وہ فارغ ہوا تو رویا تنگ نے پوچھا۔

"تمہارے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ ہے؟"

"نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید تم مجھے اس سلسلے میں کوئی مشورہ دے سکو۔"

"شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں لیکن پہلے مجھے بتاؤ کہ تم کیا کہنے یہاں آئے ہو؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بولنا شروع کیا۔

جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو رویا تنگ نے ایک بار پھر میڈ کو بلایا اور اسے تصویر لانے کے لیے کہا۔ جب وہ تصویر لے کر آئی تو اس نے انطونی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہی وہ عورت ہے جس کے بارے میں تم نے بتایا ہے؟"

"ہاں، یہ وہی ہے۔" انطونی نے تصویر میں بائیں طرف کھڑی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اگلی صبح وہ تینوں یعنی رویا تنگ، تاج اور سابق ماسٹر سارجنٹ انطونی سیئول سے یونگ جوگول کی جانب روانہ ہوئے۔ انطونی نے جو کہانی سنائی، وہ کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق لیفٹیننٹ کرنل شیفرڈ نے می سوک کو ایک قیدی کی طرح رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی تھی جو ایک بیڈروم، ٹوائلٹ، شاور اور ایک چھوٹے کچن پر مشتمل تھا۔

"اسے ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔" انطونی نے کہا۔ "کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے روزانہ ایک خادمہ آتی تھی۔ اس کے کمرے میں ایک ٹی وی بھی لگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس کے لیے اتنے سارے مردوں کے درمیان رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ خادمہ کے سوا وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس سے وہ بات کر سکتی۔ کرنل شیفرڈ بہت زیادہ شکی مزاج تھا جب وہ کام پر جاتا تو اس کی غیر موجودگی میں کسی شخص کو بیرک میں آنے کی اجازت نہ تھی اور اسی دوران میں بٹالین کو وہاں سے کوچ کرنے کا حکم ملا۔"

انطونی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "سیکنڈ انفنٹری ڈویژن کے دوسرے یونٹوں کی طرح چوتھے اور ساتویں کیولری یونٹ کو بھی وقفے وقفے سے جنگی مشقوں کے لیے جانا پڑتا تھا۔ کسی پیشگی نوٹس کے بغیر ہی روانگی کا حکم ملتا اور سپاہی و افسران اپنا سامان ٹرکوں پر لاد کر متعلقہ مقام کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ان کے ساتھ دیگر عملہ مثلاً کلرک، خانساماں، بیرے اور طبی عملے کو بھی جانا ہوتا۔"

"میں میس سارجنٹ تھا۔" انطونی نے بتایا۔ "لیکن مجھے بھی سب کے ساتھ جانا پڑا۔ البتہ کرنل شیفرڈ بے حد مضطرب تھا۔ وہ می سوک کو چھوڑ کے نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے حکم دیا کہ اسے اپنے ٹرک میں سامان کے بکسوں کے پیچھے چھپا دوں۔"

"تم می سوک کو بھی مشقوں کے میدان میں لے گئے؟"

"ہاں، وہ علاقہ نائٹ میٹر رینج کہلاتا ہے۔"

رویا تنگ نے یہ نام سن رکھا تھا۔ اب وہاں فوجیوں کو تربیت دی جاتی ہے لیکن کوریا کی جنگ کے دوران وہاں امریکی فوجوں اور چینی کمیونسٹوں کے درمیان جنوبی کوریا پر قبضے کے لیے شدید جھڑپیں ہوتی تھیں۔

"ٹھیک ہے، تم اسے وہاں لے گئے پھر کیا ہوا؟" رویا تنگ نے پوچھا۔

"پہلے دن اور پہلی رات ہم لوگ ممکنہ حملے سے بچاؤ کے لیے بار بار پوزیشن بدلتے رہے اور کھانے کے لیے بھی کسی جگہ نہیں رکے۔ نصف شب کے قریب ہمیں روشنی کرنے کی اجازت تھی۔ میں جیسے تیسے تقریباً سو سپاہیوں اور افسران کو کھانا کھلا کر فارغ ہوا تو پتا چلا کہ می سوک کہیں جا چکی تھی۔"

رویا تنگ حیرت سے اسے دیکھنے لگا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ انطونی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر سن کر کرنل شدید غصے میں آ گیا۔ اس نے مجھے اور میرے عملے کو علاقے کی تلاشی لینے کا حکم دیا لیکن وہ نہیں ملی۔ پھر اس نے ہمیں قریبی گاؤں میں جانے کا حکم دیا۔ ہم نے اپنے ساتھ ایک کورین سپاہی کو لیا تاکہ وہ مترجم کے فرائض انجام دے سکے۔ ہم نے گاؤں کے نمبردار اور تقریباً وہاں رہنے والے ہر فرد سے می سوک کے بارے میں پوچھا لیکن سب کا کہنا یہی تھا کہ انہوں نے اس حلیے کی کوئی عورت نہیں دیکھی۔"

"ہم واپس آئے تو صبح ہو چکی تھی اور یونٹ کو دوبارہ کوچ کا حکم مل چکا تھا۔ کرنل کو معلوم ہوا کہ ہم می سوک کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں تو اس نے سارا الزام مجھ پر دھر دیا اور کہا کہ میں ہی می سوک کی گمشدگی کا ذمے دار ہوں۔ پھر اس نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ می سوک کو تلاش کریں۔ اس نے علاقے کا نقشہ نکالا

اور کمپنی کمانڈروں کو مختلف علاقے سونپ دیے بلکہ یونٹ روانگی کے لیے تیار تھا لیکن کرنل نے بہانہ بنایا کہ اس کا ریڈیو کام نہیں کر رہا۔ تقریباً دوپہر کے وقت ایک سپاہی کے چلّانے کی آواز آئی۔ کرنل سمیت ہم سب اس جانب متوجہ ہوئے۔ وہ ایک چالیس فٹ گہری خندق تھی جس کی تہ میں چٹانیں تھیں۔ لڑائی کے دنوں میں ایسی خندقیں عام طور پر بمباری سے بچنے کے لیے کھودی جاتی ہیں۔ می سوک کی لاش وہاں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر خون آلود اور خربوزے کی طرح پھٹ گیا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا کیونکہ اس نے وہی اونی لبادہ پہن رکھا تھا جو میں نے اسے دیا تھا کیونکہ اس کے پاس موسم کی شدت سے بچنے کے لیے مناسب لباس نہیں تھا۔ وہ لبادہ اس کے قد کے مقابلے میں لمبا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ اسے اندھیرے میں خندق نظر نہیں آئی۔ اس کا پاؤں لبادے میں الجھا اور وہ نیچے گر گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسے اس حال میں دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑی تھی اور اس کی چٹخی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ زندہ بچی ہوگی۔"

یونگ جوگول کی جانب جاتے ہوئے رویانگ اپنی سیڈان کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا ان باتوں کو یاد کر رہا تھا جو انطونی نے اس سے کی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن مر چکی ہے لیکن گزشتہ روز ایک غیر ملکی کی زبانی اس کی تصدیق بھی ہوگئی جسے سننے کے بعد اس کا غم تازہ ہوگیا۔ اسے یاد تھا کہ جب اس کی بہن پہلی بار گھر چھوڑ کر گئی تو اس کی ماں کتنا روئی تھی۔ یہ یاد اب بھی اس کے دل میں پھانس کی طرح چبھ رہی تھی۔

انطونی کے کہنے کے مطابق کرنل شیفرڈ نے می سوک کی لاش نکالنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ ادھر ڈویژن ہیڈ کوارٹر اس بات پر برہم تھا کہ احکامات کے باوجود یہ دونوں یونٹ مقررہ جگہ پر کیوں نہیں گئے۔ انہوں نے کرنل شیفرڈ کو تلاش کرنے کے لیے ملٹری پولیس کا ایک دستہ بھیجا لیکن کرنل نے انہیں بھی یہی بتایا کہ اس کا ریڈیو خراب ہوگیا تھا اور ساتھ ہی اپنے یونٹ کو فوری روانگی کا حکم دے دیا۔ ملٹری پولیس والے اس وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے جو کچھ دیکھا یا سنا، اس کے حوالے سے اپنی رپورٹ ہیڈ کوارٹر کو دے دی جس کے نتیجے میں کرنل کے خلاف انکوائری ہوئی اور اسے کمانڈ سے ہٹا دیا گیا۔

سیڈان کی رفتار آہستہ ہوئی اور یونگ جوگول کی آراستہ دکانیں نظر آنے لگیں۔ ان کا ارادہ یہاں رات کو قیام کرنے کا تھا جبکہ علی الصباح وہ نائٹ میٹر رینج کی جانب روانہ ہو جاتے۔ رویانگ نے پہلے ہی سول ڈیفنس حکام سے اس علاقے میں جانے کے لیے پاس حاصل کر لیا تھا جو عموماً فوجی سرگرمیوں کے لیے مخصوص تھا۔ انطونی کو یقین تھا کہ وہ اس خندق کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جہاں اس نے کئی سال پہلے می سوک کی لاش دیکھی تھی۔

"میں نہیں سمجھتا کہ کسی نے اسے وہاں سے ہٹایا ہو گا۔" انطونی نے رویانگ سے کہا۔ "زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ لاش اب بھی وہیں ہوگی۔ ممکن ہے کہ اسے تھوڑی بہت مٹی نے ڈھانپ لیا ہو۔"

وہ رات ان لوگوں نے وہاں کے بہترین ہوٹل میں گزاری۔ رویانگ نے انطونی کے لیے ایک الگ کمرا کرائے پر لیا لیکن اس نے وہاں زیادہ وقت نہیں گزارا۔ تاج نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تاج نے اس کی اطلاع رویانگ کو دی تو وہ بولا۔ "شاید وہ کسی بار کی تلاش میں گیا ہو تاکہ وہاں تھوڑی بہت تفریح کر سکے۔"

اگلی صبح وہ تینوں نائٹ میٹر رینج کے لیے روانہ ہو گئے اور جب مطلوبہ مقام پر پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔

"وہ یہیں ہے۔" انطونی نے ایک گڑھے کی جانب اشارہ کیا۔ "جہاں یہ پتھر پڑے ہوئے ہیں۔"

رویانگ نے ٹارچ روشن کی اور گڑھے میں جھانک کر دیکھا۔ تقریباً چالیس فٹ نیچے مٹی اور سوکھی ہوئی شاخوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اگر وہاں کوئی لاش تھی تو اسے دیکھنے کے لیے نیچے جانا پڑتا۔ رویانگ ایک اچھا کوہ پیما تھا لہٰذا اسے چڑھنے اترنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی چنانچہ اس نے خود نیچے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب انطونی کو اس کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بولا۔ "تم اپنے ڈرائیور سے یہ کام کیوں نہیں لیتے؟"

تاج وہاں سے چوتھائی میل دور کار میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ رویانگ نے کہا۔ "یہ میرا کام ہے۔"

بیس منٹ بعد وہ ایک پرانے غار کے فرش پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ اٹھائی اور بڑی احتیاط سے پتھروں کے درمیان پڑا ہوا ملبا ہٹانا شروع کر دیا۔

"اس طرف دیکھو۔" انطونی اوپر سے چلّایا۔ وہ دائیں جانب پڑے ہوئے ٹیلوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ رویانگ ایک تنگ سرنگ کے قریب ہو گیا۔ اس نے انطونی کی بتائی ہوئی سمت کی طرف منہ کیا تو اس کی

پشت سرنگ کی طرف ہوگئی۔ وہ چند منٹ تک لاش تلاش کرتا رہا پھر اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔

"صبح بخیر مسٹر رویانگ۔" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے یونگ جوگول کی ملکہ ایک پرانا اونی لبادہ پہنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ تین پانچ کا ریوالور تھا۔

"تم اس کی لاش سے چند قدم کے فاصلے پر ہو۔" اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ہڈیاں یہیں گل سڑ گئی ہیں۔ میرے ساتھ اس نے جو کچھ کیا، اس کے بعد اس کا یہی انجام ہونا تھا۔"

"اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟" رویانگ نے حیرت سے پوچھا۔

ملکہ کا جھریوں بھرا چہرہ شعلے کی طرح چمک اٹھا، وہ بولی۔ "اس نے میرا مرد چھین لیا۔ وہ کرنل شیفرڈ کو مجھ سے دور لے گئی۔ وہ مجھ سے شادی کرنے والا تھا۔ پھر میں اس کے ساتھ یہاں سے چلی جاتی۔ میرا بھی کوئی مقام ہوتا۔ میں ایک فوجی افسر کی بیوی کہلاتی لیکن بیچ میں یہ چوہیا آ گئی۔"

"تم نے اسے دھکا دیا...... اس گڑھے میں؟" رویانگ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ صرف دھکا نہیں دیا بلکہ اسے یہاں تک لے کر بھی آئی۔ انطونی میرے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کیمپ کا میس سارجنٹ تھا اور میں یونگ جوگول کی ملکہ۔ صرف میرے انگلی ہلانے کی دیر تھی اور وہ دوڑتا ہوا چلا آتا۔ جب کرنل شیفرڈ نے انطونی کو حکم دیا کہ وہ می سوک کو بھی ساتھ لے کر چلے تو ہم نے ایک منصوبہ بنایا۔ جیسے ہی قافلہ روانہ ہوا، میں بھی لباس تبدیل کر کے ایک جگہ چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ انطونی نے وہاں ٹرک روکا اور میں بھی اس میں سوار ہوگئی۔ می سوک مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ کم از کم اسے اپنی عمر کی عورت سے بات کرنے کا موقع ملے گا لیکن وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ آخر میں کس لیے اتنی مشقت اٹھا رہی ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ اسے ان لوگوں کے چنگل سے نکالنے آئی ہوں اور ایسی جگہ لے جاؤں گی کہ نہ تو کرنل شیفرڈ اور نہ ہی ایشین اسٹار ماما سین کو پتا چل سکے گا کہ وہ کہاں گئی۔ اس کے بعد وہ بالکل آزاد ہوگی۔ می سوک بے وقوف تھی۔ اس نے میری باتوں پر یقین کر لیا۔"

"تم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھیں تاکہ کرنل شیفرڈ کو حاصل کر سکو۔" رویانگ نے کہا۔

"ہاں، میں جانتی تھی کہ وہ اس سے نہیں بلکہ مجھ سے محبت کرتا ہے پھر اسے رات کی تاریکی میں اپنے ساتھ لے گئی۔ انطونی مجھے پہلے ہی ان پرانی سرنگوں کے بارے میں بتا چکا تھا جو نائٹ میٹر رینج سے کچھ فاصلے پر واقع تھیں۔ اس نے ہمیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں اس کی ٹارچ ساتھ لے کر آئی تھی۔ ہم ایک سرنگ کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑائی۔ میں نے اسے بتایا کہ ایسی عورت کو کبھی معاف نہیں کر سکتی جو میری محبت پر ڈاکا ڈالے۔ اس نے صفائی پیش کی اور کہا کہ وہ کرنل کو نہیں چاہتی بلکہ وہ زبردستی اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مجھے اس کے جھوٹ پر غصہ آ گیا اور میں نے اسے تھپڑ مار دیا۔ جواب میں اس نے بھی میرے اوپر تھوک دیا جس پر میں نے اسے گڑھے میں دھکا دے دیا۔"

رویانگ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا توازن برقرار رکھا اور بولا۔ "جب می سوک راستے سے ہٹ گئی تو اس کے بعد کرنل نے تم سے رجوع کیوں نہیں کیا؟"

"سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔ اس نے حماقت کی کہ اپنے سپاہیوں کو می سوک کی تلاش پر لگا دیا جس پر افسرانِ بالا ناراض ہو گئے اور چند روز بعد اسے یہاں سے ہٹا دیا گیا۔ مجھے تو اس سے بات کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔"

یہ کہہ کر اس نے ریوالور کی نال رویانگ کے چہرے کی جانب کی اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

رویانگ نے اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھے اور بولا۔ "کیا تم بھوتوں پر یقین رکھتی ہو؟"

"کیا؟"

"جلدی آؤ۔" انطونی اوپر سے چلّایا۔ "ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔"

ملکہ نے اوپر کی جانب دیکھا اور بولی۔ "صبر کرو۔" پھر اس نے رویانگ سے کہا۔ "بھوتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"وہی جو تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔"

ملکہ نے پلٹ کر دیکھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ سرنگ سے نمودار ہونے والا سایہ قریب آ چکا تھا۔ اس نے بڑی

مہارت سے ملکہ کے چہرے پر ضرب لگائی۔ جیسے ہی وہ... بے ہوش ہوئی، پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ رویا تنگ نے انطونی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ رویا تنگ نے تاج کی طرف دیکھا جو ملکہ کے جسم پر جھکا اپنی انگلیوں سے اس کی شہ رگ کو دبا رہا تھا۔ رویا تنگ نے پوچھا۔

''کیا یہ ابھی تک زندہ ہے؟''

''ہاں بس چند لمحوں کی مہمان ہے۔''

''کہیں انطونی کار لے کر تو نہیں بھاگ جائے گا؟'' رویا تنگ نے پوچھا۔

''نہیں۔ تمام دروازے اور ڈکی بند ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم می سوک کی باقیات تلاش کرتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد انہیں ہڈیاں مل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ لبادہ پڑا ہوا تھا جو انطونی نے اسے دیا تھا۔ انہوں نے وہ ساری ہڈیاں ایک پورسلین کے باکس میں جمع کیں اور اسے ایک سیاہ ربن سے باندھ دیا۔ جب وہ چلنے لگے تو تاج نے کہا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے؟''

رویا تنگ جانتا تھا کہ اگر وہ تاج کو ملکہ کے قتل کا حکم دے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ نیچے جھکا اور اس نے ملکہ کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ وہ ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھی اور بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکی۔

یہ اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ دونوں ہڈیوں سے بھرے باکس اور ملکہ کو کھینچتے گھسیٹتے سرنگ سے باہر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ ملکہ بری طرح تھک گئی تھی۔ سرنگ سے باہر آتے ہی وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ رویا تنگ جانتا تھا کہ یہ جگہ سڑک سے بہت دور ہے۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر اپنی کار کی جانب چل دیے۔ رویا تنگ نے مڑ کر بے ہوش ملکہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت پڑی تھی۔

تقریباً ایک میل کا سفر طے کرنے کے بعد انہوں نے انطونی کو دیکھا جو سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ انہوں نے کار روکی اور رویا تنگ نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ انہیں دیکھ کر انطونی کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ پوری طرح پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

''تمہاری گرل فرینڈ انتظار کر رہی ہے۔'' رویا تنگ نے کہا۔

انطونی نے سر ہلایا مگر لڑکھڑاتا ہوا آگے کی طرف بڑھتا رہا جیسے وہ ملکہ سے دور ہونا چاہتا ہو۔

''کیا وہ تمہیں بلیک میل کر رہی تھی؟'' رویا تنگ نے پوچھا۔

''ہاں کئی سالوں سے۔'' انطونی نے جواب دیا۔ ''وہ کہتی تھی کہ خودکشی کر لے گی لیکن اس سے پہلے پولیس کو سب کچھ بتا دے گی کہ کس طرح ہم دونوں نے می سوک کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے کہا کہ ثبوت کے لیے وہ لبادہ ہی کافی ہے جو ابھی تک لاش کے پاس پڑا ہوا ہے اور جس پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔ پھر اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم اپنی بہن کو تلاش کرتے پھر رہے ہو۔''

''لہٰذا تم نے مجھ سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا؟''

''یہ میرا نہیں بلکہ اس کا منصوبہ تھا۔''

''اور اس نے تم سے کہا کہ اگر اس کی مدد کرو گے تو وہ تمہیں بلیک میل کرنا بند کر دے گی؟''

''ہاں۔''

''کیا تم نے ہمیشہ اس کے کہنے پر عمل کیا؟''

''میری زندگی میں وہ واحد خوب صورت عورت تھی جس نے مجھ پر توجہ دی۔''

یہ کہہ کر اس نے سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ تاج نے گاڑی اس کے قریب کی تو رویا تنگ بولا۔ ''بہتر ہے کہ تم جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤ۔''

''کیوں؟'' انطونی نے پوچھا۔

''یہاں کا آرمی کمانڈر میرا دوست ہے۔ اس کے بھائی نے میری ایک کمپنی میں بھاری سرمایہ کاری کر رکھی ہے میں نے اسے اس علاقے میں ایک جنگی مشق کرنے پر آمادہ کر لیا ہے جس میں دو آرٹلری بریگیڈ حصہ لیں گے اور دھماکا خیز مواد استعمال کیا جائے گا۔ بس کچھ ہی دیر میں یہ شو شروع ہونے والا ہے۔''

انطونی نے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ دریا کی طرف جانے والی سڑک پر مڑے۔ رویا تنگ نے مڑ کر دیکھا۔ بھاری بھرکم انطونی اب ایک نقطے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر گہری سانس لی۔ وہ مطمئن تھا کہ اسے اپنے ہاتھ دشمنوں کے خون سے نہیں رنگنا پڑے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے انجام کو پہنچنے والے تھے۔

مختار ان لوگوں کو بتا رہا تھا۔ ''ابے جاہلو! چار پانچ آدمی نہیں... ہزاروں لوگ ایک ساتھ دوڑتے ہیں۔ میراتھن کہتے ہیں اس کو۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب دوڑتے ہیں۔''

''اور کب تک دوڑتے رہتے ہیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''جب تک ریس ختم نہیں ہوتی۔'' مختار نے کہا۔ ''میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔''

اس دوران میں کلو کے ہاں سے ایک درجن چائے کی

بڑا آدمی

منظر امام

بڑا آدمی بننے کے لیے بے تحاشا جدوجہد کرنی پڑتی ہے... تب کہیں جا کر اس کا ثمر ملتا ہے... اس گائوں کے لوگ بے حد خوش قسمت تھے کہ انہیں آسانی سے ایک بڑا آدمی میسر تھا... جس کی باتیں... ادائیں لاجواب و دل پسند تھیں مگر اچانک ہی اس گائوں میں ایک دوسرا بڑا آدمی دریافت ہو گیا...

بوجھل لمحات میں ہنستی، مسکراتی اور گنگناتی تحریر کے مزے

پیالیاں اور ایک بڑی سی کیتلی میں چائے آگئی تھی۔ سب کی توجہ اب مختار سے ہٹ کر چائے کی طرف ہوگئی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سیدھے سادے لوگ تھے جن کو دنیا کے بارے میں یا تو مختار بتایا کرتا تھا یا پھر کرم نواز بتاتا جس کے گھر میں نیا نیا ٹی وی آیا تھا۔

وہ ٹی وی پر خبریں سن کر اس چوپال میں آکر بیٹھ جاتا اور گاؤں کے بہت سے لوگ اسے گھیر لیتے۔ چونکہ وہ ٹی وی پر خبریں سن کر آتا تھا اس لیے اس کے پاس تازہ ترین خبریں ہوا کرتیں۔ جبکہ مختار اس معاملے میں پیچھے رہ گیا تھا کہ اس کے پاس بیس سال پہلے کی معلومات تھیں۔ وہ بیس سال پہلے سنگاپور گیا تھا۔

آس پاس کے گھر والوں کی ڈیوٹی تھی کہ وہ باری باری اس چوپال میں چائے بھیجا کریں۔ یہ محفل عشا کی نماز کے بعد جمتی اور بہت دیر تک جاری رہتی۔

ایک بار مختار نے ان لوگوں کو بتایا۔ ”دنیا کے ہر ملک میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے ہیں۔“

”کیا بات کرتے ہو مختار چاچا! بڑے لوگ کیسے پیدا ہوسکتے ہیں۔ پیدا تو بچے ہی ہوتے ہیں۔“ کسی نے کہا۔

”ابے جاہل، وہی بچہ آگے چل کر بڑا آدمی بن جاتا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی چاچا! بچہ تو آگے چل کر بڑا ہو ہی جاتا ہے۔“

”ابے، میرا مطلب یہ ہے کہ بہت مشہور... نام والا۔ سائنس داں، مولوی، شاعر جسے پوری دنیا جانتی ہو۔“

”ہمارے حساب سے تو تم بھی بڑے آدمی ہو چاچا۔“ کسی نے کہا۔ ”تم جتنا جانتے ہو اتنا تو ہم نہیں جانتے۔“

مختار نے انکساری کے ساتھ اپنی گردن جھکا دی۔ ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھ سے بھی بڑے لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ اب ہٹلر ہی کو لے لو، وہ مجھ سے بڑا آدمی تھا۔“

”یہ ہٹلر وہی تھا نا چاچا جس نے لیڈی ڈیانا سے شادی کی تھی۔“ کسی نے کہا۔

”ابے جاہل، ہٹلر جرمنی کا بادشاہ تھا۔“ مختار جھلا کر بولا۔ ”دس دفعہ بتا چکا ہوں لیکن تم لوگوں کو یاد ہی نہیں رہتا۔“

”ہم لوگوں کو تو صرف یہی یاد رہتا ہے چاچا کہ اگر وقت پر بارش نہیں ہوئی تو چاول کی فصل کا کیا بنے گا؟“

”اسی لیے تو تم لوگ جاہل ہو۔“

یہ روز کا معمول تھا۔ کرم نواز کے پاس خبریں ہوتیں اور مختار کے پاس معلومات۔ پورے گاؤں میں مختار کی عزت کی جاتی۔

وہ خود کسان تھا۔ اس کے دو بیٹے بھی اس کے ساتھ کھیتوں پر کام کیا کرتے۔ تھوڑی بہت زمین تھی۔ جس سے اس کا گزارہ ہو رہا تھا۔

جب وہ نوجوان تھا، اس وقت مزدوری کے چکر میں سنگاپور تک ہو آیا تھا اور آج تک پورے گاؤں میں اس کی عزت اسی لیے کی جاتی تھی کہ چاچا مختار نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ بڑا علم ہے اس کے پاس۔ اس نے نہ جانے کتنی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔

”ارے وہ کس کو نہیں جانتا۔ ہٹلر سے وہ واقف ہے۔ مہاتما گاندھی کو اس نے دیکھ رکھا ہے اور تو اور اپنا دلیپ کمار تک اس کو چاچا کہہ کر بلاتا تھا۔“

”اگر دلیپ کمار بھی چاچا کہتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چاچا مختار ڈیڑھ سو برس کا ہوگا۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ خود دلیپ کمار بھی سو سال سے کم کا نہیں ہے۔ اس حساب سے تو چاچا مختار ڈیڑھ سو برس کا ہوا نا۔“

چاچا مختار کو چوپال سے اٹھ کر گھر کی طرف آتے ہوئے بہت طمانیت محسوس ہوا کرتی۔ گاؤں والے اس کی عزت کرتے تھے اور اس کی حیثیت کو چیلنج کرنے والا پورے گاؤں میں کوئی نہیں تھا۔

لیکن ایک دن اس گاؤں میں مختار کو چیلنج کرنے والا ایک آ ہی گیا۔

وہ ایک اجنبی تھا۔

پچاس پچپن کے لگ بھگ۔ بڑے بڑے بال۔ عینک لگی ہوئی۔ سامان کے طور پر اس کے پاس صرف ایک سوٹ کیس تھا۔

اس گاؤں میں اس کی آمد اتفاقیہ نہیں تھی۔ کسی زمانے میں اس کا چاچا عبدالرحیم اس گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ وہ برسوں بعد اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔

گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے بتایا۔ ”بھائی عبدالرحیم کو تو مرے ہوئے بھی بیس برس ہوگئے۔“

”اوہ۔ سو سوری۔ آف دی گیٹ۔ ان دی لیٹ۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

گاؤں والے اس کی انگریزی سن کر دنگ رہ گئے۔

”بھائی! نام کیا ہے تمہارا؟“ ایک بوڑھے نے پوچھا۔

”جمی۔“ اس نے بتایا۔ ”ویسے تو جمیل نام ہے لیکن انگلینڈ اور تنزانیہ والے مجھے جمی کہہ کر پکارتے ہیں۔ آئی ایم دی بیسٹ۔“

”واہ، بھائی تم تو انگریزوں کی طرح انگریزی بولتے ہو۔“ کسی نے تعریف کی۔

جمیل عرف جمی نے انکساری سے گردن جھکا دی۔ ”آف کورس، بائے بائے۔“

اس اجنبی کے گرد گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہو کر اسے ستائشی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے گاؤں میں کوئی اس طرح فرفر انگریزی بولنے والا آیا تھا۔ ویسے تو چاچا مختار نے دنیا دیکھ رکھی تھی لیکن ان کو بھی اتنی انگریزی نہیں آتی تھی۔

”اب تم کہاں جاؤ گے؟“ کسی نے پوچھا۔

”واپس۔ ٹو دی سٹی پوائنٹ۔“ جمی نے کہا۔ ”اب میں یہاں کہاں رہ سکتا ہوں۔“

”رک جاؤ دو چار دنوں کے لیے۔ تمہارے چاچا عبدالرحیم کا مکان تو خالی پڑا ہوا ہے۔ ہم لوگ ہی دیکھ بھال کرتے ہیں اس کی۔ اب تو وہ تمہارا ہی مکان ہوا۔ تم زندگی بھر اس میں رہ سکتے ہو۔“

”اوکے، اوکے۔“ جمیل نے رضامندی ظاہر کی۔ ”ویری مچ انڈراسٹینڈنگ۔“

پورے گاؤں میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ ایک بہت بڑے اور قابل آدمی نے ان کے گاؤں میں رہنا پسند کرلیا تھا۔

گاؤں کے لیے خوشی کی بات سہی لیکن چاچا مختار کو اپنا اقتدار ہاتھ سے جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مختار کے پاس معلومات کا خزانہ زیادہ ہو لیکن وہ انگریزی میں مار کھا رہا تھا۔ جمیل فرفر انگریزی بولتا تھا۔

جب گاؤں والے جمیل کی کچھ زیادہ ہی تعریف کرنے لگے تو مختار ایک دن جمیل سے بھڑ گیا۔ ”او بھائی! یہ بتا تنزانیہ کہاں ہے؟“

جمیل طنز سے مسکرا دیا۔ ”آ کروس دی بارڈر آف آسام۔“ اس نے جواب دیا۔ ”فال آف دی رومن ایمپائر کے پاس۔“

مختار بھی مرعوب ہو کر رہ گیا۔ ایک تو کم بخت کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ پھر اس کی معلومات بھی زبردست تھیں۔ کیونکہ اس نے دو سیکنڈ میں بتا دیا تھا کہ تنزانیہ کہاں ہے جبکہ مختار کو تنزانیہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے صرف تنزانیہ کا نام سن رکھا تھا۔

جس وقت ان دونوں کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں، اس وقت گاؤں کے بہت سے لوگ ان دو پڑھے لکھوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بغور سن رہے تھے۔

”اچھا یہ بتاؤ، ایفل ٹاور کو پیرس میں کیا کہتے ہیں؟“ مختار نے ایک دوسرا وار کیا۔

”آندرے سوسوں۔“ جمی نے جواب دیا۔ ”رجسٹرار آن دی ریکارڈ۔ پلے لینڈ اینڈ بوتیک شاپ فرانس۔“

”واہ، واہ۔“ گاؤں والے تالیاں بجانے لگے۔

پہلی بار مختار کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ اس شخص کے سامنے اس کی مسلسل توہین ہو رہی تھی۔ گاؤں والوں پر اس کی علمیت اور قابلیت کا بھرم کھلتا جا رہا تھا۔

”اوکے اوکے۔“ مختار نے گویا ایک طرح سے جمیل کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم بھی پڑھے لکھے آدمی ہو۔“

جمیل کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ اور طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے مختار کے سامنے میدان مار لیا تھا۔

مختار کے سینے پر چھریاں چلنے لگی تھیں۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس گاؤں میں اس کا کوئی مدمقابل بھی ٹپک پڑے گا۔

الجھن یہ تھی کہ گاؤں کے نوجوان اب جمیل کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ وہ ان کے سامنے انگریزی میں تقریر کیا کرتا اور سب اس کی انگریزی سن کر حیران ہو جاتے۔

ایک بار اس نے گاؤں والوں کے سامنے انگریزی میں تقریر کی۔ ”ایکس وائی زیڈ۔ ٹو دی ایم این او اور پی آئی اے، بٹالا مینوفیکچرنگ آر ڈی برمن پلس کینسر ہاسپٹل اینڈ جنرل اسٹور۔“

اس کی تقریر نے ایک بار پھر گاؤں والوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ کیا انگریزی تھی۔ بالکل انگریزوں کی طرح بولتا تھا۔

مختار بھی اس ہجوم میں موجود تھا لیکن کوئی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس گاؤں میں اس کی اہمیت زیرو ہوتی جا رہی تھی۔

اس سے جب برداشت نہیں ہوا تو وہ بول پڑا۔ ”بھائی! انگریزی بولنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز ہے علم۔ علم کا سمندر۔ پوری دنیا کے بارے میں معلوم ہونا۔ انگریزی تو گوروں کے بچے تک بول لیتے ہیں۔“

”مسٹر مختار! آفٹر دی گاڈ مہربانی... روٹین سے ہٹ

کرم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ میرے پاس صرف انگریزی نہیں ہے بلکہ علم بھی ہے۔ ایورسٹ ایکسر سائز بک اینڈ ڈائری۔"

"یہ بات ہے تو بتاؤ کے ٹو کا دریا کہاں بہتا ہے؟"

جمیل مسکرا دیا۔ "مسٹر مختار! تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کے ٹو کسی دریا کا نام نہیں ہے۔ البانیہ ایک ملک ہے۔ کے ٹو اس کے سب سے بڑے شہر کا نام ہے۔"

گاؤں والے تالیاں بجانے لگے۔

"اچھا، اب یہ بھی بتا دو کہ البانیہ کہاں ہے؟" مختار نے بھنا کر پوچھا۔

"ویری گڈ کوئسچن اینڈ ویری گڈ آنسرنگ مشین۔" جمیل نے کہا۔ "مختار صاحب! البانیہ برازیل اور سنگاپور کے بیچ میں ہے۔"

لوگوں نے اس پر بھی تالیاں بجادیں۔

مختار خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ جمیل بتا رہا تھا۔ "میرے بھائیو! تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ ہالینڈ اور تنزانیہ والے میری کتنی عزت کرتے ہیں، جب میں وہاں سے جا رہا تھا تو پورا ملک رو رہا تھا۔"

"کیوں رو رہا تھا جمیل بھیا؟" کسی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آج ان کے ملک سے ایک بہت بڑا آدمی جا رہا ہے۔ ارے تم لوگ تو خوش نصیب ہو کہ ایک بڑا آدمی خود ہی تمہارے گاؤں میں آ گیا ہے۔"

"جمیل بھیا! تم ہمیں چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے نا؟" کسی نے پوچھا۔ "تمہارے آنے کے بعد ہمارے گاؤں کی شان بڑھ گئی ہے۔ دور دور تک دھوم مچی ہوئی ہے کہ اس گاؤں میں تم جیسا بڑا آدمی آ گیا ہے۔ اب یہاں سے نہیں جانا۔"

"دیکھو، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" جمیل نے کہا۔ "کسی بھی دن اگر فن لینڈ والوں نے بلا لیا تو جانا ہی پڑے گا۔ کیونکہ ان سے میرا پچیس سال کا معاہدہ ہے۔"

"جمیل بھیا! تم چلے گئے تو ہمارے گاؤں سے علم چلا جائے گا۔"

"دیکھو، ہو سکتا ہے کہ فن لینڈ والوں کو منع کر دوں۔" جمیل نے کہا۔

"بھیا! ایک بات تو بتاؤ۔ کیا وہاں والے تم جیسے پڑھے لکھوں کی بہت عزت کرتے ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"ایسی ویسی عزت۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ روس کا ایک مشہور آدمی ہے شیکسپیئر۔ اس کی قبر روس کے ایک چھوٹے سے شہر بلغاریہ میں ہے۔ ہر سال لاکھوں آدمی صرف اس کی قبر کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔"

"واہ بھیا۔ اسی لیے تو وہ لوگ اتنی ترقی پر ہیں۔"

جمیل انہیں کچھ اور بتاتا رہا لیکن وہاں رہنا مختار کے لیے محال ہو رہا تھا۔ گاؤں والوں کے نزدیک اب اس کی اہمیت بہت کم ہو گئی تھی۔ جو کچھ تھا بس جمیل تھا۔

پہلے لوگ راستہ چلتے ہوئے اسے ادب سے جھک کر سلام کرتے اور اس سے دنیا بھر کے مسائل دریافت کرتے۔ مختار کو اچھی طرح یاد ہے۔ ایک بار کسی نے اس سے پوچھا تھا۔ "مختار بھائی! یہ ایٹم بم کیسے بنایا جاتا ہے؟"

اس پر مختار نے اپنی معلومات کا دریا بہاتے ہوئے بتایا تھا۔ "بھائیو! پہلے تو لوہے کے بڑے بڑے مضبوط پائپ لیتے ہیں پھر اس پائپ میں آسمانی بجلی کو ٹھونس کر بھر دیتے ہیں۔ بس ایٹم بم تیار۔ اب جہاں جی چاہے گرا دو۔"

"بھیا! آسمانی بجلی کو پائپ میں کیسے ٹھونستے ہیں؟"

"یہی تو سائنس ہے۔ اب میں سب کچھ تو نہیں بتاؤں گا نا۔ ایسا نہ ہو کہ کل کسی گاؤں والے کا دماغ پھر جائے اور وہ بھی ایٹم بم بنا لے۔"

مختار کے اس انکشاف پر پورے گاؤں میں واہ، واہ ہونے لگی تھی لیکن یہ سب اچھے دنوں کی باتیں تھی۔ اب تو کم بخت جمیل نے آ کر سارا کام خراب کر دیا تھا۔ گاؤں سے مختار کی ہوا اکھڑ چکی تھی۔ اب ہر طرف جمیل ہی جمیل تھا۔

اور اچانک جمیل کے بارے میں سوچتے ہوئے مختار کو ایسا لگا جیسے جمیل سے چھٹکارے کی ایک راہ اس کے سامنے آ گئی ہو۔

بہت سامنے کی ترکیب تھی اور یہ راستہ خود جمیل نے دکھایا تھا۔ وہ اس رات بہت دیر تک سوچتا رہا جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ ترکیب انتہائی شاندار رہے گی تو پھر اسے نیند آ گئی، گہری نیند۔ بہت دنوں کے بعد اسے اتنی اچھی نیند آئی تھی۔

اس نے دوسرے ہی دن سے اپنی اسکیم پر کام شروع کر دیا۔

دوسرے دن وہ نائی کی دکان پر اس وقت بال بنوانے گیا جب اس نے دیکھ لیا کہ وہاں چار پانچ لوگ موجود ہیں۔ اسے اپنے کام کا آغاز اسی دکان سے کرنا تھا۔

نائی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے مختار بھائی! کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے ہو؟"

"ہاں بھائی، ساری رات سوچتے ہوئے گزر گئی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"خیریت تو ہے مختار بھائی، کیا سوچتے رہے تھے؟" دکان میں بیٹھے ایک بندے نے پوچھا۔

"بس بھائی، میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب ہمارے گاؤں سے علم کی برکت چلی جائے گی تو پھر کیا ہوگا؟"

"کیسی بات کر رہے ہو مختار بھائی۔ علم کی برکت کیوں جانے لگی؟"

"جا رہی ہے فضل دین۔ میں نے خود جمیل کی باتیں سنی ہیں۔ وہ اس گاؤں سے جا رہا ہے۔ فن لینڈ والوں نے بلا لیا ہے اس کو۔"

"لیکن وہ تو کہہ رہا تھا کہ فن لینڈ والے چاہے اسے اپنا بادشاہ ہی کیوں نہ بنا دیں، وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔"

"فن لینڈ والے بہت زور دے رہے ہیں۔ ان کا کوئی مسئلہ اٹک گیا ہے۔" مختار نے بتایا۔ "اسی لیے جمیل کو جانا ہی ہوگا۔"

"یہ تو بہت برا ہوگا۔ ہم ابھی جا کر اس سے بات کرتے ہیں۔" کرم داد نے کہا۔ اس کی کریانے کی دکان تھی۔

"نہیں، یہی تو غلطی کرو گے۔ اگر کسی نے پوچھا تو وہ کبھی نہیں بتائے گا۔" مختار نے کہا۔ "وہ اتنا اچھا آدمی ہے کہ گاؤں والوں کے دل نہیں توڑے گا۔ بس ایک رات چپکے سے نکل لے گا اور صبح اٹھ کر جب دیکھو گے تو گاؤں سے برکت جا چکی ہوگی۔"

"مختار بھیا۔ تم تو عقل مند آدمی ہو، اس گاؤں میں اس کے بعد تمہارا ہی نمبر ہے۔ تم ہی اس کو روکنے کی کوئی ترکیب سوچو۔"

"ہاں، وہ تو میں سوچ ہی رہا ہوں۔" مختار نے کہا۔ "تم لوگ فکر مت کرو، کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا لیکن خبردار، ایک بار پھر بتا رہا ہوں کہ جمیل سے کوئی نہ پوچھے۔ وہ کبھی نہیں بتائے گا اور جب اسے معلوم ہوگا کہ گاؤں والے ہوشیار ہو چکے ہیں تو پھر فوراً نکل لے گا۔"

"ہاں ہاں بھیا۔ ہم اس سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ تم ہی اس معاملے کو سنبھال لو۔"

نائی کی دکان سے یہ کہانی نکل کر پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ فن لینڈ والوں نے جمیل کو اپنا بادشاہ بنانے کو کہا ہے اور وہ کسی دن چپکے سے غائب ہو جائے گا۔

یہ ایک گمبھیر مسئلہ تھا اسی لیے گاؤں کے ایک عزت دار آدمی کے گھر بہت سے گاؤں والے اس پر غور کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ان میں مختار بھی تھا لیکن جمیل کو اس اہم میٹنگ کی ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی تھی۔

سب جب اپنی اپنی کہہ چکے تو عزت دار آدمی نے مختار کی طرف دیکھا۔ "ہاں تو مختار بھیا! کوئی ترکیب تمہارے ذہن میں آئی؟"

"ہاں، ایک ترکیب ذہن میں آئی تو ہے۔ لیکن پتا نہیں تم لوگ اس پر راضی ہوتے ہو یا نہیں۔"

"کیوں نہیں راضی ہوں گے۔ یہ تو گاؤں کی عزت کا معاملہ ہے۔"

"دیکھو بھائیو! کسی زندہ بندے کو ہم بہت دنوں تک نہیں روک سکتے۔ وہ کسی نہ کسی طرح موقع پا کر نکل ہی جائے گا لیکن آدمی اگر مر چکا ہو تو پھر وہ نہیں بھاگ سکتا۔"

"کیا مطلب مختار بھیا! ذرا کھل کر بتاؤ۔"

"جمیل خود بتا چکا ہے کہ روس کے شہر بلغاریہ میں شیکسپیئر کی قبر ہے، دور دور سے لوگ اس قبر کی دیکھنے آتے ہیں۔ اس قبر کی وجہ سے اس چھوٹے سے شہر کو پوری دنیا جانتی ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" عزت دار نے اپنی گردن ہلائی۔

"تو پھر خود سوچ لو کہ جمیل کو ہم کس طرح روک سکتے ہیں۔" مختار نے کہا۔ "میں نے تو تم لوگوں کو راستہ بتا دیا ہے۔ اب اس پر چلو یا نہ چلو... تمہاری مرضی۔"

☆☆☆

دوسری ہی شام جمیل معمول کے مطابق گاؤں والوں کے سامنے انگریزی میں تقریر کر رہا تھا کہ اس نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف دوڑ کر آتے ہوئے دیکھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لوہے کی سلاخیں تھیں۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔

پھر جب خود اس پر دھڑا دھڑ لاٹھیاں برسنے لگیں تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ لوگ خود اس پر حملہ کرنے آئے تھے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اب اس گاؤں میں ایک بڑے آدمی کی قبر ہے جسے بہت احترام اور عقیدت مندی سے بنایا گیا ہے اور اس گاؤں کا پرانا بڑا آدمی گاؤں والوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ یہ دنیا جس گائے کے سینگوں پر کھڑی ہے، وہ گائے کتنی بڑی ہے۔

www.paksociety.com

دیوانے

مریم کے حنان

محبت میں کبھی کوئی کردار فرضی نہیں ہوتا... محبت اپنے کرداروں کو خود آگے بڑھاتی ہے... کہانی میں کئی کردار زندہ نہیں رہتے مگر محبت اپنے کرداروں کو کبھی مرنے نہیں دیتی... محبت کی مسافت اپنے مسافروں کو بکھرنے نہیں دیتی... کہانی اور محبت کے رشتوں میں ازل سے جنگ جاری ہے... جنہیں ہم خونی اور جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں... وہ اپنے عہد کو توڑ کے اپنا مان و مرتبہ پسِ پشت ڈال کے تقسیم کا جھگڑا کھڑا کر دیتے ہیں... خودغرض اور بے ایمان رشتوں کا محبت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا... چاہتوں میں ڈوبے ایسے ہی مجنوئوں کا قصّہ جو خود تو مٹ گئے مگر جاتے جاتے اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے زندہ چھوڑ گئے... کبھی نہ فراموش کرنے والے جذبات میں گندھی ایک اثرآفریں داستاں...

زندگی کی سچائیوں سے کشید کیے ہوئے دکھ سکھ کے موسموں کی تباہ کاریاں...

کمرا مختصر سا تھا اور اس کے آخری حصے میں ایک عدد سنگل بیڈ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ بیڈ کے عین اوپر چھت کے ساتھ لگا ہوا روشن دان تھا جس میں شیشہ فکس تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس روشن دان کے باہر کیسا منظر دکھائی دیتا تھا کیونکہ وہ اس تک جا نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی باہر دیکھا تھا۔ بیڈ کے کنارے پیر لٹکائے بیٹھی عورت کسی تصویر کی طرح ساکت تھی۔ اس کی عمر بیالیس کے آس پاس تھی لیکن اپنی بے داغ اور روشن گلابی جلد کی وجہ سے وہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ سر کے تمام بال قدرتی طور پر سیاہ تھے۔ نقوش دلکش تھے۔ ہلکی براؤن آنکھوں میں سوچ نمایاں تھی۔ جسم بہت متناسب اور جاذبِ نظر تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور سرمئی رنگ کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ وہ اس سادہ سے لباس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔

چھت پر ہلکی روشنی والی اسپاٹ لائٹ لگی تھی مگر یہاں دیواروں کا رنگ میلا سا تھا۔ وہ کمرے کے واحد دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ مخصوص ساخت کا تھا۔ دھات سے بنا ہوا اور اس کے اوپری حصے میں ایک چھوٹا سا حصہ شیشے سے بند تھا۔ اس سے یکساں طور پر کمرے کے اندر اور باہر دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ اسے باہر سے ہی کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا۔ اندر سے اس میں کوئی ہینڈل نہیں تھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا اور وہ یہاں قید تھی۔ اس تنگ و تاریک کمرے کے باہر بھی بہت تنگی و تاریکی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ پاگل تھی یا دوسرے پاگل ہو گئے تھے جنہوں نے اسے یہاں بھیجا تھا۔

☆☆☆

وہ صرف پندرہ برس کی تھی اور دلہن بن کر غضب ڈھا رہی تھی۔ اسے دیکھنے والوں کا یہی خیال تھا۔ سب واجد علی شاہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ اگر اس کے نام سے پہلے نواب اور آخر میں رنگیلا لگا دیا جاتا تو وہ اسمِ با مسمّٰی بن جاتا۔ دولت کے لحاظ سے وہ نواب تھا۔ اگرچہ اس کے شجرۂ نسب میں کسی نواب کا خون شامل نہیں تھا۔ اس کا باپ ساجد علی تقسیم کے بعد گجرات سے کباڑ بیچتے ہوئے پاکستان آیا اور یہاں بھی اس نے یہی شغل جاری رکھا جو آنے والے دنوں میں بہت بابرکت ثابت ہوا۔ پہلے اس نے ایک

چھوٹی سی پیپر مل لگائی مگر اسے بیچ کر وہ ٹیکسٹائل کے میدان میں کود پڑا۔ واجد علی، ساجد علی کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہ باپ کے بعد سب اسے ہی ملا تھا۔ وہ ذہین تھا مگر باپ جیسا نہیں اس لیے کاروبار کو بڑھا نہیں سکا مگر کامیابی سے چلاتا رہا۔ باپ نے اپنی زندگی میں ہی اس کی شادی کر دی تھی۔

بیوی سے بنی نہیں۔ بظاہر اس کی وجہ اولاد کی کمی تھی لیکن درحقیقت واجد عیاش شخص تھا۔ بیوی سے زیادہ وہ دوسری عورتوں کے پاس پایا جاتا تھا جنہیں اس کی شکل و صورت کے بجائے اس کی دولت سے دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے پہلی بیوی صرف دس سال میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ تب واجد آزاد ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ تاعمر آزاد ہی رہے گا مگر کیوپڈ کا تیر خاصی تاخیر سے اس کے دل تک پہنچا۔ وجہ بڑی سادہ تھی۔ جس پر یہ دل آتا تھا، وہ اس کی عمر کے تیسویں سال میں اس دنیا میں آئی تھی اور جب اس کی زندگی میں آئی تو صرف پندرہ سال کی تھی۔ واجد عمر میں اس سے تین گنا بڑا تھا مگر دولت میں اس کے باپ سے لاکھوں گنا آگے تھا۔ رحمت اللہ برنس روڈ پر چاٹ کی ریڑھی لگاتا تھا اور اسی سے اپنے کنبے کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کے چار بچوں میں نور النسا واحد بچی تھی جو میٹرک تک پہنچی اور شاید اسی لیے میٹرک میں آئی تھی کہ واجد علی کی نظرِ کرم اس پر آئے۔ وہ اس ٹرسٹ اسکول کی اسناد کی تقسیم میں مہمانِ خصوصی تھا۔ جب نور اپنی سند لینے آئی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا اور اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا۔

آدمی جب فیصلہ کر لے تو اس پر عمل درآمد کی راہ نکال ہی لیتا ہے۔ واجد نے معلوم کر لیا کہ نور النسا کون تھی اور اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ یہ جان کر اسے اپنی منزل آسان نظر آنے لگی۔

واجد نے دس فیصد ناکامی کا امکان بھی ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ایک باقاعدہ پلان سوچ لیا۔ سب سے پہلے رحمت کے ٹھیلے کو نامعلوم افراد نے آگ لگا دی۔ یہ اس کا کاروبار تھا اور اس کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے کوشش اور قرض ادھار کر کے دوبارہ ریڑھی بنوائی کہ ایک مہینے بعد اسے بھی آگ لگا دی گئی۔ اب رحمت کی تباہی میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ اس کے گھر فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ ایسے میں واجد علی شاہ اس کا نجات دہندہ بن کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے رحمت کو دوبارہ کاروبار کرایا اور پہلے سے زیادہ اچھا کرا دیا۔ اس نے رحمت کو دکان دلوا دی۔ یہ دکان اس نے خرید لی تھی۔ دکان کے لیے سامان بھی دیا اور کرایہ طلب نہیں کیا۔ رحمت حیران تھا کہ اس جیسا سیٹھ اس جیسے معمولی شخص کے لیے اتنا کر رہا ہے مگر جو بات رحمت کے ذہن میں نہیں آئی تھی، وہ اس کی جاہل بیوی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے شوہر سے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے سیٹھ نورالنسا کو پسند کرتا ہے اسی لیے مدد کر رہا ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ اسے لڑکیوں کی کمی ہے جو ایک غریب کی لڑکی کو پسند کرے گا۔''

نورالنسا کی ماں جانتی تھی کہ اس کی بیٹی کے پاس وہ سب ہے جو بہت سی جدی پشتی اور منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والی لڑکیوں کے پاس نہیں ہوتا۔ پھر اس نے گھر آئے واجد کی دلچسپی محسوس کرلی تھی۔ اس نے شوہر سے کہا۔ ''تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔ فرض کرو کہ اس نے نور کا رشتہ مانگ لیا تو...''

رحمت پریشان ہوگیا۔ ہاں کے لیے اس کا دل نہیں مان رہا تھا اور وہ انکار کرتا تو اس کاروبار سے ہاتھ دھو لیتا جو واجد نے اسے کرا کے دیا تھا۔ اس علاقے میں دکان لینا اس کی حیثیت سے باہر تھا اور دکان کے بغیر وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا ذائقہ دکان یا ٹھیلے کے بغیر بیکار تھا۔ اس میں تو فی الحال ٹھیلا لینے کی سکت بھی نہیں تھی۔ وہ ابھی قرض اتار رہا تھا۔ واجد نے ہوشیاری سے اسے صرف دکان اور سامان کرا کے دیا تھا، نقد رقم نہیں دی تھی۔ اب وہ جو کما رہا تھا، اس سے اپنا گھر چلانے کے ساتھ قرض بھی اتار رہا تھا۔ ''تو ہی کچھ مشورہ دے نیک بخت۔''

''تم ہاں کردینا۔'' بیوی نے سکون سے کہا۔

رحمت اللہ دم بہ خود رہ گیا۔ ''نور کو اس شخص سے بیاہ دوں جو عمر میں اس سے تین گنا بڑا ہے۔''

''اس کی عمر مت دیکھو، اس کی دولت اور نور کے لیے اس کی دلچسپی دیکھو۔ وہ اسے خوش رکھے گا۔ مرد کا کیا ہے ستر سال کا بھی ہو کر مرد ہی رہتا ہے۔'' بیوی نے پتے کی بات کی۔ ''سب سے بڑی بات ہے، ہم باقی دو بیٹیاں عزت سے بیاہ سکیں گے۔ جب گڈو بڑا ہوگا تو اسے تمہاری طرح دھکے نہیں کھانے پڑیں گے۔ وہ اپنے باپ کا کاروبار سنبھالے گا۔''

بیوی کی سمجھ داری نے رحمت کو قائل کرلیا۔ اس لیے جب واجد علی شاہ نے اپنے منیجر کو رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیجا تو انہوں نے پہلی بار میں اپنی رضامندی دے دی تھی۔ واجد کامیاب رہا تھا۔ راستہ ہموار ہوتے ہی اس نے تاخیر کے بغیر معاملہ آگے بڑھایا اور صرف ایک مہینے میں نورالنسا بیاہ کر اس کی عالی شان کوٹھی میں آگئی۔

واجد علی نے اسے پسند کیا تھا مگر جب وہ اس کے پاس آئی تو وہ سچ مچ اس کا دیوانہ ہوگیا۔ نورالنسا کی خوب صورتی اور اس کی معصومیت نے واجد کا دل جیت لیا۔ شاید اس نے اس دنیا میں کسی سے محبت کی تھی تو وہ نور ہی تھی۔ وہ اس کا بچوں کی طرح خیال رکھتا تھا۔ دفتر سے اٹھتے ہی وہ سیدھا گھر آتا اور پھر سارا وقت نور کے لیے مخصوص ہوتا۔ یہ وہی واجد علی شاہ تھا جس کی اکثر راتیں کوٹھی کے بجائے کہیں اور ہی بسر ہوتی تھیں۔ مگر نور کے آتے ہی اس نے انہیں یوں فراموش کردیا جیسے ان سے کبھی تعلق تھا ہی نہیں۔

واجد کا خیال بلکہ یقین تھا کہ وہ زیادہ عرصے اس روش پر قائم نہیں رہے گا۔ اس کے قدم پھر سے دوسرے کوچوں میں بھٹکنے لگیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ نورالنسا کے حسن اور پھر اس سے زیادہ اس کی خدمت گزاری اور تابع داری نے واجد کو یوں اپنا اسیر کرلیا کہ وہ دوسرے راستے ہی بھول گیا۔ واجد نے اس کے جتنے ناز اٹھائے، اسے جتنی چاہت دی، کوئی اور عورت ہوتی تو اس کے سر پر سوار ہوجاتی مگر نور اس کے قدموں کی زنجیر بن گئی جو قدموں میں رہتی ہے لیکن آدمی کو کہیں اور جانے بھی نہیں دیتی۔ پھر اس نے پہلے ہی سال اسے بیٹا بھی دے دیا اور جب واجد نے بیٹے کے ساتھ اپنی پہلی تصویر بنوائی اور دیکھی تو اسے لگا جیسے وہ اس کا بیٹا نہیں اس کا پوتا ہو۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ اپنی عمر کی آخری منزل تک پہنچ گیا ہے۔ سینتالیس برس زیادہ عمر نہیں ہوتی لیکن اس نے جو بے اعتدال زندگی اب تک بسر کی تھی، اس نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔

ایک سال بعد اس کا دوسرا بیٹا ہوا اور مزید دو سال بعد بیٹی ہوئی تو واجد علی کو فکر لاحق ہوگئی کہ اس کے بعد نورالنسا کیسے ان بچوں کو سنبھالے گی اور سب سے بڑھ کر وہ بزنس کیسے دیکھے گی۔ وہ صرف میٹرک پاس تھی اور اس نے گھر سے ہٹ کر باہر کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اسے دنیا کا پتا نہیں تھا۔ صفدر علی بیس بائیس برس کی عمر سے پہلے کاروبار سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اصغر علی تو اور چھوٹا تھا۔ حور لڑکی تھی اور اسے بیاہ کر اپنے گھر چلے جانا تھا۔ واجد علی کو نہ جانے کیوں اپنی زندگی کی طرف سے اطمینان نہیں تھا۔ حالانکہ باون برس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔

خاصے غور و خوض کے بعد واجد علی نے ایک فیصلہ کیا اور پھر نور سے بات کی۔ ''میں چاہتا ہوں تم آگے پڑھو۔''

وہ سمجھی کہ واجد مذاق کر رہا ہے۔ وہ ہنسی۔ ''کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تین بچوں کی ماں بن کر آگے پڑھوں گی۔ اب تو میرا بیٹا اسکول جانے لگا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' واجد سنجیدہ رہا۔

''تم آگے پڑھ سکتی ہو۔ ذہین ہو اور میٹرک بھی بہت اچھے نمبروں سے کیا تھا۔''

نورالنسا راضی نہیں تھی مگر شوہر کے اصرار پر مان گئی۔ وہ واجد علی سے محبت کرتی تھی۔ شروع میں وہ کچھ ڈری سہمی رہی مگر جب واجد نے اسے محبت اور مان دیا تو وہ خود بہ خود اس کے دل میں گھر کرتا چلا گیا۔ پہلے نور کی رضا میں تابع داری ہوتی تھی تو اب وفاداری بھی شامل ہوگئی۔ واجد نے اسے ایک بہترین کالج میں داخلہ دلایا۔ اس نے نور کے لیے کامرس منتخب کی تھی۔ اس نے آرٹس میں میٹرک کیا تھا اس لیے شروع میں اسے مشکل ہوئی لیکن جلد وہ نصاب سمجھنے لگی۔ کالج کے علاوہ شام کے وقت ایک استاد پڑھانے کے لیے آتا تھا۔ نور کی فطری ذہانت بھی چمک اٹھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فرسٹ ایئر میں اس نے کالج میں پوزیشن حاصل کی۔ وہاں لڑکیوں کو علم نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں ہے۔ وہ اکیس برس کی عمر میں اپنے چھریرے جسم اور معصوم چہرے کی وجہ سے سترہ اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ ڈرائیور اسے چھوڑنے اور لینے آتا تھا۔

کالج میں اس نے لڑکیوں سے فاصلہ رکھا اور اتنا گھلنے ملنے سے گریز کیا کہ وہ گھر تک پہنچ جائیں۔ وہ خود بھی کسی کے گھر نہیں جاتی تھی۔ اگر کوئی پیریڈ خالی ہوتا تو اس کا وقت لائبریری میں گزرتا۔ اسے کینٹین یا لان میں وقت گزاری کا شوق نہیں تھا۔ چار سال میں اس نے گریجویشن کیا تو اس وقت تک اس کی بیٹی حور بھی اسکول جانے لگی تھی۔ باہر نکلنے کے باوجود نور کا دل گھر میں لگا رہتا تھا۔ وہ کالج سے آتی تو بے تابی سے بچوں سے ملتی۔ انہیں آغوش میں لے کر پیار کرتی۔ ایک دن واجد نے اسے بچوں سے یوں ٹوٹ کر ملتے دیکھا تو عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''نورا! بچوں کو اتنا نہ چاہو کہ کل جب یہ تم سے آنکھیں پھیریں تو تکلیف ہو۔''

''اللہ نہ کرے، یہ مجھ سے آنکھیں پھیریں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں تو یہ بھی مجھ سے محبت کریں گے۔''

''تم بھول رہی ہو یہ تمہارے ہی نہیں، میرے بچے بھی ہیں۔ میں اپنے اور اپنی نسل کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ نورا! ہمارے خون میں وفا نہیں ہے۔ ہم بہت خود غرض لوگ ہیں۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔ آپ نے میرے ساتھ کبھی ایسا رویہ نہیں رکھا۔'' نور نے ماننے سے انکار کردیا۔ ''اور جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو ماں باپ ان سے اس لیے تھوڑی محبت کرتے کہ وہ بھی ان سے ایسی ہی محبت کریں۔''

''بات محبت کی نہیں، خود غرضی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے ان کے خون میں بھی وفا نہیں ہے۔''

نور حیران ہوئی۔ ''واجد! کیا ہوگیا ہے آپ کو... اپنی اولاد کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہیں؟''

واجد علی خاموش ہوگیا۔ اس نے نورالنسا سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اپنی بے اعتدال زندگی کا ہر راز اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا مگر ایک راز ایسا تھا جس سے نور بھی بے خبر تھی۔ بہ ظاہر واجد کے باپ ساجد علی کا انتقال ہارٹ اٹیک سے ہوا تھا لیکن یہ بات صرف واجد جانتا تھا کہ ساجد علی کو طبی امداد اتنی تاخیر سے ملی تھی کہ ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔ اگر اسے بروقت اسپتال لے جایا جاتا تو وہ بچ سکتا تھا۔ یہ تاخیر واجد نے کی تھی اور اس نے پہلے سے نہیں سوچا تھا بلکہ جب ساجد کی طبیعت خراب ہوئی تو اس وقت اس کے ذہن میں خیال آیا اور اس نے اس پر عمل کیا۔ اس نے باپ سے کہا کہ اسے گیسٹرک پرابلم ہو رہی ہے۔ وہ اسے گیسٹرک کی دوائیں دیتا رہا۔ حتیٰ کہ ساجد بے ہوش ہوگیا۔ تب وہ اسے اسپتال لے کر گیا اور تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ ساجد شوگر کا مریض تھا اس لیے تسلیم کرلیا گیا کہ اس کے ہارٹ اٹیک کا بہت دیر سے علم ہوا۔ کسی نے واجد پر شک نہیں کیا مگر وہ جانتا تھا۔ جب اس کی اولاد ہوئی تو شاید ضمیر نے اسے آئینہ دکھایا۔ جب نور سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی تو وہ خوش تھا کہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ نہیں ہوگا جو اس نے اپنے باپ کے ساتھ کیا تھا۔ مگر نور سے اولاد ہوئی تو خدشات جاگ اٹھے۔

کالج کے بعد واجد نے نور کو یونیورسٹی کی ایوننگ شفٹ میں ایم بی اے میں داخلہ دلوا دیا۔ صبح میں وہ اسے اپنے ساتھ چند گھنٹے کے لیے دفتر میں بٹھانے لگا جہاں وہ انتظامی امور دیکھتی اور روزمرہ کے معاملات میں شامل ہوتی۔ صبح بچے اسکول جاتے تھے اس لیے وہ فارغ ہوتی تھی۔ پھر بچوں کے آنے سے پہلے وہ گھر آجاتی اور شام کو یونیورسٹی جاتی۔ دو سال بعد واجد نے اسے بورڈ آف ڈائریکٹر کا رکن بنا دیا اور ساتھ ہی اسے کمپنی کے ایک تہائی شیئرز کا مالک بھی بنا دیا۔

نورالنسا نے پہلے دو سال میں جانا کہ بزنس کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے اور اب وہ سیکھ رہی تھی کہ بزنس کیا کس طرح

جاتا ہے۔ اپنی ذہانت سے وہ واجد کو مطمئن کرتی رہی اس لیے واجد زیادہ سے زیادہ اختیارات اسے دیتا رہا۔ بالآخر اس کا ایم بی اے مکمل ہو گیا اور وہ بزنس کے خاصے امور پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ ان ہی دنوں واجد کی طبیعت خراب ہوئی اور اس نے توجہ نہیں دی۔ کھانسی تھی جو کبھی کبھی شدت اختیار کر جاتی تو وہ ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا۔ مسلسل کئی مہینے تک دوائیں استعمال کرنے کے باوجود جب افاقہ نہیں ہوا تو ڈاکٹر نے اسے ٹیسٹ کرانے کو کہا اور ٹیسٹ میں یہ خوفناک حقیقت سامنے آئی کہ اسے گلے اور پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا تھا۔ کینسر دوسرے درجے میں تھا اور اس کا علاج ممکن تھا۔

واجد علی فوری طور پر علاج کے لیے سنگاپور گیا۔ وہاں اس کا آپریشن ہوا اور پھیپھڑوں کے ساتھ سانس کی نالی کا ایک حصہ بھی نکال دیا گیا۔ اس کی جگہ مصنوعی نالی لگی تھی۔ وہ صحت یاب ہو کر واپس آیا اور ایک سال تک ٹھیک رہا مگر جلد کینسر نے پھر حملہ کیا اور اس بار اس نے پورے جسم کو متاثر کیا۔ اس دوران میں نور بزنس اور گھر دیکھتی رہی۔ اسے شوہر کی فکر تھی مگر یہ واجد کا حکم تھا کہ وہ اس کی فکر کیے بغیر بزنس اور گھر دیکھے۔ وہ واپس آیا تو نور نے سکون کا سانس لیا مگر واجد علی کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس مہلت نہیں ہے۔ اس لیے وہ عجلت میں باقی اختیارات اور امور بھی نور النسا کو منتقل کرنے لگا۔ اس نے اپنی ملکیت میں تمام چیزیں اس کے نام کر دیں۔ ساتھ ہی وہ اسے سمجھاتا رہا کہ وہ کسی پر بھروسا نہ کرے کیونکہ دولت کی وجہ سے لوگ یوں اس کے گرد جمع ہوں گے جیسے شیرے پر مکھیاں آتی ہیں۔ سب اسے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے اور اسے ان سے بچنا ہوگا۔ اسے محتاط اور سخت رویہ رکھنا ہوگا۔ شادی کے ٹھیک چودہ سال بعد واجد علی شاہ اسے اپنا سب کچھ سونپ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ نور کو شاک لگا مگر اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔

واجد کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ اس کے مرتے ہی نور النسا کے رشتے دار اور واجد کے کچھ دور پرے کے رشتے دار آن موجود ہوئے۔ وہ اس چکر میں آئے تھے کہ وراثت میں انہیں بھی کچھ ملے گا مگر انہیں مایوسی ہوئی کہ واجد پہلے ہی اپنی ایک ایک چیز نور کے نام کر گیا تھا اور خود دنیا سے سکندر کی طرح خالی ہاتھ گیا تھا۔ ابتدائی مایوسی کے بعد وہ سوچ کر پُرامید ہو گئے کہ نور ایک عورت ہے اور اسے بے وقوف بنانا یا اپنی مرضی پر چلانا آسان کام ہے۔ مگر جلد انہیں یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ نور اب پندرہ سال کی معصوم اور ناسمجھ لڑکی نہیں رہی تھی۔ اب وہ تیس سال کی پختہ کار اور دنیا کی سمجھ بوجھ رکھنے والی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی۔ اس نے رشتے داروں اور مخلص بن کر آنے والوں کی تجاویز اور مشورے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیے۔ جنہوں نے زیادہ اصرار کیا انہیں دوسری طرح جواب دیا اور جنہوں نے اس کا سرپرست بننے کی کوشش کی، انہیں گیٹ کا راستہ دکھا دیا۔

رحمت اللہ چند سال پہلے گزر گیا تھا اور اس کے بعد نور کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھی مگر وہ باقی دو بیٹیوں کی شادی کر گئے تھے۔ باقی دو داماد بیٹیوں کی مناسبت سے تھے مگر صرف عمر کی حد تک۔ ورنہ دونوں ایک نمبر کے چالاک اور موقع پرست تھے۔ انہوں نے اپنے سالے نعمت کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کا فائدہ اٹھا کر اس کی دکان پر قبضہ کر لیا اور وہ بے چارہ صرف چاٹ تیار کرنے والا رہ گیا کیونکہ رحمت اسے اپنا فن سکھا گیا تھا۔ نعمت طبیعتاً بھی دب جانے والے لوگوں میں سے تھا اور پھر بہنوں کا معاملہ تھا اس لیے وہ چپ کر کے بہنوئیوں کی زیادتی برداشت کرتا رہا۔ جب ریحان اور جلیل نے نور کے ساتھ بھی یہی کرنا چاہا تو اس نے ان پر واضح کر دیا کہ اسے اپنے بہنوں کی فکر نہیں ہے۔ خود غرضی میں وہ اپنے شوہروں سے کسی طرح کم نہیں تھیں اور نور یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اگر انہوں نے زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے تو اس دکان سے بھی جائیں گے جو اب اس کی ملکیت تھی۔ واجد نے دکان ہمیشہ اپنی ملکیت میں رکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد نور نے نعمت کو دوسری دکان کروا دی اور وہ بہنوئیوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔ اس کی شادی ہو گئی اور اب اسے اپنی بیوی بچوں کی ذمے داریاں پوری کرنی تھیں۔ اس نے چاٹ ہاؤس کے بجائے پکوان سینٹر کھول لیا اور چند سالوں میں وہ اپنا کاروبار جما چکا تھا۔ وہ مالی لحاظ سے مضبوط ہوا تو نور اس کی فکر سے بے نیاز ہو گئی۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے بہت دنوں سے اسے دھوپ نہ لگی ہو اور نہ ہی چادر اور تکیے کا کور بدلا گیا ہو۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازہ کھلا اور باہر موجود سفید لباس میں موجود نرس نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ایک ٹرالی تھام رکھی تھی۔ اس کے نقوش سخت اور لہجہ کرخت تھا۔

"کھانا لے لے۔"

وہ اٹھ کر آگے آئی۔ عورت نے ایک پلاسٹک کے ڈونگے میں دلیا نما کوئی چیز نکال کر اسے تھما دی، اس کے ساتھ چھوٹی کولڈ ڈرنک کی استعمال شدہ بوتل تھی جس میں پانی تھا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ عورت آگے بڑھ گئی مگر دروازہ بند ہونے سے پہلے اس نے دیکھ لیا تھا سامنے والے دروازے کے اوپر سے ایک سفید بالوں اور سرخ چہرے والا شخص جھانک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا اور نہ جانے کیوں وہ اسے جانا پہچانا لگا تھا پھر دروازہ بند ہو گیا۔ وہ اس کے اوپری حصے سے اچک کر جھانک سکتی تھی کیونکہ اس کا قد اتنا نہیں تھا۔ وہ دلیے کا ڈونگا اور پانی لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سخت بدمزہ ہوگا مگر پیٹ خوراک مانگتا ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے چمچ بھرا اور منہ میں رکھ لیا۔

☆☆☆

سامنے والے کمرے میں موجود سفید بالوں والا بوڑھا سہیل احمد صدیقی تھا۔ اس کے بال قدرتی طور پر سفید تھے ورنہ اس کی عمر پچاس سال بھی نہیں تھی۔ صحت اچھی تھی اور رنگت سرخ و سفید تھی۔ خوش شکل اور سفید بالوں سے قطع نظر اپنی عمر سے کم ہی لگتا تھا۔ اس نے بھی سفید رنگ کا کرتا اور سرمئی رنگ کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ شاید یہ یہاں کا یونیفارم تھا۔ سہیل احمد دو ہفتے پہلے یہاں لایا گیا تھا۔ دو ہفتے پہلے اسے ہوش آیا تو وہ ایک کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک بکھرے بالوں اور عجیب نقوش والا شخص کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک پرانے طرز کا کیمرا لٹک رہا تھا جس میں فوٹوگرافر اوپر سے دیکھ کر تصویر لیتے تھے۔ وہ اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے سر... میں دیکھ لیتا ہوں آپ بے فکر رہیں... تصویریں بہت اچھی آئیں گی... آپ جانتے ہیں... کیمرا پرانا ہے مگر آپ کو تو پتا ہے کہ میں کیسا کام کرتا ہوں۔"

سہیل احمد یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے آیا۔ فوٹوگرافر فون پر بات کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک نرس اندر آئی۔ اس نے آتے ہی سہیل احمد کے بازو سے آستین اوپر کی اور انجکشن لگانے کی تیاری کرنے لگی۔ سہیل احمد کسمسایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے... میں یہاں کیسے آیا؟... اے، تم مجھے انجکشن کیوں لگا رہی ہو؟"

مگر نرس نے بے نیازی سے اسے انجکشن لگا دیا۔ چند لمحے بعد سہیل احمد کا دماغ گھومنے لگا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ اسے لگا جیسے اس کے آس پاس کچھ ہو رہا ہے، وہ بول رہا ہے اور حرکت کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر وہ کیا بول رہا ہے اور کیا کر رہا ہے، اسے یہ خبر نہیں تھی۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سامنے سرخ روشنی ہو رہی تھی۔ پھر ایک بڑا سا سر اس کے سامنے آیا۔ سر پر برائے نام بال تھے۔ ماتھا بہت بڑا اور اس کے نیچے بیک وقت مکارانہ اور سفاکانہ سے نقوش تھے۔ اس کی آنکھیں جیسے خون میں ڈوبی ہوئی تھیں اور نکیلی ناک تلے پتلے ہونٹ مستقل کھنچاؤ کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر لگ رہے تھے۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ "سہیل احمد! کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

اس کا سر اس وقت بھی گھوم رہا تھا۔ "میں... کہاں ہوں؟"

"میرے کلینک میں۔" آدمی نے جواب دیا۔ "میں ڈاکٹر کاشان ہوں مگر جاننے والے مجھے ڈاکٹر کیش کہتے ہیں۔"

"کلینک مگر کیوں؟... مجھے کیا ہوا ہے؟"

"تمہیں دماغی دورہ پڑا تھا۔" ڈاکٹر کیش نے اطمینان سے کہا۔

"یہ غلط ہے۔" سہیل احمد نے کسمسا کر کہا تو اسے پتا چلا کہ وہ اس کرسی سے بندھا ہوا ہے۔ "مجھے کیوں باندھا ہوا ہے؟"

"تمہیں دورہ پڑا تھا۔" اس نے جواب دیا اور پھر مڑ کر دیکھا تو ایک اسکرین پر سلائڈ چلنے لگی۔ اس میں سہیل احمد کی تصاویر تھیں اور ان میں وہ خود کو دیوانہ وار ان بندشوں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا جن میں وہ جکڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کیش نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ "اپنی حالت دیکھو، تمہارے چہرے پر کس قدر دیوانگی ہے۔" یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تاسف کے بجائے لطف کا عنصر تھا۔ وہ اس سلائڈ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سہیل احمد دم بہ خود تھا۔ اس کے چہرے پر دیوانگی کے تاثرات اس قدر مکمل تھے کہ اسے پاگل سمجھنے کے لیے یہی کافی تھے مگر وہ جانتا تھا کہ یہ سچ نہیں۔ کل رات وہ اپنے گھر میں تھا اور اچھا بھلا تھا۔ پھر اچانک اسے کیا ہوا کہ وہ اس طرح دیوانہ ہو گیا؟

وہ سوچ رہا تھا اور اسے پتا نہیں چلا کہ کب اسے خاموشی سے انجکشن دے دیا گیا۔ یہ نیند کا انجکشن تھا۔ وہ سو گیا اور جب جاگا تو اس کمرے میں تھا۔

☆☆☆

سہیل احمد نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ بہت کمسن تھی، مشکل سے پندرہ برس کی اور پھر وہ اس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ اس ٹرسٹ اسکول میں رضا کار استاد کی حیثیت سے پڑھاتا تھا۔ اس نے گریجویشن کے پیپرز دیے تھے اور اب ایم بی اے میں داخلہ لینا تھا۔ رزلٹ آنے تک اس کے پاس کچھ وقت تھا۔ اس کے ایک کالج فیلو کا صنعت کار باپ اس ٹرسٹ اسکول کے سرپرستوں میں سے تھا۔ اس نے سہیل سے کہا کہ وہ کچھ مہینے یہاں رضا کارانہ پڑھا دے۔ سہیل احمد مان گیا۔ اس کا باپ بھی ایک صنعت کار تھا مگر وہ اپنی فیکٹری میں لگنے والی آگ میں مارا گیا تھا۔ سہیل احمد کی ماں اس صدمے سے گزر گئی تھی۔ جب یہ سانحہ ہوا تو سہیل احمد صرف سترہ سال کا اور انٹر کا طالبِ علم تھا۔ اس کے چار بہن بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ اب وہی ان کا سرپرست تھا۔

اس نے اپنے کچھ ہمدردوں کی مدد سے انشورنس کی رقم وصول کی اور اسے ڈپازٹ کر دیا۔ فیکٹری کی زمین بیکار تھی اسے کرائے پر دے دیا اور اسی سے ان کا گزارہ ہونے لگا۔ یعنی مالی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود نوجوانی میں چار بہن بھائیوں کی دیکھ بھال اور ان کی پرورش آسان نہیں تھی۔ سب سے چھوٹی ہما تھی جو نو سال کی تھی۔ اس سے بڑا امزل احمد گیارہ سال کا پھر چودہ سال کی حنا اور سہیل سے چھوٹا کامل پندرہ سال کا تھا۔ وہ بچے نہیں تھے مگر انہیں دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ سہیل احمد نے بہ خوبی یہ ذمے داری نبھائی تھی۔ ماں باپ کے بعد اسے احساس ہوا کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسانوں کا تو کیا مالی سہارا بھی نہیں ہوتا اور ان کی مدد کرنا دوسروں پر فرض ہوتا ہے۔

اسی جذبے کے تحت وہ اس ٹرسٹ اسکول میں پڑھانے آیا جہاں غریب بچے پڑھتے تھے جن کے والدین سرکاری اسکول میں تعلیم دلانے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے دن اس نے میٹرک کلاس کی اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ لڑکیوں والی طرف سب سے آگے بیٹھتی تھی کیونکہ وہ سب سے ذہین تھی۔ ایک نظر میں اس نے سہیل احمد کی توجہ حاصل کر لی۔ وہ اسے دیکھتا تو اس کے اندر دل کی دھڑکن ایک لمحے کو گڑبڑا جاتی۔ وہ خود کو یاد دلاتا کہ وہ بہت چھوٹی ہے اور وہ اس کا استاد ہے۔ یہ اس کے منصب کی اخلاقیات کے خلاف ہے۔ اس لیے جب وہ اس کلاس میں آتا تو اس کی نظریں زیادہ تر جھکی رہتیں۔ رفتہ رفتہ اسے لڑکی کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہے اور اس کا تعلق کس طبقے سے ہے۔ تین مہینے بعد اس کا رزلٹ آ گیا اور وہ ایم بی اے میں داخلے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اس نے گریجویشن میں بہت اچھے نمبر لیے تھے پھر اس کا ٹیسٹ بھی بہترین رہا اور اسے آئی بی اے میں داخلہ مل گیا۔

جب تک داخلہ نہیں ملا تھا، وہ اسکول جاتا رہا۔ یہ ٹرسٹ اسکول انٹر تک تھا اس لیے اسے امید تھی کہ لڑکی آگے بھی پڑھے گی۔ مگر ایک بار جب وہ اسکول گیا تو اسے پتا چلا کہ لڑکی نے میٹرک کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا۔ یہی نہیں اس کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ سہیل احمد شاک میں رہ گیا۔ اس نے لفظ محبت کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، بس اس کے اندر تھا کہ یہ لڑکی اس کے لیے خاص اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اب وہ کسی اور کی ہو گئی تھی اور اب برسوں بعد، پورے ستائیس بعد سہیل احمد نے اسے یہاں اس قید خانے میں دیکھا تھا۔ گیارہ دن وہ اسی کوٹھری میں پڑا رہا تھا۔ پھر اسے نکال کر اوپری فلور پر یہاں لائے تھے اور اس نے پہلی صبح اسے دیکھا تھا۔ ستائیس برس بہت طویل عرصہ ہوتا ہے۔ دنیا بدل جاتی ہے، انسان کی کیا حیثیت ہے۔ پندرہ سالہ لڑکی اور بیالیس سال کی پختہ عمر عورت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اس کے باوجود سہیل احمد نے اسے پہچان لیا تھا۔ شاید آنکھ کی گواہی پر وہ یقین نہ کرتا لیکن دل کی گواہی کو وہ کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ وہ اس کے دل میں ہی تو رہتی تھی۔

☆☆☆

شہر سے ذرا فاصلے پر واقع یہ عمارت باہر سے ہی پُراسرار اور کسی قدر سہما دینے والا تاثر رکھتی تھی۔ اس دو منزلہ عمارت کے گرد تقریباً دس فٹ اونچی دیوار تھی اور اس پر خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ عمارت پر ہلکا سرمئی رنگ تھا اور باہر سے اس کی اوپری منزل کی جتنی کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں، ان پر فولادی سلاخیں لگی ہوئی تھیں.... چار دیواری میں بڑے گیٹ کے بجائے ایک چھوٹا سا گیٹ لگا ہوا تھا۔ اس پر ہمہ وقت گارڈ موجود رہتا تھا۔ وہاں آنے والے اپنی گاڑیاں باہر پارک کرتے تھے۔ مگر وہاں بہت کم لوگ آتے۔ چار دیواری کے سامنے والے حصے پر ایک سادہ بورڈ لگا ہوا تھا، اس پر لکھا تھا "کاشان کلینک"۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی وضاحت نہیں تھی۔ یہ عمارت جس اسکیم میں تھی وہاں اس کے سوا اور کوئی عمارت نہیں کھڑی تھی کیونکہ بلڈر نے یہاں بنیادی سہولیات ہی نہیں دی تھیں۔ اس عمارت کے لیے بھی نصف کلومیٹر دور مین ہائی وے سے بجلی، پانی، فون اور گیس کی سہولت خود حاصل کی گئی تھی۔

عمارت کے نچلے حصے میں کچھ حصہ دفاتر اور علاج گاہ کے طور پر مخصوص تھا اور عقبی حصے میں مریضوں کو رکھا جاتا تھا جبکہ اوپری فلور مکمل طور پر مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ایک درجن کمرے تھے جن میں مریضوں کو اس طرح رکھا جاتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک معمولی سا سائیکاٹرسٹ تھا۔ اس کا چھوٹا سا ذاتی کلینک تھا اور وہ ایک اسپتال میں بھی بیٹھتا تھا مگر اس کی پریکٹس نہ ہونے کے برابر تھی۔ دس سال پہلے جب وہ تعلیم مکمل کر کے عملی میدان میں آیا تو اس کے پاس اچھا موقع تھا۔ وہ معروف سائیکاٹرسٹ پروفیسر منیر کے ساتھ کام کرتا تھا مگر پھر کسی وجہ سے پروفیسر نے اسے نکال دیا۔ اس سے کوئی غلطی ہوئی تھی اور اس نے پروفیسر منیر سے معافی بھی مانگ لی تھی مگر وہ اس کے پاس واپس نہیں جا سکا کیونکہ کچھ عرصے بعد پروفیسر اپنے کلینک میں پُراسرار طور پر مردہ پایا گیا۔ اسے سرکاری ملازمت ملی مگر یہ بھی زیادہ عرصے جاری نہیں رہی۔ وہاں اس کے بارے میں منفی رپورٹ آئی تھی کہ وہ مریضوں کی ذاتی زندگی کے راز افشا کرتا ہے اور ان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر یہاں بھی ناکامی نے اس کا منہ دیکھا۔ پھر اچانک ہی جیسے تقدیر نے پلٹا کھایا۔ چند سالوں کے اندر اس نے شہر کے ایک مہنگے علاقے میں اپنا کلینک کھول لیا۔

اگرچہ یہاں بھی اس کے پاس گنے چنے لوگ آتے تھے مگر اس کے ٹھاٹ باٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خوب کما رہا ہے۔ اس نے شہر کے ایک پوش علاقے میں ذاتی بنگلا خرید لیا۔ دس سال پہلے اس نے اس ویرانے میں یہ کلینک قائم کیا۔ ڈاکٹر کاشان ایک خاص حلقے میں ڈاکٹر کیش کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کی سرگرمیاں پُراسرار تھیں کیونکہ وہ عام سوسائٹی میں گھلنے ملنے سے گریز کرتا تھا۔ وہ شام کو چند گھنٹے کے لیے شہر والے کلینک میں بیٹھتا تھا اور ہفتے میں تین بار رات کے وقت شہر سے باہر کلینک کا چکر لگاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی کار تیزی سے شہر کے باہر کلینک کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے فراخ ماتھے پر شکنیں تھیں اور آنکھیں معمول سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو یا کسی پریشانی میں ہو۔ کلینک کی عمارت کے پاس پہنچ کر اس نے کار باہر ہی روکی اور اتر کر دروازے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اندر سے گارڈ نے جھانکا اور اسے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا مگر ڈاکٹر کیش اس کی طرف توجہ دیے بغیر اندر آ گیا۔ عمارت میں آمدورفت کا ایک ہی دروازہ تھا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے مخصوص انداز میں دستک دی۔ ایک منٹ بعد اندر سے فوٹوگرافر نے دروازہ کھولا۔ اس کے بال حسبِ معمول بکھرے ہوئے تھے اور چہرے کے تاثرات عجیب سے تھے۔ اس نے ڈاکٹر کو اندر آنے کا راستہ دیا اور اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ وہ دونوں ڈاکٹر کے کمرے میں آئے۔ ڈاکٹر کیش اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر اسے گھماتا رہا پھر اس نے اچانک کہا۔ "راول! طے ہو گیا ہے۔"

راول کا اترا ہوا چہرہ مزید اتر گیا۔ اس نے کسی قدر احتجاجی لہجے میں کہا۔ "مگر کیوں ڈاکٹر... سب کچھ ٹھیک تو چل رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے اسے گھورا۔ "سب ٹھیک ہے مگر آنے والے دنوں میں شاید ٹھیک نہ رہے اس لیے سیٹ اپ فی الحال ختم کرنا ہی مناسب رہے گا۔ فکر مت کرو، تمہاری ملازمت برقرار رہے گی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" راول نے مردہ لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں تو سب ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر کیش کا چہرہ اس کی آنکھوں کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ "باس میں ہوں اس لیے فیصلہ میں کروں گا۔"

راول چونک گیا اور سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں نے کب منع کیا ہے، باس تم ہی ہو۔"

"آنے والے ہفتے کی رات کام کرنا ہے۔" ڈاکٹر کیش نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "اب سے ٹھیک تین دن بعد... تمہیں معلوم ہے کام کیسے کرنا ہے؟"

راول نے سر ہلایا۔ "معلوم ہے ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر کیش سر ہلاتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ راول اس کے پیچھے تھا اس نے دروازہ بند کیا۔ یہ سارا حصہ اس کی نگرانی میں تھا اور یہاں اس کی مرضی کے بغیر کوئی آ جا نہیں سکتا تھا۔

کُل پانچ افراد اس عمارت میں کام کرتے تھے اور

انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی کیونکہ مریض مکمل طور پر ان کے قابو میں ہوتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی کوٹھری سے بھی نہیں نکل سکتے تھے، عمارت تو دور کی بات تھی۔ ڈاکٹر کے نکلتے ہی راول دروازہ بند کر کے تیزی سے ایک کمرے میں آیا۔ یہ کنٹرول روم تھا اور یہاں ویڈیو مانیٹرز کی جاتی تھی۔ مریضوں کی کوٹھریوں میں بھی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ایک کیمرے نے ڈاکٹر کیش کو باہر جاتے دکھایا۔ اس کے جاتے ہی راول نے ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''وہ سب ختم کرنے جا رہا ہے۔ آنے والے ہفتے کی رات۔''

ریسیور رکھنے کے بعد بھی وہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے مانیٹرز پر تمام مریضوں کو چیک کیا، ان کی تعداد سترہ تھی اور وہ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ ان میں چار عورتیں اور تیرہ مرد تھے۔ یہ سارا سیٹ اپ ڈاکٹر کیش کی مرضی سے ترتیب دیا گیا تھا۔ راول مطمئن ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

نور کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کا نام پکار رہا ہو۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلے وہ اسے اپنا وہم سمجھی مگر کچھ دیر بعد اسے لگا جیسے آواز سچ مچ آ رہی ہو اور یہ دروازے کے باہر سے آ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور دروازے تک آئی۔ اس نے دروازے کے اوپر والی جالی سے باہر دیکھا۔ اس بار واضح آواز سنائی دی۔ اس نے سامنے والی کوٹھری کے دروازے سے سفید بالوں والے شخص کو جھانکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نور۔''

''آپ... مجھے پکار رہے ہیں؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔ ''آپ مجھے جانتے ہیں؟''

''ہاں، میں تمہیں جانتا ہوں میرا نام سہیل احمد ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور آہستہ بولو... یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے لیکن نیچے موجود نگران ہماری آواز سن سکتا ہے۔''

یہاں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر کیش یا اس کے ساتھی فوٹوگرافر کے علاوہ کسی نے اس سے بات کی تھی۔ یہاں مقید افراد کو آپس میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مکروہ صورت والی نرس انہیں صرف حکم دیتی تھی۔ نہ تو ان کی بات سنتی تھی اور نہ ہی ان سے کوئی بات کرتی تھی۔ دن میں دو بار انہیں کھانا دیا جاتا تھا اور دو ہی بار واش روم جانے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں کوٹھری سے نہیں نکالا جاتا تھا۔ نرس اور اس کا ساتھی مرد دونوں بہت سخت تھے اور اگر ان کی بات نہ مانی جائے یا ان سے بات کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ سخت سزا بھی دیتے تھے اور یہ سزا کرنٹ کی صورت میں دی جاتی تھی۔ ان کے پاس کرنٹ لگانے والا آلہ تھا۔ جو مریض زیادہ ہنگامہ کرتے، انہیں نیچے لے جایا جاتا تھا اور وہ دو دن وہاں رہتے۔ اس کے بعد جب واپس آتے گم صم اور خاموش ہو چکے ہوتے تھے۔ یہ سب پرانے لوگ تھے اور جانتے تھے کہ یہاں ان کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ خاموش رہنے اور حکم کی تعمیل میں عافیت سمجھتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی ان کا حوصلہ جواب دے جاتا تو وہ دبی دبی آواز میں روتے تھے اور اس میں بھی ڈرتے تھے کہ کہیں یہاں کے نگران کو نہ پتا چل جائے۔ سب سے زیادہ خوف انہیں ڈاکٹر کیش سے آتا تھا۔ ڈاکٹر کیش نے یہ سارا سیٹ اپ ان لوگوں کو اپنا فرمانبردار رکھنے کے لیے بنایا تھا۔

نور کو یہاں آئے ہوئے یہ دوسرا مہینا تھا اور کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ سچ مچ پاگل ہو گئی ہے اور اسے یہاں ٹھیک بند کیا گیا ہے۔ مگر یہ سوچیں عارضی ہوتی تھیں۔ وہ صبر سے خود پر قابو رکھتی۔ جب اسے کوٹھری سے نکالا جاتا تو اکثر دوسرے لوگوں سے جو یہاں قید تھے اس کا سامنا ہوتا تھا مگر وہ ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے جلدی جلدی باتھ روم سے فارغ ہو کر آتے تھے اور ان میں سے بعض تو جب تک کوٹھری سے باہر رہتے ان کا خوف سے برا حال ہوتا جیسے انہیں ڈر ہو ابھی ان پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب ایک شخص اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

''میں اب سے نہیں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''تم وہی نور النسا ہو جو ایمان ٹرسٹ ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں؟''

اس بار نور نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''درست ہے لیکن اس بات کو تو ستائیس سال ہو چکے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں کیونکہ میں نے ایک ایک سال کا حساب رکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے جب تم میٹرک میں تھیں تب ایک عارضی استاد آیا تھا سفید بالوں والا؟''

''مجھے یاد آ گیا۔'' وہ بے ساختہ بولی۔ ''آپ وہ سر سہیل ہیں؟''

''ہاں میں وہی سہیل ہوں لیکن میں سر نہیں ہوں۔

میں نے تو بس چند مہینے کے لیے رضا کارانہ پڑھایا تھا۔''

''لیکن استاد تو استاد ہوتا ہے۔'' نور بولی۔ ''میں تو عام سی لڑکی تھی۔ آپ نے مجھے کیسے یاد رکھا؟''

''کیونکہ تم عام لڑکی نہیں تھیں۔'' سہیل نے کہا پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ ''تم یہاں کیسے آئیں؟''

''میں یہاں کیسے آئی؟'' نور نے گویا خود سے سوال کیا۔

☆☆☆

دنیا کا مشکل ترین کام اپنی اولاد سے لڑنا ہے۔ یہ بات نور نے اس وقت جانی جب اس کے بچے بڑے ہو گئے۔ صفدر اور اصغر نے کالج کے زمانے سے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے تھے اور ان کی وہ سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں جو اوپری طبقے کی بگڑی اولاد کا خاصہ ہوتی ہیں۔ نور صبح سے شام تک بزنس میں سر کھپاتی۔ ٹیکسٹائل مل کا بزنس آسان نہیں ہوتا۔ جو وقت اسے بچوں کو دینا چاہیے تھا وہ بھی اس نے بزنس کو دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ واجد نے بزنس سنبھالنے پر زیادہ زور دیا تھا، بہ نسبت اولاد کی تربیت کے۔ اس لیے نور کی توجہ اس پر رہی تھی۔

صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب اس نے صفدر اور اصغر کو گھر میں شراب نوشی کرتے پکڑا۔ وہ اپنے کمرے میں شغل کر رہے تھے اور ان کے ساتھ دو دوست بھی تھے۔ نور پہلے تو دم بہ خود رہ گئی۔ پھر وہ ان پر برس پڑی۔ ان کے دوست تو موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہاں سے نکل گئے مگر وہ دونوں سکون سے ماں کی لعنت ملامت سنتے رہے اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی بات پر کوئی ردِعمل نہیں دے رہے ہیں تو وہ رکی تھی۔ وہ غصے سے ہانپ رہی تھی۔ صفدر نے سکون سے کہا۔ ''ماما! کیا ہم کوئی نئی بات کر رہے ہیں؟''

''اور کیا۔'' اصغر کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ ''پاپا کے بارے میں کیا خیال ہے، وہ نہیں پیتے تھے؟''

''انہوں نے شادی کے بعد چھوڑ دی تھی۔'' نور کا لہجہ کمزور ہو گیا۔

''تب ہم بھی شادی کے بعد چھوڑ دیں گے۔'' اصغر نے کہا تو نور کو غصہ آ گیا۔ اس نے بوتل اٹھا کر دیوار پر دے ماری اور چلا کر بولی۔

''میرے گھر میں یہ سب نہیں چلے گا۔''

''ماما! یہ صرف آپ کا نہیں، ہمارا گھر بھی ہے۔''

''تمہارے باپ نے سب کچھ میرے نام کیا ہے۔'' نور نے اسے جواب دیا۔ ''تم دونوں انڈر ایج ہو اور ابھی تمہارے تمام فیصلے میں کروں گی۔''

''مثلاً...'' صفدر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''تم دونوں کا جیب خرچ محدود ہو گا اور اب تم وقت سے آیا جایا کرو گے۔ دوسری صورت میں چوکیدار تمہیں اندر آنے نہیں دے گا۔''

نور کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ان پر قابو پا لے گی اور انہیں راہِ راست پر لے آئے گی مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ وہ شرافت سے گھر آ جاتے تھے اور جب نور اپنے بیڈ روم میں جاتی تو عقبی چھوٹے گیٹ سے باہر نکل جاتے، ان کے پاس اس کی چابی تھی۔ رقم کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ نور کا زیور چرا کر بیچنا شروع کر دیا۔ اپنی بائیک میں پیٹرول وہ گاڑیوں سے نکال کر ڈال لیتے تھے۔ نور کو ایک مہینے بعد پتا چلا جب اس نے اپنی جیولری چیک کی تو اس میں سے کئی چھوٹی موٹی چیزیں غائب تھیں۔ یہاں صفدر اور اصغر چالاکی سے کام لیتے تھے۔ کوئی بڑی چیز نہیں چھیڑتے تھے کہ نور کو احساس ہو جائے۔ جب اس نے ان سے پوچھا تو انہوں نے ڈھٹائی سے ملازمہ پر الزام لگا دیا۔ مگر نور جانتی تھی کہ وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ دس سال سے اس کے پاس کام کر رہی تھی اور اس نے کبھی اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔

نور پریشان ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ یہ صفدر اور اصغر کا کام ہے۔ پھر ڈرائیور نے اسے رپورٹ دی کہ گاڑیوں سے مسلسل پیٹرول غائب ہو رہا تھا اور اس نے ایک بار ان دونوں کو یہ کام کرتے دیکھا بھی تھا۔ نور نے اپنے آفس کا ایک تیز طرار لڑکا ان کے پیچھے لگایا اور اس نے ایک ہفتے کی محنت کے بعد جو رپورٹ دی، وہ خاصی ہولناک تھی۔ صفدر اور اصغر کا پڑھائی سے واسطہ بہت کم رہ گیا تھا۔ وہ جس مہنگے کالج میں پڑھتے تھے وہاں صرف کلاس لینے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کا زیادہ وقت ہائی سوسائٹی کے ایسے بگڑے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گزرتا تھا جن کا اوڑھنا بچھونا جنس اور منشیات تھا۔ وہ شراب پیتے تھے اور دوسری منشیات بھی استعمال کرتے تھے۔ نور کا دماغ گھوم گیا۔ یہ لڑکے جن کی عمریں ابھی بہ مشکل اٹھارہ اور سترہ سال تھیں تباہی کے راستے کی طرف چل پڑے تھے اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اسے تباہی کا راستہ سمجھنے کے لیے تیار بھی نہیں تھے۔

نور سختی کرتی تو وقتی طور پر سدھر جاتے مگر کچھ عرصے

بعد پھر اسی روش پر لوٹ جاتے۔ صفدر نے انٹر کیا تو نور نے اسے درمیانے درجے کی ایک یونیورسٹی میں بی بی اے میں داخلہ دلادیا۔ اس نے جو مارکس حاصل کیے تھے اسے کسی اچھی یونیورسٹی یا ادارے میں داخلہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیب خرچ کے معاملے میں بھی نور مجبور تھی، کس حد تک روک سکتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ رقم کے لیے وہ کہیں جرائم کی راہ پر نہ چل نکلیں۔ ایک سال بعد اصغر بھی اسی یونیورسٹی میں آگیا۔ نور نے انہیں کار دلا دی تھی۔ وہ اسی پر جاتے تھے۔ حور میٹرک میں آگئی تھی اور وہ نور کا نقش ثانی تھی۔ پھر اسے کھانا پینا کھلا ملا تھا تو اس کی نشوونما نور کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ وہ اسے دیکھتی تو اسے فکر لاحق ہو جاتی۔ نور کو اس کے رشتے کے حوالے سے فکر نہیں تھی بلکہ اسے فکر تھی کہ کہیں وہ بھی اپنے بھائیوں کے نقشِ قدم پر نہ چل پڑے۔ اگرچہ ابھی تک ایسے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ حور اسکول سے آنے کے بعد سوائے چند مخصوص سہیلیوں کے اور کہیں نہیں جاتی تھی۔ یہی سہیلیاں اس سے ملنے آتی تھیں۔

مگر جیسے ہی وہ کالج میں گئی، اس کے انداز میں تبدیلی آنے لگی۔ اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے تھے اور اسے ایک اچھے کوایجوکیشن کالج میں داخلہ مل گیا۔ رفتہ رفتہ وہ بدلنے لگی۔ پہلے دوپٹا سر پر نہ سہی لیکن جسم پر ہوتا تھا، اب وہ غائب ہونے لگا یا بے پروائی سے شانے پر رہ جاتا تھا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک اور گلابی چہرے پر میک اپ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ لباس بھی ایسے چست پہنتی تھی جس میں جسمانی ساخت نمایاں ہو۔ مگر اس کی دیگر سرگرمیاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی کالج سے آکر گھر میں رہتی یا سہیلیوں کے پاس جاتی تھی۔ ایک سال تک نور یہی سمجھتی رہی کہ اس کی بیٹی ابھی معصوم ہے۔

مگر ایک دن اس نے اسے دفتر سے آتے ہوئے ایک کار میں عقبی نشست پر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا۔ اس نے کھلے گریبان کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ نور دنگ رہ گئی پھر اس نے ڈرائیور سے اس کار کے پیچھے چلنے کو کہا۔

کار کا رخ سی ویو کی طرف تھا۔ وہ ایک ویرانے میں رکی اور اس سے نکل کر تین لڑکے اور دو لڑکیاں سمندر کی لہروں میں اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ حور نے چھوٹی سی ٹی شرٹ کے ساتھ اسکن فٹ جینز پہن رکھی تھی جس میں اس کا جسم بہت زیادہ نمایاں تھا۔ نور کا دماغ گھوم گیا۔ وہ کار سے اتری اور تیز قدموں سے ساحل تک آئی۔ لہروں سے انجوائے کرتی حور کی نظر اس پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو ساکت رہ گئی پھر وہ اس کی طرف آئی۔ ”ماما! آپ یہاں کیسے آئیں؟“

”میرے ساتھ چلو۔“ وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

”ماما! میں اپنے فرینڈز کے ہمراہ آئی ہوں، انہی کے ساتھ واپس جاؤں گی۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”تمہارے فرینڈز۔“ نور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”پہلے تو انہیں نہیں دیکھا اور نہ ہی تمہیں اس حلیے میں دیکھا۔“

”ماما! اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔“ نور نے اسے تھپڑ مارا۔ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لائی اور کار کی پچھلی نشست پر دھکیل کر ڈرائیور کو وہاں سے چلنے کا حکم دیا۔ حور سارے راستے روتی رہی مگر اس نے ایک بار بھی اپنے انداز سے ظاہر نہیں کیا کہ اسے ندامت ہے۔ اس کے بجائے اس کے رونے میں احتجاج اور سرکشی تھی۔ اس بار نور کا دکھ زیادہ تھا۔ بیٹوں نے برائی کی راہ اختیار کی تو کم سے کم اسے دھوکا تو نہیں دیا تھا۔ بیٹی اسے دھوکا دے رہی تھی۔ گھر سے شریفانہ لباس میں جاتی تھی اور باہر جاکر وہ اس قسم کی ڈریسنگ کرلیتی تھی۔ نہ جانے اس کی بے راہ روی کہاں تک پہنچی تھی۔ جیسے جیسے نور سوچ رہی تھی، اس کا دل دہلتا جا رہا تھا۔ گھر آکر اس نے حور سے کہا۔ ”اب تم کالج سے آنے کے بعد کہیں نہیں جاؤ گی اور نہ کوئی تم سے ملنے آئے گا۔“

”تب میں کالج بھی نہیں جاؤں گی۔“ اس نے سرکشی سے کہا۔

”مت جاؤ... گھر میں رہو۔“ نور نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اس نے ملازمہ کو حور کی نگرانی پر لگا دیا کہ اگر وہ باہر جانے کی کوشش کرے تو اسے روکے اور اگر وہ نہ رکے تو نور کو اطلاع کرے۔ اس کا خیال تھا کہ حور باہر جانے کی کوشش کرے گی مگر وہ اتنی ضدی ثابت ہوئی کہ باہر جانا تو دور کی بات ہے، اس نے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا۔ کھانے کا موڈ ہوتا تو وہیں منگوا لیتی ورنہ کھانا بھی نہیں کھاتی تھی۔ اس نے کھانے کی میز پر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ نور سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ صفدر اور اصغر نے یہ بات نوٹ کی۔ انہوں نے نور سے پوچھا تو اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”مبارک ہو، بہن بھی تمہارے نقشِ قدم پر چل پڑی ہے۔“

”تو ماما اس میں کیا برائی ہے؟“ صفدر نے کہا۔

”ماما! یہ ایلیٹ کلاس ہے اور یہاں یہی سب ہوتا ہے۔“ اصغر بولا۔

”افسوس کہ تم لوگ بالکل غیرت سے عاری ہو گئے ہو۔“

صفدر ہنسا۔ ”کیونکہ پیچھے سے یہ چیز ہمارے خون میں موجود نہیں ہے۔“

اصغر نے مطالبہ کیا۔ ”آپ حور کو کالج جانے دیں۔“

”میں نے اسے صرف کالج کے بعد گھر سے باہر جانے سے روکا ہے، کالج وہ خود نہیں جا رہی ہے۔“

”ماما! آپ کی پابندیاں بیکار ہیں۔ آپ کب تک پابندی لگائیں گی؟ کبھی نہ کبھی تو آزادی دینا ہوگی اور پھر...“ صفدر بولتے بولتے رہ گیا مگر اس کی بات واضح تھی کہ ہونا یہی تھا۔

”میں نے تمہاری جو تربیت کی ہے...“

”ماما! ہماری کلاس میں بچے پیرنٹس کی نہیں کلاس کی تربیت سے بنتے ہیں۔“ اصغر نے کہا۔

نور مجبور ہوگئی، اسے حور کو اجازت دینا پڑی لیکن اس نے شرط رکھ دی کہ وہ صرف باہر گھومے پھرے گی کسی کے گھر نہیں جائے گی۔ حور مان گئی۔ نور نے محسوس کیا کہ یہ شرط اس نے صرف دل کی تسلی کے لیے لگائی تھی ورنہ حور ایک بار گھر سے نکلنے کے بعد کیا کرتی پھرتی، وہ کیسے جان سکتی تھی۔ اس نے بیٹوں کی جاسوسی کرائی تھی، بیٹی کی کیسے کراتی؟ انسان بہت سے معاملات میں چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کرپاتا اور انہیں تقدیر پر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اکیلی تھی اور واجد نے جانے سے پہلے اسے بزنس ہینڈل کرنا سکھا دیا مگر اولاد کو قابو کرنا نہیں سکھایا تھا۔ شاید اسے خود بھی نہیں آتا تھا۔ نور بھی مجبور ہوگئی کہ وہ اولاد کو تقدیر پر چھوڑ دے، ہوسکتا ہے وہ اچھائی کی طرف لوٹ آئیں۔

مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ صفدر نے درمیان میں بی بی اے چھوڑ دیا اور اس کا اصرار تھا کہ اسے بزنس میں شامل کیا جائے۔ حالانکہ اسے کچھ آتا جاتا نہیں تھا۔ مگر وہ ماں کے اتنا سر ہوا کہ نور نے مجبوراً اسے دفتر میں ایک کمرا سیٹ کرکے دے دیا۔ اس کے ذمے کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ دوسروں کے کاموں میں ٹانگ اڑاتا تھا اور مالک ہونے کی وجہ سے ملازمین بے چارے مجبور ہو جاتے تھے۔ بعد میں وہ نور سے کہتے تو وہ صفدر کو سمجھاتی لیکن وہ سمجھنے والی چیز نہیں تھا۔ مجبوراً نور نے اسے حکم دیا کہ وہ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ صفدر نے دخل اندازی تو نہیں چھوڑی تھی مگر وہ اب حد میں آگیا تھا۔ غالباً اسے بھی سمجھ میں آگیا تھا۔

اصغر نے ذرا ہوشیاری دکھائی۔ وہ پڑھتا تو کم تھا مگر اس نے یونیورسٹی کی انتظامیہ اور اساتذہ میں اچھی پی آر بنا رکھی تھی۔ اس وجہ سے اس کا سمسٹر رکتا نہیں تھا۔ تعلیم کے نام پر وہ ماں سے اچھی خاصی رقم کھینچ لیا کرتا تھا اور اسے عیاشی میں اڑا دیتا۔ اس طرح اس نے ایم بی اے مکمل کر لیا۔ اس کے بعد بھی اس نے ہوشیاری دکھائی اور نور سے کہا کہ وہ کام سیکھنا چاہتا ہے۔ نور نے اسے پہلے مل بھیج دیا۔ چھ مہینے اس نے وہاں تجربہ حاصل کیا، اس کے بعد وہ ہیڈ آفس آگیا۔ یہاں نور نے اسے اسسٹنٹ منیجر بنا دیا۔ چھ مہینے بعد وہ ایگزیکٹوز میں شامل ہوگیا۔ بزنس کے معاملے میں اس نے سچ مچ محنت کی تھی۔ ایک سال میں اس نے اتنا سیکھ لیا جتنا صفدر تین سال میں نہیں سیکھ سکا تھا۔ نور اس سے خوش تھی اور بتدریج ذمے داریاں اسے دے رہی تھی۔ صفدر اس صورتِ حال سے ناخوش تھا۔ وہ اکثر نور سے جھگڑا کرتا کہ وہ اصغر کے ساتھ جو کر رہی ہے، وہ اس کے ساتھ کبھی نہیں کیا۔

حور تعلیم میں تیز تھی۔ اس نے انٹر بھی بہت اچھے نمبر سے کیا اور اسے ایک اچھے تعلیمی ادارے میں داخلہ مل گیا۔ اس نے بھی ایم بی اے کا انتخاب کیا اور ساتھ ہی اپنے مستقبل کے ساتھی کا انتخاب بھی کرلیا۔ دوسرے سال اس نے ماں سے عاطف کو ملوایا۔ عاطف شبیر کا تعلق ایک کاروباری گھرانے سے تھا اور وہ بھی ایم بی اے کر رہا تھا۔ دبلا اور سانولے رنگ کا عاطف صورت سے ہی چالاک نظر آتا تھا اور وہ حور کا پاسنگ بھی نہیں تھا مگر اس نے نہایت چالاکی سے حور کو قابو کرلیا تھا۔ بے شک اس کا تعلق ایک بڑے کاروباری گھرانے سے تھا مگر اس کا باپ معمولی درجے کا کاروباری تھا۔ وہ ڈیفنس میں اپنے ایک عزیز کی کوٹھی میں مقیم تھے اور ان کے پاس ذاتی گھر تک نہیں تھا۔

عاطف ایک نمبر کا آوارہ اور عیاش لڑکا تھا۔ اس کے پہلے بھی متعدد لڑکیوں سے تعلقات رہے تھے اور وہ ایک لڑکی کے خودکشی کیس میں بھی ملوث رہا تھا۔ تعلیم کے نام پر

گزشتہ کئی سال سے یونیورسٹی میں وقت ضائع کر رہا تھا۔ نے یہ ساری معلومات حور کے سامنے رکھیں مگر اس پر وئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ماما! مجھے معلوم ہے، عاطف نے خود بتایا ہے۔''

''تب بھی تم ایسے شخص سے شادی کرنا چاہ رہی ؟''

''ماما! یہاں کون غلطیوں سے پاک ہے۔'' حور خرانہ انداز میں بولی۔ ''ممکن ہے جسے آپ منتخب کریں، اس سے بھی بڑی کوئی چیز نکلے اور ماما! عاطف مجھ سے ص ہے اس لیے اس نے اپنے ماضی کے بارے میں اف صاف بتا دیا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں، میں شادی روں گی تو عاطف سے کروں گی۔''

نور ایک بار پھر مجبور ہوگئی۔ عاطف نے ایک سال ر اپنی تعلیم مکمل کر لی اور حور کے دباؤ پر نور نے اسے بھی س میں شامل کر لیا۔ مزید ایک سال بعد اس نے حور اور طف کی شادی کر دی کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ان نوں کے تعلقات تمام حدیں پھلانگ چکے ہیں اور اس ے پہلے اس کا کوئی نتیجہ سامنے آئے، اس نے بہتر سمجھا کہ ں ایک کر دیا جائے۔ شادی کے بعد عاطف گھر داماد بن رہنے لگا۔ حور کی شادی کے بعد صفدر نے اپنی پسند کی ی سے شادی پر اصرار کیا اور نور نے اس کی بھی شادی کر ی۔ لڑکی صفدر کی کلاس فیلو رہی تھی۔ اتفاق سے اس کا تعلق ں ایک درمیانے کاروباری گھرانے سے تھا۔ نور چاہتی ی کہ اصغر کی بھی شادی کر دے، یہاں بھی اصغر نے چالاکی ے کام لیا۔ مونا کو اس نے خود پسند کیا مگر نور سے کہا کہ اگر اسے پسند کرے گی، تب ہی وہ اس سے شادی کرے ۔ نور کے ناپسند کرنے کا سوال ہی نہیں تھا جب صفدر اور ر نے اپنی پسند کی شادی کی تھی تو وہ اصغر کو کس طرح ی۔ نور بارہ سال سے یہ بزنس اکیلی چلا رہی تھی۔ اسے وع میں کچھ مشکلات پیش آئی تھیں مگر اس کے بعد اسے لات پر قابو پانا آ گیا تھا۔ اس کی عمر بیالیس تھی اور ابھی تازہ دم اور مضبوط تھی اس لیے جب ایک صبح ناشتے کی پر صفدر، اصغر اور حور نے اس سے مطالبہ کیا کہ اب ں ان کے حوالے کیا جائے تو وہ حیران رہ گئی۔

''کیوں؟''

''ماما! اب آپ کی آرام کی عمر ہے۔'' عاطف نے ی سے کہا۔ ''کام کرنے کے لیے ہم موجود ہیں۔''

نور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہوا کہ بزنس کے ایک حصے کو سنبھال سکے، پورا بزنس سنبھالنا تو دور کی بات ہے۔ جب تم لوگ اس قابل ہو جاؤ گے تو میں خود پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''جب آپ نے بارہ سال پہلے یہ بزنس سنبھالا تھا، تب آپ کو کچھ نہیں آتا تھا مگر آپ نے سب ہینڈل کر لیا۔'' صفدر نے کہا۔ ''اسی طرح جب ہمارے سر پر آئے گا، تب ہم بھی ہینڈل کر لیں گے۔''

''تمہارے باپ نے ایسے ہی مجھے سب ہینڈ اوور نہیں کر دیا تھا۔ ان کی وفات سے پہلے میں بزنس کے ایک ایک شعبے میں خود کام کر کے تجربہ حاصل کر چکی تھی۔ میں نے خاص طور سے بزنس چلانے کے لیے ایم بی اے کیا۔ اگر تم لوگ اس قابل ہو جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ یہ سب بالآخر تم لوگوں کو ہی ملنا ہے۔''

''اس کا فیصلہ آپ کریں گی کہ ہم اس قابل ہوئے ہیں یا نہیں؟'' صفدر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''ہم کبھی اس قابل ہوں گے بھی نہیں۔'' حور نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ نور ان کی گفتگو نظر انداز کر کے اٹھ گئی۔ مگر یہ آغاز تھا۔ اب انہوں نے مشترکہ طور پر نور پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پہلے سے ہی سب سوچ چکے تھے۔ ایک مہینے کے دوران انہوں نے کئی بار نور سے بات کی اور رفتہ رفتہ وہ زور دینے لگے کہ اس حد تک کام اس کی جسمانی اور دماغی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔ ایک صبح وہ ناشتا کر کے گھر سے روانہ ہوئی تو اسے دفتر پہنچتے ہوئے ہلکے سے چکر آنا شروع ہو گئے۔ وہ اندر داخل ہوئی تو پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ شرابیوں کی طرح ڈولتی اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی اور اس نے ٹوٹے پھوٹے انداز میں اپنی سیکریٹری سے کچھ کہنے کی کوشش کی اور پھر چکرا کر گر پڑی۔ ڈاکٹر طلب کیا گیا اور اس نے ہائپر ٹینشن تشخیص کیا۔ اسے آرام کا مشورہ دیا۔ اس دوران میں صفدر، اصغر اور عاطف بھی آ گئے۔ وہ زبردستی اسے گھر لے گئے۔

نور نے دو دن آرام کیا اور گھبرا گئی۔ اس نے کبھی دو دن آرام نہیں کیا تھا۔ بیماری میں بھی وہ ایک دن ہی گھر میں رہتی تھی، دوسرے دن دفتر پہنچ جاتی تھی۔ اس نے دفتر جانا چاہا تو اسے پتا چلا کہ ڈرائیور گاڑی لے کر صفدر کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ اس نے صفدر کو کال کی تو اس نے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس نے ایک اچھے ڈاکٹر سے

اپائنٹ منٹ لیا۔ آج وہ اسے وہاں لے جائے گا۔ نور نے انکار کیا مگر اس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ شام کو وہ گھر آیا اور اسے تیار کر کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ جب نور نے کلینک کا بورڈ دیکھا اور ڈاکٹر کاشان کو سائیکاٹرسٹ پایا تو اس نے انکار کیا مگر صفدر کسی نہ کسی طرح اسے اندر لے گیا۔ وہاں ڈاکٹر کاشان کو دیکھ کر نور کی طبیعت اور خراب ہوئی۔ وہ اسے صورت اور باتوں سے ہی اچھا آدمی نہیں لگا مگر وہ اس سے بڑی نرم آمیز چاپلوسی سے پیش آیا۔ ایک نرس نے اسے لائم جوس کا گلاس پیش کیا اور پھر وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بتانے لگا کہ مسلسل محنت کس طرح انسان کو اندر سے کھوکھلا کرتی ہے اور بالآخر اسے دماغی مریض بنا دیتی ہے۔

جوس پی کر نور کی ذہنی کیفیت عجیب سی ہونے لگی، اسے لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ ڈاکٹر کی آواز بھی عجیب سے انداز میں گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وہ بھی بول رہی تھی اور خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے۔ جواب میں ڈاکٹر جو کہہ رہا تھا وہ بھی ٹھیک سے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سو جائے۔ آخر اسے ہوش نہیں رہا اور جب وہ جاگی تو وہ اسی کلینک کے ایک کمرے میں تھی اور وہاں حور سمیت سب موجود تھے۔ وہ سب پریشان تھے مگر نہ جانے کیوں نور کو ان کی پریشانی بناوٹی لگی تھی۔ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کیا ہوا تھا؟''

''ماما! آپ کی وہی کیفیت ہوئی تھی جو دفتر میں ہوئی تھی۔'' عاطف نے کہا۔ ''آپ خود سے باتیں کر رہی تھیں اور آپ کو ہوش نہیں تھا۔''

''یہ بکواس ہے، میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ لائم جوس میں کچھ ملا ہوا تھا۔''

مگر کسی نے اس کی بات کا اثر قبول نہیں کیا۔ وہ سب ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر صفدر نے اپنا ٹیب اس کے سامنے کیا۔ ''ماما! یہ دیکھیں... ڈاکٹر کاشان کے آفس میں لگے کیمرے کی ریکارڈنگ ہے۔''

ٹیب پر اس کی ویڈیو اور آواز آنے لگی۔ اس میں وہ بہکی بہکی باتیں اور حرکتیں کر رہی تھی۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی مگر اسے یقین تھا کہ یہ سب اس لائم جوس کی وجہ سے ہوا۔ اس میں کچھ ملا ہوا تھا جس نے اس کے حواس بکھیر دیے اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے ٹیب بستر پر پھینک دیا۔ ''یہ سازش ہے۔''

''ماما! دفتر میں کیا ہوا تھا؟'' حور نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ مسلسل کام کر کے آپ کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ آپ کو علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' نور نے چلا کر کہا۔ ''یہ تمہاری سازش ہے جو تم لوگوں نے بزنس پر قبضے کے لیے کی ہے۔ میں تم لوگوں کو کامیاب ہونے نہیں دوں گی۔''

نور کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ دروازہ کھلا اور اسے لائم جوس دینے والی نرس اندر آئی۔ اس نے ہاتھ میں انجکشن لیا ہوا تھا۔ اسی لمحے صفدر اور اصغر نے اسے دائیں بائیں سے پکڑ لیا۔ اس نے مزاحمت کی بے سود کوشش کی مگر نرس کو انجکشن لگانے سے نہ روک سکی۔ انجکشن لگتے ہی اس کے حواس پر غنودگی چھانے لگی اور پھر اسے ہوش آیا تو وہ اس قید خانے میں تھی۔

☆☆☆

نور کی کہانی کئی قسطوں میں مکمل ہوئی تھی کیونکہ اس نے سہیل احمد کو تفصیل سے سب بتایا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے تھک جاتی تھی اس لیے باقی پھر کہہ کر لیٹ جاتی تھی۔ اسے سب سنانے میں دو دن لگے تھے۔ سہیل نے کہا تھا کہ جب وہ اپنی بات مکمل کر لے گی تب وہ اسے اپنی کہانی سنائے گا۔ واجد کے بعد نور کبھی کسی مرد سے اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کر سکی تھی۔ اس کے سارے ماتحت مرد تھے، اسی طرح جن سے بزنس ہوتا تھا وہ بھی مرد تھے مگر ان سے سوائے بزنس اور متعلقہ امور کے کبھی بات نہیں کی تھی۔ سہیل احمد سے اس کی پرانی وابستگی بھی نکل آئی تھی۔ وہ کچھ عرصے کے لیے سہی لیکن اس کا استاد بھی رہا تھا۔ دن میں انہیں موقع نہیں ملتا تھا کیونکہ مرد اور عورت نرس وہاں موجود رہتے تھے اور کام کے علاوہ بھی وہ خاموشی سے چکر لگا کر مریضوں کو دیکھتے رہتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ صرف رات کو موقع ملتا تھا تو نور دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ کھڑی نہیں ہو پاتی تھی۔

''بہت افسوسناک بات ہے۔'' سہیل نے افسوس کیا۔ ''مگر کیا کیا جائے، ہمارے معاشرے میں خود غرضی اور نفسا نفسی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔''

نور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس میں میرا قصور بھی ہے۔ میں نے جتنی توجہ بزنس کو دی، اتنی توجہ اولاد کو دیتی تو شاید یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

’’تمہاری تربیت انہیں اچھا انسان بناتی لیکن تمہاری تربیت نہ کرنے سے انہیں بُرا انسان بننا چاہیے تھا کرمنل مائنڈ نہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’انہوں نے جو کیا ہے، وہ سنگین جرم ہے۔ کسی کو یوں حبسِ بے جا میں رکھنا سنگین جرم ہے اور پھر اسے صحیح الدماغ ہوتے ہوئے بھی پاگل قرار دینا۔‘‘

’’مجھے لگتا ہے ڈاکٹر کیش کا اصل کام یہی ہے۔‘‘

’’بالکل میں اسے سمجھ گیا ہوں۔‘‘ سہیل نے کہا۔ ’’بلکہ چند سال پہلے میں نے کسی سے اس کے بارے میں سنا بھی تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔‘‘

’’میں تھک گئی ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ میں اپنی کہانی کل سناؤں گا اگر موقع ملا تو۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ اس قید خانے میں آنے والے پل کا پتا نہیں ہے۔ کل تو بہت دور کی بات ہے۔ بہرحال اب تم آرام کرو۔‘‘

نور بستر کی طرف لوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

لڑکی بہت خوب صورت تھی مگر کمزور بھی تھی۔ دبلا جسم اور کسی قدر ڈھیلی کھال والی گردن جیسے وہ بیمار رہی ہو۔ حالانکہ اس کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگت بہت سفید تھی اور نقوش تیکھے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اس نے مہارت سے میک اپ کرکے دبا دیے تھے۔ ہیئر اسٹائل و میک اپ سے اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اسے پوری طرح چھپا نہیں سکی تھی۔ اس کا نام شمل احسان تھا اور وہ ایک سال پہلے ڈاکٹر کیش کے شہر سے باہر والے کلینک میں تھی۔ اسے وہاں اس کے چچا محسن سومرو نے داخل کرایا تھا جو اس کی زمین اور جائداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ شمل کا تعلق ایک جاگیردار فیملی سے تھا مگر اس کی ماں شہری تھی۔ اس کے باپ احسان سومرو نے یہاں ایک بڑی کوٹھی اور کئی پلاٹ اور مکانات اس کی ماں کے نام کردیے تھے۔ وہ عمر رسیدہ تھا اس لیے جب اچانک فوت ہوا تو یہ ماں بیٹی بے سہارا نہیں رہے۔

مگر اس وقت اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا چچا جو سب گاؤں کی جاگیر اور حویلی کا اکیلا وارث تھا، وہ اس کی کوٹھی اور دوسری جائداد پر بھی نظر جمائے ہوئے ہے۔

اسے موقع شمل کی ماں کے انتقال کے بعد ملا۔ شمل کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور پہلا ہی دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اسپتال جانے کی نوبت نہیں آئی اور وہ رات سوتے میں گزر گئی۔ شمل کے لیے یہ صدمہ زیادہ بڑا تھا کہ اس کا سوائے ماں کے دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے گریجویشن کیا تھا اور اس کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماں اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر شمل ماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی اس لیے اس نے شرط لگا دی کہ وہ ایسے شخص سے شادی کرے گی جو گھر داماد بن کر رہے۔ مگر ایسا کوئی شخص نہیں ملا تھا۔ محسن سومرو آیا اور اتنی محبت سے ملا کہ شمل سب بھول گئی۔ وہ اس پر اعتبار کرنے لگی تھی اور اسی اعتبار کے نتیجے میں وہ ڈاکٹر کیش کے کلینک پہنچ گئی۔

وہ جوان اور مضبوط تھی۔ آسانی سے دماغی مریضہ بننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے یہاں اسے الیکٹرک شاک کے ساتھ دوائیں دی جاتی تھیں۔ اسے منشیات بھی استعمال کرائی جاتی تھی۔ ڈاکٹر کیش اسے دیوانگی کا انجکشن دے کر اس کا لباس اتروا دیتا تھا اور پھر اس کی حرکتوں کی ویڈیو بنا کر اسے دکھاتا تو وہ شرم سے پانی پانی ہوجاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ چند مہینے میں اس کی حالت تباہ ہوکر رہ گئی۔ ڈاکٹر کے حکم پر راول اسے مارفین کا انجکشن دیتا تھا۔ اسے روز انجکشن درکار تھا اور نہیں ملتا تو اس کی حالت خراب ہونے لگتی تھی۔ آخر میں وہ اتنی عادی ہوگئی تھی کہ آخر کے چند گھنٹے وہ تڑپ کر گزارتی تھی۔ ایک دن راول اسے انجکشن دے رہا تھا کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ راول نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ’’کیا بات ہے؟ انجکشن نہیں لوگی تو حالت خراب ہو جائے گی۔‘‘

’’میں منع نہیں کر رہی، ایک سوال کرنا ہے۔‘‘ وہ بولی۔

’’کیا؟‘‘

’’تم نے کسی سے محبت کی ہے؟‘‘

راول کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اسے انجکشن دے کر چلا گیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ نہ ہی بعد میں اس بارے میں کچھ کہا لیکن پھر اس کے رویّے میں تبدیلی آنے لگی۔ شمل نے محسوس کیا کہ اب وہ انجکشن دیتا تو اس کی طلب کم ہو جاتی تھی مگر مٹتی نہیں تھی۔ بارہ گھنٹے بعد اس کی حالت بگڑنے لگتی تھی مگر انجکشن اسے چوبیس گھنٹے بعد ہی ملتا تھا۔ ایک دن اس نے راول سے پوچھ لیا تو اس نے کہا۔

''اب میں تم کو نشہ کم کر کے دے رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

''میں نہیں جانتا لیکن میں تمہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

شمل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے اور تباہ تو میں ہو چکی ہوں۔''

''نہیں تمہارے سامنے بہت بڑی زندگی ہے۔''

''میں یہاں سے نکلوں گی تو کچھ کر سکوں گی۔''

اس وقت راول نے اسے جواب نہیں دیا لیکن ایک دن اس نے خاموشی سے اسے لانڈری لے جانے والی گاڑی میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اس نے اسے ایک فلیٹ کا پتا اور اس کی چابی دی۔ ''تم وہاں رہو گی جب تک اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل آتا۔ بھاگنا مت ورنہ پولیس یا اپنے چچا کے ہاتھ آئیں تو یہیں پہنچا دی جاؤ گی۔''

شمل یہ سمجھتی تھی۔ اسے ڈاکٹر کیش سے چھپنا تھا اور اسے اپنے چچا سے بھی بچنا تھا۔ پولیس اس مسئلے کا حل نہیں تھی کیونکہ پولیس کی مدد کے بغیر ڈاکٹر یہ دھندا چلا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی قسمت کہ وہ یہاں سے سب کی ..... نظروں سے بچ کر نکل گئی اور اسے فلیٹ تک پہنچنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ راول کا فلیٹ تھا مگر اس کے بارے میں ڈاکٹر کیش کو بھی علم نہیں تھا۔ تب سے وہ یہیں چھپی ہوئی تھی۔ راول اس سے رابطے میں تھا۔ وہ اسے کال بھی کرتا تھا اور مہینے میں ایک دو بار چھپ کر اس سے ملنے آتا تھا۔ ان دونوں میں ایک غیر محسوس تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ شمل وہاں سے نکلنے کے بعد بھی بہت عرصے بیمار رہی۔ دواؤں اور خاص طور سے منشیات کے اثرات سے چھٹکارے میں اسے وقت لگا۔ اب اس کی صحت بہتر ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ راول نے اس کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اسے یوں چھپایا ہوا تھا، اس کے اخراجات برداشت کر رہا تھا اور جواب میں اس نے کبھی اس سے کچھ نہیں مانگا یا چاہا تھا۔ اس نے تو کبھی اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ آخری بار وہ آیا تو اس نے شمل کو بتایا۔

''ڈاکٹر کیش سب سمیٹنے جا رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''خطرات بڑھ گئے ہیں۔''

''کیا وہ یہاں سے چلا جائے گا؟''

''شاید اس شہر سے چلا جائے لیکن اس ملک سے نہیں جائے گا، وہ جو کام کرتا ہے اس کے مواقع یہیں تو ہیں۔''

''کہیں بھی جائے اس سے ہماری جان تو چھوٹ جائے۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے مگر ہمیں آخر تک محتاط رہنا ہوگا اسے بھنک بھی پڑ گئی تو ہمیں مار دے گا۔ یہ کام اس کے لیے ذرا مشکل نہیں ہے۔ ویسے شاید وہ چھوڑ دے۔''

''میں جانتی ہوں، اس کی سفاکی بھگت چکی ہوں۔''

''ایک بار اس سے جان چھوٹ جائے تو پھر تمہارے چچا کو بھی دیکھ لیں گے۔''

''سنو، میں اب واپس نہیں جانا چاہتی۔''

راول نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تو کیا ساری عمر اس تنگ و تاریک فلیٹ میں رہو گی؟''

''ہاں، تمہارے ساتھ میں اس سے بھی تنگ و تاریک جگہ رہ سکتی ہوں۔'' شمل نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ وہ بہت عرصے سے یہ بات کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پائی تھی۔ آج اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ ''میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں ہمیشہ۔''

راول کانپنے لگا۔ ''سچ میں؟''

''ہاں، سچ... دل و جان کے ساتھ۔'' وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔

راول خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے، ہم اس چکر سے نکل جائیں پھر ہم ساتھ رہیں گے۔''

پھر راول نے اسے کال کر کے بتایا کہ ڈاکٹر کیش نے فیصلہ کر لیا ہے اور جب اسے پتا چلا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے تو شمل بے چین ہو گئی۔ اس نے اگلی بار راول سے فون پر کہا۔ ''راول! ہم اس کے جرم میں حصہ نہیں بن سکتے۔ یہ سترہ لوگوں کی زندگی کا سوال ہے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں سوائے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے۔'' راول نے بے بسی سے کہا۔

''تم کر سکتے ہو راول... پلیز ان مظلوم لوگوں کو بچاؤ۔''

''اچھا، میں سوچتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ راول عام طور سے شمل کو رات کے وقت کال کرتا تھا جب وہ اکیلا ہوتا تھا۔ شمل کے پاس ایک موبائل تھا اور وہ اسے یہاں لینڈ لائن سے کال کرتا تھا کیونکہ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں موبائل فون کے سگنل بہت کمزور آتے تھے۔ شمل سے بات کر کے وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ جب سے شمل سے اس کا تعلق بنا تھا، تب سے وہ اپنے اندر تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ اسے ان لوگوں سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی

جن سے پہلے بھی ہمدردی نہیں کی تھی۔ راول ڈاکٹر کیش کا پروردہ تھا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو وہ ایک یتیم خانے میں تھا۔ وہ یتیم خانہ وہاں رہنے والے بچوں کے لیے عقوبت خانہ تھا جہاں کون سی اذیت اور تکلیف تھی جو انہیں نہیں دی جاتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں راول وہاں سے بھاگ نکلا۔ اسے صرف اپنا نام معلوم تھا۔ ایک رات پارک میں سوتے ہوئے اسے پولیس والے پکڑ کر لے جا رہے تھے کہ ڈاکٹر کیش نے پولیس والوں کو روک لیا۔ اس نے بڑے رعب سے بات کی اور راول کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کا ملازم ہے۔ ابھی یہاں نیا آیا ہے تو راستہ بھول گیا تھا۔ جان بچتے دیکھ کر راول نے بھی اقرار کر لیا کہ وہ ڈاکٹر کیش کا ملازم ہے حالانکہ اس وقت اسے اس کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔

بہرحال اس کی جان بچ گئی اور ڈاکٹر کیش اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس وقت اس نے ترقی شروع کر دی تھی۔ پہلے کچھ دن وہ اسے گھر میں پرکھتا رہا اور جب اس نے محسوس کیا کہ اس لڑکے سے کام لیا جا سکتا ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ شہر والے کلینک لے جانے لگا۔ وہاں اس نے اسے تربیت دی۔ مریضوں کی تھراپی اور مخصوص سیشن کے دوران وہ اسے ساتھ رکھتا تھا۔ پانچ سال بعد جب اس نے شہر سے باہر والا کلینک کھولا تو راول بہت کچھ سیکھ چکا تھا اور اس نے اسے وہاں کا نگران بنا دیا۔ راول نے سب سنبھال لیا۔ اپنی بدحواس شخصیت سے قطع نظر وہ ذہین تھا اور جیسا ڈاکٹر کیش چاہتا تھا، اس نے ویسا ہی کیا۔ مخصوص سیشن کے دوران جب فوٹو گرافی کی ضرورت پڑتی تو یہ کام بھی راول کرتا تھا۔ پہلے ڈاکٹر کیش نے اسے یہ پرانا کیمرا دیا مگر جب جدید ڈیجیٹل کیمرے آ گئے تب بھی راول نے اسی کیمرے سے کام جاری رکھا۔ اسے اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کیش اس پر پوری طرح اعتماد کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب شمل وہاں سے غائب ہوئی تو اس نے راول پر شک نہیں کیا۔ البتہ وہ حیران تھا کہ لڑکی نے دس فٹ اونچی دیوار جس پر دو فٹ تک خاردار تار بھی لگی تھی، کس طرح عبور کی۔ جب لڑکی اور اس کے چچا کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

گیٹ پر موجود دن رات کے دونوں گارڈز ڈاکٹر کے اعتماد کے آدمی تھے اور وہ اسے ہی جواب دہ تھے۔ اگر راول بھی کسی کو اندر یا باہر کرنا چاہتا تو وہ اس کا مجاز نہیں تھا۔ عمارت میں ہفتے میں ایک بار سپلائی کی گاڑی آتی تھی جو کھانے پینے کا اور دوسرا ضروری سامان لاتی تھی۔ دوائیں اور میڈیکل سے متعلق دوسرا سامان خود ڈاکٹر لاتا تھا جبکہ ہفتے میں ایک ہی بار لانڈری کی گاڑی آتی دھلے ہوئے کپڑے دے کر میلے کپڑے لے جاتی تھی۔ یہاں موجود مریضوں کو ہر تیسرے دن کپڑے بدلنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ تیسرے ہی دن وہ نہاتے تھے۔ راول سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ جب یہاں قیدی تھے تو ان کی کسی حد تک دیکھ بھال کیوں کی جاتی تھی۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ڈاکٹر کیش سے اس بارے میں سوال کرتا کیونکہ اتنے عرصے اس کے ساتھ رہ کر وہ جان گیا تھا کہ ڈاکٹر نہایت سفاک شخص ہے اور سوائے اپنے اس کے نزدیک کسی کی اہمیت نہیں تھی۔

ان دس سالوں میں یہاں کم سے کم پچاس لوگ آئے تھے اور ان میں سے بیس اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ جب کسی مریض کی رخصتی کا وقت آتا تو ڈاکٹر کیش اسے پہلے ہی اس بارے میں اشارہ کر دیتا تھا۔ راول چھ گھنٹے پہلے اسے مخصوص انجکشن دیتا تھا جس سے آدمی میں دیوانگی آ جاتی تھی اور جب اسے دورہ پڑتا تو ڈاکٹر کیش آتا تھا۔ پھر وہ مریض کو ایک انجکشن اور لگاتا تھا اور اس کے چند منٹ بعد مریض اینٹھ... کر ختم ہو جاتا تھا۔ یہ موت اتنی خوفناک ہوتی تھی کہ راول جب دیکھتا تو اس کی روح تک کانپ جاتی۔ مرنے سے پہلے مریض کا جسم یوں تڑتا مڑتا تھا جیسے اس کی ایک ایک رگ و پٹھا کھنچ رہا ہو۔ وہ بہت اذیت سے جان دیتا تھا اور پھر ڈاکٹر کیش ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ لاش لواحقین کے حوالے کر دیتا تھا۔ راول جانتا تھا یہ قتل ہے اور ڈاکٹر قاتل تھا۔ یہی نہیں کہ وہ قاتل تھا بلکہ وہ مرنے والوں کی موت سے لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے والے ہوتے تھے اور وہ راول کو نفسیاتی معالج کے بجائے نفسیاتی مریض لگتا تھا۔

مگر ایک مریض کی موت الگ بات تھی... بیک وقت سترہ افراد کی موت اور وہ بھی اس اذیت ناک انداز میں۔ راول کا دل پہلے ہی تیار نہیں تھا پھر شمل نے کہا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان لوگوں کو کیسے اس درندے سے بچائے۔ اگر وہ پولیس سے رابطہ کرتا تو ڈاکٹر کے ساتھ خود بھی پکڑا جاتا اور اس کے تمام جرائم میں برابر کا ذمے دار قرار پاتا۔ اس سے پہلے اسے شاید اس کی پروا نہ ہوتی مگر اس سے پہلے اسے انسانوں کی پروا کب تھی۔ وہ شاید خود

بھی انسان نہیں تھا۔ یہ تو شمل تھی جس نے اسے انسان ہونے کا احساس دلایا تھا۔ مگر وہ ڈاکٹر کیش کے خلاف ہونے کا سوچ کر ہی لرز جاتا۔ ساتھ ہی اسے احساس تھا کہ اسے شمل کی بات نبھانی ہے۔ چاہے اس کے لیے اسے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑی۔

☆☆☆

ڈاکٹر کیش انسانوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جنہیں انسانیت کے بجائے حیوانیت پسند تھی۔ وہ بچپن سے اذیت پسند تھا اور اسی وجہ سے اپنے ماں باپ سے مار کھاتا تھا۔ اس کا باپ نشے کا عادی تھا اور جب وہ نشے میں دھت ہوکر اس کی ماں پر تشدد کرتا تو اس کے لیے یہ سب سے ... پُرلطف وقت ہوتا تھا۔ اس نے صرف تشدد نہیں بلکہ ماں باپ کے تعلق کے اور بھی پہلو دیکھے تھے اس لیے اس کے نزدیک یہ سب حیوانوں جیسا فطری ہوگیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے انسانوں کی چیر پھاڑ کا موقع ملتا مگر انٹر میں اس کے اتنے نمبر ہی نہیں آئے تھے کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ ملتا مجبوراً اس نے نفسیات پڑھی۔ کچھ عرصے بعد لگا کہ اصل میں وہ اسی مضمون کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس میں اس کے لیے سب کچھ تھا تسکین کا سامان بھی اور دولت بھی۔ لیکن اسے درست لائن پکڑنے میں وقت لگا۔ بالآخر وہ جو چاہتا تھا اس نے حاصل کرلیا۔

اس نے پندرہ سالوں میں بہت کمایا تھا۔ اس کی کوٹھی کی مالیت ڈھائی کروڑ روپے تھی اور وہ چالیس لاکھ کی لگژری کار میں سفر کرتا تھا۔ لیکن اس کی اصل دولت ایک بیرونِ ملک بینک اکاؤنٹ میں ڈالرز کی صورت میں جمع تھی اسے معلوم تھا کبھی بھی اسے یہاں سے بھاگنا پڑے گا اور وہ اسی وقت کی قبل از وقت تیاری کر رہا تھا۔ پھر وہ وقت آگیا۔ ایک مہینا پہلے اسے ایک کال ملی اور اس میں بولنے والے نے اس..... کے کچھ کرتوت بیان کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر دس کروڑ روپے ادا کرے۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ بولنے والے نے اس کے کرتوت منظرِ عام پر لانے کی دھمکی نہیں دی تھی بلکہ اس نے کہا۔

''اگر دس کروڑ نہ دیے تو راستے میں کہیں تیری کھوپڑی میں گولی اتار دیں گے۔''

اس شہر اور ملک میں جو ہو رہا تھا، وہ ڈاکٹر کیش سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ یہاں چند ہزار کے عوض ٹارگٹ کلرز کسی کو بھی اڑا جاتے تھے۔ وہ اپنی جان کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک اس کی جان ہی تھی جس سے وہ پیار کرتا تھا اس لیے اس نے فوری وائنڈ اپ کا فیصلہ کیا۔ اس نے فون کرنے والے سے مہلت لی اور کوٹھی فروخت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کلینک کی عمارت وہ فروخت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ویسے بھی تباہ ہو جاتی اور صرف پلاٹ رہ جاتا۔ اس علاقے میں زمین کی ویلیو نہ ہونے کے برابر تھی۔ کوٹھی کا سودا ہو گیا۔ دوسری طرف وہ ان افراد کے لواحقین سے رابطہ کر رہا تھا جو اس کی تحویل میں تھے اور وہ انہیں پیشکش کر رہا تھا۔ جو مان گئے تھے، ان سے سودا کر لیا اور جو نہیں مان رہے تھے وہ انہیں بلیک میل کر رہا تھا کہ اس صورت میں وہ کسی وقت بھی ان کے بندے کو چھوڑ دے گا اور وہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔

اس دھمکی نے ان لوگوں کے ہوش اڑا دیے تھے اور وہ بھی مان گئے۔ سترہ میں سے پندرہ نے سودا کرلیا تھا اور خطیر رقم اسے مل گئی تھی۔ کوٹھی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اس نے بیرونِ ملک ٹرانسفر کر دی۔ خود وہ فی الحال کوٹھی تک محدود ہو گیا تھا۔ شہر والے کلینک جانا بند کر دیا تھا۔ ایک دوبار محسوس ہوا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے، اس کے بعد وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دن پہلے ہی اپنی لگژری کار فروخت کر کے ایک پرانی مگر چلنے میں اچھی کار لے لی تھی۔ وہ اس کی کوٹھی کی عقبی گلی کے ساتھ سڑک پر پارک تھی۔ اس نے ہفتے کی رات کی فلائٹ سے ٹکٹ بک کرالیا تھا اور اب بس ایک دن باقی رہ گیا تھا اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاتا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کسی دور دراز پُرامن ملک میں اس دولت کے بل پر عیش و آرام سے رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ملک سے نکل کر یہ سب نہیں کر سکے گا۔ مگر اب اسے ضرورت بھی نہیں تھی البتہ وہ اپنے کام کو مس ضرور کرتا۔

اس کا اور راول کا ساتھ پندرہ سے زیادہ برس پر محیط تھا مگر وہ اس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بعد میں وہ پکڑا جائے گا اور شاید اس کے کیے کی سزا اسے ملے گی مگر ڈاکٹر کیش کو اس کی فکر نہیں تھی۔ اسے ان سیکیورٹی گارڈز اور نرس جوڑے کی پروا بھی نہیں تھی جو اس کے جرائم میں شریک تھے۔ ویسے بھی وہ احساس کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اس نے اپنے سب ساتھیوں کو بہت اچھا معاوضہ دیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کسی معاملے میں ان کا ذمے دار نہیں تھا۔ ہفتے کے دن وہ صبح سے بے چین تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد یہ معاملہ

نمٹ جائے اور وہ یہاں سے چلا جائے۔ اس کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ اگر وہ آج یہاں سے نہیں جا سکا تو شاید پھر کبھی نہ جا سکے گا۔ بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ اپنی چھٹی حس پر بھروسا کرتا تھا اور اس کے اشارے پر عمل کرتا تھا شاید اسی لیے وہ اب تک بچتا آیا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی اس نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کا سامان دو بڑے سوٹ کیس میں تھا۔ اس کے پاس کچھ نقد رقم تھی، یہ دس ہزار ڈالرز تھے جو وہ اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ راول اپنا کام بارہ بجے شروع کرے گا اور اس کی فلائٹ رات دو بجے تھی۔ جب تک لوگوں کو اصل صورتِ حال کا پتا چلے گا وہ یہاں سے دور جا چکا ہوگا۔ آٹھ بجے اسے غیر متوقع طور پر راول کی کال آئی۔

''باس! یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟'' ڈاکٹر کیش کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ ''اگر کوئی مسئلہ ہے تو حل کرو۔''

''میں نہیں کر سکتا، آپ کی موجودگی لازمی ہے۔''

''میں نہیں آسکتا۔'' اس نے انکار کیا۔

''باس! اس صورت میں آج رات کے پروگرام پر عمل نہیں ہو سکے گا۔''

''کیوں؟''

''یہ میں فون پر نہیں بتا سکتا۔'' راول پریشانی سے بولا۔

ڈاکٹر کیش نے سوچا اور سر ہلایا۔ آج رات کے پروگرام پر لازمی عمل درآمد ہونا تھا۔ ورنہ اس کے لیے مسئلہ بن جاتا اور عین ممکن ہے اس کی تلاش شروع ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ تیزی سے کلینک کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اپنا سامان کار میں رکھ لیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ کلینک سے ہی ائرپورٹ چلا جائے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مسئلہ کیا ہوا تھا مگر کوئی نہ کوئی بات تھی جبھی راول نے اسے بلایا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے اس نے کار کلینک کے سامنے روکی اور اپنا لیدر بیگ اٹھا لیا۔ اس میں اس کے تمام اہم کاغذات اور رقم بھی تھی۔ اس نے گیٹ کے گارڈ کو کار پر نظر رکھنے کو کہا اور اندر آیا۔ مخصوص انداز میں دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے پریشان حال راول کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ کو دکھاتا ہوں۔''

ڈاکٹر کیش اندر آیا۔ وہ آگے تھا۔ راول نے اس کے دفتر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا، دفتر میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ سامنے فرش پر مرد اور عورت نرس اور دن کا گارڈ پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے راول کی طرف مڑنا چاہا تھا کہ اسے کمر میں چبھن محسوس ہوئی اور اس سے پہلے کہ وہ مڑتا اس کے گھٹنے جواب دے گئے۔ وہ نیچے گرا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا مگر اس کا جسم مکمل طور پر بے حس ہو گیا تھا اور یہ ایک دوا کا اثر تھا جو وہ اکثر دوسروں پر آزماتا رہتا تھا۔ راول نے وہی دوا اسے انجیکٹ کر دی تھی پھر اسے بھی کھینچ کر باقی تینوں کے ساتھ ڈال دیا اور سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد عمارت کی طرف سے بزر بجا۔ گیٹ پر موجود گارڈ عمارت کی طرف آیا۔ داخلی دروازے کے اوپری حصے سے ایک خانہ کھلا اور چھوٹی سی ٹرے میں چائے کا مگ باہر آیا۔ گارڈ نے مگ لیا اور گرم چائے کے گھونٹ لیتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔ تیسرے گھونٹ پر اسے چائے کے ذائقے میں فرق محسوس ہوا مگر تب تک دیر ہو گئی تھی۔ اچانک اس کے ہاتھ سے مگ چھوٹ کر گرا اور پھر وہ خود بھی گر گیا۔ راول باہر آیا۔ اس نے گارڈ کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر گیٹ کی طرف آیا۔ وہ گیٹ کھول کر باہر آیا اور کچھ دیر کھڑا رہا۔ جلد ایک طرف جھاڑیوں سے ایک سایہ جدا ہو کر اس کی طرف آیا، یہ شمل تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے؟''

''پوری طرح۔'' راول نے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

اندر آکر اس نے صحن میں پڑے گارڈ کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچنا شروع کیا اور اسے بھی ڈاکٹر کیش کے دفتر میں لے آیا۔ شمل ان پانچ کرداروں کو دیکھ کر سہم گئی۔ ان سے اس کی اذیت ناک یادیں وابستہ تھیں۔ اگرچہ راول بھی کبھی ان میں شامل تھا مگر اب وہ بدل گیا تھا۔ شمل نے پوچھا۔ ''ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''وہی جو یہ دوسروں کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔'' راول نے کہا۔ ''آؤ وقت کم ہے، ہمیں پہلے لوگوں کو آزاد کرنا ہے۔''

چابیاں راول کے پاس ہوتی تھیں۔ اس نے پہلے اوپر کے لوگوں کو ایک ایک کر کے ان کی کوٹھریوں سے آزاد کرانا شروع کیا ساتھ ہی وہ انہیں دھیمی آواز میں سمجھا رہا تھا کہ وہ خاموشی سے یہاں سے نکلیں اور ایسی جگہ سے مدد حاصل کریں جو ان کو ان کے لواحقین سے محفوظ رکھ

سکیں۔ شمل نے انہیں مشورہ دیا۔ ”تم لوگ کسی ٹی وی چینل چلے جاؤ۔ ایک بار تمہاری کہانی منظرِ عام پر آ گئی تو جن لوگوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے، وہ سب پکڑے جائیں گے۔“

راول خوش ہو گیا۔ ”یہ تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔“

ایک بوڑھا بولا۔ ”ہم کہاں ہیں؟“

”یہ جگہ ایک ویرانے میں ہے شہر سے ذرا دور۔“

”ہم شہر تک کیسے جائیں گے؟“

”میں کچھ کرتا ہوں۔“ راول نے کہا۔ وہ انہیں نیچے لایا۔ ان میں نور اور سہیل احمد بھی تھے۔ راول نے نچلے فلور پر قید افراد کو بھی آزاد کیا۔ اکثر اب بھی سہمے ہوئے تھے اور انہیں لگ رہا تھا کہ ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔ ابھی ان پر کوئی عذاب نازل ہوگا اور وہ کسی تکلیف دہ مرحلے سے گزریں گے۔ راول آفس میں آیا۔ اس نے بے سدھ پڑے افراد کی تلاشی لی اور ان کے پاس جتنی رقم تھی، وہ سب نکال لی۔ یہ اچھی خاصی ہزاروں میں رقم تھی۔ پھر اس کی توجہ ڈاکٹر کیش کے بیگ پر گئی، اس نے اٹھا کر اسے کھولا تو اس کے ایک خانے میں دس ہزار ڈالرز کی رقم دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے گڈی نکال کر اپنی جیب میں رکھی اور باہر آیا۔ اس نے مقامی کرنسی ان سب میں بانٹ دی۔ ”تم لوگوں کو کچھ دور چلنا ہوگا پھر ہائی وے پر کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔ پولیس کے پاس مت جانا ورنہ ہو سکتا ہے پھنس جاؤ۔“

راول سمجھا کر انہیں گیٹ تک لایا اور پھر انہیں باہر نکال کر گیٹ بند کر لیا۔ وہ واپس آیا تو شمل مضطرب ٹہل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ان لوگوں کا کیا کرنا ہے... پولیس کے حوالے کرو گے؟“

”نہیں، اس صورت میں یہ پھر آزاد ہو جائیں گے اور ہم ڈاکٹر کیش سے نہیں چھپ سکتے۔“

”پھر؟“

”ان کے ساتھ وہی ہوگا جو انہوں نے دوسروں کے لیے سوچا تھا۔“ راول کا لہجہ سرد ہو گیا اور شمل کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”آگ...“ اس نے کہا۔

”بالکل... یہاں سب تیار ہے، بس ایک تیلی دکھانے کی دیر ہے۔“ راول اسے عمارت کے ایک وسطی کمرے میں لایا۔ وہاں گھی کے ڈبے کے سائز کا ڈبا رکھا تھا۔ اس سے ایک تیلی نکل کر باہر تک جا رہی تھی۔ ”اسے آگ دکھا کر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

شمل پہلی بار پریشان ہوئی۔ ”ہم یہاں سے کہاں جائیں گے؟“

”اس شہر سے دور کہیں اور۔“ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر کیش مجھے اچھی خاصی رقم دیتا تھا، وہ سب جمع ہے... اور یہ دیکھو۔“ اس نے جیب سے ڈالرز کی گڈی نکال کر دکھائی۔ ”سمجھ لو دس لاکھ سے اوپر رقم ہے۔ ہمارے پاس رقم ہوگی تو ہم کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔“

شمل ہچکچائی اور پھر بولی۔ ”راول! کیا یہ ٹھیک ہوگا؟“

”کیوں ٹھیک نہیں ہوگا؟ یہ انسان نہیں درندے ہیں۔ کتنے انسانوں کو مار چکے ہیں۔ اس سے بڑھ کر انہیں اذیت دیتے رہے ہیں۔ تم بھول رہی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟... سب سے بڑھ کر اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“

شمل کو سب یاد تھا اور اس کے اندر پنپنے والی انسانیت لمحے بھر میں غائب ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ درندے ہیں اور اسی قابل ہیں۔“

راول باہر آیا تو ڈاکٹر کیش کی خستہ حال کار موجود تھی۔ اس نے اس میں سے سوٹ کیس نکالے اور اندر لے آیا۔ انہیں فرار کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی اور ڈاکٹر کی یہ کار ان کے کام آتی۔ اس نے ڈاکٹر کی جیب سے چابی نکالی جو بے بسی کے ساتھ پڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ اسے اپنا انجام نظر آ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید اب اسے احساس ہو رہا ہوگا کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ جو کرتا آیا تھا تو وہ بے بسی کی کیفیت میں کیا محسوس کرتے ہوں گے۔ راول اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ البتہ جب وہ جانے لگا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ کام پہلے کیوں نہیں کیا... لیکن شاید ہر کام کے لیے ایک وقت مخصوص ہوتا ہے۔ آج اس کام کا وقت آ گیا ہے جس آگ میں تم دوسروں کو جلانے جا رہے تھے، اب اس میں خود جلو گے۔“

راول آفس سے نکل گیا۔ اس کے ایک منٹ بعد ایک دبا ہوا دھماکا ہوا اور پھر ایسی آواز آئی جیسے آگ بھڑک رہی ہو۔ رفتہ رفتہ آگ اس کمرے کی طرف آنے لگی۔ تپش اور دھواں اندر آ رہا تھا، ان کا دم گھٹ رہا تھا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ پھر آگ اندر گھس آئی اور بے جان چیزوں کے ساتھ جاندار جسموں کو بھی چاٹنے لگی۔ یہ قدرت کا انتقام تھا۔ دوسروں کو اذیت دے کر ان کی چیخوں سے لطف اندوز ہونے والے اب اذیت سے چیخ بھی نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

نور باہر آ کر ہراساں سی تھی۔ وہ سہیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ پھر اسے اپنی کیفیت پر ہنسی آنے لگی۔ جب تک وہ قید خانے میں تھی تو مطمئن تھی اور باہر آ کر پریشان ہو رہی تھی۔ کوشش کے باوجود اس کی ہنسی نکل گئی۔ سہیل نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر مسکرایا۔ ”تم خوش ہو؟“

”نہیں، اس کے برعکس پریشان ہوں اور مجھے ہنسی اپنی پریشانی پر آئی ہے کہ میں آزاد ہو کر پریشان ہوں۔“

”اب تم کہاں جاؤ گی؟ کسی چینل کے پاس؟“

”نہیں مجھے تماشا بننے کا شوق نہیں ہے۔“ اس نے انکار کیا۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہاں جاؤں؟“

”میرا ابھی ارادہ نہیں ہے۔ اب تک میں قید اور مجبور تھا لیکن اب مجبور نہیں ہوں۔“

نور نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کیا کریں گے؟“

”تم دیکھ لینا۔“ سہیل نے کہا پھر ہچکچا کر بولا۔ ”تم کہاں جاؤ گی؟“

”ظاہر ہے اپنے گھر۔“

”وہاں تمہارے بچے ہیں جو تمہیں اس قید خانے میں ڈالنے کے اصل ذمے دار تھے۔“ سہیل تلخ لہجے میں بولا۔ ”کیا تم پھر کسی قید خانے میں جانا چاہ رہی ہو؟“

نور نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”تب میں کیا کروں؟“

”اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو تو میرے ساتھ چلو۔ پہلے میں اپنے مسئلے سے نمٹ لوں، اس کے بعد تمہارا مسئلہ بھی نمٹا سکتا ہوں۔“

نور نے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے آپ پر اعتماد ہے۔“

ان میں اکثر بوڑھے اور کمزور تھے اس لیے وہ بہت آہستہ چل رہے تھے۔ بیس منٹ بعد وہ ہائی وے پر تھے جہاں ٹریفک گزر رہا تھا۔ یہاں بسیں چلتی تھیں اور ایک بس آ کر رکی تو وہ سب اس میں سوار ہو گئے۔ بس کے مسافر اور ڈرائیور اتنے سارے معمر اور ایک جیسے لباس والے افراد کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ بس آگے شہر کی طرف جا رہی تھی لیکن سہیل، نور کے ساتھ پہلی آباد جگہ اتر گیا جہاں ٹیکسیاں تھیں۔ اس کے پاس رقم تھی۔ اس نے ٹیکسی لی اور اسے ایک پوش آبادی کا پتا بتایا۔ نور نے ٹیکسی میں بیٹھ کر پوچھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”میرے ایک ٹھکانے پر۔“ سہیل نے آہستہ سے کہا۔ ”شاید میں نے یہ اسی وقت کے لیے بنایا تھا۔ اس کے بارے میں سوائے میرے اور کوئی نہیں جانتا۔“

آدھے گھنٹے بعد وہ اس خوب صورت اور مہنگی نظر آنے والی عمارت کے سامنے اترے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو گارڈ نے سہیل کو پہچان کر سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئے۔ صاف ستھرے ٹائلز سے چمکتی راہداریاں اور اعلیٰ درجے کے ماربل سے بنے زینے تھے۔ وہ دوسرے فلور پر آئے۔ ایک اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے آ کر سہیل نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اَن لاک۔“

ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ یہ آواز سے کھلنے اور بند ہونے والا تالا تھا۔ یہ بہت شاندار قسم کا لکڑی کے پینل اور دبیز قالین سے سجا ہوا اپارٹمنٹ تھا۔ ہر چیز اعلیٰ ترین معیار کی تھی مگر فی الحال نور کسی چیز پر توجہ دینے کے قابل نہیں تھی۔ اس کا پیاس سے برا حال تھا۔ اس لیے سہیل سب سے پہلے کچن والے حصے میں آیا، اس نے ڈبل ڈور فریج کا دروازہ کھولا اور اندر سے منرل واٹر کی سیل بوتل نکالی۔ اس نے پہلے نور کے لیے گلاس میں پانی نکالا پھر خود پیا اور نور سے پوچھا۔ ”چائے کافی... کیا پیو گی؟“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ نور نے سادگی سے کہا۔

”سوری مجھے خیال نہیں رہا... ہمیں چلنا بھی بہت پڑا ہے۔“

”میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔“ نور نے کہا۔ فریزر میں مچھلی اور بیف کا گوشت تھا۔ سہیل نے مچھلی اور گوشت نکالا اور پکانے کی تیاری کرنے لگا۔ نور نے کہا۔

”لائیں میں بناتی ہوں۔“

”تم کھانا بناتی ہو؟“

”ہاں، اکثر چھٹی کے دن بناتی تھی۔ جب تک واجد زندہ تھے میرے ہاتھ کا ہی کھاتے تھے۔“

سہیل نے چھری اور سامان اس کے حوالے کیا۔ ”ٹھیک ہے تب تک میں ذرا شاور لے کر چینج کر لوں۔“

خودنور کو اس لباس سے وحشت ہورہی تھی اور وہ نہانا چاہتی تھی مگر اسے کہتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ اس نے گوشت اور مچھلی کے قتلے سادہ انداز میں تلے، ان کے ساتھ ساسز اور وائٹ پیپر تھا۔ سہیل شاور کے بعد کپڑے بدل کر آگیا تو نور ایک لمحے کو چونک گئی۔ سادہ سیاہ پتلون اور پورے آستین کی شرٹ میں وہ کہیں سے اتنی عمر کا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر اس کے بال سفید نہ ہوتے تو کوئی اسے تیس پینتیس سے زیادہ کا تسلیم نہ کرتا۔ سہیل اس کے دیکھنے کے انداز پر رکا اور پھر پوچھا۔ ''کوئی چینج آیا ہے؟''

''بہت... آپ تو بدلے ہوئے لگ رہے ہیں۔''

''قیدی اور آزاد انسان میں فرق تو ہوتا ہے۔'' سہیل مسکرایا۔ ''میرا خیال ہے تم بھی چینج کرنا چاہتی ہو۔ لیکن افسوس میرے پاس یہاں صرف میرے کپڑے ہیں۔ البتہ ایک نائٹ سوٹ ہے شاید اس سے کام چل جائے۔''

نور خوش ہوگئی۔ ''مجھے بھی اس لباس سے وحشت ہو رہی ہے۔''

سہیل اسے گیسٹ روم میں لایا۔ اس کا نائٹ سوٹ بھی نور کو خاصا بڑا تھا مگر نہا کر اور کپڑے بدل کر اس نے خود کو خاصا پُرسکون محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر تھے۔ کھانے کے دوران نور نے کہا۔ ''آج آپ نے اپنی کہانی سنانے کو کہا تھا۔''

''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ڈنر کے بعد کافی پر۔''

☆☆☆

سہیل نے اپنے باپ کی فیکٹری کی زمین پر اپنی فیکٹری لگائی تو یہ ترقی کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔ یہ چھوٹا ہوزری یونٹ اس کے باپ کی فیکٹری جتنا بڑا تو نہیں تھا لیکن جلد اس نے اسے بڑھا لیا اور دس سال بعد وہ ایسی ہی ایک فیکٹری اور قائم کر چکا تھا۔ اب مزمل اور کامل بھی تعلیم مکمل کر کے اس کے ساتھ آگئے تھے۔ اس نے حنا اور کامل کی شادی ایک ساتھ کی۔ خود وہ بہن بھائیوں کے اصرار کے باوجود خود کو شادی پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ جب وہ شادی کا سوچتا تو وہ لڑکی اس کے ذہن میں آجاتی تھی مگر اس کی تو شادی ہوچکی تھی۔ اس کے بعد کوئی دل کے پاس آئی ہی نہیں تو وہ شادی کے لیے کیسے آمادہ ہوتا۔ بارہ سال پہلے اس نے ہما اور مزمل کی شادی بھی نمٹا دی۔ اب وہ سب گھر بار اور بچوں والے تھے۔ ان کی فیملی سہیل احمد کی اپنی فیملی تھی اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتا تھا لیکن وہ اسے کیا سمجھتے تھے، یہ اسے کچھ عرصے پہلے پتا چلا۔

سہیل نے یہ کاروبار اپنی محنت سے بنایا تھا۔ قرض لے کر اس نے پہلی فیکٹری کھولی پھر قرض اتار کر اس نے فیکٹری کو مکمل کیا اور اس کے بعد دوسری فیکٹری قائم کی جس کا سارا مال بیرونِ ملک جاتا تھا۔ باپ کی طرف سے اسے جو کوٹھی اور دوسری جائداد ملی تھی، وہ اس نے پہلے ہی بہن بھائیوں میں بانٹ دی تھی۔ کوٹھی اور فیکٹری کی زمین کی قیمت لگا کر اس کی ساری رقم چاروں بہن بھائیوں کے حوالے کر دی اور خود اس میں سے ایک روپیا بھی نہیں لیا تھا۔ گویا اب اس کا سب کچھ صرف اس کا تھا اور اس کے بعد اس کے بہن بھائیوں کا ہوتا۔ ویسے وہ اب بھی انہیں بزنس کے منافع میں سے ایک حصہ دے رہا تھا جو عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھا مگر وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اور زیادہ چاہتے تھے اور مزید بھی انہیں سہیل سے مل سکتا تھا۔ ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ اپنی بے تحاشا خواہشات پوری کرنے کے لیے خود سے کما سکیں۔

مگر سہیل کی زندگی میں اس کے بزنس اور دولت پر وہ اختیار حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ بے شک وہ ان سے بڑا تھا مگر بوڑھا نہیں تھا۔ اس کی صحت اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے زیادہ اچھی تھی۔ وہ اعتدال سے زندگی گزارتا تھا۔ مناسب اور متوازن غذا کے ساتھ وہ ورزش کا خیال رکھتا تھا۔ ہر چھ مہینے بعد اپنا مکمل چیک اپ کراتا تھا۔ اگر اس کے بہن بھائی اس کے مرنے کا انتظار کرتے تو اس میں بہت وقت لگ سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس سے پہلے دنیا سے گزر جاتے۔ پھر اس کا دنیا سے گزر جانا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا کیونکہ سہیل نے ایک وصیت کے تحت اپنے بعد بزنس کو ایک ٹرسٹ کی صورت دی تھی۔ اس کے بہن بھائی اس میں نگراں کی حیثیت سے کام کر سکتے تھے اور کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع ان میں تقسیم ہوتا۔ یہ بھی پورا نہیں ملتا بلکہ انہیں نصف ملتا اور باقی نصف سہیل احمد کے طے کیے ہوئے فلاحی اداروں کے پاس جاتا۔ وہ اب بھی اپنی آمدنی کا نصف ان ہی اداروں کو دیتا تھا۔ اصل میں چاروں کو یہی بات کھٹکتی تھی کہ سہیل اتنی بڑی رقم انہیں دینے کے بجائے مفت خوروں میں بانٹ دیتا تھا۔ ان کے نزدیک وہ مفت خورے تھے۔ آڈٹ اور غیر جانبدار شخصیات کی طرف سے نگرانی کا ایسا سسٹم بنایا گیا تھا کہ کوئی

اس کا توڑ نہیں کر سکتا تھا۔ سہیل نے اپنی اس وصیت سے بہن بھائیوں کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔

اس لیے انہوں نے دوسرا طریقہ نکالا۔ کامل کا ایک دوست ڈاکٹر کیش کا کلائنٹ تھا اور اس نے اپنے دادا کو فاتر العقل قرار دلوا کر پہلے دولت اور جائداد پر قبضہ کیا اور پھر اس کا دادا ڈاکٹر کیش کے کلینک میں دنیا سے گزر گیا اور اب سب اس کا تھا۔ کامل سے اس کی ایسی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی تھی کہ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں بتا دیا کہ اس نے کیسے دادا سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اس سے کامل کو خیال آیا اور پہلے اس نے مزمل سے بات کی اور جب مزمل مان گیا تو انہوں نے بہنوں سے بات کی اور جب وہ بھی مان گئیں تو وہ ڈاکٹر کیش سے ملے۔ اگرچہ اس نے بہت بھاری فیس کا مطالبہ کیا تھا مگر اس کے بدلے انہیں کئی سو گنا زیادہ دولت ملنے والی تھی۔ اس لیے وہ مان گئے اور پھر ڈاکٹر کیش کے بتائے طریقے پر عمل کر کے انہوں نے سہیل کو دماغی مریض بنایا۔ بالآخر اسے ڈاکٹر کیش کے کلینک پہنچا دیا گیا۔ اب کاروبار پر بہن بھائیوں کا قبضہ تھا۔ انہوں نے عدالت سے آرڈر حاصل کر لیا تھا۔ مگر وہ اس دولت اور بزنس کے مالک نہیں بن سکتے تھے اسی لیے جب ڈاکٹر کیش نے ان سے رابطہ کیا اور سہیل کے بارے میں پیشکش کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔

☆☆☆

نور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پندرہ سالہ لڑکی کون تھی جس کی وجہ سے سہیل احمد نے آج تک شادی نہیں کی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت مند تھا، کامیاب بزنس مین تھا، اچھے فیملی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتا تھا، معاشرے میں عزت اور مقام تھا، خوبرو تھا۔ اسے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی تھی۔ مگر صرف ایک لڑکی کی خاطر اس نے جوانی کے قیمتی سال تنہا گزار دیے۔ جب وہ خاموش ہوا تو نور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟... شادی کیوں نہیں کی... اپنی فیملی کیوں نہیں بنائی... آج آپ کے جوان بچے ہوتے تو کس میں جرأت تھی آپ کے ساتھ ایسا کرتا۔''

''تمہارے بھی تو جوان بچے ہیں۔'' سہیل نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اول تو یہ ممکن ہی نہیں تھا لیکن اگر میں شادی کر لیتا میری اولاد ہوتی تو کیا ضمانت تھی کہ وہ ایسا نہ کرتی۔''

''اس ملک میں لاکھوں دولت مند ہیں۔'' نور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ان میں سے چند درجن، سو چند سو افراد کی اولادیں ایسی نکل آئیں تو ضروری نہیں ہے کہ سب ایسے ہی ہوں۔ میں نے خود سے کہیں زیادہ دولت مند اور مختار کل افراد کے بچوں کو ان کے سامنے ایسے باادب دیکھا ہے کہ وہ آنکھ اٹھا کر بات بھی نہیں کرتے ہیں۔ سہیل! یہ میری اور آپ کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے بچے اور بہن بھائی ایسے نکل آئے۔ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بیک گراؤنڈ ہوگا۔''

''بس اب تو وقت گزر گیا۔'' سہیل نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میری سمجھ میں یہ شخص نہیں آیا۔ کہاں تو یہ ڈاکٹر کیش کا دستِ راست بنا ہوا تھا اور کہاں اس نے سب کو آزاد کرا دیا۔''

''جہاں تک میں نے جانا ہے، ڈاکٹر کیش ابلیس صفت شخص ہے اور کوئی شخص اس کی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس شخص کے اندر بھی یقیناً انسانیت موجود تھی اور وہ ابھر آئی۔ مجھے لگ رہا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے تب ہی اس نے سب کو آزاد کرایا اور وہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کیش کا جرم منظرِ عام پر آئے۔ اسی لیے اس نے رہا ہونے والوں کو میڈیا کے سامنے جانے کو کہا۔''

''ٹی وی لگائیں شاید اس پر کچھ آگیا ہو۔''

ان کی توقع کے عین مطابق وہ لوگ ایک معروف ٹی وی چینل کے دفتر جا پہنچے تھے اور ہنگامی ٹرانسمیشن میں ان لوگوں کی کہانیاں نشر کی جارہی تھیں۔ پولیس اور اعلیٰ حکام حرکت میں آگئے تھے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ شہر سے دور ڈاکٹر کیش کے کلینک میں شدید آگ لگ گئی تھی جس نے پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور فائر بریگیڈ آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چونک گئے۔ ''میرے خدا... تو اس نے اس لیے ہم سب کو وہاں سے نکالا۔'' نور نے کہا۔ ''اس جگہ آگ کیسے لگی؟''

''یہ یقیناً اسی شخص کا کام ہے۔'' سہیل نے یقین سے کہا۔ ''اس نے صرف ہمیں آزاد نہیں کرایا بلکہ اس قید خانے کو بھی تباہ کر دیا۔ اب وہاں کسی کو قید نہیں کیا جا سکے گا۔''

''ہاں۔'' نور نے گہری سانس لی۔ ''مگر ابھی لالچ اور ڈاکٹر کیش جیسے لوگ موجود ہیں۔ یقیناً ایسے قید خانے اور بھی ہوں گے۔''

☆☆☆

صفدر نشے میں دھت ہو کر سو رہا تھا کہ اس کی بیوی

روبی نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ وہ بہ مشکل اٹھا تھا۔ روبی نے بدحواسی کے عالم میں اسے اطلاع دی کہ ڈاکٹر کیش کے کلینک سے تمام قیدی آزاد ہو کر ایک ٹی وی چینل پہنچ گئے ہیں۔ خبر سنتے ہی صفدر کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟ آج رات تو...“

”وہ لوگ آزاد ہو گئے۔ وہاں کام کرنے والے راول نامی شخص نے انہیں آزاد کر دیا ہے۔“ روبی نے تلخی سے کہتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔

اس چینل کے اسٹوڈیو میں وہ تمام افراد موجود تھے جو اس کلینک سے نکلے تھے۔ صفدر نے بڑے سائز کی اسکرین کے پاس جا کر معائنہ کیا اور بولا۔ ”اس میں ماما نہیں ہیں۔“

”نہیں ہیں۔“ روبی کے لہجے میں امید آگئی۔ ”کلینک میں آگ بھی لگ گئی ہے مگر ابھی بجھائی نہیں جا سکی ہے۔ ممکن ہے وہ وہیں ہوں۔ میں باقی سب کو اٹھاتی ہوں۔“

دس منٹ میں اصغر، مونا، حور اور عاطف بھی لاؤنج میں آگئے۔ وہ سب اب ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ مگر جلد یہ حقیقت سامنے آگئی کہ ان لوگوں کے ساتھ ایک بوڑھا جوڑا بھی تھا جو راستے میں بس سے اتر گیا تھا۔ یہ سن کر ان سب کے چہرے بھی اتر گئے۔ حور نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”اگر وہ ماما ہوئیں تو...“

”تو ہماری خیر نہیں ہوگی۔“ صفدر نے تلخی سے کہا۔ ”میں شروع سے اس تجویز کا مخالف تھا۔“

”لیکن اس کے ثمرات سمیٹنے میں تم نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔“ اصغر نے طنز کیا۔

”صرف میں؟ کیا تم شامل نہیں تھے؟“ صفدر چلّایا۔

”پلیز آپس میں لڑنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔“ حور نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اس سے پہلے بات بگڑ جائے ہمیں اس کا کوئی حل نکالنا ہوگا۔“

”بات تو بگڑ چکی ہے۔“ اصغر نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔“ عاطف معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اگر ماما یہاں ہوتیں تو یقیناً بگڑ جاتی۔ ہماری خوش قسمتی کہ وہ ابھی تک میڈیا تک نہیں پہنچی ہیں اور انہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

”کیسے؟“

”تلاش گم شدہ کے ذریعے۔“ عاطف نے کہا۔ ”اسٹوری یہ ہوگی کہ وہ غائب دماغی کی مریضہ ہیں اور کل رات گھر سے نکل گئی تھیں۔ ہم نے یہی تو مشہور کیا ہوا ہے۔ اب کسی کو کیا پتا کہ وہ ڈاکٹر کیش کے کلینک میں تھیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہیں رکھ کر ان کا علاج کرا رہے تھے۔“

”تم بھول رہے ہو۔“ صفدر نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”عدالت میں ڈاکٹر کیش کا بیان... لیا گیا تھا تب عدالت نے ہمیں بزنس پر اختیار دیا۔“

”اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کلینک میں تھیں۔ ڈاکٹر کیش کا کہنا ہے کہ وہ ریکارڈ نہایت خفیہ رکھتا ہے اور اگر وہ اس عمارت میں ہوا تو تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ وہ سب جل کر راکھ ہو جائے گا۔ وہ کنفرم نفسیاتی مریضہ ہیں اس لیے بات ان کی نہیں ہماری مانی جائے گی۔“

عاطف کی بات سن کر ان لوگوں نے کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔

”مقامی پولیس اسٹیشن میں گم شدگی کی رپورٹ کراتے ہیں۔ پھر خود اسپتالوں اور ایسی جگہوں پر جا کر دیکھتے ہیں جہاں لاوارث لوگ پہنچائے جاتے ہیں۔ ان کی تصویریں لے جائیں گے اور کل سے ٹی وی اور اخبارات میں بھی اشتہار کرنا شروع کریں گے۔ اس طرح ایک ماحول بن جائے گا کہ وہ گم گئی ہیں اور ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کسی کے پاس پہنچیں یا پولیس سے رابطہ کیا تب بھی کوئی ان کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔“ اصغر نے سوچتے ہوئے کہا۔

”شوہر کس کا ہے؟“ حور نے فخر سے عاطف کو دیکھا تو وہ مسکرانے لگا مگر دو منٹ بعد ہی ان سب کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ اچانک وہاں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ روبی نے اٹھ کر کال ریسیو کی اور پھر دوسری طرف سے آواز سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے جلدی سے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

”ماما ہیں... اسپیکر آن کرنے کو کہہ رہی ہیں۔“

وہ سب جھپٹ کر اس کے پاس پہنچے۔ صفدر نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”ماما...“

”کاش میں تم لوگوں سے ماما کہنے کا حق چھین سکتی۔“ دوسری طرف سے نور کی سرد آواز آئی۔

"آپ کہاں ہیں؟ ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔" اصغر بولا۔

"ماما! ہم بہت پریشان ہیں۔" حور زبردستی روہانسا لہجہ بنا کر بولی۔

"مجھے تم لوگوں کی پریشانی کا اچھی طرح اندازہ ہے۔اس لیے میں بتادوں، میں محفوظ ہوں اور تم لوگوں کی پہنچ سے دور ہوں۔ ابھی میں نے صرف اس لیے کال کی ہے کہ تم لوگ میری تلاش میں کوئی حماقت نہیں کرو گے۔ یعنی مجھے گم شدہ قرار دینے یا پولیس میں رپورٹ کرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"ماما! مجبوری ہے ایسا تو کرنا پڑے گا۔" عاطف نے چالاکی سے کام لینے کی کوشش کی۔ "ورنہ آپ واپس آجائیں۔"

"اگر تم لوگوں نے ایسا کیا تو میں بھی اس ٹی وی چینل تک پہنچ جاؤں گی۔کل تک تم لوگوں کو اچھی طرح پتا چل جائے گا کہ ڈاکٹر کیش کی مدد لینے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اس لیے تم لوگ ان میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو بالکل خاموش بیٹھو گے۔"

ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔صفدر نے گھبرا کر کہا۔ "ماما! آپ بے فکر رہیں، ہم کچھ نہیں کریں گے۔" دوسرے بھی یقین دلانے لگے۔

"ماما..." حور نے کہنا چاہا لیکن لائن کٹ گئی۔

"نمبر دیکھو۔" اصغر نے کہا اور صفدر نے جھک کر فون میموری میں نمبر چیک کیا۔ یہ ایک موبائل نمبر تھا۔ انہوں نے اسے ڈائل کیا مگر آگے سے جواب آیا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔وہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اگرچہ نور کی کال نے ان کا ایک منصوبہ ناکام بنا دیا تھا مگر ساتھ ہی انہیں اطمینان ہو گیا کہ وہ ان سے ناراض ہے مگر انہیں قانون کے حوالے نہیں کرے گی۔ جیسا کہ دوسرے لوگوں نے اپنے لواحقین کے ساتھ کیا تھا۔ چینل کے توسط سے پولیس کے اعلیٰ حکام ان سے رابطہ کر رہے تھے۔ امید کی جا رہی تھی کہ جلد معاملے کی عدالتی تحقیقات شروع ہو جائیں اور مجرموں کو سزا ملتی ۔ وہ سوچ سکتے تھے کہ نور ان لوگوں میں شامل ہوتی تو ان کے ساتھ بھی یہی سب ہوتا.... وہ امید ہو گئے۔حور نے کہا۔

"شاید ماما ہمیں معاف کر دیں۔"

"وہ ہمیں معاف کر دیں گی۔" اصغر نے یقین سے کہا۔ "آخر ہم ان کی اولاد ہیں۔"

وہ نور کے لیے سوچ رہے تھے کہ وہ انہیں معاف کر دے گی لیکن انہوں نے ایک بار بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ کیسی اولاد تھے۔انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ صفدر کچھ سوچ رہا تھا، اس نے ان کی طرف دیکھا۔ "تم لوگ بھول رہے ہو۔ ماما کے بارے میں ان لوگوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا۔ وہ کون ہے اور ماما اس کے ساتھ کیوں گئی ہیں؟"

وہ چونک گئے۔ یہ سوال اہم تھا اور اس کا جواب ایک ہی شخص دے سکتا تھا، یعنی ڈاکٹر کیش... مگر جب انہوں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا موبائل نمبر بند جا رہا تھا اور شہر والے کلینک پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس واقعے کے بعد فرار ہو گیا ہے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ڈاکٹر کیش دنیا سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن سہیل کچھ دیر کے لیے کہیں گیا۔نور نے رات اس کے مشورے پر اپنے گھر کال کی تھی اور اسی کے مشورے پر اس نے ان سے بات کی۔ سہیل کا کہنا تھا کہ وہ ٹی وی چینل پر نہیں گئی تھی اس لیے وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے گم شدہ ظاہر کر سکتے ہیں۔وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ انہوں نے جاننے والوں میں یہ خبر پھیلائی ہو گی اس لیے اگر وہ کسی سے کہے گی تو اس کی بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ سہیل کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔اس نے بروقت کال کر دی تھی اور اب وہ مجبور ہو گئے تھے کہ چپ کر کے بیٹھ جائیں۔وہ صبح اٹھی تو سہیل نے اس کے لیے ناشتا بنا دیا۔وہ خود کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں کچھ دیر میں آؤں گا اگر دیر ہو تو پریشان مت ہونا۔کچھ بنانا مت، میں باہر سے لے آؤں گا۔"

ناشتے کے بعد نور نے ٹی وی لگایا۔کلینک کی آگ بجھا دی گئی تھی اور فائر فائٹر حکام کا کہنا تھا کہ آگ کیمیکل سے لگائی گئی تھی اس لیے اس پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔ اندر سے پانچ تقریباً راکھ ہو جانے والی لاشیں ملی تھیں جن کی شناخت ناممکن تھی۔ ان کے ڈی این اے ٹیسٹ کرائے جا رہے تھے۔ اب تک ان لاشوں کے بارے میں کسی شخص نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

اعلیٰ حکام ان لوگوں کو ان کے گھروں اور دوسری جائداد کا قبضہ دلا رہے تھے اور یہ سب میڈیا کی وجہ سے ہوا تھا۔نور سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ٹی وی چینل پر چلی جاتی تو

آج اس کے بچے بھی گرفتار ہو چکے ہوتے۔مگر وہ ایسا نہیں چاہتی تھی اسے تماشا بنانے اور بننے سے نفرت تھی۔ سہیل دوپہر میں آیا۔نور اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے بال لائٹ براؤن کرا لیے تھے اور وہ بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ ڈھیروں شاپرز لے کر آیا تھا۔ان میں سے دو شاپرز اس نے نور کے حوالے کیے۔ "اس میں تمہارے لیے کپڑے اور دوسری چیزیں ہیں۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" نور نے کئی شاپرز دیکھ کر کہا۔ "آپ ایک ہی سادہ سوٹ لے آتے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، تم اس سے کہیں زیادہ کے لائق ہو۔" سہیل نے کہا۔ "دیکھو اور بتاؤ کیسا لگا۔"

نور نے ایک شاپر کھولا۔ یہ ریڈی میڈ سوٹ کا ایک نامور برانڈ تھا جس کا اپنا اسٹور تھا۔ ایک بہت خوب صورت فراک سوٹ تھا اور دوسرا کرتہ ٹراؤزر سوٹ تھا۔ ایک نائٹ سوٹ تھا اور ایک سادہ شلوار سوٹ تھا۔ایک گھر کی چپل تھی اور ایک نازک سی سینڈل تھی۔ اس نے دیکھا اور خوش نظر آنے لگی۔ "سب بہت اچھا ہے۔ لیکن یہ تو جوان عورتوں اور لڑکیوں پر اچھے لگیں گے۔"

"حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں ہے، تم اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اور قیمتی لباس پہنتی ہو گی۔" سہیل نے کہا۔ "بائی داوے تم نہ بوڑھی ہو اور نہ بدصورت۔"

"تھینک یو ویری مچ۔"

"شکریہ ایسے ادا نہیں کیا جاتا ہے۔" سہیل نے آہستہ سے کہا۔ "تحفے کا صحیح شکریہ اسے استعمال کرنا ہے۔"

"میں ابھی چینج کر کے آتی ہوں۔" نور نے شاپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ آئی تو سہیل اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اس کی نظروں نے نور کو لجا دیا تھا۔وہ جانتی تھی وہ اس عمر میں بھی بہت خوب صورت تھی۔جن لوگوں کو پہلی بار پتا چلتا تھا کہ صفدر، اصغر اور حور اس کی اولاد ہیں تو ان کو قطعی یقین نہیں آتا تھا۔ اب بھی اسے دیکھنے والے بہت تھے مگر ان کی نظروں میں وہ محبت اور سراہتا ہوا احساس نہیں ہوتا تھا جو اس نے واجد کی اور اس کے بعد اب سہیل کی آنکھوں میں محسوس کیا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

سہیل نے گہری سانس لی۔ "اپنی بدقسمتی پر غور کر رہا ہوں۔"

نور اداس ہو گئی۔ "ایسا نہ کہیں، بدقسمت تو میں ہوں۔سولہ سال کی عمر میں خود سے تین گنا بڑے شخص سے بیاہ دی گئی۔ ہاں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ واجد نے سچ مچ مجھ سے محبت کی اور میرا بے پناہ خیال رکھا۔وہ مجھ سے اس حد تک مخلص تھے کہ انہوں نے مجھے اولاد سے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ ان کے خون میں وفا نہیں ہے اور یہ مجھ سے دغا کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔"

"ایسا تو میرے ساتھ بھی ہوا۔ بچے تمہارا خون نہیں ہیں لیکن یہ بہن بھائی تو میرا خون ہیں لیکن انہوں نے کیا کیا۔" سہیل احمد بھی اداس ہو گیا۔ "میں نے باپ بن کر ان کی پرورش کی اور انہوں نے مجھے یہ صلہ دیا؟"

"شاید دولت چیز ہی ایسی ہے۔" نور بولی پھر اس نے سہیل سے پوچھا۔ "آپ نے بال کلر کیوں کرا لیے؟ ویسے یہ آپ پر بہت اچھے لگ رہے ہیں۔"

"غیر نمایاں ہونے کے لیے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرے قدرتی سفید بال بہت نمایاں ہوتے ہیں، لوگ چونک کر دیکھتے ہیں۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"دوسرا وکیل کروں گا۔ مجھے شبہ ہے کہ میرا وکیل بھی ان لوگوں سے مل گیا ہے ورنہ وہ اتنی آسانی سے مجھے اس کلینک میں داخل نہیں کر سکتے تھے۔"

"شاید ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرا وکیل واجد کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مجھے پسند نہیں ہے لیکن اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اس لیے میں نے اسے برقرار رکھا۔"

"اس کے بعد میں کم سے کم دو مستند ماہرین نفسیات سے اپنے بارے میں سرٹیفکیٹ حاصل کروں گا اور اس کے بعد عدالت کا رخ کروں گا۔"

"عدالتی طریقہ کار بہت طویل ہوتا ہے۔"

سہیل نے گہری سانس لی۔ "میں جانتا ہوں، اس میں وقت لگ سکتا ہے لیکن یہی واحد درست طریقہ ہے۔"

"آپ پہلے ان لوگوں سے براہِ راست بات کریں۔"

"یہ اس مرحلے پر مشکل ہے کہ ان کے پاس ڈاکٹر کیش کا سرٹیفکیٹ ہے کہ میں دماغی طور پر بیمار ہوں۔ جب تک میں اس کا توڑ نہیں کر لیتا تب تک ان سے بات کرنا بیکار ہے۔ہاں اس کے بعد بات کر سکتا ہوں۔"

"تب آپ ایسا ہی کریں۔ عدالت کا آپشن آخر میں رکھیں اور ہو سکے تو کچھ لو دو کی بنیاد پر فیصلہ کر لیں تاکہ ان کے منہ بند ہو جائیں۔ کچھ بھی ہے بہرحال وہ آپ کے

www.paksociety.com

بہن بھائی ہیں۔ آپ ان کی طرح نہیں ہیں اس لیے ان جیسا بھی مت کریں۔"

"تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے۔" سہیل احمد نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ "حسن و ذہانت کا امتزاج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔"

نور شرما گئی۔ اسے لگا اس کے اندر کی عورت جسے اس نے واجد کے بعد تھپک کر سلا دیا تھا پھر سے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ سمجھتی کہ راکھ ہو گئی ہے لیکن اس راکھ میں کہیں چنگاری دبی ہوئی تھی۔

☆☆☆

مزمل، کامل، ہما اور حنا کو یقین تھا کہ سہیل زندہ ہے لیکن وہ کہاں تھا؟ ان کی خوش قسمتی کہ ڈاکٹر کیش کا کلینک مکمل طور پر جل گیا تھا اور اس کے شہر والے کلینک سے پولیس کو قید کیے جانے والے لوگوں کے بارے میں کوئی ریکارڈ نہیں ملا تھا اور اس وجہ سے بھی پولیس کو قید افراد کے لواحقین کے خلاف کارروائی میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ دوسری طرف وہ بہرحال ان لوگوں کی اولاد اور قریبی رشتے دار تھے اس لیے کئی افراد نے تو پولیس ایف آئی آر واپس لینے کی بات کی تھی۔ وہ انہیں معاف کرنے کو تیار تھے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ پانچ افراد کی لاشیں پولیس کے حلق میں اٹک گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے ان میں ڈاکٹر کیش کی لاش کا تعین اس کے ڈینٹل اسٹرکچر سے ہوا تھا مگر باقی چار لاشیں بدستور نامعلوم افراد کی تھیں۔ شبہ تھا کہ یہ ڈاکٹر کیش کے ساتھ اس کلینک میں کام کرتے تھے اور قیدیوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ان کے ذمے تھی۔

جو ڈھائی درجن سے زیادہ افراد اس کلینک میں موت کا شکار ہوئے تھے، ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے قاتل وارث بچ نکلے تھے اور امکان تھا کہ باقی بھی بچ جائیں گے۔ شاید ہی کسی کو سزا ہو۔ ہاں یہ امکان تھا کہ قید سے واپس آنے والے اب انہیں اپنی دولت اور جائداد سے عاق کر دیں گے۔ ان لوگوں کے لیے یہی سب سے بڑی سزا ہوگی۔ اصل قاتلوں کو سزا مل چکی تھی۔ انہوں نے سہیل کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ جب ان کی پریشانی انتہا کو پہنچ گئی تو سہیل نے غیر متوقع طور پر خود رابطہ کر لیا۔ اس نے کامل کو کال کی۔ "میں تم چاروں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بھائی، آپ کہاں ہیں؟"

"تم مجھے بھائی کہنے کا حق نہیں رکھتے۔" سہیل نے رکھائی سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ ملنے آ رہے ہو یا نہیں؟"

"ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔" کامل نے کہا۔ "سہیل بھائی، ہم سب بہت شرمندہ ہیں۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم جیسے لوگ کتنے شرمندہ ہو سکتے ہو۔" سہیل احمد نے طنز کیا۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے دو گھنٹے بعد کال کریں، میں باقی سب کو بتا دوں۔"

"میں دو گھنٹے بعد کال کرتا ہوں۔" سہیل نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس نے دو گھنٹے بعد کال کی تو دوسری طرف سب جمع تھے۔ سہیل نے انہیں ایک گھنٹے بعد ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں ملنے کے لیے کہا۔ "میں انتظار کروں گا۔ اگر تم لوگ ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہاں نہ پہنچے تو میں چلا جاؤں گا اور پھر تم لوگوں سے کسی اور طریقے سے ملاقات ہوگی۔"

"ہم ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔" کامل نے اسے یقین دلایا اور وہ لوگ سچ مچ ایک گھنٹے کے اندر فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں موجود تھے۔ وہاں سہیل سر پر گرم ٹوپی اور سیاہ عینک میں ان کا منتظر تھا۔ گرم ٹوپی میں اس کے کلر زدہ بال چھپ گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ سہیل نے ویٹر کو اشارہ کیا اور سب سے پوچھا لیکن سب نے انکار کر دیا تو اس نے اپنے لیے کہا۔ "اوکے، ایک کافی لے آؤ۔"

ان چاروں کے چہرے پُرتشویش تھے لیکن سہیل پُرسکون تھا۔ چند منٹ بعد کافی آئی تو اس نے اس کا گھونٹ لے کر دیکھا اور سر ہلایا۔ "اب ہم بات کرتے ہیں۔"

"کیا بات کرتے ہیں؟" کامل نے کسی قدر جرأت کا مظاہرہ کیا۔ "ہم نے عدالت سے آرڈر لیا تھا۔"

سہیل طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ میں ان لوگوں میں شامل نہیں تھا جو ٹی وی چینل پہنچ گئے تھے ورنہ اس وقت تم چاروں لاک اپ میں پڑے ہوتے۔ میں اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔ میں تم لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے کوٹ سے ایک لفافہ نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ "پہلے اسے دیکھ لو۔"

لفافے میں دو نوں معروف ماہرین نفسیات کی رپورٹس تھیں جن میں انہوں نے سہیل کو دماغی لحاظ سے مکمل صحت مند اور قابلِ رشک اعصاب کا مالک قرار دیا تھا۔ ان چاروں نے تفصیل سے رپورٹس کو دیکھا۔ اس دوران

میں سہیل کافی پیتا رہا۔ مزمل نے پہلی بار کہا۔ "ان رپورٹس کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔"

"ہم وکیل کریں گے۔" ہما بولی تو سہیل نے پہلی بار دکھ کا اظہار کیا۔

"ہما! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تمہیں تو میں نے بیٹی کی طرح پالا... گودوں میں کھلایا ہے۔"

ہما پر سہیل کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے بجائے وہ سرکشی سے بولی۔ "لیکن آپ نے ہمیں ہمارا حق نہیں دیا۔"

"ہمیں محتاج بنا کر رکھا۔" حنا نے اس کی تائید کی۔

"حق؟" سہیل نے تلخی سے کہا۔ "یہ سب میں نے اپنی محنت سے بنایا۔ پاپا جو چھوڑ کر گئے تھے اس کا ایک روپیا بھی اپنے لیے نہیں لیا، سب تم لوگوں میں بانٹ دیا۔ اپنے پاس سے بھی دیا پھر بھی تم حق کی بات کرتے ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں ایک دن میں بے دخل کر دوں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں بے یار و مددگار ہوں۔ میرے پاس دولت بھی ہے اور اثر رسوخ بھی۔ میں کسی ٹی وی چینل پر جائے بغیر بھی تم سب کو جیل پہنچا سکتا ہوں۔ مگر میرا خون تم چاروں کی طرح سفید نہیں ہوا ہے۔ مجھے اب بھی ماں باپ کی عزت کا پاس ہے اس لیے میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔"

"کیسا موقع؟" کامل نے جلدی سے پوچھا۔ وہ چاروں ڈھٹائی کا مظاہرہ ضرور کر رہے تھے لیکن اندر سے ڈرے ہوئے تھے۔

"میں تم چاروں کو دس دس کروڑ روپے دوں گا اور اس کے بعد تم لوگوں کا میرے بزنس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

"صرف دس کروڑ روپے؟" مزمل نے منہ لٹکا کر کہا۔

"دس کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تم بزنس شروع کر سکتے ہو۔ چاروں مل جاؤ تو تقریباً نصف ارب روپے کا سرمایہ ہو جائے گا۔ کچھ قرض لے سکتے ہو۔ ستر اسّی کروڑ سے بڑا بزنس اسٹارٹ کیا جا سکتا ہے۔ تم لوگوں کو تجربہ تو ہو گیا ہے۔"

"آپ ہم سے تعلق ختم کر دیں گے؟" ہما نے پوچھا۔

"نہیں لیکن آئندہ کبھی اعتبار نہیں کروں گا۔" سہیل نے کہا۔ "اگر تمہیں ضرورت پڑی تو مدد بھی کروں گا۔ مگر تم مجھ سے مطالبہ نہیں کر سکو گے۔ سمجھ لو ہمارا رشتہ بس دنیا والوں کے سامنے رہ جائے گا۔ ہم ایک خاندان کا تاثر دیں گے لیکن ایک خاندان ہوں گے نہیں۔"

"اگر ہم انکار کر دیں؟" کامل نے کہا۔ اس پر سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس صورت میں مجھے تم لوگوں کو بزنس اور کوٹھی سے بے دخل کرنے میں زیادہ سے زیادہ چھ مہینے لگیں گے۔ اس کے بعد بھی تمہاری جان نہیں چھوٹے گی۔ اس دوران میں تم لوگوں نے جو گھپلے کیے ہوں گے اور اپنی نااہلی سے بزنس کو جو نقصان پہنچایا ہوگا اس کے لیے عدالت میں گھسیٹے جاؤ گے۔ میرے پاس پیسا ہے اس لیے یہ کھیل میرا ہوگا اور تم تباہ ہو جاؤ گے۔ میرا نقصان پورا ہو نہ ہو لیکن تمہارا نقصان ناقابلِ تلافی ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے سال سے بھی پہلے تم لوگ فٹ پاتھ پر آ جاؤ گے۔"

سہیل کی کھینچی تصویر خاصی ہولناک اور کسی حد تک حقائق پر مبنی تھی۔ ان کے چہرے سفید پڑ گئے۔ پھر کامل نے ہمت کر کے کہا۔ "کیا ہمارے پاس سوچنے کا وقت ہے؟"

"بالکل نہیں... یہاں سے معاملہ طے کر کے اٹھنا ہے ورنہ پھر ملاقات عدالت میں ہوگی۔"

"ہمیں مشورے کا موقع تو ملنا چاہیے۔" مزمل نے کہا۔

"اوکے، تم لوگ دس منٹ میں جو چاہے مشورہ کر لو۔"

وہ چاروں اٹھ کر ایک کونے میں چلے گئے۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئے تو ان کے چہروں پر ہاں تھی۔ سہیل مسکرایا اور اس نے کوٹ سے ایک چھوٹی فائل نکالی۔ "یہ تحریری معاہدہ ہے... اس کی رو سے میں تم چاروں کو دس کروڑ روپے فی کس ادا کروں گا اور اس کے بعد تمہارا میرے بزنس اور جائداد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ نیز تم لوگ کورٹ آرڈر سے بھی دست بردار ہو گے۔"

مزمل نے فائل کھولی اور وہ چاروں اس پر جھک گئے۔ معاہدہ واضح تھا اور ان کے پاس اس پر سائن کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ ان چاروں نے باری باری دستخط کیے اور فائل سہیل کو واپس کر دی۔ اس نے فائل واپس کوٹ میں رکھی اور بولا۔ "کل تک تم لوگ کوٹھی خالی کر دو گے اور اب کوئی بھی آفس نہیں جائے گا۔ تم جی ایم کو کال کر کے کورٹ آرڈر سے دست برداری کا بتاؤ گے۔"

"ہمیں رقم کب ملے گی؟" مزمل بولا۔ "ہمارے

پاس تو کچھ نہیں ہے۔‘‘

’’اگر آپ بعد میں انکار کرتے ہیں تو ہم کس کے پاس جائیں گے؟‘‘ کامل بولا تو سہیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

’’تم لوگ اپنے ضمیر کے پاس جاؤ گے اگر تمہارے پاس اس نام کی کوئی چیز ہے اور وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا ہو اور میں کیا ہوں۔‘‘ سہیل کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ’’میرے چھوٹے بہن بھائیو! یہ ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اب میں تمہارا بڑا نہیں رہا ہوں۔‘‘

☆☆☆

نور کچن میں تھی جب سہیل اندر آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے خوشبو سونگھتے ہوئے کہا۔ ’’ایسا لگ رہا ہے پلاؤ بن رہا ہے۔‘‘

’’آپ نے ٹھیک پہچانا۔‘‘ وہ ہنسی۔ ’’لگتا ہے آپ کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ صرف خوشبو سے بتا دیتے ہیں۔‘‘

’’ہاں لیکن اگر کھانا کسی اچھے ہاتھ کا بنا ہو۔‘‘

’’آپ خوش ہیں، اس کا مطلب ہے کام ہو گیا۔‘‘

’’تقریباً۔‘‘ سہیل نے فائل نکال کر میز پر رکھی۔ ’’اس پر ان چاروں کے سائن ہیں۔ کل تک وہ کوٹھی خالی کر دیں گے اور اب آفس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ مجھے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے میں دس پندرہ دن لگ سکتے ہیں۔‘‘

’’آپ کا مسئلہ تو ماشاء اللہ سے حل ہو گیا۔‘‘ نور فائل دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’اب میرا مسئلہ حل کرنا ہے۔‘‘

’’بالکل، مجھے ذرا کمانڈ حاصل کر لینے دو۔‘‘ سہیل نے کہا اور پھر ٹھنڈی سانس لی۔ ’’کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارا مسئلہ کبھی حل نہ ہو۔‘‘

نور انجان بن کر بولی۔ ’’وہ کیوں؟‘‘

’’کیونکہ پھر تم یہاں سے چلی جاؤ گی۔‘‘

’’مجھے جانا تو ہے۔‘‘

سہیل اس کے قریب آگیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’میری خواہش ہے کہ تم کبھی مت جاؤ... ہمیشہ یہیں رہو۔‘‘

’’آپ مجھے پروپوز کر رہے ہیں۔‘‘ نور نے سکون سے پوچھا۔ ویسے اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

’’دل و جان سے۔‘‘ سہیل نے کہا۔ ’’میں نے کبھی کسی سے کوئی بات اتنی سنجیدگی سے نہیں کہی۔‘‘

’’میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت دی۔‘‘ نور بولی۔ ’’لیکن اس حالت میں میرے لیے فیصلہ کرنا دشوار ہے۔‘‘

’’میں بھی تم سے ابھی ہاں یا نہ کا نہیں کہہ رہا۔ تم اچھی طرح سوچو بلکہ جب واپس چلی جاؤ تب فیصلہ کرنا۔ مجھے تمہارا فیصلہ سر آنکھوں پر قبول ہو گا۔ لیکن نور یاد رکھنا، اب ہم دونوں اس دنیا میں اکیلے ہیں۔ میں اپنے بہن بھائیوں سے دور ہو چکا ہوں۔ پہلے جیسی بات کبھی نہیں آئے گی۔ اسی طرح تم اپنے بچوں سے محبت کرو گی مگر تم کبھی ان پر اعتماد نہیں کر سکو گی۔ ایسے میں انسان کے لیے اکیلے رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے بہترین انتخاب ہو سکتے ہیں۔‘‘

نور نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوبارہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ سہیل کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دن رات ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہ رہے تھے مگر سہیل کے دل میں نور کے حوالے سے ایک لمحے کو بھی کوئی غلط خیال نہیں آیا تھا۔ وہ کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا جس کا دل اس کے قابو میں نہ ہو۔ ستائیس برس کی محبت کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ نور کو اس کی مرضی سے اپنائے اور اگر ایسا نہ ہو سکا تب بھی وہ اپنے مقدر کے لکھے پر راضی ہو گا۔ مگر ان چند دنوں میں جو انہوں نے ساتھ گزارے تھے، نور کے لیے اس کی محبت اور چاہت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا کہ شاید وہ اس سے دور چلی جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی جو اس کی محبت محسوس کر کے اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔ وہ بیالیس برس کی پختہ کار عورت تھی جو اب تک ایک پوری بزنس ایمپائر چلاتی آئی تھی۔ اس کے جوان بچے اور پوتی پوتے اور نواسے بھی تھے۔ وہ اس کے پروپوزل کا صرف جذبات میں آکر جواب نہیں دے گی۔

اگلے دن سہیل نے اپنی کوٹھی اور آفس کا قبضہ حاصل کیا۔ اس نے سب سے پہلے آفس کے ان افسران کی چھٹی کی جنہوں نے اس معاملے میں اس کے بہن بھائیوں کا ساتھ دیا تھا جبکہ وہ اس کے بارے میں جانتے تھے۔ کوٹھی کے ملازمین مجبور اور بے بس تھے پھر سہیل ان کے بارے میں جانتا تھا اس لیے اس نے انہیں برقرار رکھا۔ مگر وہ کوٹھی میں واپس نہیں گیا۔ وہ آفس سے اپارٹمنٹ پر ہی واپس آتا تھا۔ اس نے ان چاروں کو وعدے کے مطابق دس

کروڑ روپے ادا کر دیے تھے۔ وہ چاروں اب نادم تھے اوراس کے پاس معافی کے لیے آنا چاہتے تھے مگر سہیل نے نرمی سے منع کر دیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اوراگر وہ ملنا چاہیں تو پہلے اس سے اجازت طلب کریں۔ وہ اجازت دے تو وہ اس سے ملنے کے لیے آسکتے ہیں ورنہ نہیں۔

☆☆☆

اس واقعے کو ایک مہینا گزر گیا۔ مگر نور نے دوبارہ ان سے رابطہ نہیں کیا تھا اور وہ اسی تشویش میں تھے کہ وہ کہاں تھی اوراب تک ان کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی تھی۔ ان کی حالت ان چوروں کی سی تھی جن کی نشان دہی ..... ہو چکی تھی اور چوری کا مال اور ثبوت بھی پولیس کے پاس آ گیا تھا۔ بس ان کی گرفتاری باقی رہ گئی تھی۔ ایک طرف تو انہیں نور کی فکر تھی بلکہ اپنی فکر تھی۔ دوسری طرف ان تین مہینوں میں بزنس مسائل بڑھتے جارہے تھے کیونکہ ان کے پاس مطلوبہ تجربے کی کمی تھی۔ تجربہ کار ملازمین مسائل حل کر سکتے تھے مگر وہ فیصلے کی ذمے داری سے بچنا چاہتے تھے اور وہی کرتے تھے جو یہ تینوں ان سے کہتے تھے۔ ان مسائل کی وجہ سے ان کے دو بڑے آرڈر منسوخ ہو چکے تھے اور یہ تقریباً پچاس کروڑ روپے مالیت کے تھے۔ کورٹ آرڈر بھی ان کے لیے مسئلہ تھا کیونکہ اس کی رو سے وہ بنیادی فیصلے نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے آپس میں بھی اختلافات تھے۔

اگر نور کلینک میں لگنے والی آگ میں ماری جاتی تو ان کے بہت سے مسئلے حل ہو سکتے تھے۔ وہ وراثت کو تقسیم کر سکتے تھے۔ مل اور بزنس فروخت کر سکتے تھے اوراس سے انہیں اتنی رقم مل جاتی کہ اس کا سود ہی کھاتے تب بھی بہت عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے۔ مگر یہ ان کا خیال تھا ورنہ انسانی خواہشات پوری کرنے کے لیے قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہوتا ہے۔ یہ تو ایک معمولی سی ٹیکسٹائل مل اوراس کا بزنس تھا۔ بہرحال نور کے زندہ ہونے سے ان کا یہ خواب بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ روز رات کے وقت سر جوڑ کر بیٹھتے اوراس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتے مگر کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ بات شروع کرتے ہی ذرا سی دیر میں بحث شروع ہو جاتی اور وہ آپس میں جانوروں کی طرح لڑنے اور ایک دوسرے پر چیخنے چلّانے لگتے۔ اس رات بھی وہ لڑ جھگڑ رہے تھے کہ فون کی بیل بجی۔ حور نے دیکھا اور بولی۔ ''وہی نمبر ہے۔''

وہ سب لپک کر آئے اور اسپیکر فون آن کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ حور نے بے تابی سے کہا۔ ''ماما.....''

''ہاں، بات کر رہی ہوں۔'' نور نے کہا۔ ''اب وقت آ گیا ہے تم سے بات کی جائے۔''

''ماما! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' صفدر چالاکی سے بولا۔ ''آپ کو آرام اور علاج کی اشد ضرورت ہے۔''

''جبھی تم لوگوں نے مجھے اس قید خانے میں ڈلوایا تھا۔'' نور سرد لہجے میں بولی۔ ''مگر میں بالکل ٹھیک ہوں اور میرے پاس اسی شہر کے دو معروف ماہرینِ نفسیات کے سرٹیفکیٹ ہیں کہ میں ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے مکمل صحت مند ہوں اور اپنے سارے معاملات خود چلانے کی اہل ہوں۔''

''یہ بات آپ کو عدالت میں ثابت کرنا پڑے گی۔''

''اگر وہاں جانے کی نوبت آئی تو وہاں بھی ثابت کردوں گی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ تم یہ حماقت نہیں کرو گے۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں ماما؟''

''میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھ رہی ہوں۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔''

''کیسی تجویز؟'' صفدر نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''ہم بزنس سے دست بردار نہیں ہوں گے، یہ ہمارے باپ کی وراثت ہے۔''

''تم بھول رہے ہو یہ سب اب میرا ہے اور میرے نام پر ہے۔'' نور کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''لگتا ہے تم لوگ معاملے کو عدالت تک لے جانا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے ایسا ہی صحیح۔ مجھے دیر لگے گی لیکن میں سب واپس حاصل کرلوں گی اوراس کے بعد تم سب کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دوں گی۔''

''آپ ایسا نہیں کرسکتیں ماما..... ہم آپ کی اولاد ہیں۔'' حور نے کہا۔

''میں ایسا نہیں چاہ رہی، یہ تم لوگ ہو جو مجھے مجبور کرو گے۔ دوسری صورت وہی ہے جو میں تمہارے سامنے رکھنے جارہی ہوں۔''

''کیسی صورت ماما؟''

''میں تم سب کو بزنس میں پندرہ پندرہ فیصد شیئرز دوں گی۔ باقی پچپن فیصد میرا ہوگا۔''

''اس طرح تو فیصلہ آپ کا چلے گا۔'' صفدر نے احتجاج کیا۔

''تم لوگوں نے اپنے فیصلے چلا کر تین مہینے میں جو کیا ہے اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔'' نور نے کہا۔ ''پچاس کروڑ کا نقصان کس نے کیا ہے۔''

''ہمارے ہاتھ میں فیصلے کی طاقت نہیں ہے۔'' اصغر بولا۔

''اس پر بھی تم اس بزنس کے لیے مرے جارہے ہو۔''

''ماما! کیا ہم سوچ سکتے ہیں؟'' حور نے کام کا سوال کیا۔

''اسی کال کی حد تک۔ اس کے بعد تم لوگوں سے عدالت میں ملاقات ہوگی۔''

''ماما! آپ کو پتا ہے عدالتوں میں کتنا پیسا لگتا ہے؟'' صفدر نے کسی قدر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''مجھ سے زیادہ کسے پتا ہوگا۔ میرے بچے تم یہ مت سمجھنا کہ میں خالی ہاتھ ہوں۔ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتی ہوں اور دوسرے طریقے سے بھی انصاف خریدنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ اگر تم اسے بلف سمجھ رہے ہو تو شوق سے عدالت میں آجاؤ۔ مگر یہ بات یاد رکھنا کہ اس کے بعد مفاہمت کی ہر صورت ختم ہو جائے گی۔ تم لوگوں کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور تم نے ان تین مہینوں میں جو کیا ہے اس کا جواب بھی دینا ہوگا۔''

''ہم مشورہ کر کے بتاتے ہیں۔'' اصغر نے کہا اور وہ فون کے پاس سے ہٹ گئے۔ وہ کچھ دیر آپس میں بحث کرتے رہے اور پھر انہوں نے سہیل کے بہن بھائیوں کے برعکس فیصلہ کیا۔ انہوں نے نور کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا اور اسے عدالت میں جانے کا مشورہ دیا۔

☆☆☆

عدالت میں خاصا ہجوم تھا کیونکہ اس فیصلے کی میڈیا پر بھی خاصی دھوم مچ چکی تھی۔ نور کے ساتھ اس کے چاروں بچے تھے۔ مگر سہیل احمد ایک بار بھی اس معاملے میں سامنے نہیں آیا تھا۔ اس نے خود کو بالکل الگ تھلگ رکھا تھا۔ جب معاملہ عدالت میں گیا تو اس سے پہلے ہی نور سہیل کے اپارٹمنٹ سے ایک اچھے اور محفوظ ہوٹل کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی۔ وہاں سے وہ ہوٹل کی گاڑی میں ایک ..... گارڈ کے ساتھ باہر جاتی تھی۔ کیس کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا وکیل کیا گیا تھا اور کیس براہِ راست ہائی کورٹ میں دائر کیا تھا۔ صرف دو مہینے میں عدالت نے فیصلہ محفوظ کر لیا تھا اور آج فیصلہ سنایا جانا تھا۔ نور کے بچوں نے بھی ایک بڑا وکیل کیا تھا مگر ان کا کیس کمزور تھا اور تمام پیشیاں واضح طور پر ان کے خلاف گئی تھیں۔ فیصلہ متوقع تھا اور سب دھڑکتے دل سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پوری عدالت میں کوئی پُرسکون تھا تو وہ نور تھی۔ آج وہ بہت اچھے انداز میں تیار ہو کر آئی تھی اوراس نے مناسب میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ جج اپنے چیمبر سے نکل کر آیا تو سب اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے اپنی نشست سنبھالی اور فیصلہ سنانے سے پہلے معاشرے کی اخلاقی قدروں پر چھوٹی سی تقریر کی۔ اس کا لب لباب انسانوں کے آپس کے رشتوں میں مفادات کا عمل دخل تھا۔ پھر اس نے مختصر فیصلہ سنایا۔

''مسٹر صفدر علی، مسٹر اصغر علی اور مسز عاطف اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ ان کی والدہ مسماۃ نورالنسا دماغی اور نفسیاتی لحاظ سے اپنا کاروبار اور دیگر مالی معاملات سنبھالنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے عدالت حکم دیتی ہے کہ مدعیہ نورالنسا بیگم کو ان کی جائداد اور کاروبار کا مکمل قبضہ دلایا جائے اور فریقِ ثانی کو مکمل بے دخل کیا جائے۔''

فیصلہ سنتے ہوئے صفدر، اصغر، حور اور عاطف کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ ان کا وکیل پہلے ہی ان سے نظریں چراتے ہوئے عدالت سے نکل گیا تھا۔ پھر انہوں نے بھی اپنے وکیل کی پیروی کی۔ نور اپنے وکیل کے ہمراہ مبارک باد لیتی ہوئی باہر آئی تو میڈیا اور پریس کے نمائندے موجود تھے مگر اس نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ عدالت سے باہر اس کا ڈرائیور اس کی کار سمیت موجود تھا۔ وہ عدالتی عملے کے ہمراہ سیدھی اپنے گھر گئی۔ پہلے وہاں سے صفدر، اصغر اور حور کو مع فیملی کے بے دخل کیا گیا۔ کوٹھی پر پولیس لگا دی گئی تھی۔ اس کے بعد نور آفس گئی۔ اس نے بھی سب سے پہلے ان افسران کو فائر کیا جو ذاتی مفاد اور ملازمت کی خاطر ان لوگوں سے مل گئے تھے۔ اس کے بعد اسے معاملات سنبھالنے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ اس نے کینسل شدہ آرڈر دوبارہ حاصل کیے اور مشکل کا باعث بننے والے رول اینڈ ریگولیشن منسوخ کر دیے۔

ایک مہینے بعد نور نے صفدر، اصغر اور حور کو کوٹھی میں طلب کیا۔ اس وقت وہاں سہیل بھی موجود تھا۔ ان تینوں نے سوالیہ نظروں سے نور کی طرف دیکھا مگر اس نے ان کا سوال نظر انداز کر دیا۔ وہ بولی۔ ''میرے بچو! یہ کوٹھی اور کاروبار تم تینوں کا ہے اور میرے بعد تمہیں ہی ملے گا۔ یہ کوٹھی اب تمہارے حوالے ہے۔ بزنس میں تم تینوں کو پندرہ پندرہ فیصد شیئرز ملے گا اور تم اپنے حصے کی آمدنی سے گزارہ کرو گے۔ مگر یہ شیئرز مشروط ہوں گے۔ انہیں برقرار رکھنے کے لیے محنت کرنا ہوگی۔ اگر کوئی اپنی ذمے داری پوری نہیں کر پائے گا تو سالانہ جائزے میں اس کی کارکردگی کے لحاظ سے شیئرز کم کر دیے جائیں گے۔''

''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ یہ سب ہمارا ہے۔'' صفدر نے کہا۔ ویسے ان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ نور

اتنی اچھی پیشکش کرے گی۔

''ہاں لیکن میرے بعد، میری زندگی میں تم لوگ اسی طرح اس کاروبار سے حصہ اور آمدنی حاصل کر سکتے ہو۔ اس میں بھی تمہارا فائدہ ہے۔ تم دل جمعی سے سیکھو گے اور جب کاروبار تمہارے ہاتھ میں آئے تو تم اسے چلانے کے قابل بھی ہو جاؤ گے۔ ابھی تم صرف نقصان کر سکتے ہو۔ اگر تمہیں منظور ہے تو تم سب یہاں واپس آ سکتے ہو۔''

''ماما! آپ کہاں جائیں گی؟'' اصغر نے پوچھا۔

''ماما! یہ کون ہیں؟'' حور نے سہیل کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرے شوہر سہیل احمد ہیں۔ ہم نے کل شام ہی نکاح کیا ہے اور اب میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ آج شام ولیمہ ہے اگر تم تینوں چاہو تو اس میں شریک ہو سکتے ہو۔''

وہ تینوں ساکت رہ گئے اور نور سہیل احمد کا ہاتھ تھام کر باہر چلی گئی مگر ایک منٹ بعد واپس آئی۔ اس نے کہا۔

''ایک بات یاد رکھنا... اگر میری موت غیر طبعی ہوئی تو پہلے سے تیار ایک گفٹ ڈیڈ کی رو سے میری ہر چیز ایک فلاحی ادارے کو چلی جائے گی۔ تم لوگوں کو اس کا ایک روپیا بھی نہیں ملے گا۔''

نور ان کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی جہاں سہیل اس کا منتظر تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ان لوگوں کو وارن کر آئیں؟''

نور حیران ہوئی۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''ویسے تو میں تمہیں ستائیس سال سے جانتا ہوں لیکن ان دو ہفتوں میں ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے دل اور دماغ میں بس گیا ہوں۔ تم جو سوچتی ہو اور جو کرنے والی ہوتی ہو، مجھے پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔''

نور کی آنکھیں جھک گئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''یہ سچ ہے۔ میں بھی آپ کے لیے ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔''

سہیل نے اپنی محبت کو دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ تھامے گاڑی کی طرف بڑھ گئے جہاں ڈرائیور دروازہ کھولے ان کا منتظر تھا۔ اگلے دن وہ ہنی مون پر شمالی علاقے کی طرف جا رہے تھے جہاں موسم کی آخری برف باری ہو رہی تھی اور واپسی میں وہ چند دوسرے شہروں سے ہوتے ہوئے آتے۔ نور خاص طور سے لاہور دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ اس نے چند ایک بار ہی لاہور دیکھا تھا اور وہ بھی بزنس کے سلسلے میں وہاں گئی تھی۔ اب وہ لاہور کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ وہ دو ہفتے بعد لاہور پہنچے۔ جس رات انہوں نے واپسی کی فلائٹ لینی تھی، نور کا موبائل گرنے کی وجہ سے خراب ہو گیا۔ وہ ڈنر کے لیے باہر جا رہے تھے۔ ان کا ارادہ مزنگ فوڈ اسٹریٹ جانے کا تھا۔ سہیل نے کہا۔ ''ابھی چل کر دوسرا موبائل لے لیتے ہیں۔''

وہ پہلے مال روڈ پر واقع ایک شاپنگ مال پہنچے جو موبائل اور دوسری ڈیجیٹل اشیا کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور ایک بڑی شاپ کی طرف جا رہے تھے کہ نور چونکی۔ اس نے سہیل کا بازو تھام کر کہا۔ ''وہ دیکھیں...''

سہیل نے دیکھا اور دنگ رہ گیا پھر اس نے کہا۔ ''یہ تو راول ہے۔''

راول ایک چھوٹی لیکن شیشوں اور جدید ڈسپلے سے سجی دکان میں موجود تھا۔ یہاں اسمارٹ فون، ٹیب پی سی اور ڈیجیٹل کیمرے فروخت ہو رہے تھے۔ وہ اس کی طرف آئے تو وہ انہیں دیکھ کر چونکا۔ اس کے بال اب سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکی لیکن نفاست سے بنی شیو تھی اور اس نے آنکھوں پر ہلکے فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا مگر وہ اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے پیشہ ورانہ خوش اخلاقی سے کہا۔ ''یس سر اینڈ میڈم... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''خدمت تو آپ کرتے رہے ہیں۔'' سہیل نے معنی خیز انداز میں کہا تو نور جلدی سے بولی۔

''کوئی اچھا موبائل دکھائیں۔''

وہ موبائل دکھانے لگا۔ نور کو ایک جدید اسمارٹ فون پسند آیا اور وہ اس نے خرید لیا۔ سہیل نے ادائیگی کی اور پھر کہا۔ ''آپ ہمارے ایک واقف کار سے مل رہے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے، یہ وہ نہیں ہیں۔'' نور بولی۔

''میرا نام حسن مجتبیٰ ہے۔''

''دیکھا میں نے کہا تھا نا۔'' نور بولی اور اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکل آئی۔ سہیل نے باہر آ کر کہا۔

''وہ راول تھا۔''

''آپ نے ٹھیک کہا، وہ راول تھا لیکن جب ہر فرد کو ایک موقع ملا ہے تو اسے بھی ملنا چاہیے۔ وہ بدل گیا ہے۔''

سہیل نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ہاں اسے بھی موقع ملنا چاہیے۔''

رسم دغا

اسما قادری

زندگی کا ہر دور یادگار اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے... مگر بچپن کے دور کی ہر بات... ہر ادا... نرالی اور انوکھی ہوتی ہے... ایک ایسی ہی بچی کی کہانی جو معصومیت اور سادگی کا شاہکار تھی... اسے نہیں معلوم تھا کہ چالاکی و عیاری کے جال میں بچے بھی الجھ کر اپنے گھر کا راستہ بھول جاتے ہیں... ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جو اپنوں سے دوری کا سبب بن جاتی ہیں... سنسنی خیز لمحات اور جذبات میں ہلچل مچا دینے والی تحریر کے اتار چڑھاؤ۔

والدین اور بچوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ایک پراثر کہانی

''سر! کیا سچ پارک میں بہت ساری گلہریاں ہیں؟'' وہ رمشا کو ہوم ورک کروا رہا تھا کہ اچانک اس نے لکھنا چھوڑ کر کاپی پر سے سر اٹھایا اور پرتجسس لہجے میں پوچھنے لگی۔

''ہاں ہیں لیکن اس وقت گلہریوں کا کیا ذکر؟ تم اپنا ہوم ورک دھیان سے کرو ورنہ اسکول سے کمپلین آ جائے گی۔'' فراز نے جواب میں تنبیہ کی۔

''گلہریاں بہت پیاری ہوتی ہیں نا سر؟ پتا ہے جب وہ پھدک پھدک کر ایک شاخ سے دوسری پر جاتی ہیں تو اتنی اچھی لگتی ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے انہیں گود میں لے کر خوب سارا پیار کروں۔ لیکن حقیقت میں تو مجھے کبھی انہیں ہاتھ لگانے کا موقع ملا ہی نہیں، بس ان کی تصویر کو ہی ہاتھ لگایا ہے۔'' وہ یوں دکھی لہجے میں بتا رہی تھی جیسے اس سے بڑی کوئی محرومی ہی نہ ہو۔ اس کے انداز پر فراز کو ہنسی آنے لگی لیکن مسکراہٹ کو ہونٹوں میں ہی چھپا کر اس نے سنجیدگی اختیار کی اور مصنوعی غصے سے بولا۔

"رمشا! میں نے کہا ہے نا کہ اپنے ہوم ورک پر دھیان دو اور جلدی کام مکمل کرو۔ آج مجھے ذرا جلدی واپس جانا ہے۔"

"اوکے سر۔" وہ منہ بناتی ہوئی دوبارہ کاپی پر جھک گئی۔ اسی وقت دروازے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ فراز نے سر اٹھا کر دیکھا تو رمشا کی دادی ٹرے اٹھائے اندر آرہی تھیں۔

"ارے آنٹی! میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ یہ زحمت مت کیا کریں۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد چائے پی کر ہی یہاں آتا ہوں اس لیے بالکل خواہش نہیں ہوتی۔"

اسے سچ مچ ان کا چائے بنا کر لانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

"مجھے بالکل بھی زحمت نہیں ہوتی بلکہ اسی بہانے میں بھی چائے پی لیتی ہوں ورنہ اپنی اکیلی جان کے لیے تو بنا کر پینے کا دل نہیں چاہتا۔" انہوں نے شفقت سے اس کی بات کا جواب دیا۔

رمشا کے مما اور پاپا دونوں ملازمت کرتے تھے۔ اس لیے وہ بے چاری دن بھر اکیلی ہوتی تھیں۔ کام کاج کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ رمشا کی مما فریحہ کھانا تیار کر کے آفس جاتی تھیں جبکہ صفائی ستھرائی اور دیگر کاموں کے لیے صبح کے وقت ایک جز وقتی ملازمہ آتی تھی۔ دادی صاحبہ خود بھی خاصی ایکٹیو خاتون تھیں اور عمر کے تقاضوں کے باعث جو تھوڑے مسائل ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے ساتھ کسی بڑی بیماری وغیرہ کا مسئلہ نہیں تھا اس لیے انہیں گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے میں بہو بیٹے کو کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"آپ مجھے لاجواب کر دیتی ہیں۔" فراز نے مسکرا کر ان کی بڑھائی گاجر کے حلوے کی پلیٹ تھامی تو وہ بھی مسکرا دیں اور بولیں۔

"باتوں میں لاجواب کرنے کے علاوہ میں حلوہ بھی لاجواب بناتی ہوں۔ ذرا کھا کر بتاؤ کہ کیسا بنا ہے؟"

"بہت مزے دار ہے آنٹی۔ آپ تو سچ مچ بڑی شاندار کک ہیں۔ سچ بتائیں یہ جو ٹی وی والی زبیدہ آپا ہیں، وہ آپ کی شاگرد تو نہیں رہیں۔" فراز نے تھوڑا سا حلوہ چکھا اور دل کھول کر ان کی تعریف کی جس پر وہ خوش ہو گئیں اور مسکراتے ہوئے بتانے لگیں۔

"میں خاندان بھر میں اپنی کوکنگ کی وجہ سے مشہور تھی۔ خاص طور پر سویٹ ڈشز تو بہت ہی زبردست بناتی تھی لیکن اب عمر کے ساتھ ساتھ پکانا کم ہو گیا ہے۔ زیادہ محنت ہی نہیں کی جاتی۔" بیٹے اور بہو کے دن بھر گھر پر نہ ہونے کے باعث وہ کسی سے بات کرنے کو ترستی رہتی تھیں اسی لیے فراز کے ساتھ موقع پا کر اکثر ہی گپ شپ لگا لیتی تھیں۔ رمشا ان کے اس معمول کی عادی تھی اس لیے سر جھکائے خاموشی سے ہوم ورک کرتی رہی۔ فراز گاہے بگاہے اس کی کاپی پر نظر ڈالتا رہا کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو اسے ٹوک سکے۔

"ارے ہاں آنٹی! مجھے یاد نہیں رہا۔ میں آپ کے لیے مٹھائی لایا تھا۔ میری بہن کی منگنی ہوگئی ہے، اس خوشی میں۔" فراز کو حلوہ کھاتے ہوئے یاد آیا تو بولا اور پلیٹ میز پر رکھ کر اپنے بیگ سے پلاسٹک کے شاپنگ بیگ میں رکھے مٹھائی کے دو چھوٹے ڈبے باہر نکالے۔

"بہت مبارک ہو بیٹا۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" انہوں نے بڑے تپاک سے اسے مبارک باد دی۔

"یہ باقی گھر والوں کے لیے ہے اور یہ میں اسپیشلی آپ کے لیے لایا ہوں۔ اس مٹھائی میں جو میٹھا استعمال ہوا ہے، وہ شوگر کے مریضوں کو نقصان نہیں پہنچاتا۔" اس نے دونوں ڈبے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے نشان دہی کی کہ کون سا ڈبا ان کے لیے ہے۔

"جیتے رہو بیٹا۔ بہت خیال رکھنے والے نیک بچے ہو۔" وہ خوش ہو گئیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے انہیں شوگر کا مسئلہ ہو گیا تھا اور میٹھے کی شوقین ہونے کے باوجود وہ احتیاط کرنے لگی تھیں۔

یہاں تک کہ اپنا اتنی محنت سے بنایا گیا حلوہ بھی بس ذرا سا چکھا تھا۔ اصل میں حلوہ انہوں نے سجاد کی خاطر بنایا تھا۔ وہ گاجر کا حلوہ بہت شوق سے کھاتا تھا اور فریحہ ایک اچھی بیوی ہونے کے باوجود اپنی ملازمت کی مصروفیت و تھکن کی وجہ سے اس قسم کے کاموں کو ٹالنے کی کوشش کرتی تھی۔

"اپنی امی کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد دینا۔ میں انہیں فون کر کے خود بھی مبارک باد دوں گی۔" انہوں نے اس کے سامنے ہی ڈبا کھولا اور برفی کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھ لیا۔

"جی ضرور۔" فراز نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"شادی کب ہے بہن کی؟" انہوں نے مٹھائی کھاتے ہوئے خواتین والی مخصوص تفتیش کا آغاز کیا۔

"جی ابھی کچھ وقت لگے گا۔ شاید ڈیڑھ دو سال۔ امی کا ارادہ ہے کہ سبین اور فرحین دونوں کی ایک ساتھ ہی

شادی کریں۔ اس طرح خرچے میں تھوڑی بچت ہو جائے گی۔ سبین کا منگیتر آپ کو معلوم ہے کہ تین سال کے کنٹریکٹ پر دمام گیا ہوا ہے۔ اسے واپس آنے میں ڈیڑھ سال سے زیادہ وقت لگے گا پھر ہماری بھی تیاری نہیں ہے اس لیے امی نے فرحین کے سسرال والوں سے دو سال کی مہلت مانگ لی ہے۔" اس نے انہیں تفصیلی جواب دیا۔ اس سے گپ شپ لگاتے رہنے کی وجہ سے وہ اس کے اہلِ خانہ کے ناموں کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں سے واقف تھیں اس لیے اس نے انہیں اس انداز میں جواب دیا تھا۔

"فکر مت کرو۔ انشاء اللہ دونوں بچیاں عزت سے اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔ میں ہر نماز میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔ سجاد سے بھی کہتی رہتی ہوں کہ اس کے آفس میں کوئی جگہ نکلے تو تمہارے لیے بات کرے۔" وہ واقف تھیں کہ فراز کے والد حیات نہیں ہیں۔ پچھلے سال ہی ان کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازمت کرتے تھے جہاں سے ان کی گریجویٹی کے نام پر فراز کی والدہ کو بس اتنی رقم ملی تھی کہ انہوں نے مکان کا اوپر والا پورشن بنا کر اسے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ باقی پنشن وغیرہ کچھ نہیں تھی۔ فراز نے حال ہی میں بی ایس سی کیا تھا اور آج کل صبح کی شفٹ میں ایک پرائیویٹ اسکول میں میتھس اور فزکس پڑھانے کے ساتھ ساتھ دو تین بچوں کو ہوم ٹیوشن بھی دیتا تھا۔ اس کی بہنیں بھی گھر پر محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں لیکن غریب آبادی ہونے کی وجہ سے آمدنی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ان کی نسبت فراز زیادہ بہتر کما لیتا تھا لیکن یہ رقم بھی پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور اس میں سے بھی اسے دن بھر گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے کھانے پینے اور پیٹرول کے لیے پیسے نکالنے پڑتے تھے۔ موٹر سائیکل وہ اپنے مرحوم والد کی استعمال کرتا تھا جو کافی پرانی تھی اور آئے دن اس میں بھی کوئی نہ کوئی خرچہ نکلتا رہتا تھا۔ عمر میں وہ بہنوں سے زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن گھر کا واحد مرد ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

"تھینک یو آنٹی۔" ان کے خلوص کا شکریہ ادا کر کے وہ رمشا کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کا کیا ہوم ورک چیک کرنے لگا۔

"گڈ! تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔" کاپی دیکھنے کے بعد اس نے تعریف کی تو رمشا خوش ہو گئی۔

"آپ میرے فیس پر اسٹار دیجیے۔ میں مما کو دکھاؤں گی۔" جھٹ اس نے فرمائش بھی کر ڈالی تو فراز نے بال پوائنٹ سے اس کے گلابی پھولے پھولے گالوں پر ایک ایک اسٹار بنا دیا۔

"دیکھیں دادی! میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟" اس نے اپنا چہرہ دادی کو دکھایا۔

"میری بیٹی ہے ہی بہت پیاری۔" دادی فوراً اس کی بلائیں لینے لگیں۔

"اچھا آنٹی، مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے رشتے داروں میں مٹھائی تقسیم کرنی ہے اس لیے آج رمشا کو تھوڑا کم وقت دیا ہے لیکن اس کا ہوم ورک مکمل ہے۔" دادی پوتی کے لاڈ کو دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ادب سے اجازت طلب کی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ایک دن تھوڑا کم وقت دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کل تو ویسے بھی چھٹی ہے اگر کچھ رہ بھی گیا ہوگا تو فریحہ خود دیکھ لے گی۔" انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا تو وہ اپنا بیگ اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

رمشا نے دادی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ انہیں سوتے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی باہر نکلی۔ برآمدے میں اس کی سرخ اسپورٹس سائیکل کھڑی تھی۔ سائیکل کو احتیاط سے گھسیٹتی ہوئی وہ گیٹ تک آئی اور ذیلی دروازہ کھول کر سائیکل سمیت باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کو کھینچ کر بند کر دیا۔ دروازے میں آٹومیٹک لاک موجود تھا جس کو اندر سے بغیر چابی کے کھولا جا سکتا تھا جبکہ باہر سے کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت ہوتی تھی۔ باہر نکلتے نکلتے اس نے چابی بھی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ آج جمعہ تھا اور اسے قرآن شریف پڑھانے کے لیے آنے والے استاد صاحب چھٹی کیا کرتے تھے اس لیے اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کال بیل بجنے سے دادی کی آنکھ کھل جائے گی اور وہ اس کے غیاب سے آگاہ ہو جائیں گی۔

اصل میں وہ جانوروں کی دیوانی تھی اسی لیے فراز کی زبانی قریبی پارک میں گلہریوں کی موجودگی کے بارے میں سن کر بے چین ہو گئی تھی اور اتفاق سے دادی کے سو جانے کے باعث اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ پارک جا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ گلہریاں دیکھ کر آدھے پون گھنٹے میں واپس گھر آجائے گی اور دادی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ پیڈل پر تیز تیز پیر مارتی ہوئی وہ جلد اپنی لین سے باہر نکل گئی۔ ان کا چھوٹا

www.paksociety.com

ساون یونٹ بنگلا جس علاقے میں تھا، وہاں زیادہ تر اسی طرح کے چھوٹے لیکن جدید انداز کے صاف ستھرے بنگلوز بنے ہوئے تھے۔ دراصل یہ پڑھے لکھے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی آبادی تھی جہاں گھروں میں دولت کی بہت زیادہ ریل پیل تو نہیں تھی لیکن لوگ بہرحال اتنے خوش حال اور آسودہ ضرور تھے کہ دورِ جدید کی بیشتر سہولیات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا سکیں اور ان کی خواہشات کو پورا کر سکیں۔ اس سب کے حصول کے لیے البتہ انہیں سخت محنت کرنی پڑتی تھی جیسا کہ سجاد اور فریحہ کرتے تھے۔ دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ارینج میرج تھی اور شادی کے بعد دو سال کا عرصہ فریحہ نے خانہ داری کرتے ہوئے ہی گزارا تھا لیکن رمشا کی پیدائش کے بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ صرف سجاد کی تنخواہ میں وہ اپنی بیٹی کو وہ لائف اسٹائل نہیں دے سکے گی جس کی اپنے دل میں خواہش رکھتی ہے۔ اس نے سجاد کے ساتھ اس مسئلے کو ڈسکس کیا اور رمشا کو دادی کے حوالے کر کے خود ملازمت کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اس نے بی سی ایس کر رکھا تھا چنانچہ اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ سجاد کی جاب بھی اچھی تھی چنانچہ پانچ سال کے عرصے میں وہ پرانا گھر بیچ کر یہ گھر خریدنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان دونوں کی تنخواہیں ملا کر نا صرف گھریلو اخراجات احسن طریقے سے پورے ہو جاتے تھے بلکہ وہ رمشا کے مستقبل کے لیے سیونگ بھی کر رہے تھے۔ اپنی اس مصروفیت میں انہیں دوسرے بچے کا خیال نہیں آیا تھا اور سات سال کی ہو جانے کے باوجود رمشا ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اپنے اکلوتے ہونے کی وجہ سے وہ تنہائی محسوس کرتی تھی اور شاید اسی وجہ سے اسے جانوروں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔

ایک بار وہ ضد کر کے بلّی کا بچہ پالنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھی لیکن جب اس بلونگڑے نے گھر میں جگہ جگہ گندگی پھیلانا شروع کی تو فریحہ نے اسے گھر سے نکالنے کا حکم دے دیا۔ اس کا موقف بھی ٹھیک تھا۔ اس کی ٹف روٹین میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ گھر میں کوئی جانور پالا جاتا اور وہ اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے وقت نکال پاتی۔ بلونگڑے کو گھر بدر کیے جانے پر رمشا نے خاصا سخت احتجاج کیا تھا اور کئی دن تک روتی رہی تھی لیکن آخرکار فریحہ اسے منانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور معاملہ اس نئی اسپورٹس سائیکل کے آنے سے طے پا گیا تھا البتہ رمشا کی جانوروں کے ساتھ جنونی محبت اپنی جگہ قائم تھی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی وہ اپنے اس شوق کی وجہ سے ایک کارنامہ انجام دے چکی تھی۔ اس کی ایک کلاس فیلو نے اسے بتایا کہ اس کے فادر اس کے لیے رنگ برنگے چوزے لائے ہیں تو وہ ان چوزوں کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گئی اور ایک دن اسکول سے واپسی میں کلاس فیلو کے ساتھ چپکے سے اس کے گھر کے سامنے وین سے اتر گئی۔ وین والے نے جب اس کے گھر کے سامنے وین لے جا کر روکی تو اس میں سے رمشا کو نہ اترتے دیکھ کر حق دق رہ گیا۔ ادھر وین کا ہارن سن کر دروازے تک آنے والی دادی کے بھی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ وین ڈرائیور کی بے پروائی پر گرجنے برسنے لگیں۔ گھگیائے ہوئے ڈرائیور کو بھی کچھ نہ سمجھ آتا تھا کہ اسکول سے اس کے سامنے وین میں سوار ہونے والی بچی آخر کہاں گئی؟ آخر یہ عقدہ ایک بچے کے بیان سے حل ہوا جس نے بتایا کہ رمشا اپنی کلاس فیلو بسمہ کے ساتھ اس کے گھر پر اتر گئی تھی۔

دادی اسکول وین میں ہی بیٹھ کر بسمہ کے گھر پہنچیں تو پوتی صاحبہ چوزوں کے ساتھ مشغول پائی گئیں۔ وہ ان رنگ برنگے چوزوں میں اتنی منہمک تھی کہ اسے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ کیسی خطرناک حرکت کر بیٹھی ہے۔ بعد میں فریحہ اور سجاد کے علم میں یہ واقعہ آیا تو دونوں نے اسے سخت تنبیہ کی اور وقتاً فوقتاً سمجھاتے رہے کہ اس قسم کی حرکت کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں لیکن وہ بچی ہی تو تھی۔ دو ماہ کے عرصے میں ساری نصیحتیں اور تنبیہات بھول گئی اور یاد رہا تو صرف اتنا کہ پارک میں جا کر درختوں پر پھدکتی گلہریاں دیکھنی ہیں۔ تقریباً ساڑھے چار بجے وہ اپنی اسپورٹس سائیکل کے ساتھ پارک میں داخل ہوئی اور سائیکل مخصوص جگہ پر کھڑی کرنے کے بعد اس سمت چل دی جہاں برگد کے پرانے درخت موجود تھے۔ پارک میں کچھ اور بھی بچے موجود تھے جو مختلف بھاگنے دوڑنے والے کھیل کھیل رہے تھے لیکن اسے کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف گلہریاں دیکھنا چاہتی تھی چنانچہ درختوں کی قطار کے سامنے ٹکٹکی باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہو بیٹا؟'' اسے اس طرح کھڑا پا کر ایک آدمی اس کے قریب چلا آیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

''میں یہاں گلہریاں دیکھنے آئی ہوں انکل..... لیکن ابھی تک صرف ایک گلہری نظر آئی ہے اور وہ بھی فوراً

ہی کہیں چھپ گئی۔'' اس نے فطری بے ساختگی کے ساتھ اسے اپنا مسئلہ بتایا۔

''کیا تمہیں گلہریاں پسند ہیں؟'' آدمی نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ درمیانی سی عمر کا آدمی تھا جس نے پینٹ شرٹ پر نیلے رنگ کا ایپرن پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خاصی گھنی داڑھی موچھیں تھیں لیکن نفاست سے ترشی ہوئی ہونے کی وجہ سے بری نہیں لگ رہی تھیں۔ داڑھی اور سر کے بالوں میں سفیدی کی جھلک نظر آ رہی تھی اور آنکھوں پر موجود نفیس فریم والے چشمے کے باعث وہ خاصا سوبر محسوس ہو رہا تھا۔

''مجھے تو سارے ہی جانور بہت اچھے لگتے ہیں لیکن مما مجھے پیٹس رکھنے کی پرمیشن ہی نہیں دیتیں۔ وہ بہت بزی رہتی ہیں نا اس لیے کہتی ہیں کہ میرے پاس تمہارے پیٹس کی پھیلائی گندگی صاف کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ بے چاری دادی بھی بوڑھی ہو گئی ہیں اور پاپا کہتے ہیں کہ ہمیں دادی سے کام کروانے کے بجائے ان کے آرام کا خیال رکھنا چاہیے۔'' اپنے باتونی پن کی وجہ سے وہ اس اجنبی مرد کو سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ اپنے معصوم انداز میں اس طرح باتیں کرتی ہوئی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آدمی کے دل کو اس کی معصومیت پر پیار آنے لگا لیکن اگلے ہی پل سر جھٹک کر وہ کچھ اور سوچنے لگا۔

''آپ کو بھی پیٹس اچھے لگتے ہیں انکل؟'' ابھی وہ سوچ میں ڈوبا ہوا ہی تھا کہ رمشا کے سوال نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''ہاں بیٹا۔ مجھے پیٹس کا بہت شوق ہے اور میں نے اپنے گھر میں بہت سے پیٹس رکھے ہوئے ہیں۔ میری بیٹی ان کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جال پھینکا۔

''ہیں انکل..... سچ سچ؟ کون کون سے پیٹس ہیں آپ کے پاس؟'' رمشا فوراً ایکسائٹڈ ہو گئی۔

''کبوتر، آسٹریلین طوطے، ایک بلی کا بچہ اور چار پانچ چوزے ہیں۔ تم دیکھو گی انہیں؟'' اس نے ترغیب دینے والے انداز میں پوچھا۔

''نہیں، مجھے دیر ہو جائے گی۔'' رمشا کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جانا چاہتی ہے اور بادل ناخواستہ ہی انکار کر رہی ہے۔

''بالکل بھی دیر نہیں ہو گی۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے ساتھ میری گاڑی میں چلو۔ میں دس منٹ میں واپس تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔'' اسے جھجکتے دیکھ کر آدمی نے پیشکش کی جس کے بعد رمشا کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ فوراً ہی اس آدمی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ آدمی نے اپنی گاڑی پارک سے باہر ذرا ہٹ کر پارک کی تھی۔ اپنی سائیکل وہیں چھوڑ کر رمشا اس کے ساتھ چل پڑی۔

''آپ کی بیٹی کتنی بڑی ہے انکل؟'' آدمی کے ساتھ کار تک جاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''تمہارے ہی جتنی ہے۔'' آدمی نے قدرے بے پروائی سے جواب دیا اور کار کے دروازے کو اَن لاک کر کے پہلے اسے بٹھایا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کار نے ابھی تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ یک دم ایک ہاتھ پیچھے سے آگے آیا اور رمشا کے منہ اور ناک کو دبوچ لیا۔ وہ ذرا سا کسمسائی لیکن اس ہاتھ میں موجود رومال میں بسی بو نے اسے زیادہ موقع نہیں دیا اور وہ بے ہوش ہو کر سیٹ پر ڈھے سی گئی۔

☆☆☆

کرسی پر بیٹھتے ہوئے فراز نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پانچ بجنے میں دو منٹ باقی تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر ریستوران میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے ورنہ جس طرح راستے میں اس کی موٹر سائیکل نے نخرے دکھانے شروع کیے تھے، اس سے اس کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اور پچھلی بار کی طرح ثوبیہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ثوبیہ اس کے ساتھ اسکول میں ملازمت کرتی تھی۔ اسی کی طرح وہ بھی ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد کی کریانے کی چھوٹی سی دکان تھی اور اپنی محدود آمدنی میں انہوں نے اپنی چاروں بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ چاروں بہنیں خوش شکل اور سلیقہ مند تھیں۔ اخلاقی تربیت بھی اچھی ہوئی تھی۔ اس لیے بہت اچھے حالات نہ ہونے کے باوجود بیٹیوں کے رشتوں کے سلسلے میں والدین کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی کی وہ شادی کر چکے تھے۔ دوسری بھی منگنی شدہ تھی جبکہ تیسری کے لیے آنے والے رشتوں پر آج کل غور کیا جا رہا تھا۔ امید تھی کہ جلد ایک رشتہ فائنل ہو جائے گا۔ ثوبیہ کے والدین نے بیٹیوں کے رشتے طے کرتے وقت زیادہ ڈیمانڈز نہیں رکھی تھیں اس لیے بھی وہ اس فرض سے آسانی سے سبکدوش ہو رہے تھے۔

انہوں نے صرف شریف گھرانے کے سلجھے ہوئے نوجوانوں کا مطالبہ کیا تھا اس لیے آسودہ تھے۔ اگر مال و دولت، اچھی نوکری اور اچھے مکان کے چکر میں پڑتے تو پریشان ہو جاتے۔ فراز کو ان ساری باتوں کا علم ثوبیہ کی زبانی ہوا تھا۔ وہ اسکول میں بیالوجی پڑھاتی تھی۔ اس نے اور فراز نے آگے پیچھے ہی یہ ملازمت اختیار کی تھی اور اولین دنوں سے ہی ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرنے لگے تھے۔ لیکن اسکول جیسی جگہ پر ایک دوسرے سے زیادہ۔۔۔ بے تکلف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساتھی ٹیچرز کے علاوہ سیکنڈری کلاسز کے طلبہ بھی اس قسم کے معاملات پر کڑی نظر رکھا کرتے تھے۔ ذرائع ابلاغ کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ نے بچوں کو اپنی عمر سے کہیں آگے پہنچا دیا تھا۔ خاص طور پر ایسے معاملات میں تو وہ خصوصی دلچسپی لیتے تھے اس لیے ثوبیہ اور فراز نے بہت احتیاط سے کام لیا۔ اسکول میں ان کا رویہ عام کولیگز جیسا تھا لیکن موبائل فون کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے مستقل رابطے میں رہتے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ بار باہر بھی مل لیتے تھے۔ ثوبیہ شام کے اوقات میں ایک کمپیوٹر سکھانے والے ادارے میں پڑھتی تھی۔ جب انہیں آپس میں ملاقات کرنی ہوتی تو ثوبیہ اپنے انسٹی ٹیوٹ اور فراز ٹیوشن سے چھٹی کرتا اور دونوں طے شدہ مقام پر پہنچ جاتے۔ یہ ملاقاتیں ہمیشہ پبلک پلیس پر ہوتی تھیں لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ مقام ایسا ہو جہاں ان کی جان پہچان کے افراد سے مڈبھیڑ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

"آرڈر سر۔" فراز کے کرسی سنبھالتے ہی ایک ویٹر اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

"شیور۔" فراز نے مینیو کارڈ تھاما اور ثوبیہ کی پسند کے مطابق ریفریشمنٹ کی چیزیں نوٹ کروانے لگا۔ ثوبیہ چائے یا کافی پینا زیادہ پسند نہیں کرتی تھی اس لیے اس کے لیے اس نے اورنج جوس کا آرڈر دیا جبکہ اپنے لیے کافی منگوائی۔

"میری ایک مہمان آنے والی ہیں۔ وہ آجائیں تو اس کے پندرہ منٹ بعد یہ سب لے کر آنا۔" آرڈر نوٹ کروا دینے کے بعد اس نے ویٹر کو ہدایت کی تو وہ "یس سر" کہہ کر مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ برسوں سے لوبرڈز کو یہاں آتا دیکھنے کا عادی تھا اور جانتا تھا کہ نوعمر لڑکے چوری چھپے کی ان ملاقاتوں میں لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر آرڈر کرتے تھے۔ ویٹر آرڈر لے کر گیا ہی تھا کہ فراز نے ثوبیہ کو آتا ہوا دیکھا۔ اس نے سرمئی رنگ کی جدید تراش کی قمیص اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ ٹراؤزر سادہ تھا جبکہ قمیص پر سفید، سیاہ اور سرخ رنگ کے ڈاٹس پڑے ہوئے تھے۔ زیور کے نام پر اس نے کانوں میں سرخ رنگ کے بٹن جیسے چھوٹے چھوٹے ٹاپس پہن رکھے تھے اور ہونٹوں پر سرخ چمکتی ہوئی لپ اسٹک کے علاوہ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں تھیں۔ بس یہی اس کا کل سنگھار تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اپنے سیاہ بالوں کو اس نے یونہی سمیٹ کر پیچھے سے کیچر میں جکڑ دیا تھا اور بہت سی شریر لٹیں کیچر سے نکل کر اس کے رخساروں اور صراحی دار گردن پر گر رہی تھیں۔ فراز اسے محویت سے دیکھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے مقابل کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے؟ بالکل ندیدوں کی طرح گھورے جا رہے ہو۔" ثوبیہ نے قدرے جھینپتے ہوئے مصنوعی خفگی سے اسے ٹوکا۔

"میں تو تمہیں داد دے رہا ہوں۔ یہ سارا اہتمام میرے لیے ہی تو ہے ورنہ اسکول میں تو یہ سب نہیں ہوتا۔" فراز کا اشارہ لپ اسٹک اور کاجل کی طرف تھا۔ اسکول میں ثوبیہ ان اشیا کا استعمال نہیں کرتی تھی اور بالکل سادگی سے آتی تھی۔

"وہ تو انسٹی ٹیوٹ میں ایک پارٹی تھی اس لیے یہ تیاری کی تھی۔" ثوبیہ نے بے نیازی دکھانی چاہی۔

"یہ بہانہ تو تم نے اپنی اماں سے کیا ہوگا، مجھ پر کیوں آزما رہی ہو؟" شریر لہجے میں بولتے ہوئے فراز ہنسا تو ثوبیہ کے ہونٹوں پر بھی شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" اس بار فراز نے دھیمے لہجے میں کچھ ایسے انداز میں کہا کہ ثوبیہ کی گھنیری پلکیں لرزنے لگیں۔

"بس اب مجھے جلد امی سے بات کرنی پڑے گی۔ کم سے کم منگنی کر کے میں تمہیں اپنے نام بک تو کروا لوں ورنہ کوئی رقیبِ روسیاہ درمیان میں کود پڑا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"میں نے اسی لیے تمہیں ملاقات کے لیے یہاں بلوایا ہے فراز۔" ثوبیہ کے کہے اس جملے نے اسے جھٹکا لگایا اور اسے یاد آیا کہ آج چھٹی سے قبل ثوبیہ نے اسے ایس ایم ایس کے ذریعے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی ورنہ عموماً وہ لوگ فراز کی فرمائش پر ہی کہیں باہر ملا کرتے تھے۔ ثوبیہ زیادہ تر ایسی ملاقاتوں سے

گریز کی کوشش کرتی تھی۔

’’کیا کوئی مسئلہ ہے؟ مجھے تمہارا ایس ایم ایس پڑھ کر ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔ بہرحال مجھے حیرت تو تھی اسی لیے مصروفیت کے باوجود تمہیں انکار نہیں کرسکا۔ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہماری لو اسٹوری میں بیچ ولن کی انٹری ہو چکی ہے؟‘‘ فراز الجھا ہوا تھا، اس کے باوجود ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’مسئلہ ٹھیک ٹھاک قسم کا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ آج کل نادیہ کی کسی جگہ رشتے کی بات چل رہی ہے۔‘‘ ثوبیہ نے ابھی بتانا شروع ہی کیا تھا کہ ویٹر نے فراز کا دیا ہوا آرڈر سرو کرنا شروع کردیا۔ ثوبیہ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

’’یہ چکن پیٹیز لو۔ تمہیں پسند ہیں نا۔‘‘ ویٹر چلا گیا تب بھی فوری طور پر موضوع پر آنے کے بجائے فراز نے آدابِ میزبانی نبھانا زیادہ ضروری سمجھا۔ ثوبیہ نے خاموشی سے ایک پیٹیز اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا اور فراز کی خاطر تھوڑا سا چکھ کر بولی۔ ’’مزیدار ہے، تم میری پسند کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگے ہو۔‘‘

’’جن سے محبت ہو، ان کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا اور تم تو مجھے اتنی عزیز ہو چکی ہو کہ دل چاہتا ہے تمہارے لیے آسمان سے چاند تارے توڑ کر لے آؤں۔‘‘ فراز نے جذباتیت سے اس کی بات کا جواب دیا۔

’’میں چاند تاروں کی خواہش رکھنے والی لڑکی نہیں ہوں فراز۔ میں سادہ سی لیکن محبت سے بھرپور زندگی میں بھی خوش رہ سکتی ہوں۔ اگر مجھے زندگی میں بہت کچھ درکار ہوتا تو تمہارے حالات سے واقف ہونے کے باوجود کبھی تمہاری حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔‘‘ ثوبیہ نے سنجیدگی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

’’میں اچھی طرح یہ بات جانتا ہوں ثوبیہ ..... مجھے معلوم ہے کہ تم ایک قناعت پسند لڑکی ہو۔ میں تو بس تم پر اپنے جذبات کی شدت ظاہر کرنا چاہتا تھا۔‘‘ فراز نے قدرے شرمساری سے وضاحت پیش کی۔

’’جذبات کی شدت کو عملی طور پر ثابت کرنے کا وقت آگیا ہے فراز۔‘‘ ثوبیہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تو وہ ایک بار پھر چونکا۔

’’کیا مطلب؟ کیا کوئی گڑبڑ ہے؟ اوہ ہاں..... تم بتا رہی تھیں کہ تمہاری بہن نادیہ کے رشتے کے سلسلے میں کہیں بات چیت چل رہی ہے لیکن اس معاملے سے ہمارے معاملے کا کیا تعلق بنتا ہے؟‘‘ وہ موضوعِ گفتگو پر واپس آگیا۔

’’تعلق بنتا تو نہیں تھا لیکن اچانک بن گیا ہے۔ رشتہ بہت اچھا ہے اور ہم لوگ اسے فائنل کرنے ہی لگے تھے کہ ان لوگوں نے ایک اور مطالبہ کردیا جس کے بعد ان سے سوچنے کے لیے مزید وقت لے لیا گیا ہے۔‘‘

’’کیا انہوں نے جہیز میں کسی قیمتی چیز کی فرمائش کی ہے؟‘‘ فراز نے اندازہ لگایا۔

’’نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سوچ بچار کے لیے وقت لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، ابو فوراً انکار کردیتے۔ انہوں نے کوئی اور مطالبہ کیا ہے۔‘‘

’’ایسا کیا مطالبہ ہے؟ تمہارے والد تو کسی سرکاری محکمے میں بھی ملازم نہیں ہیں کہ سوچا جائے وہ لوگ ان کے ذریعے اپنی کوئی پھنسی ہوئی فائل نکلوانا چاہتے ہیں۔‘‘ فراز کے الجھ کر کہنے پر ثوبیہ کے ہونٹوں سے نقرئی سی ہنسی پھوٹ پڑی۔ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی بار یوں کھل کر ہنسی تھی۔

’’مذاق اڑا رہی ہو میرا۔‘‘ اس کے یوں ہنسنے پر فراز نے خفگی کا اظہار کیا۔

’’نہیں بس یونہی تمہارے قیافوں پر ہنسی آگئی تھی۔ میرا خیال ہے میں تمہیں اصل صورتِ حال سے آگاہ کر ہی دوں ورنہ تم یونہی الٹے سیدھے اندازے لگاتے رہو گے۔‘‘ اس نے اپنی ہنسی پر قابو پالیا تھا لیکن ہونٹوں پر شوخ لپ اسٹک کی ہی سی شوخ مسکراہٹ اب بھی موجود تھی۔ فراز بغیر کچھ بولے خفا سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ حقیقتاً وہ خفا نہیں تھا بلکہ اسے ثوبیہ کے چہرے کو کھلتے گلاب کا سا تاثر دینے والی یہ مسکراہٹ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

’’نادیہ کے لیے جن صاحب کا رشتہ آیا ہے، ان کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جو الیکٹرونکس میں ڈپلوما کرکے کسی ٹیکسٹائل مل میں اچھی ملازمت کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے اس کے لیے میرا رشتہ بھی دے دیا ہے اور اسی وجہ سے ابو کو سوچ بچار کے لیے مزید وقت لینا پڑا ہے۔‘‘

’’اوہ .....‘‘ فراز کے چہرے کا رنگ بدلا۔

’’تمہارا کیا اندازہ ہے، انکل اور آنٹی اس سلسلے میں کیا فیصلہ کرسکتے ہیں؟‘‘

’’خاندان کے اعتبار سے وہ لوگ انہیں بہت زیادہ پسند آئے ہیں اور انہوں نے صرف لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مہلت لی ہے۔‘‘ ثوبیہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

’’کیا اس سلسلے میں تمہاری رائے نہیں لی جائے گی؟‘‘ فراز نے ذرا امید سے پوچھا۔

’’اس کا میں پہلے ہی اظہار کرچکی ہوں۔ میں نے امی کے سامنے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ دو بہنوں کو ایک گھر میں دینا کسی طور دانش مندی نہیں ہوگی کیونکہ سگی بہنیں بھی دیورانی جٹھانی بن کر روایتی چپقلش کا شکار ہو جاتی ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ ہم بہنوں کے درمیان ایسی کوئی گڑبڑ ہو۔‘‘

’’گڈ ..... تم نے یہ اچھی دلیل دی۔ پھر آنٹی نے اس کے جواب میں کیا کہا؟‘‘ فراز کی ذرا جان میں جان آئی۔

’’انہوں نے مجھے بری طرح ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں نے تم بہنوں کی ایسی پرورش کب کی ہے جو سسرالی رشتوں سے دل میں عناد رکھنے کی گنجائش نکلے۔ تم نے اپنی بڑی بہن فوزیہ کو نہیں دیکھا کہ وہ اپنے سسرال میں کس طرح گھل مل کر رہتی ہے اور یہاں تمہیں اپنی سگی بہن کے جٹھانی ہونے کے خیال سے وہم آرہے ہیں۔‘‘ ثوبیہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے اپنی امی سے ٹھیک ٹھاک قسم کی جھاڑ پڑی ہے۔

’’تو کیا وہ لوگ تمہاری رائے کو اہمیت دیے بغیر یہ رشتہ طے کردیں گے؟‘‘ فراز کو ذرا سا طیش آیا۔

’’دیکھو فراز ..... ہماری کلاس میں والدین بس اس حد تک براڈ مائنڈڈ ہوتے ہیں کہ لڑکی کے کسی بہت ہی ٹھوس جواز کو خاطر میں لا کر اس کے اعتراض پر کان دھریں۔ ورنہ عام طور پر رشتے کو اپنے معیار پر پرکھنے کے بعد ہاں کردی جاتی ہے۔‘‘

’’پھر بھی کوئی تو طریقہ نکالنا ہوگا اس رشتے کو ٹالنے کے لیے۔ کیا تم میری جگہ اتنی آسانی سے کسی اور کو دے دو گی؟‘‘

’’تمہاری جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی اسی لیے تو حل تلاش کرنے کے لیے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔‘‘ فراز کے طعنے نے اسے خفا کردیا۔

’’پلیز ثوبیہ ..... ناراض مت ہو۔ میں اس بات کو سن کر بہت الجھ گیا ہوں اس لیے تم سے ایسے لہجے میں بات کر بیٹھا۔‘‘ فراز نے فوراً ہی اس سے معذرت کی۔ وہ دونوں گفتگو میں اس طرح الجھ گئے تھے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دھیان دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فراز کے سامنے رکھی کافی ٹھنڈی اور ثوبیہ کا اورنج جوس گرم ہوگیا تھا لیکن انہیں اس کا ہوش ہی کہاں تھا۔

’’حل صرف یہ ہوسکتا ہے کہ تم اس رشتے کے فائنل ہونے سے پہلے اپنا پروپوزل بھجوا دو۔‘‘ ثوبیہ جو پہلے ہی حل سوچ کر اس سے ملنے کے لیے آئی تھی، بول پڑی۔

’’تم نے بتایا ہے کہ وہ صاحب اچھی ملازمت کر رہے ہیں۔ اس صورت میں مجھ جیسے جاب لیس شخص کے پروپوزل پر کون غور کرے گا؟ پرائیویٹ اسکول کی جاب اور چند ٹیوشنز کے بل پر میں کماتا ہی کتنا ہوں؟‘‘ حل سن کر فراز نے مایوسی کا اظہار کیا۔

’’تم پروپوزل تو بھجواؤ پھر آگے کے معاملات میں سنبھالنے کی کوشش کروں گی۔ میں فوزیہ باجی کے ذریعے امی ابو کو اپنی پسند سے آگاہ کرکے تمہارا رشتہ قبول کرنے کے لیے زور ڈلواؤں گی۔ ابو کو ابھی آسیہ باجی اور نادیہ کی شادیاں کرنی ہیں اور وہ اتنی جلدی میری شادی کے اخراجات اٹھانے کے متحمل نہیں ہوسکتے اس لیے رشتہ طے ہونے کے بعد اچھا خاصا وقت لیا جاسکتا ہے۔ اس عرصے میں انشاء اللہ تمہیں کوئی مناسب ملازمت ضرور مل جائے گی۔‘‘ وہ جیسے سب کچھ سوچ کر آئی تھی۔ فراز کے پاس مزید کسی بات کی گنجائش نہیں رہی۔ ثوبیہ سے شادی کا تو وہ خود بھی خواہش مند تھا۔ اسے کھونا اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا لیکن گھر میں بات کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس کی امی پہلے ہی یہ بات واضح کرچکی تھیں کہ وہ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد ہی بیٹے کی شادی کے بارے میں سوچیں گی۔ وہ بھی اس وقت جب اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ ان کا موقف بھی غلط نہیں تھا۔ لڑکے کے گھر سنبھالنے کا اہل ہونے سے قبل اس کی شادی کردینا زیادہ مناسب نہیں ہوتا اور بعد میں کئی طرح کے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

’’ٹھیک ہے، میں مناسب موقع دیکھ کر امی سے بات کرتا ہوں پھر تمہیں بتاؤں گا۔‘‘ اس نے ثوبیہ کو اپنی والدہ کے خیالات سے آگاہ کیے بغیر مختصر جواب دیا اور یوں ان کی ملاقات بہت پھیکے انداز میں اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆

رمشا کو اغوا کرکے لے جانے والے اسے ایک عام سی آبادی کے ایسے مکان میں لے گئے تھے جہاں سازوسامان کو دیکھ کر یہ اندازہ تو ہوتا تھا کہ یہ گھر آباد ہے لیکن فی الحال وہاں ان لوگوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ ان دونوں نے بچی کو لے جا کر ایک چارپائی پر لٹایا۔ چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔

”ارے، یہ چابی کیسی ہے؟“ لٹاتے ہوئے رمشا کے ٹراؤزر کی جیب میں موجود چابی گر گئی تھی جس پر پہلے داڑھی والے کی نظر پڑی اور اس نے چابی اٹھا کر اس کے ساتھ منسلک ٹیگ چیک کیا۔ ٹیگ پر مین گیٹ کے الفاظ لکھے تھے۔ اصل میں رمشا کی دادی مختلف قسم کی چابیوں کے درمیان کنفیوز ہو جاتی تھیں اس لیے فریحہ نے ان کی آسانی کے لیے ہر چابی کے ساتھ ٹیگ منسلک کر دیے تھے۔ ٹیگ پر لکھے الفاظ پڑھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”میرے خیال میں یہ ان کے گھر کی چابی ہے۔“ اس نے بالکل درست اندازہ لگایا اور پُرخیال انداز میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا بولتے ہو یار... چل کر پہلے گھر کا صفایا کر دیتے ہیں۔ یہ ہم دونوں کا بونس ہوگا۔ بعد میں تاوان کی رقم ملے گی تو اسے آپس میں برابر سے بانٹ لیں گے۔“

”تجویز تو اچھی ہے لیکن یہاں اس کے پاس کون رہے گا؟“ دوسرے آدمی نے رمشا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بے ہوش ہے، اتنی جلدی ہوش میں نہیں آئے گی۔ پھر بھی احتیاطاً ہم اسے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں ہم واپس بھی آجائیں گے۔ داڑھی والے نے فوراً ہی حل پیش کر دیا جس پر دونوں نے تیزی سے عمل کر ڈالا۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ مکمل تیاری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ دروازے کو انہوں نے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ رمشا کے گھر تک فاصلہ بھی انہوں نے پندرہ منٹ میں طے کر لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ فریحہ تقریباً ساڑھے چھ بجے اور سجاد سات بجے کے بھی بعد گھر واپس آتا ہے اس لیے اس وقت گھر پر دادی کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔

انہوں نے رمشا کے گھر کا دروازہ چابی کی مدد سے کھول کر اندر قدم رکھے تو اس وقت صرف پانچ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد ان میں سے ایک نے اپنے چہرے پر نقاب لگا لیا جبکہ داڑھی والے نے ایسی کوئی زحمت نہیں کی۔ وہ پہلے ہی میک اپ میں تھا اس لیے اسے اپنی اصل صورت کسی کی نظروں میں آجانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اندر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ گھر میں کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہونے کے یقین کے باوجود وہ تھوڑے سے گھبرائے ہوئے تھے اور یہ گھبراہٹ ان کی ناتجربہ کاری کا ثبوت دے رہی تھی۔ پہلے انہوں نے پورے گھر کا جائزہ لیا تو انہیں ایک کمرے میں سوئی ہوئی دادی نظر آگئیں۔ داڑھی والے نے اپنے ساتھی کی مدد سے انہیں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ آوازوں سے ان کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اس طرح باندھے جانے پر دادی نے ہلکی سی مزاحمت تو ضرور کی لیکن دو ہٹے کٹے مردوں کے سامنے ان کے بوڑھے وجود کی کمزور سی مزاحمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انہیں باندھنے کے کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں اس کمرے کی طرف آئے جو ماسٹر بیڈروم کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ جو کچھ ملا، اسی کمرے سے ہی ملے گا۔

سب سے پہلے انہوں نے الماری پر طبع آزمائی کی۔ وہ کوئی ماہر نقب زن نہیں تھے لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد الماری کے عام سے تالے کو کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ الماری میں موجود عام سے لاک کو کھولنے میں بھی انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ لاکر میں انہیں فریحہ کے دو گولڈ کے سیٹ مل گئے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی چند چیزیں تھیں لیکن کیش موجود نہیں تھا۔ داڑھی والا الماری کے دوسرے خانوں میں جلدی جلدی ہاتھ مارتے ہوئے تلاشی لینے لگا۔ اسے امید تھی کہ لاکر کے علاوہ بھی کہیں سے کچھ مل جائے گا۔ اس کی یہ امید بارآور ثابت ہوئی۔ ہینگر سے لٹکے سجاد کے ایک پرانے کوٹ کی اندرونی جیب سے رقم برآمد ہو گئی۔ اندازاً یہ بیس پچیس ہزار روپے تھے جو داڑھی والے نے اپنے اوپر کی جیبوں میں ٹھونس لیے۔

”چل یار نکلتے ہیں۔ زیادہ دیر یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔“ رقم مل جانے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کو کھنگالتے اپنے ساتھی کو ٹوکا۔ دونوں نے اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے اس لیے انہیں اپنے فنگر پرنٹس کے سلسلے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ یہاں پولیس اتنے جدید انداز میں کام نہیں کرتی اور وہ کون سا فریحہ اور سجاد کو پولیس تک جانے کی اجازت دیتے۔ چھ بجنے میں ٹھیک پانچ منٹ باقی تھے جب وہ اس گھر سے باہر نکلے۔ داڑھی والا آگے تھا۔ دروازے کو کھینچ کر بند کرتا اس کا ساتھی پلٹا تو سامنے والے گھر سے ایک نوجوان کو نکلتا دیکھ کر فوراً داڑھی والے کی آڑ میں ہو گیا۔ نوجوان نے ان دونوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اپنی بائک اسٹارٹ کر کے اڑن چھو ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں بھی گاڑی میں بیٹھ کر واپس اس مکان تک پہنچ

گئے جہاں انہوں نے رمشا کو رکھا تھا۔

”تم یہ چیزیں کہیں چھپا کر رکھ دو۔ میں گاڑی واپس کر کے آتا ہوں۔“ داڑھی والے نے اپنے ساتھی کو مکان کے دروازے پر چھوڑتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلا کر ہاتھ میں موجود کپڑے کا تھیلا لیے گاڑی سے اتر گیا۔ مکان اسی کا تھا اسی لیے محلے کے کسی فرد کو اس کی یہاں آمد و رفت پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

آفس وین نے ٹھیک ساڑھے چھ بجے فریحہ کو اس کے گھر کے گیٹ پر ڈراپ کیا۔ اپنے پاس موجود چابی سے اس نے لاک کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ آج آفس میں بہت زیادہ کام تھا اس لیے وہ خاصی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اسے حسبِ معمول وہاں رمشا نظر نہیں آئی، تب بھی اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دادی کے کمرے میں ان کے پاس ہوگی اس لیے اسے اس کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی۔ عام طور پر وہ ساس کے سامنے موجود نہ ہونے کی صورت میں ان کے کمرے میں جا کر انہیں سلام کرتی تھی لیکن اس وقت اس نے سوچا کہ اگر وہاں گئی تو رمشا کو بھی اس کی آمد کی خبر ہو جائے گی اور وہ اس کے پیچھے لگ کر اس کے ساتھ ہی بیڈروم میں آجائے گی۔ ماں کی آمد کے ساتھ اسے اپنے دن بھر کی روداد سنانا اور طرح طرح کے سوالات کر کے کان کھانا اس کی عادت تھی۔ فریحہ چونکہ اس وقت سر میں درد محسوس کر رہی تھی اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی، اس لیے سیدھی بیڈروم میں چلی گئی۔ لیکن وہاں قدم رکھتے ہی اس کے ہونٹوں سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ الماری کے ٹوٹے ہوئے لاک، کھلے دروازے، بکھرا سامان اور اجڑی تجوری سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا۔ یہاں نقب زنی کی واردات ہو چکی ہے۔ لیکن اسے چیزوں سے زیادہ اپنی انمول دولت کی فکر ہوئی اور وہ دیوانہ وار رمشا، رمشا پکارتی ہوئی بیڈروم سے باہر نکلی۔ اس کی پکار پر کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تو وہ اور بھی زیادہ وحشت زدہ ہو گئی اور بھاگ کر ساس کے کمرے میں پہنچی۔ یہاں کا منظر اور بھی زیادہ وحشت زدہ کر دینے والا تھا۔ وہ اپنے بستر پر رسیوں سے بندھی پڑی تھیں اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ رمشا کا البتہ کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ساس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالا اور ان کی بندشیں کھولتے ہوئے انہیں آوازیں دینے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھیں۔ فریحہ نے ان کے سرہانے رکھی میز پر سے پانی کا جگ اٹھا کر ان کے چہرے پر چھینٹے مارے اور گلاس میں پانی ڈال کر انہیں پلایا تب جا کر وہ کچھ بولنے کے لائق ہو سکیں۔

”رمشا کہاں ہے امی؟“ اس نے انہیں جھنجوڑتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں سوال کیا۔ اب تک وہ اپنی ہمت سے بہت بڑھ کر برداشت کا مظاہرہ کر چکی تھی ورنہ حال تو ایسا تھا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگتی یا بے ہوش ہو جاتی۔

”رمشا اپنے کمرے میں تھی۔ میں سو رہی تھی جب پتا نہیں کس نے زبردستی مجھے باندھ کر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر شاید میں بے ہوش ہو گئی۔“ انہوں نے بہت مشکل سے اسے بتایا اور پھر یوں اپنا سر تھام لیا جیسے بہت زوردار چکر آرہے ہوں۔ فریحہ سمجھ گئی کہ ان کا شوگر لیول گر رہا ہے اور اگر ذرا سی بھی مزید تاخیر ہوئی تو وہ بے ہوش ہو کر گر جائیں گی۔ وہ دوڑ کر ریفریجریٹر سے جوس کا ایک ڈبا نکال کر لائی اور اسٹرا ڈال کر زبردستی ان کے ہونٹوں سے لگایا پھر خود سجاد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”سجاد فوراً گھر آجائیں۔ رمشا گھر پر نہیں ہے۔ یہاں شاید ڈاکو آئے تھے۔ امی اپنے بیڈروم میں رسیوں سے بندھی ہوئی ملی ہیں مجھے۔“ سجاد کی آواز سن کر اس کا سارا ضبط جواب دے گیا اور دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اس نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

”کیا کہہ رہی ہو فریحہ ... میری کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“ سجاد شاید راستے میں تھا اور ٹریفک کے شور کی وجہ سے اس کی آواز صحیح طور پر سن نہیں پا رہا تھا۔ کچھ فریحہ کے مسلسل رونے کی وجہ سے بھی آواز واضح نہیں تھی۔

”آپ جلدی سے گھر آجائیے۔ رمشا گھر میں نہیں ہے۔“ فریحہ نے بمشکل اپنی بات دہرائی پھر اسے ساس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ جوس کا ڈبا ان کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور وہ خود بھی بے ہوش ہو کر دوبارہ بستر پر ڈھے گئی تھیں۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ فریحہ نے اپنے حواس پر قابو پایا اور بھاگتی ہوئی گھر سے باہر نکل کر سامنے والوں کے دروازے تک پہنچ کر کال بیل بجائی۔ پریشانی میں اس نے کال بیل کا بٹن ضرورت سے زیادہ دبایا تھا اور فوری طور پر انگلی بھی نہیں ہٹائی تھی اس لیے بیل مسلسل بجتی چلی گئی اور مکین چونک اٹھے کہ یہ کون ہے جو اتنی بدتہذیبی سے بیل بجا رہا ہے۔ فوراً ہی ایک نوجوان دروازے تک آیا۔

”کیا بات ہے بھابی! خیریت تو ہے؟“ وہ جو ذرا

جارحانہ انداز میں دروازے تک آیا تھا، فریحہ کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

"امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے سلمان..... پلیز انہیں اسپتال لے جاؤ۔" اس نے روتے ہوئے نوجوان سے التجا کی۔ سلمان غیر شادی شدہ تھا اور اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ فریحہ اور سجاد کے پاس اتنا وقت تو نہیں ہوتا تھا کہ محلے والوں سے زیادہ میل جول رکھ سکیں لیکن سلمان کی فیملی سے ان کی اچھی علیک سلیک تھی۔ اس کی والدہ اور فریحہ کی ساس کی البتہ کبھی کبھی ایک دوسرے کے گھر آمدورفت یا کھانوں کا تبادلہ چلتا رہتا تھا۔

"ریلیکس بھابی۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔ آپ اور امی مل کر آنٹی کو باہر لائیں۔" سلمان تیزی سے حرکت میں آ گیا جبکہ اس کے پیچھے ہی دروازے تک چلی آنے والی اس کی والدہ فریحہ کو دلاسا دیتی ہوئی اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کے گھر کی طرف لے گئیں۔ سلمان دوڑ کر اندر سے گاڑی کی چابی لایا اور اسے باہر نکالنے لگا۔ وہ گاڑی باہر لایا تو اس دوران فریحہ اور اس کی والدہ بے ہوش صفیہ خاتون کو بمشکل سنبھالے دروازے تک لا چکی تھیں۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور صفیہ خاتون کو سیٹ پر لٹانے میں ان دونوں کی مدد کرنے لگا۔

"بیٹھیے بھابی۔" ساتھ ہی اس نے فریحہ کو بھی پکارا۔

"نہیں۔" وہ جیسے بدک کر پیچھے ہٹی۔ "مجھے رمشا کو دیکھنا ہے۔ آنٹی پلیز! آپ امی کے ساتھ اسپتال چلی جائیں۔ ابھی سجاد آتے ہیں تو میں آپ سے کانٹیکٹ کرتی ہوں۔" فریحہ کو نہ جانے کس غیبی طاقت نے ان لوگوں کو پوری صورتِ حال سے آگاہ کرنے سے روک رکھا تھا۔ اس کے اس رویّے پر سلمان اور اس کی والدہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ آنسوؤں سے تر وحشت زدہ چہرہ اور کانپتے ہونٹ۔ ایک طرف وہ اپنی ساس کے لیے اس قدر پریشان تھی تو دوسری طرف ان کے ساتھ اسپتال جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سلمان کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا لیکن یہ بحث مباحثے کا وقت نہیں تھا۔ صفیہ خاتون کو فوری طور پر اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے امی..... آپ صفیہ آنٹی کے ساتھ پیچھے بیٹھیے۔ ہم انہیں اسپتال لے چلتے ہیں۔" کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے اپنی والدہ سے کہا۔ ایک انسانی زندگی کو بچانے کی کوشش کسی بھی قسم کے رویّے کی وضاحت سے کہیں زیادہ ضروری تھی۔

☆☆☆

سجاد گھر سے کچھ فاصلے پر تھا جب اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے اسکرین پر آنے والے نمبر کو دیکھا۔ نمبر لینڈ لائن کا تھا اور اس کے لیے اجنبی بھی، بہرحال اس نے کال ریسیو کر لی۔

"مسٹر سجاد! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنیے۔ اگر آپ نے کچھ بھی میری ہدایت کے خلاف کیا تو بدترین نتائج کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔" اس کی ہیلو کے جواب میں کسی نے کھردری سی آواز میں یہ جملے ادا کیے جنہیں سن کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ پہلے ہی فریحہ کی کال کی وجہ سے بہت پریشان تھا اور اوپر سے یہ کال۔

"کون ہو تم اور اس فضول گفتگو کا کیا مقصد ہے؟" بے حد سخت لہجے میں اس نے کال کرنے والے سے دریافت کیا۔

"اس فضول گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ میں آپ کو آگاہ کر سکوں کہ آپ کی اکلوتی بیٹی رمشا ہمارے قبضے میں ہے اور آپ کو اس کی زندگی کی قیمت صرف پچاس لاکھ روپے ادا کرنی ہو گی۔ آپ جلد از جلد اس رقم کا بندوبست کریں۔ میں جلد آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ اور ہاں، پولیس سے رابطہ کرنے کی غلطی مت کرنا۔" دوسری طرف سے اتنا کہہ کر رابطہ ختم کر دیا گیا اور سجاد ہیلو ہیلو ہی کہتا رہ گیا۔ اس اثنا میں وہ گھر کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ میکانکی انداز میں گاڑی روک کر وہ نیچے اترا تو بدحواس فریحہ سے دروازے پر ہی سامنا ہو گیا لیکن سجاد نے فوری طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دی اور اس نمبر پر کال بیک کرنے لگا جس سے ابھی ابھی اسے فون کیا گیا تھا۔ اس کی کوشش ناکام گئی۔

"سجاد، سجاد! رمشا کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس اس شخص کی کال آئی تھی۔" کال کرنے میں ناکام ہو کر سجاد مایوس اور جھنجلایا ہوا سا گھر میں داخل ہوا تو فریحہ نے اس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے ہذیانی سے انداز میں اسے آگاہ کیا لیکن اپنے اس انداز کے باوجود اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ سجاد اس کی بات سن کر چونک گیا۔

"کیا..... کیا کہا اس شخص نے؟"

"اس نے کہا ہے کہ ہمیں رمشا کی رہائی کے بدلے پچاس لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے اور یہ بات پولیس سمیت ہر ایک سے چھپانی ہے۔ اگر ہم نے کسی کو کچھ بتایا تو رمشا کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔" فریحہ نے اسے

بتایا۔

وہ ہمت والی عورت تھی لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ ایک ماں کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل تھا۔ وہ بھی خود کو سنبھالنے کی کوشش میں نڈھال ہوئے جا رہی تھی۔

"آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔" سجاد اسے بازو سے تھام کر اندر لے گیا اور لاؤنج میں پڑے صوفے پر اپنے ساتھ لے کر بیٹھ گیا۔

"وہ نمبر دکھاؤ جس سے تمہیں کال آئی تھی۔" اس نے فریحہ سے کہا تو اس نے اپنا موبائل سجاد کے حوالے کر دیا۔ سجاد نے نمبر دیکھا۔ یہ وہی نمبر تھا جس سے اسے کال کی گئی تھی۔ فریحہ کو اس سے ٹھیک دو منٹ پہلے کال کی گئی تھی۔ اس بار اس نے فریحہ کے موبائل سے اس نمبر پر کال بیک کی لیکن نتیجہ حسبِ سابق رہا۔

"سمجھ نہیں آتی کہ ان لوگوں نے رمشا کو اغوا کیسے کیا؟ اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر سے باہر نہیں جاتی اور اگر راستے میں کہیں وین روک کر اسے اغوا کیا جاتا تو اسکول انتظامیہ ہمیں دوپہر میں ہی انفارم کر دیتی۔" سجاد نے پریشانی سے اپنی پیشانی رگڑی۔

"میرے خیال میں رمشا کو گھر سے ہی اغوا کیا گیا ہے۔" فریحہ نے اپنا اندازہ بیان کیا اور پھر اسے اپنے گھر واپس آنے کے بعد کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے سجاد کو بیڈروم کی حالت بھی دکھائی۔ صفیہ خاتون کے بارے میں سن کر سجاد تڑپ گیا۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا اور آفس سے واپس آنے کے بعد لازماً کچھ وقت ان کے ساتھ گزارتا تھا لیکن آج راستے میں ہی رمشا کے اغوا کی خبر سن کر اس بُری طرح الجھ گیا تھا کہ فوری طور پر ان کی طرف دھیان نہیں جا سکا تھا۔

"میں سلمان کو فون کرتا ہوں۔" وہ سب کچھ بھول کر پہلے سلمان کا نمبر ملانے لگا۔

"السلام علیکم سجاد بھائی۔" سلمان نے فوراً اس کی کال ریسیو کی۔

"وعلیکم السلام۔ امی کی طبیعت کیسی ہے سلمان؟" سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"اللہ کا کرم ہو گیا سجاد بھائی۔ ڈاکٹرز نے فوری ٹریٹمنٹ دیا ہے تو آنٹی کی حالت سنبھل گئی ہے ورنہ ان کی حالت خاصی سیریس تھی۔ لیکن آپ فکر نہ کریں، اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" سلمان نے اسے بتایا تو اس نے تھوڑا سا سکون محسوس کیا۔

"تھینک یو سو مچ سلمان۔ اس مشکل وقت میں تم ہم لوگوں کے اتنے کام آئے۔ پلیز تھوڑا سا فیور اور دے دو۔ کچھ دیر اور تم لوگ امی کے ساتھ اسپتال میں رک جاؤ۔ میں ایک مسئلے میں پھنسا ہوا ہوں، اسپتال پہنچنے میں تھوڑا وقت لگ جائے گا۔" اس نے عاجزی سے سلمان سے درخواست کی۔ اس سے یہ درخواست کرتے ہوئے وہ خاصا آکورڈ فیل کر رہا تھا اور ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کے اس طرزِ عمل سے سلمان اور اس کی والدہ کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے سلسلے میں بے پروائی برت رہا ہے اور اسے ان کی فکر نہیں ہے، لیکن وہ کسی کو کیا بتاتا کہ وہ کس مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔

"ٹھیک ہے سجاد بھائی۔ میں اور امی آنٹی کے پاس ہی ہیں، آپ آرام سے آ جائیے۔" سلمان نے اس سے کہا تو اس نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا اور فریحہ کے ساتھ مل کر ایک بار پھر باریک بینی سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ بیڈروم کے علاوہ گھر کے کسی حصے کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ الماری سے سارا زیور اور کیش غائب تھا اور اس کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔

"جب تم آفس سے آئیں تو کیا گیٹ کا لاک ٹوٹا ہوا تھا؟" سجاد نے فریحہ سے دریافت کیا۔

"نہیں، میں معمول کے مطابق چابی سے تالا کھول کر اندر آئی تھی۔ اپنے بیڈروم میں آنے سے پہلے تو مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کوئی گھر میں گھسا ہے۔" فریحہ نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے جواب دیا۔ سجاد کے آنے سے اسے اتنی ڈھارس ضرور ملی تھی کہ اس نے رونا بند کر دیا تھا لیکن پریشان تو وہ بہرحال تھی۔

"عجیب بات ہے۔ الماری کے عام سے تالے انہوں نے توڑ کر سامان نکالا ہے اور گیٹ کا اتنا مضبوط لاک وہ ایسے کھول کر اندر آ گئے جیسے ان کے پاس لاک کی چابی موجود ہو۔" سجاد نے جا کر بیرونی گیٹ کے لاک کا جائزہ لیا اور پھر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ اس وقت وہ بھرپور اعصابی مضبوطی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ بھی تھا کہ فی الحال اسے رمشا کی سلامتی کا یقین تھا اور وہ امید کر سکتا تھا کہ رقم کے عوض وہ رمشا کو واپس حاصل کر سکتا ہے۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے کال بیل بجائی ہو۔ امی سو رہی تھیں۔ رمشا نے گیٹ کھول دیا ہو گا۔ بچی کے ساتھ زبردستی کر کے گھر کے اندر داخل ہونا کون سا مشکل کام ہے۔" فریحہ نے خیال آرائی کی۔

"ہاں، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔" سجاد نے اس سے اتفاق کیا اور وہ دونوں گیٹ سے واپس پلٹے۔

"ارے ۔۔۔۔ یہ رمشا کی سائیکل کہاں ہے؟ گھر میں کہیں بھی نظر نہیں آئی۔" برآمدے سے گزرتے ہوئے سجاد کو خیال آیا کہ رمشا کی سائیکل اپنی مخصوص جگہ پر موجود نہیں ہے۔ باقی گھر میں بھی اس نے کہیں سائیکل نہیں دیکھی تھی۔ سائیکل کا نہ ہونا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ رمشا خود سائیکل لے کر کہیں نکلی ہے۔۔۔۔ لیکن کہاں؟ وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ فریحہ نے جا کر جلدی سے گھر کی چابیاں چیک کیں۔ ان چابیوں میں مین گیٹ کی چابی موجود نہیں تھی، اس نے اپنا سر تھام لیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ رمشا خود باہر گئی تھی اور کسی نے موقع دیکھ کر اسے اغوا کر لیا۔" سجاد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"لیکن اچانک اغوا کرنے والے کسی اجنبی کو ہمارے موبائل نمبرز اور روٹین کا کیسے علم ہوسکتا ہے؟ کوئی اجنبی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ گھر میں امی اور رمشا اکیلی ہوتی ہیں۔" فریحہ نے اس سے اختلاف کیا۔

"اغوا کرنے والوں کے لیے رمشا سے یہ معلومات حاصل کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔ وہ اتنی چھوٹی ہے، کسی کے ڈانٹ کر پوچھنے پر ہی سب کچھ بتا دیا ہوگا۔" سجاد نے اپنی رائے کے حق میں دلیل دی۔

"کچھ کریں سجاد ۔۔۔۔ مجھے اپنی بچی ہر حال میں واپس چاہیے۔" سجاد نے تو صرف ڈانٹنے کا ذکر کیا تھا لیکن فریحہ کو خیال آیا کہ اس قسم کے لوگ اپنے مقصد کے حصول کے لیے معصوم بچوں پر بھی تشدد کر جاتے ہیں۔ بیٹی کے تکلیف میں ہونے کے خیال سے اس کا دل کٹنے لگا اور ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔

"بی بریو فریحہ ۔۔۔۔ انشاء اللہ ہماری رمشا جلدی واپس آجائے گی۔ اغوا کاروں نے رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ رقم لے کر وہ اسے چھوڑ دیں گے۔" سجاد روتی ہوئی فریحہ کو تسلی دینے لگا۔

"ہم پچاس لاکھ کہاں سے دیں گے؟ بینک میں اتنا زیادہ کیش تو نہیں ہے ہمارے پاس ۔۔۔۔ اور وہ ظالم تو میرا سارا زیور بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔" فریحہ کو کسی طور قرار نہیں آرہا تھا۔

"میں ہوں نا۔ میں کروں گا رقم کا انتظام۔ رقم کے لیے اگر مجھے اپنا آپ بھی بیچنا پڑا تو بیچ ڈالوں گا۔ بس تم رونا بند کر دو، میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہیں رمشا ضرور ملے گی۔" سجاد نے اسے خود سے لگا کر چپ کروایا۔ تھوڑی سی جدوجہد سے فریحہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی۔

"تم گھر پر ہی رک کر ان کے فون کا انتظار کرو۔ انہوں نے رقم کے لیے رمشا کو اغوا کیا ہے اس لیے دوبارہ رابطہ ضرور کریں گے۔ میں امی کے پاس اسپتال جاتا ہوں۔ ہم میں سے جس کے بھی موبائل پر اغوا کاروں نے رابطہ کیا، وہ دوسرے کو فون پر بتا سکتا ہے۔ اس وقت میرا اسپتال پہنچنا ضروری ہے ورنہ سلمان اور اس کی والدہ کو تجسس ہوجائے گا کہ ہمارے رویّے کے پیچھے کیا وجہ ہے اور حقیقت ہم کسی کو بتا نہیں سکتے۔ رمشا کے تحفظ کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اغوا کاروں کی ہدایات پر پوری طرح عمل کریں ورنہ مشتعل ہو کر وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" سجاد اسے سمجھا بجھا کر گھر سے روانہ ہوگیا۔

"تھینک یو یار۔ آج تم بہت کام آئے۔" سلمان سے اسپتال میں ملاقات ہوئی تو اس نے تہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"شرمندہ مت کریں سجاد بھائی ۔۔۔۔ پڑوسی ہونے کے ناتے میرا اتنا فرض تو بنتا ہی تھا۔ اگر آپ چاہیں تو میں مزید یہاں رک سکتا ہوں۔" سلمان نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"نہیں یار! مجھے خود بھی امی کی فکر ہورہی تھی لیکن مسئلہ ایسا ہوگیا تھا کہ فوری طور پر اسپتال نہیں پہنچ سکا۔ تم اور آنٹی بھی سوچتے ہوگے کہ ہم کیسے بے پروا لوگ ہیں کہ اپنی ماں کی فکر ہی نہیں۔" سجاد نے شرمندہ سے انداز میں کہا۔

"ارے نہیں بھئی۔ ہم بالکل بھی ایسا نہیں سوچ سکتے۔ صفیہ آنٹی آپ کی اور بھابی کی فرماں برداری کی اتنی تعریفیں کرتی ہیں کہ کسی غلط بات کے ذہن میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھ سے شیئر کر سکتے ہیں۔" سلمان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا تو وہ تھوڑا سا گڑبڑا گیا۔

"یعنی سچ مچ کوئی گڑبڑ ہے۔" سجاد کے انداز پر سلمان جیسے پُریقین ہوگیا۔

"نہیں یار! بس وہ گھر پر چوری کی واردات ہوگئی ہے۔ فریحہ گھر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ الماری کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے اور امی بے ہوش تھیں۔ اسی لیے وہ خود امی کے ساتھ اسپتال نہیں آسکی اور مجھے بھی دیر ہوگئی۔"

سجاد نے رمشا کے اغوا کی بات چھپا کر چوری کی واردات سے آگاہ کر دیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ آپ نے پولیس میں رپورٹ کروائی؟" سلمان نے تشویش سے پوچھا۔ وہ دونوں ابھی تک باہر کوریڈور میں ہی کھڑے تھے اور سجاد اس کمرے میں نہیں پہنچ سکا تھا جہاں صفیہ خاتون سلمان کی والدہ کی نگرانی میں موجود تھیں۔

"رپورٹ تو ابھی نہیں لکھوائی ہے۔ لکھوانے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ ہماری پولیس کون سا چوروں کو پکڑ لیتی ہے۔" سجاد نے اسے ٹالا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ یہ بتائیں کہ رمشا تو ٹھیک ہے نا؟ وہ بھی تو واردات کے وقت گھر میں ہی ہو گی۔" سلمان نے اس سے بڑا نازک سوال کر دیا۔

"ہاں، وہ ٹھیک ہے۔ بس خوف زدہ زیادہ ہو گئی ہے اس لیے فریحہ مستقل اس کے ساتھ ہے۔" سجاد نے خود کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ظاہر ہے۔ بچی خوف زدہ تو ہوتی ہی۔ ویسے چور کیا کچھ لے گئے ہیں؟" سلمان نے تبصرہ کرتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"صرف زیور اور کیش۔" جواب دیتے ہوئے اس کے لبوں سے سرد آہ نکلی۔ وہ کیسے کسی کو بتاتا کہ چور اس کا سب سے قیمتی متاع لے گئے ہیں۔

"سجاد بھائی! آج سوا پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان میں نے دو افراد کو آپ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹی سی تھیلی بھی تھی لیکن وہ اتنے اطمینان سے اندر سے نکلے تھے کہ میں سمجھا آپ کے کوئی عزیز ملاقات کے لیے آ کر جا رہے ہیں۔ وہ گاڑی میں آئے تھے۔" سلمان نے اسے آگاہ کیا۔

"ذرا ان لوگوں کے حلیے تو بتاؤ۔" سجاد نے بے چینی سے کہا۔ جواب میں سلمان نے اسے داڑھی والے کا حلیہ بتا دیا لیکن دوسرے کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کے پیچھے تھا اس لیے وہ اسے صحیح سے دیکھ نہیں سکا۔

"جو حلیہ تم نے بتایا ہے، اس حلیے کا کوئی فرد ہمارے عزیزوں میں شامل نہیں ہے۔ ویسے بھی سب جانتے ہیں کہ میں اور فریحہ ملازمت کرتے ہیں اس لیے کوئی سات بجے سے پہلے ہمارے گھر ملاقات کے لیے نہیں آتا۔" حلیے سے کوئی اندازہ نہ ہونے پر اس نے مایوسی سے بتایا۔

"کاش، میں ان کی گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیتا۔" سلمان نے افسوس کا اظہار کیا۔

"تمہیں کیا خبر تھی کہ وہ چور ہیں۔" سجاد کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑی۔ "آؤ، میں ذرا امی کو تو دیکھ لوں۔" اس نے قدم آگے بڑھائے۔ سلمان سے ہونے والی گفتگو سے اسے یہ بات کنفرم ہو گئی تھی کہ رمشا کو گھر سے اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ خود ہی باہر گئی تھی۔

☆☆☆

ثوبیہ سے ملاقات کے بعد فراز گھر پہنچا تو خاصا پریشان تھا۔ ثوبیہ اس کی محبت تھی اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اسے پانا بھی آسان نہیں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی والدہ ثوبیہ کے گھر رشتہ لے جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گی لیکن بہرحال اسے اپنی سی کوشش تو کرنی ہی تھی۔

"اچھا ہوا بھائی آپ گھر آ گئے۔ میں آپ کو فون کرنے ہی لگی تھی۔ امی کا بی پی بہت ہائی ہو گیا ہے۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑے گا۔" گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا سبین سے سامنا ہو گیا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ فراز نے جلدی سے اندر جا کر امی کو دیکھا، واقعی ان کی حالت خاصی خراب تھی اور وہ دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں بازو کو دبا رہی تھیں۔

"میں ٹیکسی لاتا ہوں۔ تم امی کی زبان کے نیچے گولی رکھو۔" اس نے سبین سے کہا اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی والدہ بلڈ پریشر کی مستقل مریضہ تھیں اس لیے اس نوعیت کی دوائیں گھر پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ ٹیکسی لے کر آیا، تب تک سبین بھی چادر اوڑھ کر ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ فراز نے اپنی والدہ کو سہارا دے کر ٹیکسی میں سوار کروایا۔ سبین بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی جبکہ فرحین کو وہ لوگ گھر پر چھوڑ کر جا رہے تھے۔

"مائنر سا ہارٹ اٹیک ہے۔ شکر ہے کہ آپ بروقت انہیں اسپتال لے آئے، ورنہ کنڈیشن کریٹیکل بھی ہو سکتی تھی۔" اسپتال پہنچنے کے بعد انہیں فوری ٹریٹمنٹ دیا گیا۔ اس دوران سبین آئی سی یو کے سامنے کھڑی رہی جبکہ فراز دوائیں وغیرہ لانے کے چکر میں گھن چکر بنا رہا۔ اس مصروفیت کے دوران اس کی سجاد پر بھی نظر پڑی تھی لیکن جلدی میں ہونے کی وجہ سے وہ اس سے بات نہیں کر سکا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد آئی سی یو میں ڈیوٹی دیتے ایک ڈاکٹر نے انہیں امی کی حالت کے بارے میں آگاہ کیا ورنہ اس سے پہلے تو کوئی ڈھنگ سے بات ہی نہیں کر رہا تھا۔

"کیا ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں؟" فراز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ تین چار گھنٹوں بعد شاید یہ ممکن ہو سکے۔" ڈاکٹر جواب دے کر آگے بڑھ گیا تو فراز، سبین کی طرف متوجہ ہوا۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"پریشان مت ہو۔ شکر ہے کہ اب امی کی طبیعت ٹھیک ہے۔" اس نے سبین کو تسلی دی پھر بولا۔ "میں فرحین کو فون کر کے بتاتا ہوں۔ وہ گھر پر پریشان ہو رہی ہو گی۔" سبین نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ فراز نے گھر کا نمبر ملایا اور فرحین کو تسلی و تشفی دینے کے بعد اپنے ایک دوست کو فون کیا۔ دوست کو امی کی طبیعت کے بارے میں بتا کر اس نے اس سے درخواست کی کہ وہ گھر سے اس کی موٹر سائیکل یہاں اسپتال پہنچا دے کہ اپنی سواری موجود ہونے سے ذرا سہولت کا احساس رہتا ہے۔ دوست نے اس کا یہ کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ فراز کچھ دیر تو سبین کے ساتھ وہیں کھڑا رہا پھر اس نے سوچا کہ باہر چلا جائے تاکہ دوست موٹر سائیکل لے کر آئے تو اسے پریشانی نہ ہو۔ باہر کی طرف جاتے ہوئے اس کی ایک بار پھر سجاد سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس بار وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکا۔

"خیریت سر! آپ یہاں؟" سلام کے بعد اس نے ان سے دریافت کیا۔

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ یہاں ایڈمٹ ہیں۔" سجاد نے بتایا۔

"ارے، جب میں آپ کے گھر سے رمشا کو پڑھا کر روانہ ہوا تھا، تب تو وہ بالکل ٹھیک تھیں۔" وہ حیران ہوا۔

"تم رمشا کو پڑھا کر کتنے بجے ہمارے گھر سے نکلے تھے؟" سجاد نے بے تابی سے پوچھا۔

"تقریباً سوا چار بجے۔ آج مجھے ایک جگہ کام سے جانا تھا اس لیے جلدی نکل گیا تھا۔" اس نے وضاحت دی لیکن سجاد نے کچھ نہیں کہا۔

"اینی پرابلم سر؟" اس کے انداز میں غیر معمولی پن محسوس کر کے فراز پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"نہیں یار! گھر میں چوری کی واردات ہو گئی ہے۔ چور سارا زیور اور پیسا لے گئے۔ امی سو رہی تھیں۔ امی کو انہوں نے سوتے میں ہی باندھ ڈالا اور شاید اسی وجہ سے ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی۔" سجاد نے اسے بتایا۔

"ویری سیڈ۔ میں آنٹی سے مل کر ان کی خیریت معلوم کرتا ہوں۔ کس روم میں ہیں وہ؟" فراز نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"روم نمبر سکسٹین میں لیکن ابھی وہ سو رہی ہیں۔" سجاد نے اسے بتایا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی بری طرح الجھا ہوا تھا کہ اسے فراز سے اس کی یہاں موجودگی کی وجہ پوچھنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔

"اوکے۔۔۔ میں بعد میں ان کی مزاج پرسی کے لیے آؤں گا۔" فراز نے قدم آگے بڑھائے پھر خیال آنے پر پلٹا۔

"رمشا۔۔۔ رمشا تو ٹھیک ہے نا سر، میرا مطلب ہے واردات کے وقت وہ بھی تو گھر پر ہو گی نا؟" اس کے سوال پر سجاد کا دل کٹنے لگا لیکن وہ دل کو لاحق تکلیف کسی سے بانٹ نہیں سکتا تھا چنانچہ نہایت ضبط سے بولا۔

"ٹھیک ہے لیکن مینٹلی ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"انشاء اللہ وہ جلد سیٹ ہو جائے گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ انسان حادثات کے اثرات سے نکل ہی آتا ہے۔" فراز عجیب سے لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ شاید اس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ثوبیہ کا بچھڑ جانا اس کے لیے ایک بڑا حادثہ ہو گا لیکن ہو سکتا ہے وقت اس دکھ کا مداوا کر دے۔ فی الحال تو وہ امی کی حالت کی وجہ سے ان سے اس موضوع پر بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

"بچی کے گھر سے کتنا مال تمہارے ہاتھ آیا؟" داڑھی والے اور اس کے جوان ساتھی کو کڑے تیوروں سے گھور کر یہ سوال کرنے والے کا سر بالکل صاف تھا اور گھنی بھوؤں کے سائے میں موجود آنکھوں میں شاطر پن صاف پڑھا جا سکتا تھا۔

اس کے جملے نے داڑھی والے اور اس کے ساتھی کو چونکا دیا لیکن پھر فوراً ہی تیز لہجے میں بولا۔ "تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارا ہمارا معاملہ صرف اس ڈیل کی حد تک ہے۔ باقی ہم نے جو کچھ کمایا، وہ ہمارا بونس ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم نے ہمارے ذمے بچی کے اغوا اور تاوان کی وصولی کا کام لگایا ہے اور معاہدے کے مطابق تاوان کی رقم میں ہم دس دس فیصد اور تم اسّی فیصد کے حصے دار ہو گے۔ اس کے علاوہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں، تمہیں اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔" داڑھی والے

کے ساتھی نے بھی اس کے موقف کی حمایت کی۔
"ناراض کیوں ہو رہے ہو یار! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ تمہاری محنت کی کمائی تمہیں مبارک ہو۔ میں پہلے ہی اس پلان کا ماسٹر مائنڈ ہونے کی وجہ سے تم دونوں سے کہیں زیادہ کمانے والا ہوں۔" گنجے نے ہنس کر بات ختم کر دی تو وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔
"تم نے میک اپ اچھا کیا ہے۔ اس حلیے میں تو رمشا جیسی معصوم بچی تو کیا، کوئی سمجھ دار آدمی بھی مشکل ہی سے تمہیں پہچان سکتا ہے۔" داڑھی والے کی طرف رخ کر کے اس نے اس کی تعریف کی۔
"شکریہ۔ میں تمہارے حکم پر ہی کئی دن سے اس حلیے میں گھوم رہا ہوں اور میرا ابھی یہی خیال ہے کہ میں نے خاصی مہارت سے اپنے حلیے میں تبدیلی کی ہے۔" داڑھی والے نے سپاٹ لہجے میں اسے جواب دیا۔
"بچی کا کیا حال ہے؟ پریشان تو نہیں کیا اس نے؟" گنجے نے دریافت کیا۔
"وہ بے چاری بچی کیا تنگ کرے گی۔ پہلے ---- بے ہوش تھی، اب ہوش میں آئی ہے تو ہاتھ پیر کی بندشوں اور منہ میں ٹھنسے کپڑے کی وجہ سے بالکل معذور ہے۔ البتہ میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہے اور اگر اسے مستقل اسی حال میں رکھا گیا تو یہاں سے آزادی پانے کے بعد بھی بہت عرصے تک ذہنی طور پر اس صدمے سے باہر نہیں آسکے گی۔" یہ سب بولتے ہوئے داڑھی والے کے لہجے میں رمشا کے لیے ہمدردی تھی۔
"تمہیں ان ساری باتوں پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی چند گھنٹے اور اسے اسی حال میں بھوکا پیاسا رہنے دو۔ پھر اس کی آواز میں اس کے ماں باپ کے لیے پیغام ریکارڈ کروانا۔ بچی کی آواز جتنی دردناک اور بسورتی ہوئی ہو گی، اس کے ماں باپ اتنی جلدی تاوان کی رقم کا بندوبست کریں گے۔" گنجے نے رکھائی سے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
"امید ہے کہ تم میری ہدایات کے مطابق کام کرو گے۔ آواز ریکارڈ کرنے کے بعد کل صبح نو اور دس بجے کے درمیان تم اس کی ماں سے رابطہ کرنا اور بچی کی آواز کا ریکارڈ سنا کر پوچھنا کہ تاوان کے سلسلے میں انہوں نے کیا انتظام کیا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ تاوان کی رقم میں میری اجازت کے بغیر ایک روپے کی بھی کمی نہیں کرنی۔"
کھڑے ہونے کے بعد اس نے ان دونوں کو چند ہدایات دیں اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل پر آیا تھا لیکن موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ اس طرح ٹوٹی ہوئی تھی کہ پورا نمبر ہی نہیں پڑھا جا رہا تھا۔ ورنہ وہ دونوں اس نمبر کے ذریعے اس کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کرتے۔
"مردود بالکل ہی انسانیت سے عاری ہے۔ اپنے مقصد کے لیے معصوم بچی کو بھی ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے۔" اس کے جانے کے بعد داڑھی والے نے دانت کچکچاتے ہوئے تبصرہ کیا۔
"چھوڑ یار! کر تو ہم بھی کچھ ایسا ہی رہے ہیں۔" اس کے ساتھی نے بیزاری سے تبصرہ کیا۔
"ہماری مجبوری ہے۔ اگر ہم نے بیس تاریخ تک استاد مستانے کو رقم ادا نہیں کی تو ہماری لاشیں کسی ویران جگہ پر پڑی ملیں گی۔ وہ بھی ایسی حالت میں کہ ہمارے گھر والوں کے لیے ہماری شناخت مشکل ہو جائے گی۔" داڑھی والے نے جھرجھری سی لیتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھی کا بھی چہرہ لٹک گیا۔
"یار سرمد! ہم نے خود اپنے ساتھ برا کیا۔ ہمیں برائی کی راہ پر قدم رکھتے ہوئے سوچنا چاہیے تھا کہ اس کا انجام برا ہی ہو گا۔"
"حالات نے قدم بھٹکا دیے۔ جہاں جینے کی راہیں نہ ملیں، وہاں ہم جیسے ایسے ہی چور راستوں پر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" داڑھی والے نے حسرت سے جواب دیا۔ اس کا نام عاقل تھا۔ وہ اور سرمد کالج کے زمانے کے دوست تھے۔ دونوں نے گریجویشن کر رکھا تھا لیکن اب تک کوئی مناسب ملازمت تلاش نہیں کر سکے تھے۔ مجبور ہو کر سرمد نے ٹیلی فون کے محکمے میں لائن مین کی عارضی ملازمت کر لی تھی اور یہ ملازمت بھی اسے کسی رشتے دار کے توسط سے ملی تھی۔ عاقل اتنی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ عموماً سفید پوش گھرانوں کی طرح ان کے گھروں میں بھی بے شمار مسائل تھے جن کا حل جوان بیٹے کی اچھی نوکری کی صورت میں ڈھونڈا جاتا ہے اور جب بیٹے یہ امید پوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو دانستہ یا نادانستہ طنز و طعنوں کے حق دار بھی قرار پاتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔
ڈپریشن کا شکار دونوں نوجوانوں نے غم غلط کرنے کے لیے پتا نہیں کیسے شراب نوشی کا آغاز کر دیا اور پھر جوا بھی کھیلنے لگے۔ دونوں علتیں ایسی تھیں جو بے تحاشا پیسا مانگتی ہیں۔ انہوں نے کبھی دوستوں سے قرض لیا، کبھی گھر سے ہی رقم اڑا لی۔ یہاں تک کہ موقع ملنے پر گھر کی خواتین کے پاس موجود چھوٹے موٹے زیور بھی چرا کر بیچ ڈالے۔ سرمد کے پاس ایک موقع اور تھا۔ اس نے ٹیلی فون کے تاروں کے بنڈل کے بنڈل بیچ ڈالے پھر بھی شرابی اور جواری کا خرچہ کہاں پورا ہوتا ہے۔ وہ جس اڈے پر اپنے شوق پورے کرنے جاتے تھے، وہاں بھی کئی لوگوں کے مقروض ہو گئے۔ خاص طور پر اڈے کے مالک استاد مستانہ کی انہیں خاصی رقم ادا کرنی تھی۔ کچھ دن پہلے ہی استاد نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر رقم نہیں ملی تو وہ ان دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔
استاد کی دھمکی کو وہ صرف دھمکی سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتے تھے کہ حاصل شدہ معلومات کے مطابق وہ ماضی میں نادہندگان کو اس انجام سے دوچار کر چکا تھا۔ مایوسی اور پریشانی کے اس عالم میں جب ان کے پاس ایک اجنبی کا فون آیا اور اس نے انہیں پیشکش کی کہ اگر وہ دونوں اس سے ایک ملاقات کر لیں تو وہ انہیں اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ بتا سکتا ہے تو قدرتی طور پر وہ اس کی بتائی ہوئی جگہ پر دوڑے چلے گئے۔ فون کرنے والا یہی گنجا تھا جس نے اقبال کے نام سے اپنا تعارف کروایا تھا۔
اس نے ان کے سامنے رمشا کے اغوا کا منصوبہ رکھا تو پہلے تو وہ دونوں بدک گئے لیکن پھر اقبال نے قائل کر لیا کہ تھوڑی سی محنت اور ہوشیاری سے وہ اتنی بڑی رقم حاصل کر سکتے ہیں کہ استاد مستانہ کا قرض ادا کرنے کے بعد بھی ان کے پاس اچھی خاصی رقم بچ جائے گی۔ اقبال کا منصوبہ سادہ تھا جس کے پہلے حصے میں عاقل کو اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ وہ اپنے حلیے میں معقول تبدیلی کر کے تقریباً ایک ہفتے تک رمشا کے گھر کے اردگرد منڈلاتا رہا تھا کہ جب بھی بچی اکیلی دکھائی دے، وہ سرمد کو اس کی اطلاع دے دے اور خود بچی کو ورغلا کر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لے۔ سرمد کا کام یہ تھا کہ وہ عاقل کی مصروفیت کے دوران ہمیشہ اس کی کال سن کر روانہ رہنے کے لیے تیار رہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کار کرائے پر لے کر سرمد نے کرائے ہی کی ایک دکان نما گیراج میں کھڑی کر دی تھی۔ رمشا کو رکھنے کے لیے مکان کا انتظام بھی انہیں خود کرنا تھا البتہ اخراجات کے لیے رقم اقبال نے فراہم کی تھی۔ کرائے کا مکان تلاش کرنے کی زحمت سے وہ اس لیے بچ گئے کہ سرمد کے گھر والے کسی قریبی عزیز کے گھر شادی میں شرکت کے لیے پندرہ دنوں کے لیے اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اقبال نے انہیں رمشا کی تصویریں فراہم کر رکھی تھیں اس لیے انہوں نے بہت آسانی سے اسے اغوا کر لیا۔ ایک طرح سے اقبال اپنے اس دعوے میں بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ یہ بہت آسان کام ہے اور وہ دونوں بغیر کسی دشواری کے اسے انجام دے سکتے ہیں۔ انہوں نے پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کر لیا تھا اور اب دوسرے کے لیے بھی پُرامید تھے۔ رقم مل جاتی تو سارے مسئلے حل ہو جاتے۔
"یار سرمد! میں نے تو سوچ لیا ہے کہ رقم ہاتھ آ گئی تو قرض ادا کرنے کے بعد استاد مستانے کے اڈے کا رخ بھی نہیں کروں گا۔ ہم دونوں مل کر کوئی کاروبار شروع کر لیں گے اور عزت کی زندگی گزاریں گے۔"
"بالکل یار! پھر ہماری بھی شادیاں ہوں گی اور پیارے پیارے بچے ہوں گے۔" سرمد خواب میں کھو سا گیا۔
"بچے۔۔۔" عاقل چونکا۔ "بچے کتنے پیارے اور معصوم ہوتے ہیں نا یار۔۔۔ پھر ہم اس معصوم بچی پر کیسے اتنا ظلم کر سکتے ہیں۔ باندھ کر رکھنا تو چلو ہماری مجبوری ہے لیکن بھوکا پیاسا رکھنا قطعی انسانیت نہیں ہے۔ اس کے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو یار۔" وہ بے چین سا ہو گیا۔
"ٹھیک ہے، میں کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔ تم اس کے پاس جاؤ اور پہلے سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کرو کہ منہ کھولے جانے پر وہ ہنگامہ نہیں کرے گی۔ اگر آواز باہر گئی تو محلے والے مشکوک ہو سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ میں اسے ہینڈل کر لوں گا۔ تو کچھ لے کر تو آ۔" عاقل نے اس سے کہا اور اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں رمشا خوف و بے بسی کی تصویر بنی بستر پر پڑی تھی۔ اس کے دونوں رخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔
شراب اور جوئے کی لت نے بے شک ان دونوں میں بہت سی برائیاں پیدا کر دی تھیں لیکن بنیادی طور پر وہ شریف گھرانوں کے اچھے لڑکے تھے اس لیے رمشا کی یہ حالت دیکھ کر عاقل کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھا اور آہستہ آہستہ پیار سے کچھ سمجھانے لگا۔ سرمد ٹرے میں دودھ کا گلاس، مکھن لگے توس اور جیم کا جار لیے کمرے میں آیا تو عاقل رمشا کے منہ اور ہاتھوں کو آزاد کر چکا تھا۔
"مجھے اپنے گھر جانا ہے انکل۔" بہت دھیمی آواز میں

اٹک اٹک کر وہ بمشکل یہ جملہ بول سکی۔ حلق خشک ہونے کی وجہ سے اس کے لیے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

"پہلے تم خاموشی سے یہ کھا پی لو پھر میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔" عاقل نے اسے بہلایا۔

"میں گھر جا کر کھانا کھالوں گی۔" وہ کسمسائی۔

"اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو تمہیں دوبارہ پہلے کی طرح باندھ دیا جائے گا۔" مجبوراً سرمد کو اسے دھمکانا پڑا۔ رمشا نے کچھ دیر آنسو بھری اور ...... رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹرے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ بھوکی تھی، اس کے باوجود ایک سلائس اور تھوڑے سے دودھ کے سوا حلق سے کچھ نہ اتار سکی۔ عاقل کا اصرار بھی کچھ کام نہ آیا۔ البتہ کچھ دیر بعد وہ پُرسکون نیند سوگئی۔

"میں نے دودھ میں نیند کی آدھی گولی ملا دی تھی۔ اب یہ سکون سے سوتی رہے گی اور ہمیں اسے باندھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ البتہ احتیاطاً ہم دونوں باری باری جاگ کر نگرانی کرتے رہیں گے۔" سرمد نے رمشا کے سونے کے بعد یہ سب کہا تو عاقل نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ سرمد کی تجویز سے اسے بالکل بھی اختلاف نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے تھوڑا سا سکون ہی محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

فریحہ نے مانیٹر کی اسکرین پر ظاہر ہونے والے ایڈریس کو دیکھا۔ وہ ایڈریس اس نے اس نمبر کی مدد سے نکالا تھا جس سے اغوا کاروں نے اس کے اور سجاد کے موبائلز پر کال کی تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے طور پر متعدد بار اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن ہر کوشش ناکام گئی تھی۔ اغوا کاروں نے دوبارہ ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ پھر فریحہ کو خیال آیا کہ لینڈ لائن نمبر سے ایڈریس معلوم کرنا تو زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ وہ فوراً کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی اور اب ایڈریس اس کے سامنے تھا۔ اس نے ایڈریس نوٹ کیا اور شولڈر بیگ لٹکا کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور عام طور پر وہ آفس سے آنے کے بعد اکیلی گھر سے باہر نہیں جایا کرتی تھی لیکن آج تو سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک رکشا روکا اور اسپتال کا نام بتا کر رکشے والے کو وہاں چلنے کا کہا۔ راستے میں اس نے فون کر کے سجاد کو بتا دیا کہ وہ اسپتال آرہی ہے چنانچہ سجاد اسے اسپتال کے گیٹ پر ہی مل گیا۔

"امی کی طبیعت کیسی ہے؟" کوئی بھی بات کرنے سے پہلے اس نے ساس کی طبیعت معلوم کی۔

"اب بہتر ہیں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا ہے۔ ان کے ذہن میں تھوڑا بہت خیال تھا کہ کسی نے انہیں رسی سے باندھا تھا لیکن میں نے انہیں جھٹلا دیا اور کہا کہ وہ شوگر لو ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھیں اور غنودگی میں ہی انہیں وہم ہوگیا ہوگا۔" سجاد نے اسے بتایا۔ دونوں میاں بیوی کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ ضبط کی جن منزلوں سے گزر رہے تھے، خود انہیں ہی معلوم تھا۔

"میں نے فون نمبر کی مدد سے یہ ایڈریس نکالا ہے۔ اگر تمہارا کوئی جاننے والا پولیس میں ہے تو اس ایڈریس کی مدد سے مجرموں کو ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔" فریحہ نے ایڈریس لکھا پرچہ اس کے سامنے کیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجرم اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ جس جگہ بیٹھے ہوں، وہاں کے نمبر سے کال کریں۔ آج کل بڑے بڑے فنکار موجود ہیں۔ دبئی میں بیٹھ کر پاکستان کے نمبر سے اور بھارت میں بیٹھ کر دبئی کے نمبر سے کال ملا لیتے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں تو یہ ایڈریس ہمارے لیے بیکار ہی ہوگا۔ بہرحال میں دیکھ لیتا ہوں۔" سجاد نے پرچہ تھام لیا اور اس پر لکھا ایڈریس پڑھا۔

"یہ تو اسی علاقے کا ایڈریس ہے جہاں فراز رہتا ہے۔" ایڈریس پر ایک نظر ڈال کر اس نے تبصرہ کیا۔

"فراز کا فون نمبر تو ہے نا آپ کے پاس، اس سے رابطہ کر کے معلومات حاصل کریں۔" فریحہ بے چینی سے بولی تو اسے خیال آیا کہ فراز سے اس کی کچھ دیر قبل یہاں اسپتال میں ہی ملاقات ہو چکی ہے۔ یہ بات اس نے فریحہ کو بھی بتائی۔

"آپ اسے کال کریں۔ اگر وہ اب بھی اسپتال میں ہے تو ہم فیس ٹو فیس اس سے بات کر سکتے ہیں۔" فریحہ نے تجویز دی تو سجاد نے فراز کا نمبر ملایا۔ فراز اسپتال میں ہی تھا چنانچہ سجاد کی فرمائش پر فوراً لان میں آنے کے لیے تیار ہوگیا۔

اس کے آنے کے بعد سجاد نے ایڈریس اس کے سامنے رکھ کر پوچھا کہ کیا وہ اس بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔

"یہ تو میری پچھلی گلی کا ہی ایڈریس ہے لیکن آپ اس بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟" فراز حیران ہوا۔

"یہاں امی کے کوئی عزیز رہتے ہیں۔ امی چاہتی ہیں کہ ہم ان سے رابطہ کریں لیکن ان کا فون مسلسل بزی

جا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ خراب ہے۔" سجاد نے بہانہ بنایا۔

"ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی بے چاری عافیہ آنٹی گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ شوہر کا انتقال ہوگیا ہے اور بیٹے اپنا فیوچر بنانے کے چکر میں سالوں سے باہر ہیں۔ ماں کی انہیں بس اتنی پروا ہے کہ ماہ دو ماہ بعد اخراجات کے لیے ڈرافٹ بھیج دیتے ہیں۔ دو ڈھائی مہینے پہلے باہر کے مال کے چکر میں ان کے گھر ڈکیتی بھی ہو چکی ہے۔ ڈاکوؤں نے اپنے حسبِ منشا مال نہ ملنے پر عافیہ آنٹی کو زدوکوب بھی کیا تھا لیکن ان کے بیٹوں پر پھر بھی اثر نہیں ہوا کہ لوٹ کر واپس آجائیں یا ماں کو اپنے پاس بلالیں۔" فراز نے ایک سانس میں انہیں ساری تفصیل کہہ سنائی۔ اس تفصیل کو سن کر سجاد کو یقین ہوگیا کہ اکیلی خاتون کے فون نمبر کو اغوا کاروں نے استعمال کیا ہے۔

"صبح میں گھر جاؤں گا۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کا پیغام عافیہ آنٹی تک پہنچا دوں؟" فراز نے پوچھا۔

"تھینکس۔ میں جا رہا ہوں، راستے میں ان سے ملتا ہوا چلا جاؤں گا۔" سجاد نے اسے انکار کر دیا اور فریحہ کے ساتھ اسپتال کی مرکزی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار بھی اسے فراز کی یہاں موجودگی کی وجہ معلوم کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

"میری بچی سجاد! ہم کہاں سے اتنی بڑی رقم کا انتظام کریں گے؟" فریحہ جو ایڈریس معلوم ہونے پر ذرا سی پُرامید ہوئی تھی، ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ریلیکس میری جان...... میں ہوں نا۔ میں کروں گا سارا انتظام۔" سجاد نے اسے تسلی دی لیکن حقیقتاً وہ سخت متفکر تھا۔ اس کے اور فریحہ کے مشترکہ اکاؤنٹ میں چند لاکھ سے زیادہ رقم موجود نہیں تھی اور یہاں مرے پر سو دُرّے کے مصداق زیور اور کیش بھی چوری ہوگیا تھا۔ بہرحال اس کے پاس امید کا ایک در کھلا تھا جس پر دستک دینے کے لیے وہ فریحہ کو اسپتال میں چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

"پچاس لاکھ؟" اس کے سامنے بیٹھی خوب صورت عورت نے حیرت سے پوچھا۔ وہ تقریباً سجاد کی ہم عمر تھی۔

"تمہارے لیے یہ اتنی زیادہ بڑی رقم تو نہیں ہے سونیا جو تم اس طرح حیران ہو رہی ہو۔" سجاد نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جتایا۔

"وہ الگ بات ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تمہیں اچانک اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔" سجاد نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"تمہارے اندر یہی تو خامی ہے کہ تم نے کبھی مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ شادی جیسا اہم فیصلہ تک تم نے میری لاعلمی میں کر ڈالا تھا اور اب بھی جانے مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟" سونیا نے اس سے شکوہ کیا۔

"اب اتنا وقت گزر جانے کے بعد ایسی باتیں کرنے کا کیا فائدہ سونیا۔ جب میری شادی ہوئی تو تم ملک سے باہر تھیں اور تم جانتی ہو کہ میں کبھی بھی تم میں انٹرسٹڈ نہیں رہا تھا۔" سجاد نے بیزاری سے اس کی بات کا جواب دیا۔ خوب صورت اور دولت مند سونیا اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔ اس کی سجاد میں دلچسپی بہت واضح تھی لیکن سجاد ان لڑکوں میں سے نہیں تھا جو دولت اور حسن پر ریجھ جاتے ہیں۔ اسے اندازہ تھا کہ سونیا حاکمانہ مزاج کی لڑکی ہے جس سے شادی کی صورت میں اسے اس کا محکوم بن کر رہنا پڑے گا۔ سجاد کی عزتِ نفس کو یہ گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے کبھی سونیا کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ بعد میں جب اس کی فریحہ سے شادی ہوئی تو وہ اس کی اچھی فطرت کی وجہ سے اس کا گرویدہ ہوگیا اور یوں وہ دکھ سکھ کے ساتھی بنے ایک دوسرے کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارنے لگے۔ لیکن اب اس پُرسکون زندگی میں ہل چل مچ گئی تھی۔ سونیا سے اب بھی اس کی کبھی کبھار ملاقات یا ٹیلی فونک گفتگو ہو جاتی تھی۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اور اپنے پاپا کا بزنس سنبھال رہی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آج بھی سجاد سے محبت کرتی ہے لیکن سجاد اپنی ساری محبت فریحہ کے لیے وقف کر چکا تھا۔

"میں بزنس ویمن ہوں سجاد...... اور مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ کس بات کو کرنے کے لیے کون سا وقت مناسب ہوتا ہے۔" سونیا عجیب سے انداز میں مسکرائی اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تم پچاس لاکھ کا مطالبہ لے کر میرے سامنے اس وقت بیٹھے ہو اور تمہاری شکل سے ہی لگتا ہے کہ تمہیں رقم کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اتنی بڑی رقم تمہیں کس وجہ سے دے دوں؟ ایک بزنس ویمن کی حیثیت سے اتنی بڑی انویسٹ منٹ کرتے ہوئے مجھے اپنے پرافٹ کا بھی تو خیال رکھنا ہوگا۔ دنیا میں کہیں بھی غیر مشروط قرض دینے کا رواج نہیں ہے۔" اس کے چہرے پر مکاری تھی۔

"رقم دینے کے لیے تمہاری کیا شرط ہے؟" سجاد نے

بے بسی سے پوچھا۔

’’میں یہ رقم بغیر واپسی کے تقاضے کے ہمیشہ کے لیے تمہیں دے سکتی ہوں لیکن تمہیں بھی میری خواہش پوری کرنی ہوگی۔‘‘ سونیا کا لہجہ پُراسرار ہوگیا۔

’’کیسی خواہش؟‘‘ الفاظ سجاد کے حلق میں پھنسنے لگے۔

’’تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔‘‘ سونیا نے دھما کا کیا۔

’’یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو؟‘‘ اس کا مطالبہ سن کر سجاد بدک گیا۔

’’ہوش میں ہوں یا نہیں لیکن یہ جانتی ہوں کہ اس پوزیشن میں ہوں کہ تم سے ایسا مطالبہ کرسکوں۔ میں تم سے بہت اچھی طرح واقف ہوں سجاد اور مجھے معلوم ہے کہ تم کسی معمولی وجہ سے میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر نہیں آسکتے..... تو میں اس موقع کا فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ یہ ڈیل مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے سکتی ہے۔‘‘ اس کا لہجہ جذباتی ہوگیا۔

’’تم بے وقوف ہو سونیا۔ اس طرح سودے بازی اور زبردستی سے کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔‘‘ سجاد نے ترشی سے اسے سمجھایا۔

’’یہ میرا مسئلہ ہے۔ ایک بار تمہارا نام میرے نام کے ساتھ جڑ گیا اور تم میرے ہوگئے تو میں تم پر اتنی شدت سے اپنی محبت کو نچھاور کروں گی کہ تمہارے پاس مجھ سے محبت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔‘‘ وہ جیسے اس وقت کے خیال سے ہی مدہوش ہوئی جارہی تھی۔ سجاد کو اندازہ ہوگیا کہ وہ اس جنونی عورت کو کچھ نہیں سمجھا سکتا چنانچہ چپکے سے اٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اب اسے سوچنا تھا کہ کیا وہ یہ ڈیل کرسکتا ہے؟ ہر باپ کی طرح اسے بھی اپنی بیٹی جان سے پیاری تھی لیکن وہ فریحہ سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ اسے چھوڑنے کا فیصلہ اتنی آسانی سے کیسے کر سکتا تھا اور جیسی سونیا کی فطرت تھی، وہ تو بعد میں بھی اسے اس کی بیٹی سے نہ ملنے دیتی۔ یہ ڈیل اس کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوتی۔ پریشان حال سا گاڑی چلاتا وہ کیسے اپنے گھر تک پہنچ گیا، اسے اندازہ بھی نہ ہوا۔

’’کیا میں پولیس کو رپورٹ کردوں؟‘‘ نڈھال سی حالت میں صوفے پر ڈھتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا۔

’’نہیں، میرے اس عمل سے رمشا کو نقصان ہوسکتا ہے۔ مجرم کسی نہ کسی طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے کہ کہیں میں پولیس سے رابطہ نہ کرلوں۔ اشتعال میں آکر وہ رمشا کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔‘‘ فوراً ہی اس کے دل نے نفی میں جواب دیا۔ اغوا کاروں کی طرف سے پہلی کال آئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور انہوں نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ یہ بات بھی اس کے اعصاب کے لیے بہت بڑا امتحان ثابت ہورہی تھی۔

’’کیا میں سونیا کا مطالبہ مان سکتا ہوں؟‘‘ اس نے خود سے دوسرا سوال کیا۔

’’اس کے علاوہ میرے پاس کوئی حل بھی تو نہیں ہے لیکن..... لیکن میں فریحہ کو کیسے اپنی زندگی سے بے دخل کر سکتا ہوں؟ وہ کتنی خیال رکھنے والی، وفا شعار اور محنتی عورت ہے۔ اس کی سلیقہ مندی اور محنت کے سہارے ہی میں اس لائق ہوا کہ یہ گھر بنا سکوں۔ یہ گھر جس کے ایک ایک کونے کو فریحہ نے بہت محبت سے سجایا ہے۔ کیا میں اسے اس گھر سے بے دخل کرسکتا ہوں؟ مجھے تو ایسا کوئی حق ہی نہیں ہے۔‘‘ دل و دماغ سونیا کا مطالبہ ماننے سے انکاری تھے۔ یک دم ہی اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔

’’گھر..... میں یہ گھر بیچ کر بھی تو رقم حاصل کرسکتا ہوں۔‘‘ انہوں نے جب یہ گھر خریدا تھا تو اس کی قیمت پینتیس لاکھ روپے تھی۔ گھر کی خریداری میں پرانے گھر کو فروخت کرنے سے حاصل ہونے والی رقم کے ساتھ، ان کی بچت، فریحہ کی سونے کی چوڑیاں اور امی کا ایک قیمتی گلوبند سیٹ بھی کام آگیا تھا۔ لیکن تیزی سے بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے اب ان کے مکان کی ویلیو تقریباً ڈبل تھی۔ سجاد کی معلومات کے مطابق اس علاقے کے ان جیسے سنگل اسٹوری گھر پینسٹھ سے ستر لاکھ کے درمیان فروخت ہورہے تھے لیکن ظاہر ہے وہ ایمرجنسی میں گھر بیچنے کی کوشش کرتا تو مارکیٹ ویلیو سے کم پر بیچنا پڑتا۔ اغوا کاروں نے اسے کوئی ٹائم فریم نہیں دیا تھا لیکن وہ رقم کے انتظام میں تساہل سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ رمشا سے جدائی کا ایک ایک لمحہ اس پر بھاری گزر رہا تھا۔

’’میں سلمان سے بات کرتا ہوں۔‘‘ فیصلہ ہوگیا تو وہ فوراً ہی ایک نئے عزم سے عمل کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلمان اسٹیٹ کا کاروبار کرتا تھا اور اسے امید تھی کہ پڑوسی ہونے کے ناتے وہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر قیمت میں اس کا مکان خرید سکتا ہے۔ وہ اسی وقت اٹھ کر سلمان کے گھر پہنچ گیا۔

’’آیئے سجاد بھائی! خیریت ہے؟ آنٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟‘‘ سلمان نے ایک اچھے پڑوسی کی طرح اسے اپنے گھر میں گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔

’’امی ٹھیک ہیں۔ فریحہ ہے ان کے پاس۔‘‘ سجاد نے کھوئے کھوئے سے انداز میں بتایا۔

’’اور رمشا کہاں ہے؟ کیا اسے گھر پر سوتا ہوا چھوڑ کر آئے ہیں؟‘‘ سلمان کے سوال نے سجاد کے دل پر گھونسا سا مارا۔

’’اسے فریحہ نے اپنی بہن کے گھر چھوڑ دیا ہے۔ وہ وہاں اپنے کزنز کے ساتھ آرام سے ہے۔‘‘ یہ جواب دیتے ہوئے سجاد کا دل طرح طرح کے وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ رمشا کس حال میں تھی؟ اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ پہلی کال کے بعد اغوا کاروں نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ البتہ وہ خود اپنی بچی کے بدلے میں ہر ممکنہ قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔

’’یہ آپ نے اچھا کیا۔ امی کے کہنے پر ایک گھنٹا پہلے میں آپ کے گھر گیا تھا کہ آپ لوگوں سے کھانے وغیرہ کا پوچھ لوں لیکن کال بیل کا کوئی رسپانس نہیں ملا۔ شاید آپ لوگ گھر پر نہیں تھے۔‘‘ سلمان نے بتایا۔ اسی وقت اس کی والدہ چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئیں۔

سجاد نے انہیں سلام کیا اور پھر بولا۔ ’’اس تکلف کی کیا ضرورت تھی آنٹی۔ خوامخواہ آپ نے اتنی رات کو زحمت کی۔‘‘

’’زحمت کیسی؟ میں سلمان کے ابو کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے تمہیں آتا دیکھا تو ایک کپ تمہارے لیے بھی بنالی۔ باقی دوسری چیزیں تو ریڈی میڈ ہیں۔‘‘ انہوں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا اور اصرار کر کے اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگیں لیکن سجاد نے ایک پیالی چائے کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔

’’اتنے پریشان مت ہو بیٹا! ہماری عمر کے لوگوں کے ساتھ چھوٹے موٹے مسائل چلتے رہتے ہیں۔ صفیہ بہن انشاء اللہ جلد صحت یاب ہوجائیں گی۔‘‘ اس کی پریشان صورت دیکھ کر انہوں نے نہایت خلوص سے تسلی دی۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر چلی گئیں۔

’’میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں سلمان۔‘‘ ان کے جانے کے بعد سجاد نے اپنے لب کھولے۔

’’حکم کریں سجاد بھائی۔‘‘ سلمان نے تابع دارانہ انداز میں کہا۔

’’میں اپنا گھر فوری طور پر سیل کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

’’وہ کیوں؟ کیا کسی اور جگہ گھر پسند آگیا ہے؟‘‘ سلمان نے حیرت کا اظہار کیا۔

’’نہیں، بس کوئی اور مسئلہ ہے۔ تم بتاؤ کہ میرا یہ کام کردو گے؟‘‘ سجاد نے اسے کوئی واضح جواب دیے بغیر پوچھا۔

’’میرا تو کام ہی یہی ہے لیکن آپ بتائیں کہ ڈیڑھ دو مہینے کی مہلت تو دیں گے نا؟ صحیح کسٹمر لگنے میں اتنا وقت تو لگ ہی جائے گا۔‘‘

’’نہیں، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ مجھے ایک دو دن کے اندر ہی گھر بیچنا ہے۔‘‘ سجاد نے جواب دیا۔

’’اتنی جلدی؟ اتنی جلدی کوئی کسٹمر اول تو ملے گا نہیں۔ مل بھی گیا تو آپ کے مکان کی اصل قیمت سے بہت کم رقم ملے گی۔‘‘ سلمان نے اس پر حقیقت واضح کی۔

’’مجھے معلوم ہے پھر بھی میں اتنی ہی جلدی مکان بیچنا چاہتا ہوں۔‘‘ سجاد کا لہجہ اٹل تھا۔

’’مسئلہ کیا ہے؟ آپ مجھے بتائیں تو سہی۔‘‘

’’کہا نا یار! نہیں بتا سکتا۔ تم مکان بکوانے کے سلسلے میں میری کوئی مدد کرسکتے ہو تو بتاؤ۔‘‘ سجاد نے قدرے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

’’ٹھیک ہے۔ میرے پاس آپ کے لیے ایک آفر ہے۔ میں پینتیس لاکھ فوری کیش پر آپ کا مکان خرید سکتا ہوں۔‘‘ سلمان نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

’’پینتیس لاکھ ..... صرف پینتیس لاکھ۔ اس مکان کی موجودہ ویلیو تو ساٹھ سے پینسٹھ لاکھ تک ہوگی۔‘‘ سجاد حیران ہوا۔

’’آپ غلط نہیں کہہ رہے لیکن آپ جتنی جلدی یہ سودا چاہتے ہیں، میں آپ کو اتنی ہی آفر کرسکتا ہوں۔‘‘ سلمان اب ایک خالص کاروباری آدمی تھا۔

’’اچھا میں سوچوں گا۔‘‘ سجاد قدرے مایوسی سے کھڑا ہوگیا۔ گھر آکر وہ حساب کتاب کرنے لگا۔ اغوا کاروں نے پچاس لاکھ کا مطالبہ کیا تھا۔ سلمان مکان کے پینتیس لاکھ دیتا تو پندرہ لاکھ پھر بھی باقی رہتے۔ اس کے اکاؤنٹ میں تقریباً پانچ لاکھ پڑے تھے۔ وہ ملاتا تو چالیس لاکھ بنتے۔

اس کی گاڑی بہت اچھی حالت میں تھی لیکن وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ ان حالات میں دو ڈھائی لاکھ بھی مل جائیں تو

بڑی بات ہوگی۔ یعنی کھینچ تان کر بھی وہ صرف چالیس بیالیس لاکھ کا انتظام کرسکتا تھا۔

”صبح دوسرے اسٹیٹ ایجنٹس سے رابطہ کروں گا۔“ اس نے فیصلہ کیا۔ اسے امید تھی کہ شاید کوئی اسے سلمان سے بہتر آفر دے دے۔ اغوا کار بھی ایک بار کے بعد دوبارہ رابطہ کرنا بھول گئے تھے ورنہ وہ تاوان کی رقم میں کچھ کمی کروانے کی ہی کوشش کرتا۔ دوسری طرف اسے خاندان یا دوستوں میں سے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا تھا جس سے وہ آٹھ دس لاکھ کی رقم ادھار مانگ سکے۔ بالفرض کوئی دے بھی دیتا تو وہ اتنا بڑا قرض ادا کیسے کرتا؟ اتنی رقم جمع کرنے کے لیے انہیں اچھا خاصا عرصہ درکار ہوتا اور ظاہر ہے کوئی بھی طویل مدت کے لیے اتنی بڑی رقم قرض نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی وہ ساری رات بے قراری میں گزری۔ فریحہ کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں میاں بیوی وقفے وقفے سے ایک دوسرے کو فون کرتے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ آیا اغوا کاروں کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا ہے یا نہیں۔

سجاد نے فریحہ کو گھر بیچنے کے فیصلے اور سلمان کی پیشکش کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا تھا۔ فریحہ نے اس گھر کو بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا لیکن اولاد سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا اس لیے وہ اس فیصلے سے متفق تھی۔ البتہ سلمان کی موقع پرستی پر اسے دکھ ہوا تھا۔ اس قیامت خیز رات کا اختتام سجاد کے فون کی گھنٹی بجنے سے ہوا۔

☆☆☆

خاکی رنگ کی پینٹ شرٹ میں ملبوس سرمد ہاتھ میں ایک تھیلا لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ صبح کی ہوا میں اس کے گھنگرالے بال ہوا سے لہرا رہے تھے البتہ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کوئی ناپسندیدہ کام کرنے جا رہا ہو۔ اصل میں تو اس وقت وہ اپنے محکمے کی طرف سے ڈیوٹی پر تھا اور اسے ٹیلی فون کی خرابی کے سلسلے میں ملنے والی مختلف شکایات کو دور کرنا تھا لیکن ساتھ ہی ایک ڈیوٹی اور بھی تھی جو وہ اس ڈیوٹی کی آڑ میں انجام دیتا۔ اس نے جیب میں سے پرچہ نکال کر وہ ایڈریس دیکھے جہاں سے ٹیلی فون کی خرابی کے سلسلے میں شکایات درج کروائی گئی تھیں۔ پھر ایک گلی میں داخل ہو کر تیسرے مکان پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں ایک نوعمر لڑکا باہر نکلا۔

”تم نے ٹیلی فون کی خرابی کی کمپلین کروائی تھی؟“ لڑکے کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے بیزاری سے دریافت کیا۔

”جی۔“

”جلدی سے ایک سیڑھی کا بندوبست کرو، میں تمہاری لائن ٹھیک کرتا ہوں۔“ سرمد نے نادرشاہی حکم جاری کیا۔

”لیکن یہ تو آپ کے محکمے کی ذمے داری ہے۔“ لڑکے نے اعتراض کیا۔

”فون ٹھیک کروانا ہے تو سیڑھی لے آؤ۔ میں دس منٹ تک کونے والے ہوٹل میں بیٹھا ہوں پھر چلا جاؤں گا۔“ سرمد آخر کو گورنمنٹ کا ملازم تھا، کسی ذمے داری کو کیسے قبول کرتا۔ اکڑ کر جواب دیا اور پھر اکڑتا ہوا ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد جب وہ دودھ پتی پی کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ لڑکا سیڑھی کا انتظام ہوجانے کی اطلاع لے کر ہوٹل میں آپہنچا۔

سرمد سستی چھوڑ کر حرکت میں آگیا۔ پہلے اس نے بڑی ایمان داری سے فون کی خرابی کا مسئلہ حل کیا۔ کام کے دوران اس کے گلے میں ایک پرانی وضع کا ٹیلی فون سیٹ لٹک رہا تھا جس کے ذریعے پہلے تو اس نے کال کر کے یہ کنفرم کیا کہ آیا وہ جس گھر کا فون ٹھیک کرنے آیا ہے، وہ ٹھیک ہوگیا ہے یا نہیں۔۔۔۔ اس کے بعد ذہن نشین کیا ہوا سجاد کا نمبر ملایا۔ سجاد نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کرلی جس سے اس کی بے قراری کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”رقم کا بندوبست ہوگیا یا نہیں؟“ سرمد نے آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ پہلے بھی اسی طریقے سے اس نے سجاد کو کال کی تھی۔ وہ علاقے کا لائن مین تھا اس لیے اس کے لیے کسی بھی نمبر کو اپنی مرضی سے استعمال کر لینا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ یہ بہت سادہ طریقہ تھا جس کے لیے انہیں کسی سائنسی تکنیک کے استعمال یا بہت زیادہ جھنجٹ میں نہیں پڑنا پڑا تھا۔ اس کام کے لیے اس کا انتخاب بھی شاید اسی وجہ سے کیا گیا تھا۔

”میں کوشش کر رہا ہوں لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے۔ میں شاید پچاس لاکھ جمع کرنے میں کامیاب نہ ہوسکوں۔ تم لوگ تاوان کی رقم میں کچھ کمی کرلو۔“ سجاد جو بے چینی سے اغوا کاروں کی طرف سے فون کا انتظار کر رہا تھا، جلدی جلدی بولنا شروع ہوگیا۔

”لگتا ہے تمہیں اپنی بیٹی سے پیار نہیں ہے۔“ سرمد نے جان بوجھ کر لہجے کو خوفناک بنایا البتہ آواز دھیمی تھی۔

”کس باپ کو اپنی اولاد پیاری نہیں ہوتی؟ میں بھی اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا رہا ہوں۔ گھر، گاڑی اور

بینک بیلنس سب اس پر نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن سب ملا کر بھی تمہارے مطالبے کے مطابق رقم پوری نہیں ہو پا رہی اس لیے تم سے درخواست کر رہا ہوں کہ تاوان کی رقم میں تھوڑی کمی کرلو۔“ سجاد نے گویا بلبلا کر اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کے لہجے کی بے بسی پر سرمد کا دل پسیجنے لگا لیکن وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے بجھے دل کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا اور بوجھل قدموں سے وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے پاس موجود پرچے میں ابھی بہت سی کمپلینز درج تھیں لیکن اس کا کوئی بھی کام کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”کیا رہا؟“ وہ گھر واپس پہنچا تو عاقل نے اس سے دریافت کیا۔

”بات ہوگئی ہے۔“ سرمد نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

”بے چارہ سچ کہہ رہا ہوگا کہ پچاس لاکھ نہیں دے سکتا۔ ہم تو اس کے گھر سے اس کی بیوی کا زیور بھی سمیٹ لائے ہیں۔“ عاقل کو بھی افسوس ہوا۔ دونوں بہت دیر چپ بیٹھے رہے۔ رمشا اٹھی تو اسے ضروریات سے فارغ کروا کر ناشتا کروایا گیا۔ وہ اچھی خاصی خوف زدہ تھی اور عاقل کے ذرا سا ڈانٹ کر بولنے پر ہی اتنی سہم گئی تھی کہ اس کی ہدایت کے مطابق ذرا بھی آواز نہیں نکالی تھی۔ البتہ اس نے ناشتا بھی زیادہ رغبت سے نہیں کیا تھا۔ اس کے تعاون کی وجہ سے عاقل اور سرمد نے اسے دوبارہ باندھنا ضروری نہیں سمجھا اور اس کا دل بہلانے کے لیے ٹی وی پر کارٹون لگا کر دے دیے۔

”اسے اتنے عیش میں رکھو گے تو اس کا باپ خاک تاوان کی رقم دے گا؟“ اقبال آیا تو کمرے کا منظر دیکھ کر سیخ پا ہونے لگا۔ رمشا کے ہاتھ میں چپس کا ایک پیکٹ تھا اور وہ کارٹون دیکھ رہی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے باس۔ کون سا اس کا باپ اسے دیکھ رہا ہے۔“ عاقل نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن اب دیکھے گا۔“ اقبال یک دم رمشا پر جھپٹا اور اس کے پھول سے گالوں پر تین چار کرارے کرارے تھپڑ لگائے۔ اس عمل کو انجام دیتے ہوئے اس نے رمشا کا منہ ایک ہاتھ سے دبوچ لیا تھا اس لیے وہ آواز نہیں نکال سکی تھی، البتہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

”اگر چیخی چلائیں تو گلا دبا کر مار دوں گا۔“ اقبال خوفناک لہجے میں بولا اور جب یقین ہوگیا کہ بچی شور نہیں مچائے گی، تب اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا۔

”اپنے ممی پاپا سے بولو کہ۔۔۔“ اقبال رمشا کو بتانے لگا کہ اسے کیا بولنا ہے اور جب وہ اس کی ہدایت کے مطابق بولنا شروع ہوئی تو وہ ہینڈی کیم کی مدد سے اس کی ویڈیو بنانے لگا۔

☆☆☆

اغوا کاروں نے سجاد کو کوئی جواب نہیں دیا تھا اور وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی درخواست پر تاوان کی رقم کم کرنے پر تیار ہوں گے یا نہیں۔ البتہ وہ اپنی سی پوری جدوجہد کر رہا تھا کہ رقم جمع ہوجائے۔ بلیک کافی کی ایک تلخ پیالی پینے کے بعد وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے ایک کار ڈیلر سے ملاقات کر کے اپنی گاڑی فروخت کرنے کی بات کی۔ ڈیلر اچھا آدمی تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ گاڑی کی ممکنہ اچھی قیمت دلوا دے گا۔ اس سے فارغ ہو کر سجاد نے اسٹیٹ ایجنسیوں کے چکر لگانا شروع کر دیے اور چکرا کر رہ گیا۔

سب کے سب موقع پرست اور لٹیرے تھے۔ فوری کیش پر خریدنے کے لیے تیار ہونے والوں میں سے کسی نے بھی سلمان سے اچھی پیشکش نہیں دی۔ ہاں، کچھ لوگ تھے جو اسے پچاس لاکھ سے اوپر رقم ادا کرنے کے لیے تیار تھے لیکن وہ فوری پےمنٹ نہیں کرسکتے تھے۔ ایک نے پانچ دن اور دوسرے نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی تھی۔ باقیوں نے کوئی اچھی پارٹی مل جانے پر مارکیٹ ریٹ کے مطابق سودا کروانے کی پیشکش کی تھی لیکن سجاد کے لیے تو رمشا سے دوری کا ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ اس کا بس چلتا تو اپنی بیٹی کو چند منٹ بھی ان ظالموں کی تحویل میں نہ رہنے دیتا۔ کئی گھنٹے خوار ہونے کے بعد وہ گھر واپس آگیا۔ آتے ہوئے وہ بینک سے اپنی جمع پونجی بھی نکال لایا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا اکاؤنٹ بینک کی ایسی برانچ میں تھا جو مین مارکیٹ میں ہونے کی وجہ سے ہفتے کے دن بھی کھلی رہتی تھی۔ گھر پہنچتے ہی فریحہ نے امید بھری نظروں سے اس کا استقبال کیا۔

”یہ رقم سنبھال کر رکھ دو، میں امی سے ملتا ہوں۔“ وہ صفیہ خاتون کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فریحہ پہلے ہی اسے فون پر اطلاع دے چکی تھی کہ امی کی چھٹی ہوگئی ہے اور وہ انہیں گھر لا رہی ہے۔ ماں سے گلے لگ کر ملتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔

”پاگل ہوئے ہو کیا سجاد جو یوں بچوں کی طرح رو رہے ہو۔ دیکھو میں بالکل بھلی چنگی تمہارے سامنے بیٹھی

ہوں لیکن تم میاں بیوی نے ایسے شکلیں لٹکائی ہوئی ہیں جیسے میرا بالکل آخری وقت آ گیا ہو۔ اگر آ بھی گیا ہو تو کیا غم ہے۔ میں اپنے حصے کی ساری خوشیاں دیکھ چکی ہوں اس لیے اب اس دنیا کو چھوڑنے پر کوئی دکھ نہیں ہوگا۔'' وہ نرم گرم لہجے میں سمجھانے لگیں۔ اصل معاملے کی تو انہیں خبر نہیں تھی۔ سجاد کی ہدایت پر فریحہ نے انہیں یہی بتایا تھا کہ رمشا اپنی خالہ کے گھر ہے۔

''آپ کے ہونے کے خیال سے ہی دل کو ڈھارس ملتی ہے امی۔ بس آپ ہمارے لیے دعا کرتی رہیں۔'' سجاد نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میری تو ساری دعائیں ہیں ہی تم تینوں کے لیے۔ جاؤ جا کر رمشا کو لے آؤ۔ اس کی چہکار گھر میں گونجے گی تو ساری اداسی ختم ہو جائے گی۔'' بیٹے کے بال سنوارتے ہوئے انہوں نے بڑی محبت سے حکم دیا۔

''آج رہنے دیں امی۔ اتنے دنوں بعد وہاں گئی ہے۔ بچوں کے ساتھ خوش ہوگی۔ میں واپس لے کر آیا تو اداس ہو جائے گی۔'' اس نے بہانہ بنایا، اسی وقت کال بیل کی آواز گونجی۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گیا تو وہاں کوریئر سروس والا کھڑا تھا۔ اجنبی نام اور پتے سے اس کے نام پر ایک پارسل بھیجا گیا تھا۔ اس نے قدرے الجھن کے ساتھ پارسل وصول کرلیا۔

''کون تھا سجاد؟'' فریحہ جو اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی، پوچھنے لگی۔

''دفتر کے ایک ساتھی نے اپنا ایک پارسل میرے ایڈریس پر منگوایا تھا، وہی آیا ہے۔'' سجاد کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ فریحہ کو اس پارسل سے الگ رکھے۔

''اچھا، آپ یہ بتائیں کہ اتنے گھنٹوں سے باہر تھے، کیا بات بنی؟'' فریحہ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس کا ذہن تو مسلسل اپنے مسئلے میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

''نہیں، لگتا ہے سلمان سے ہی دوبارہ بات کرنی ہو گی۔'' اس نے جواب دیا تو فریحہ کا چہرہ مزید اتر گیا۔

''ہمت کرو، انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ جاؤ جا کر امی کو دیکھو، انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔'' اسے پارسل میں موجود شے کے بارے میں جاننے کا تجسس تھا اس لیے فریحہ کو منظر سے ہٹایا اور خود بیڈ روم میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ چند منٹ بعد وہ اپنے ٹی وی کی اسکرین کا منظر دیکھ رہا تھا، اس نے اس کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔

''پاپا! مجھے یہاں سے لے جائیں۔ یہ لوگ مجھے مارتے ہیں۔ کھانا بھی نہیں دیتے۔ مجھے آپ کے اور ممی کے پاس آنا ہے۔'' روتے ہوئے وہ بڑی بے بسی سے التجا کر رہی تھی۔ اس کے پھول سے رخساروں پر ثبت انگلیوں کے سرخ سرخ نشانوں کا خاص طور پر کلوز اپ لیا گیا تھا جس نے سجاد کے دل کو مزید تڑپا دیا تھا۔ پارسل میں ایک مختصر نوٹ بھی موجود تھا جس میں لکھا تھا۔

''اگر اپنی بچی کو اس سے بُرے حال میں نہیں دیکھنا چاہتے تو جلد از جلد رقم کا انتظام کرلو۔''

سجاد تو بغیر کسی ہدایت کے ہی اس جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ اب بھی اٹھ کر فوراً سلمان سے ملنے چلا گیا۔ وہ گھر کے بجائے اپنی ایجنسی پر ملا۔

''آئیے آئیے سجاد بھائی! پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟ میری آفر ایکسپٹ کر رہے ہیں یا نہیں؟'' گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے سلمان نے پوچھا۔

''کیسے ایکسپٹ کروں؟ تم نے آفر ہی اتنی کم دی ہے۔'' سجاد نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ مہینا دو مہینا انتظار کرلیں، میرا وعدہ ہے کہ اپنی آفر سے ڈبل قیمت دلواؤں گا آپ کو.... لیکن میں خود اس سے زیادہ کی آفر نہیں کر سکتا۔'' وہ پھر کاروباری بندہ بن گیا۔

''کچھ تو بڑھاؤ سلمان۔'' سجاد نے جیسے التجا کی۔

''میں نے غلط قیمت نہیں لگائی ہے۔ آپ دوسروں سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر ایک میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم سے کم قیمت ہی لگائے گا لیکن تم سے تو میں ایسی امید نہیں رکھ سکتا۔ کچھ پڑوسی ہونے کا ہی خیال کرو یار۔'' وہ ایک مجبور باپ تھا جو اپنی اولاد کی سلامتی کے لیے شاید بھیک بھی مانگنے پر تیار ہو جاتا۔

''ٹھیک ہے۔ اب آپ نے ایسی بات کہہ دی ہے تو مجھے اپنی آفر بڑھانی پڑے گی۔ ایسا کریں کہ آپ مجھ سے سینتیس لے لیں، بس یہ لاسٹ آفر ہے ورنہ آپ مارکیٹ میں کہیں بھی اپنا مکان فروخت کرنے کے لیے آزاد ہیں۔'' جیسے گھوڑا گھاس سے دوستی نہیں کرتا، بالکل اسی طرح سلمان اپنے کاروباری مفادات کو پڑوس کی دوستی پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ناچار سجاد کو اس سے سینتیس لاکھ پر سودا کرنا پڑا۔ یہ رقم سلمان نے ایک گھنٹے بعد اسے گھر پر پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ کار ڈیلر کے پاس گیا۔ اس نے اسے ڈھائی لاکھ ادا کیے۔ یہ رقم لے کر وہ گھر

واپس آیا اور اسے بھی فریحہ کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی سلمان سے ہونے والی ڈیل کے بارے میں بھی اطلاع دی۔

''سینتیس اور ڈھائی ملا کر بنے ساڑھے انتالیس لاکھ۔ پانچ ہماری جمع پونجی ہے۔ اس کو ملا کر یہ کل ہوئے ساڑھے چوالیس لاکھ۔ ساڑھے چھ لاکھ تو اب بھی باقی ہیں۔'' سارا حساب لگا کر وہ ذرا مایوسی سے بولی۔

''جہاں اتنے ہوئے ہیں، باقی بھی ہو جائیں گے۔'' سجاد نے اسے تسلی دی اور ایک بار پھر تنہائی میں جا کر سونیا سے رابطہ کرنے لگا۔

''ہیلو سویٹ ہارٹ.... پچاس لاکھ تیار ہیں، تم طلاق کے کاغذات تیار کروالو تو مجھ سے لے جانا۔'' اس کی آواز سنتے ہی سونیا نے لہک کر کہا۔

''سونیا! کیا تم مجھے صرف ساڑھے چھ لاکھ دے سکتی ہو؟'' خود پر بے حد ضبط کرتے ہوئے اس نے سونیا سے پوچھا۔

''کم آن ڈارلنگ! اپنی اتنی کم قیمت تو مت لگاؤ۔'' وہ بہکے ہوئے لہجے میں بولی۔ شاید اس نے پی ہوئی تھی۔

''میں تم سے یہ رقم ادھار مانگ رہا ہوں سونیا۔ جلد ایک ایک پائی ادا کر دوں گا۔'' دانت بھینچتے ہوئے اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ بیٹی کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ایسی بے ہودہ عورت سے بات کرنا گوارا نہ کرتا۔

''ایک روپیا مانگو یا ایک کروڑ۔ شرط صرف اور صرف ایک ہے مسٹر سجاد۔ تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دے کر میرا بننا ہوگا۔ اگر میرے نہیں بن سکتے تو چلو اتنا کرو اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ کم سے کم اتنا اطمینان تو رہے گا کہ تم میرے نہیں ہو تو کسی اور کے بھی نہیں ہو۔'' نشے میں ڈوبی، وہ بولتی چلی گئی۔ سجاد کو اندازہ ہو گیا کہ اس سے بات کرنا بیکار ہی ہو گا۔ اب اس کی آخری امید یہی تھی کہ اغوا کار اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے تاوان کی رقم میں کمی کر دیں۔

اس کی یہ امید رائگاں نہیں گئی۔ اسی روز رات تک اغوا کاروں کی دو کالز مزید آئیں جن میں انہوں نے اتنی رعایت کر دی کہ سجاد پچاس کے بجائے پینتالیس لاکھ ادا کر دے۔ تاوان کی رقم طے ہونے کے بعد ادائیگی کا طریقہ کار طے کیا جانے لگا۔

''تم تو اب بے کار ہو گئے ہو اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ رقم اور بچی کا تبادلہ اس کے ٹیوٹر کے ذریعے کیا جائے۔ تم اسے رقم دے کر گیارہ بجے روانہ کر دینا۔ ہم خود اس کے موبائل پر اس سے رابطہ کر کے بتا دیں گے کہ اسے کہاں پہنچنا ہے۔'' فون کرنے والے کے الفاظ نے سجاد کو احساس دلایا کہ اغوا کار نہ صرف اس کے بارے میں ہر خبر رکھتے ہیں بلکہ اس پر نظر بھی رکھے ہوئے ہیں جب ہی تو انہیں معلوم ہے کہ وہ اپنی کار سے محروم ہو چکا ہے۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اس نے شروع سے اس معاملے میں پولیس کو ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ رمشا کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔'' اسے امید تھی کہ فراز جیسا نفیس لڑکا اس کی مدد کے لیے تیار ہو جائے گا۔ ایک گھنٹے بعد اس کی کال پر فراز وہاں آیا اور اس کی زبانی حالات جان کر حسبِ توقع فوراً ہی تیار ہو گیا۔

''تھینک یو فراز۔'' اس کے فوری رضامند ہو جانے پر سجاد نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''ایسا مت کہیں سر! میں تو خود اس خبر کو سن کر تڑپ اٹھا ہوں۔ رمشا اتنی پیاری بچی ہے، کیا میں اس کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟'' فراز نے بڑے خلوص سے کہا۔ پھر ٹھیک گیارہ بجے وہ رقم کا بیگ لیے سجاد کے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے کوئی خاص سمت یا جگہ نہیں بتائی گئی تھی۔ اس لیے موٹر سائیکل کو یونہی اِدھر اُدھر دوڑاتا رہا۔ آخرکار گیارہ بیس پر اس کے موبائل پر کال موصول ہوئی۔

''یونیورسٹی روڈ پر صفورا گوٹھ کی طرف جانے والے راستے پر آ جاؤ۔'' مختصر ہدایت دے کر کال منقطع کر دی گئی۔ فراز نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ سجاد کی طرف سے اسے کسی ایڈونچر سے سختی سے منع کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ صرف رقم اور بچی کے تبادلے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ پچیس منٹ بعد وہ صفورا گوٹھ جانے والے راستے پر پہنچا تو اسے ایک بار پھر موبائل پر موٹر سائیکل روک کر ایک طرف کھڑے ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ اس نے اس حکم پر بھی من و عن عمل کیا۔ یہ جگہ سنسان تھی اور رقم سے بھرا بیگ لے کر رات کے اس پہر وہاں کھڑا ہونا یقیناً دل گردے کا کام تھا لیکن فراز نے یہ کام سرانجام دے ڈالا۔ اسے دو تین منٹ سے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ اندھیرے میں بالکل اچانک ایک سیاہ رنگ کی گاڑی اس کے قریب آ کر رکی اور ایک شخص نے اتر کر پھرتی سے گن اس کے پہلو میں لگا دی۔

''رقم کا بیگ مجھے دے دو۔'' وہ دبے ہوئے لہجے میں غرایا۔

"بیٹی کہاں ہے؟" فراز نے پوچھا۔

"وہ رہی۔" اس آدمی نے اشارے سے پچھلے دروازے سے اترتی رمشا کی نشاندہی کی۔ رمشا نے فراز کو پہچان لیا اور دوڑ کر اس کے پاس آئی۔ فراز نے جلدی سے اسے اپنے بازو میں سمیٹ لیا۔ اسی وقت داڑھی مونچھ والے مسلح شخص نے اس کے ہاتھ سے بیگ چھینا اور بھاگ کر گاڑی میں سوار ہوگیا۔ سیکنڈوں میں گاڑی وہاں سے اڑن چھو ہوگئی۔ فراز نے روتی ہوئی رمشا کو پیار کیا اور تھوڑی سی کوشش سے اسے خاموش کروانے میں کامیاب ہونے کے بعد موٹر سائیکل پر اپنے سامنے بٹھا کر واپسی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔ روانگی سے قبل اس نے سجاد کو فون کر کے رمشا کی بازیابی کی اطلاع دے دی تھی بلکہ ان کی آپس میں بات بھی کروا دی تھی۔ چنانچہ وہ گھر پہنچا تو وہ لوگ دروازے پر ہی منتظر کھڑے ملے۔ دونوں میاں بیوی نے خوب بھینچ بھینچ کر رمشا کو پیار کیا اور ساتھ ساتھ روتے بھی رہے۔ ان لمحات میں پہلی بار صفیہ خاتون کو خبر ہوئی کہ ان کی پوتی اغوا ہوگئی تھی اور اب خیر سے گھر بھی آچکی ہے۔ انہوں نے پوتی کے ساتھ ساتھ فراز کی خوب بلائیں لیں۔ تقریباً دو بجے رات کو فراز ان کے گھر سے روانہ ہوا تو خود بھی خاصا مسرور تھا۔

☆☆☆

"میں تو گلہریاں دیکھنے پارک گئی تھی۔ سر نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں بہت ساری گلہریاں آتی ہیں پھر وہاں پر وہ داڑھی والے انکل مل گئے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے گھر میں بہت سارے بینٹس ہیں تو میں ان کے ساتھ بینٹس دیکھنے ان کے گھر چلی گئی۔" دوسرے دن کہیں جا کر رمشا خوف کے حصار سے نکلی تو اس نے ماں باپ کو اپنے اغوا کی داستان سنائی۔ اس داستان کو سن کر فریحہ چونک گئی پھر تنہائی ملنے پر اس نے سجاد سے بات کی۔

"سجاد! کہیں رمشا کے اغوا میں فراز کا تو ہاتھ نہیں ہے؟ بہت سی باتیں اس کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ رمشا کو اسی نے گلہریوں کا ذکر کر کے پارک جانے پر اکسایا تھا کیونکہ اسے علم ہے کہ رمشا جانوروں کی دیوانی ہے۔ رمشا کے اغوا والے روز وہ اپنی بہن کی منگنی کی مٹھائی لے کر آیا تھا جسے کھانے کے بعد امی خلافِ معمول دوپہر میں سو گئی تھیں۔ یقیناً اس مٹھائی میں نیند کی دوا شامل ہو۔ تیسرا اہم نکتہ یہ کہ ہمیں جتنی کالز موصول ہوئی ہیں، وہ اس علاقے کے فون سے ہی کی گئیں جہاں فراز رہتا ہے۔ اور پھر کتنی عجیب بات ہے کہ اغوا کاروں نے تاوان کی وصولی کے لیے آپ کے بجائے فراز کا انتخاب کیا۔ کیا اس لیے کہ وہ ان کا ہی ساتھی تھا؟" فریحہ کی بات میں وزن تھا۔ سجاد سوچ میں پڑ گیا۔ فراز ان کے گھر باقاعدگی سے آنے والا وہ شخص تھا جسے ان کے گھر کے حالات سے اچھی خاصی واقفیت تھی اس لیے اس کے لیے ایسی کوئی کارروائی کرنا آسان تھا۔

"تمہاری بات میں وزن تو ہے لیکن فراز اتنے نفیس اطوار کا لڑکا ہے کہ میرا دل ماننے کے لیے راضی نہیں ہوتا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتا ہے۔" سجاد قدرے تذبذب کا شکار تھا۔

"آج کل اچھے خاصے نوجوان مسائل کے حل کے لیے شارٹ کٹ ڈھونڈنے لگے ہیں۔ فراز کے گھر میں بھی کئی مسائل ہیں۔ وہ جاب لیس ہے۔ اسے اپنی بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں، خود زندگی میں سیٹ ہونا ہے تو کیا وہ ان سارے مسائل کے حل کے لیے ایسا راستہ نہیں ڈھونڈ سکتا؟" فریحہ کی اس دلیل نے سجاد کو قائل کر لیا۔

"اگر ایسا ہے تو وہ بچے گا نہیں۔ پہلے تو رمشا کی وجہ سے میں مجبور تھا، اب مجھے پولیس تک جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" سجاد غصے سے بولا۔ اس کا غصہ جائز تھا۔ انہوں نے بے پناہ ذہنی اذیت اٹھائی تھی اور اپنے کل سرمائے سے الگ محروم ہوگئے تھے بلکہ رقم پوری کرنے کے لیے پچاس ہزار فریحہ کی بہن سے قرض بھی لینا پڑے تھے۔ سلمان نے انہیں گھر خالی کرنے کے لیے پندرہ دن کی مہلت دی تھی اور فی الحال تو ان کے پاس کسی مناسب علاقے میں کرائے کا گھر لینے کے لیے ایڈوانس کی رقم بھی موجود نہیں تھی۔ اس کے لیے سجاد نے اپنے دفتر سے لون لینے کا سوچا ہوا تھا۔ وہ لوگ اچھی بھلی زندگی گزارتے ہوئے یک دم ہی صفر پر چلے گئے تھے اور ظاہر ہے دوبارہ سب کچھ بنانا آسان نہیں تھا۔

"میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔" غصے سے بھرا وہ فوراً گھر سے روانہ ہوگیا۔ گاڑی نہیں رہی تھی اس لیے اسے رکشے میں جانا پڑا۔

"آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی قانون پر اعتماد کرنے کے بجائے بلیک میلرز کے ہاتھوں میں اتنی آسانی سے بے وقوف بن جائیں تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ آپ کو پہلی فون کال ملتے ہی ہم سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔" اس کی زبانی سارا قصہ سن کر ایس ایچ او نے قدرے ترشی سے کہا۔

"اولاد کی زندگی داؤ پر لگی ہو تو انسان کچھ سوچ سمجھ نہیں پاتا۔" سجاد نے دھیمے لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

"خیر جو ہوا سو ہوا۔ ہم اس لڑکے کو چیک کرتے ہیں جس پر آپ کو شک ہے۔" ایس ایچ او نے یقین دہانی کروائی اور خوش اخلاقی سے سجاد کو رخصت کیا۔ شاید اسے ایک آسان کیس ہاتھ لگا تھا جس کو حل کرنے سے اس کے ریکارڈ میں ایک اچھا اضافہ ہو جاتا۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز پر سجاد گیٹ پر گیا۔ وہ ابھی ابھی آفس سے آیا تھا البتہ فریحہ اپنی جاب پر نہیں گئی تھی۔ رمشا کے ذہن پر اپنے اغوا کی دہشت طاری تھی اس لیے اسے اسکول نہیں بھیجا گیا تھا۔ اس کو کمپنی دینے کے خیال سے فریحہ نے چھٹی کر لی تھی۔ صفیہ خاتون ابھی مکمل طور پر فٹ نہیں تھیں اس لیے بھی اس کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔

"السلام علیکم سجاد بھائی! معاف کیجیے گا، آپ کو ذرا زحمت دے رہا ہوں۔" گیٹ پر سلمان تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور کھڑا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" سجاد نے مروت کا مظاہرہ کیا۔

"اصل میں ان صاحب کو گھر دکھانا ہے۔ یہ اس علاقے میں مکان خریدنے میں انٹرسٹڈ ہیں۔" سلمان نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"لیکن ابھی تو ہم اس گھر میں رہ رہے ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اصولاً تو اب یہ مکان میرا ہے اور میں کسٹمر ہاتھ سے نہیں نکال سکتا۔ آپ بے فکر رہیے، سودا ہو بھی گیا تو میں پندرہ دن پورے ہونے سے پہلے آپ کو مکان چھوڑنے کے لیے نہیں کہوں گا۔"

سجاد کے اعتراض کا جواب اس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔ اصولاً وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا چنانچہ طوعاً و کرہاً سجاد کو اسے اندر آنے کی اجازت دینی پڑی۔ سلمان نے شکریہ ادا کیا اور ساتھ آنے والے گاہک کو گھر دکھانے لگا۔ سجاد لاؤنج میں آ بیٹھا جہاں فریحہ، رمشا کو ڈرائنگ میں کلر بھروا رہی تھی۔ فریحہ کو اس نے سلمان اور اس آدمی کی آمد کا مقصد بتا دیا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھے وہ سلمان کی آواز سنتے رہے۔ اپنے کسٹمر کو گھر دکھاتے ہوئے وہ مسلسل اس کی تعریفوں میں مصروف تھا۔ اس نے تقریباً دس منٹ لیے اور پھر دوبارہ لاؤنج میں آیا۔

"اچھا سجاد بھائی۔۔۔۔ آپ کے تعاون کے لیے بہت شکریہ۔" اس نے سجاد سے مصافحہ کیا اور پھر اس کے برابر میں بیٹھی رمشا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "رمشا گڑیا بڑی سنجیدگی سے پڑھائی کر رہی ہے۔" اس نے دایاں

ہاتھ بڑھا کر رمشا کے رخسار پر پیار سے ہلکی سی چٹکی لی۔ رمشا نے ردِعمل میں کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔ سجاد کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ تھا۔ اغوا جیسے حادثے سے گزرنے کے بعد شاید وہ گھر کے افراد کے علاوہ ہر ایک سے خوف زدہ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رمشا کو اپنے قریب کرلیا۔ اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ سلمان اس کی حالت کا نوٹس لیے بغیر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

"سلمان سے مجھے اس قسم کے رویّے کی امید نہیں تھی۔ یہ تو پکا کاروباری بندہ نکلا ہے۔" فریحہ جو اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی، واپس آکر بولی۔

"آدمی کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے ساتھ معاملات کرو۔۔۔ اور دیکھا جائے تو وہ اتنا غلط بھی نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔" سجاد کا لہجہ شکستہ تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ فراز کے بارے میں بھی ہم نے کب سوچا تھا کہ وہ ایسا نکلے گا۔" فریحہ بھی رنجیدہ ہوئی۔

"اس کا بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ میری ایس ایچ او سے بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ٹھیک ٹھاک چھترول کے باوجود فراز نے اپنا جرم تسلیم نہیں کیا۔ اس کے گھر کی تلاشی لینے پر بھی کچھ نہیں ملا ہے۔ اس کے موبائل سے پولیس نے وہ موبائل نمبر بھی حاصل کرلیا ہے جس سے اس کے مطابق اغواکاروں نے کال کر کے اسے ہدایات دی تھیں۔ نمبر ایسی غیر قانونی سم کا ہے جو کسی کے نام رجسٹرڈ نہیں اور اب وہ سم بھی بند جا رہی ہے۔"

"ارے رمشا! کیا بات ہے بیٹا۔۔۔ کیوں رو رہی ہو؟" سجاد کی بات سنتے ہوئے فریحہ کی نظر رمشا پر پڑی تو تڑپ کر اس کے قریب آئی۔ سجاد کے ساتھ لگی وہ بہت خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا! کیوں رو رہی ہو؟" سجاد نے بھی پریشانی سے پوچھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے پاپا۔" اس نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں ڈر لگ رہا ہے بیٹا؟ آپ تو مما پاپا کے پاس ہو نا۔" سجاد نے اسے سمجھایا۔

"پاپا! سلمان انکل کا ہاتھ بالکل ان گندے والے گنجے انکل کی طرح تھا جنہوں نے مجھے مارا تھا۔ ان کے ہاتھ میں بھی سلمان انکل کے ہاتھ کی طرح چوٹ لگی ہوئی تھی اور انہوں نے بالکل ویسا ہی بینڈ پہن رکھا تھا۔"

رمشا کے الفاظ نے ان دونوں کو بُری طرح چونکا دیا۔ اگلے ہی لمحے سجاد ایس ایچ او کا نمبر ملا کر تیسرے مشکوک فرد کی نشاندہی کر رہا تھا۔ دوسری فرد سونیا تھی جس پر اسے صرف اس کی بے ایمان فطرت کی وجہ سے شک ہوا تھا لیکن اس کی اونچی حیثیت کی وجہ سے فی الحال ایس ایچ او نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی اور فراز کو ہی تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔

☆☆☆

فراز اور ثوبیہ کئی دن بعد آج پھر اسی ریسٹورنٹ میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ ثوبیہ قدرے خراب موڈ میں وہاں آئی تھی لیکن فراز پر نظر پڑتے ہی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ اس کی دائیں آنکھ کے نیچے نیل کا نشان تھا اور وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا کمزور لگ رہا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔۔۔ کیا کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"کیا مطلب سمجھ لو؟ صاف طور پر بتاتے کیوں نہیں ہو کہ کیا ہوا ہے؟ میں تمہارے لیے کتنی پریشان رہی ہوں، کچھ اندازہ ہے۔ نہ تم اسکول آرہے تھے اور نہ ہی تمہارا فون آن تھا۔ کتنے میسج کیے میں نے تمہیں لیکن کسی ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔ اِدھر گھر والوں نے الگ میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے کہ جلد ہاں کردوں۔ میں تو دو طرف سے پس کر رہ گئی۔" اس کا غصہ جو فراز کی حالت دیکھ کر دب گیا تھا، عود کر آیا۔

"تم یہ تو نہیں سمجھ رہی تھیں کہ میں نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی ہے اور شادی کا ذکر ہوتے ہی منظر سے غائب ہوگیا ہوں؟" اس کے سرخ ہوتے رخساروں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے فراز نے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔

"بے وفائی کرو گے تو اپنی جان سے جاؤ گے۔" ثوبیہ نے ٹیبل پر پڑا کانٹا اٹھا کر مارنے والے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔

"پہلے ہی پولیس والوں نے مار مار کر انجر پنجر ڈھیلے کر دیے ہیں، باقی کی کسر تم پوری کردو۔" فراز مسکینیت سے بولا۔

"کیا۔۔۔؟ تمہیں پولیس والوں نے مارا ہے۔۔۔ مگر کیوں؟" وہ حیرت سے چیخی۔

"کسی کی کرنی میرے گلے میں آگئی تھی۔" فراز

اسے تفصیلات سنانے لگا۔

"میں رمشا نامی ایک بچی کو ٹیوشن دیتا ہوں۔ بچی کو کسی نے اغوا کرلیا تھا لیکن بعض اتفاقات ایسے ہوئے کہ شک مجھ پر گیا۔ رمشا جانوروں کی بہت شوقین ہے اور اتفاق سے میں اس سے ذکر کر بیٹھا کہ اس کے گھر کے قریبی پارک میں بہت سی گلہریاں ہیں۔ وہ اپنی دادی سے چھپ کر اکیلی پارک چلی گئی اور وہاں سے اغوا کرلی گئی۔ اب یہ بھی اتفاق تھا کہ اغواکار اس کے والدین سے تاوان کی وصولی کے لیے جس علاقے کے فون نمبرز استعمال کرتے رہے، میرا گھر بھی وہیں موجود ہے۔ رمشا کے اغوا والے دن میں بہن کی منگنی کی مٹھائی لے کر ان کے گھر گیا تھا۔ رمشا کی دادی جنہیں میں صفیہ آنٹی کہتا ہوں، شوگر پیشنٹ ہیں۔ اس دن شاید پہلے سے ہی ان کی طبیعت خراب تھی لیکن گھر والوں نے جب مجھ پر شک کرنا شروع کیا تو انہیں لگا کہ میں نے صفیہ آنٹی کو مٹھائی میں کچھ ملا کر کھلا دیا تھا۔ اس لیے وہ خلافِ معمول دوپہر میں سوگئیں اور رمشا کو گھر سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ شک کو یقین کی حد تک پہنچانے میں اغواکاروں کے اس مطالبے نے کہ تاوان کی رقم رمشا کے ٹیوٹر فراز کے ہاتھ بھیجی جائے، حتمی کردار ادا کیا اور یوں میں تھانے پہنچ گیا جہاں مجھے الٹا لٹکا کر خوب چھترول کی گئی اور پولیس والے یہ قبول کروانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں نے رمشا کو اغوا کیا تھا۔ مارے ہار کر میں شاید یہ الزام تسلیم بھی کرلیتا لیکن تاوان کے پینتالیس لاکھ روپے کہاں سے لا کر پیش کرتا اس لیے مار کھاتا رہا اور انکار کرتا رہا۔" فراز کی سنائی داستان پر ثوبیہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ تمہاری جان کیسے چھوٹی؟" اس نے یوں تجسس سے پوچھا جیسے کوئی کہانی سن رہی ہو۔

"پھر ایک اتفاق نے ہی میری جان بچائی۔ سجاد صاحب کا ایک پڑوسی ہے سلمان۔ اسٹیٹ ایجنسی چلاتا ہے۔ اس کی ان کے مکان پر نظر تھی اور اسی نے یہ سارا گیم کھیلا تھا۔ وہ بچی کی نگرانی کرتا رہا اور ساتھ ہی ایک بندے کی ڈیوٹی بھی لگادی کہ وہ گھر کے آس پاس گھومتا رہے تاکہ جب بھی بچی اکیلی باہر نظر آئے، اسے بہلا پھسلا کر اغوا کرلیا جائے۔ میری پارک میں گلہریوں والی اطلاع کی وجہ سے اس کا کام آسان ہوگیا۔ بچی اغوا ہوگئی۔ ساتھ ہی گھر میں چوری کی واردات بھی کردی گئی۔ چنانچہ سجاد صاحب کو نہایت کم قیمت پر سلمان سے اپنے مکان کا سودا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی گاڑی فروخت کی اور بینک بیلنس وغیرہ ملا کر تاوان ادا کردیا۔ سلمان پر کوئی الزام لگا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو رمشا سے بھی میک اپ میں ملا تھا اور ایک گنجے آدمی کو دیکھ کر وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ سلمان ہے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ بچوں کی قوتِ مشاہدہ کتنی مضبوط ہوتی ہے۔ رمشا نے بھی نوٹ کرلیا کہ جس گنجے آدمی نے اسے مارا پیٹا تھا، اس کے دائیں ہاتھ پر زخم کا نشان تھا اور اس نے کلائی میں ایک بینڈ پہن رکھا تھا۔ سلمان سے ملاقات ہونے پر اس نے ان دو نشانیوں کو نوٹ کر کے والدین کو اس بارے میں آگاہ کردیا اور سجاد صاحب ایس ایچ او کے علم میں یہ بات لے آئے۔ ایس ایچ او نے سلمان کو اٹھوالیا اور پھر سارا سچ بھی اگلوا ڈالا۔ یوں اب وہ اور اس کے ساتھی سلاخوں کے پیچھے ہیں اور میں تمہاری شرربار نگاہوں کا سامنا کرنے کے لیے یہاں بیٹھا ہوں۔" فراز نے ساری تفصیل سنائی۔

"بہت چالاک آدمی ہے یہ سلمان تو۔ ایک ہاتھ سے رقم دی اور دوسرے سے لے بھی لی۔ مکان بھی اس کا ہوگیا۔" ثوبیہ نے تبصرہ کیا۔

"ایسا ویسا چالاک۔۔۔ اگر رمشا ایک معمولی بات نوٹ کر کے اسے گرفتار نہ کروادیتی تو لاکھوں کما لیتا۔ اپنے ساتھیوں کو تو اس نے صرف پانچ پانچ لاکھ ہی دیے تھے۔ پینتیس لاکھ واپس اس کے اپنے پاس پہنچ گئے تھے۔ پھر مکان بیچ کر بھی وہ تقریباً اتنا ہی پرافٹ کماتا کیونکہ سجاد صاحب کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس نے تقریباً آدھی قیمت میں ان کا مکان خرید لیا تھا۔" فراز نے اس کی تائید کرتے ہوئے بتایا۔

"شکر ہے خبیث پکڑا گیا ورنہ تم تو بڑی مصیبت میں پڑ جاتے۔ تمہیں تو اس نے پھنسا ہی دیا تھا۔" ثوبیہ نے جھرجھری لی۔

"واقعی۔۔۔ تاوان کی رقم مجھ سے منگوا کر تو اس نے میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ میرا موبائل نمبر بھی بڑی چالاکی سے حاصل کیا تھا۔ ایک دن میں رمشا کو پڑھا کر نکلا تو مجھ سے ملا اور بولا کہ اس کے ایک جاننے والوں کو ٹیوٹر کی ضرورت ہے چنانچہ میں اپنا نمبر دے دوں۔ اصل میں تو وہ مجھے قربانی کا بکرا بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس

مصیبت سے نکال لیا۔'' ثوبیہ آبدیدہ ہوگئی۔

''شکر کی تو ایک اور بات بھی ہے لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری طرف کیا صورتِ حال ہے؟ تمہارے گھر والے رشتے کے لیے ہاں تو نہیں کر بیٹھے؟'' فراز کے انداز میں خوشی اور تشویش دونوں کے رنگ تھے۔

''نہیں، فی الحال میں نے انہیں روکا ہوا ہے۔ آپی سے تمہارے سلسلے میں بات بھی کر لی تھی۔ انہوں نے مدد کا وعدہ تو کیا ہے لیکن انہیں بھی یہ تشویش ہے کہ ایک سیٹلڈ بندے کے مقابلے میں ابو کسی جاب لیس کے رشتے پر مشکل سے غور کریں گے۔'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں سنجیدگی سے بتایا۔

''تو سمجھو مسئلہ حل ہوگیا۔ تمہارے ابو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرنے والے داماد کو تو قبول کرلیں گے نا؟'' فراز نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ ''اسے پڑھو۔''

ثوبیہ نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر دیکھا۔

''اپائنٹ منٹ لیٹر۔'' اس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے جھلملا اٹھیں۔

''جی جناب۔'' فراز مسکرا کر بولا۔

''اف میرے اللہ! میں کتنی خوش ہوں، تمہیں بتا نہیں سکتی۔'' وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کھلکھلائی۔

''خوش تو میں بھی بہت ہوں۔ اللہ نے آزمائش میں ضرور ڈالا لیکن پھر فوراً ہی ایک بڑی خوش خبری بھی دے دی۔ صفیہ آنٹی کے کہنے پر سجاد صاحب اپنی فرم میں میری جاب کے لیے کوشش تو پہلے ہی کر رہے تھے۔ واقعے کے بعد انہوں نے اپنی جان لڑا دی۔ ان کی کوشش کی وجہ سے ہی مجھے یہ جاب ملی ہے۔ دونوں میاں بیوی نے گھر آ کر مجھ سے اور امی سے بہت معذرت بھی کی کہ ان کے شک کی وجہ سے ہم اتنی بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ امی ان دنوں اسپتال میں تھیں اور میں نے دونوں بہنوں کو سختی سے یہ تاکید کردی تھی کہ ان کے علم میں یہ بات نہ آنے پائے ورنہ میری گرفتاری کی خبر سن کر تو انہیں کچھ ہو ہی جاتا۔ میرے پیچھے میرا ایک اچھا دوست سارے معاملات دیکھتا رہا۔ یوں میں اس مصیبت سے نکل آیا۔ تھانے سے آنے کے بعد بھی تم سے فوری طور پر یوں رابطہ نہیں کیا کہ جوتا تمہیں دکھانے کے لائق نہیں تھا اور رشتے والے مسئلے میں بھی میں کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ اب سارے مسائل حل ہوگئے ہیں تو تمہارے سامنے حاضر ہوں۔ یہ بتاؤ کہ بردکھوے کے لیے کب تمہارے گھر حاضر ہوں؟'' بہت سنجیدگی سے بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ شوخ ہوگیا۔

''فی الحال تو اپنی اماں بہنوں کو بھیج دو.... بردکھوا تو اسی وقت کروانا جب یہ باقی کے ڈینٹ پینٹ بھی صحیح ہو جائیں۔'' اس نے فراز کی آنکھ کے نیچے پڑے نیل کے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے بھی زیادہ شوخ لہجے میں جواب دیا اور کھلکھلا کر ہنسی۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے، پہلے زمانے میں لڑکیاں اپنی شادی کے ذکر پر شرما کر نظریں جھکا لیتی تھیں، یہاں قہقہے لگائے جا رہے ہیں۔'' فراز نے مصنوعی دکھ کا اظہار کیا۔

''تو فی الحال شادی ہو بھی کب رہی ہے؟ ابھی تو منگنی ہوگی۔ میرے گھر والے میری دونوں بڑی بہنوں کو اور تم فرحین اور سبین کو نمٹاؤ گے۔ سال دو سال تو انتظار کرنا پڑے گا اور یہ عرصہ میں تمہاری تنخواہ پر عیش کرتے ہوئے گزاروں گی۔ منگنی کے بعد ہم پابندی سے ملا کریں گے۔ تم مجھے خوب شاپنگ کروانا اور کھلانا پلانا۔ اس ریسٹورنٹ کے ڈنر تو میں ہر ہفتے کھانے آیا کروں گی۔'' ثوبیہ نے اسے اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی سے آگاہ کیا اور مزید بولی۔ ''سچ فراز.... کتنا مزہ آئے گا نا جب تم کبھی مجھے لنچ پر لے جاؤ گے، کبھی ڈنر پر اور کبھی کبھی ہم ہائی ٹی لے لیا کریں گے۔''

''یا اللہ .... سارے کھانے پینے کے پروگرام ہیں۔ شادی تک تو تمہاری یہ پتلی کمر کمرا بن جائے گی۔'' فراز نے تشویش کا اظہار کیا۔

''تو کیا موٹی ہونے کے بعد میں تمہارے لیے قابلِ قبول نہیں رہوں گی؟'' ثوبیہ نے آنکھیں نکالیں۔

''نہ بابا.... میری ایسی جرأت کہ تمہیں ریجیکٹ کروں۔ ہم تو وعدہ نبھانے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ایک بار جو کمٹمنٹ کرلی اسے ساری زندگی نبھائیں گے۔ ویسے بھی بے ایمانی سے کچھ نہیں ملتا۔ انجام سلمان جیسوں کا سا ہوتا ہے۔'' اس نے پہلے کانوں کو ہاتھ لگائے پھر ٹیبل پر رکھا ثوبیہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''ایک بار اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے تو اب ساری زندگی نہیں چھوڑنا ہے۔'' ٹون بدلی۔ شوخ لہجہ خواب ناک ہوا تو ثوبیہ کی شوخی بھی حیا میں ڈھل گئی۔ اس کا یہ شرمایا ہوا روپ اتنا دل موہ لینے والا تھا کہ فراز آنکھیں جھپکائے بنا اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔